رپورٹ تحقیقاتی عدالت برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳

مقرر کردہ زیر پنجاب ایکٹ ۲، ۱۹۵۴

المعروف

منیر انکوائری رپورٹ

نیا زمانہ

نیا زمانہ پبلیکیشنز

رپورٹ تحقیقاتی عدالت برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳
مقررکردہ زیر پنجاب ایکٹ ۲، ۱۹۵۴

المعروف

منیر انکوائری رپورٹ

محمد شعیب عادل نے

حاجی حنیف پریس سے چھپوا کر

نیا زمانہ پبلیکیشنز،

14 بی، ٹیمپل روڈ، لاہور سے شائع کی

قیمت: 500 روپے

فہرست

عرض ناشر (نئے ایڈیشن کے لیے)	9
تعارف (نئے ایڈیشن کے لیے)	10
ابتدائیہ	13
ضابطہ کار اور فریقان تحقیقات	16
حصہ اول تقسیم ملک سے لے کر لاہور کنونشن تک	**24**
نزاع	24
احمدی	24
احرار	27
دو احراری لیڈروں کی گرفتاری	31
میجر محمود کا قتل	32
احرار لیڈروں کی تقریریں	34
افغانستان میں احمدیوں کی سنگساری اور "الشہاب"	39
مزید قتل	48
یوم تشکر	54
احمدیوں کی مسجد جلا دی گئی	57
احراریوں کی دوسری تقریریں	58
پالیسی اور تدابیر	61
بخاری کی مزید تقریریں	65

مسجدوں میں عام جلسوں کے خلاف دفعہ 144 کے احکام کا نفاذ، 103

سرگودھا اور گوجرانوالا کے کیس 103

جہانگیر پارک میں چوہدری ظفر اللہ خان کی تقریر 121

کراچی میں آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن 125

لاہور میں آل مسلم پارٹیز کنونشن 125

اخبارات 131

محکمہ اسلامیات 140

حصہ دوم: لاہور کنونشن سے لے کر کراچی اور پنجاب میں علماء کی گرفتاری تک 142

از 14 جولائی 1952 تا 27 فروری 1953 142

دفعہ 144 کے احکام واپس لے لیے گئے 142

ٹپ کا واقعہ 147

بعد کے واقعات 157

اخبارات 160

آزاد 160

آفاق 163

احسان 164

مغربی پاکستان 166

مزید تقریریں۔ پالیسی پر نظر ثانی 184

علماء کی سرگرمیاں اور وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ سے ان کی ملاقاتیں 195

ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ 211

ڈائریکٹ ایکشن کی دھمکی کے مقابلے کی تیاریاں 212

ابتدائی تدابیر 223

حصہ سوم: فسادات 232

(27 فروری سے فسادات کے خاتمہ تک)

فسادات کا حال 232

لاہور 233

دولتانہ صاحب نے ٦ مارچ کا بیان واپس لے لیا 258

سیالکوٹ 259

گوجرانوالا 268

راولپنڈی 274

لائل پور 276

منٹگمری 280

حصہ چہارم: وہ کوائف جن کا نتیجہ مارشل لاء کے اعلان کی صورت میں نکلا 283

مسلمانوں اور احمدیوں کے درمیان عقائدی اختلافات 289

ختم نبوت 289

مسیحات 293

جہاد 296

دیگر شکایات والزامات 303

مطالبات کی پشت پر نظریہ 311

اسلامی مملکت	312
اسلامی مملکت کی بنیادیں: قرآن، سنت، اجماع، اجتہاد	316
اسلامی مملکت کے لازمی اجزاء	325
اسلامی مملکت میں حاکمیت اور جمہوریت	327
علماء کے نزدیک اسلامی مملکت کے دوسرے لوازم کیا ہیں	328
مقنّنہ اور قانون سازی	328
غیر مسلموں کا موقف	331
ارتداد	340
دوسرے مذاہب کی تبلیغ	344
جہاد	345
غیر مسلم مملکتوں کے مسلمانوں پر ردعمل	353
دوسرے اثرات	359
مطالبات کے متعلق خواجہ ناظم الدین کا ردعمل	363
جن کوائف کا نتیجہ مارشل لا کی صورت میں نکلا، ان کا جامع خلاصہ	367
حصہ پنجم: فسادات کی ذمہ داری	**368**
ذمہ داری	368
آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کراچی اور آل مسلم پارٹیز کنونشن لاہور	372
تعلیماتِ اسلامی بورڈ کے ممبر	377
جماعت اسلامی	377
احرار	395
احمدی	405

مسلم لیگ 407
اخبارات 435
مرکزی اور صوبائی حکومتیں: خواجہ ناظم الدین اور مسٹر دولتانہ کا نزاع 437

حصہ ششم: سول کے حکام نے صورت حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے جو تدابیر اختیار کیں وہ کافی تھیں یا ناکافی 446

نظم حکومت کی مشینری 446
قانون اور انتظام میں فرق 448
چیف منسٹر صرف پالیسی وضع کرتا ہے 449
اسلامی حکومت کے متعلق خواجہ صاحب کا تصور 461
اپنے آپ کو حالات کی لہر پر چھوڑ دینے کی پالیسی 464
رگڑا مست قلندر دا 486
مئی 1952 میں ڈی آئی جی، سی آئی ڈی نے صورت حالات کا عام جائزہ لگایا
اور پالیسی کی وضاحت کے لیے نئی چٹھیاں جاری کیں 493
5 جولائی 1952 کے فیصلے 504
19 جولائی 1952 کو احرار کی طرف سے یقین دہانی 509
24 دسمبر 1952 کا فیصلہ 526
پریس 537
تعلیم بالغاں کا فنڈ 553
آفاق (اخبار) 554
مزدور (اخبار) 555
آزاد (اخبار) 556

ڈائریکٹ ایکشن	557
آخری مرحلہ	562
دفعہ 144 کا استعمال	573
فصیلی شہراور مسجد وزیر خان	583
نیازی کی گرفتاری	590
فائرنگ نرم کرنے کا فیصلہ	594
فوج کے ساتھ روابط	601
کیا مارشل لاء سے بچنا ممکن تھا؟	615
حصہ ششم کے متعلق نتائج کا جائزہ	620

عرضِ ناشر

اس رپورٹ کو دوبارہ شائع کرنے کا جذبہ محرکہ خالد حسن کا وہ مضمون تھا جو انھوں نے دی فرائیڈے ٹائمز، 9 جون 2006 کو نیا زمانہ کی مسلسل اشاعت کے چھ سال مکمل ہونے پر تحریر کیا اور لکھا کہ یہ رپورٹ پاکستان کے ہر سکول و کالج کے نصاب کا لازمی حصہ ہونی چاہیے۔ اس رپورٹ کی اشاعت کا مقصد کسی فرد، فرقہ، مسلک یا مذہبی گروہ کی دل آزاری نہیں۔ کسی کو نیچا دکھانا مقصود ہے اور نہ ہی کسی خاص گروہ کے افکار کی ترویج و فروغ۔ ''نیا زمانہ'' کا مقصد اس ملک میں سماجی انصاف اور جمہوری نظام حکومت اور معاشرے کے لیے کوشش کرنا ہے۔

ہمارے ہاں سیکولرازم کو لادینیت سے تعبیر کیا جاتا ہے جو کہ صریحاً غلط ہے۔ سیکولر نظام حکومت میں ریاست کو کسی مذہب سے تعلق نہیں ہوتا اس کے لیے تمام شہری برابر ہیں اور مذہب ہر شہری کا نجی معاملہ ہوتا ہے۔ سیکولرازم ایک سیاسی رویہ ہے جو جمہوریت کی بنیاد ہے، اس کے بغیر دنیا میں کوئی ریاست جمہوری نہیں کہلا سکتی، کسی معاشرے کو جمہوری قرار نہیں دیا جاسکتا، سیاست کی زبان میں سیکولرازم کا مطلب ہے مملکت کے شہریوں کو حقوق و فرائض میں مساوی سمجھنا، ان کے درمیان مذہبی، نسلی یا لسانی بنیادوں پر کسی قسم کا امتیاز نہ برتنا وغیرہ ہے۔

یہی کچھ قائداعظم محمد علی جناح نے ۱۱راگست ۱۹۴۷ء کو دستور ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا اور ماہنامہ نیا زمانہ مسلسل سات سالوں سے یہی پرچار کرتا چلا آرہا ہے۔

محمد شعیب عادل

ایڈیٹر ماہنامہ ''نیا زمانہ''، لاہور

تعارف

(نئے ایڈیشن کے لیے)

1953ء میں، پنجاب میں ہونے والے احمدی مخالف فسادات کے بارے میں ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کیا گیا تھا جس نے تفصیل کے ساتھ ان اسباب ووجوہات کی نشان دہی کی جوان فسادات کا باعث بنے تھے۔ یہ ایک تاریخی دستاویز ہے، کیونکہ اس میں نہ صرف ان فسادات کے بارے میں غیر جانبداری سے تجزیہ کیا گیا ہے، بلکہ ان کے تاریخی پس منظر کو بھی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔اس رپورٹ کی تازہ اشاعت کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس مرحلہ پر اوران حالات میں اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس رپورٹ میں جن مذہبی تنازعات کا ذکر کیا گیا ہے کیا وہ ابھی تک اس طرح سے موجود ہیں اور مسلسل فسادات کا باعث بن رہے ہیں؟ اگر اسکا جواب ہاں میں ہے تو پھراس سوال کا جواب ڈھونڈنے کی ضرورت ہے کہ آخر نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی ہم ابھی تک انہی مسائل کا شکار کیوں ہیں؟

تاریخ میں وہ قومیں آگے بڑھتی اور ترقی کرتی ہیں جن کے ہاں نئے افکار اور نظریات پیدا ہوتے رہتے ہیں تا کہ وہ بدلتے ہوئے حالات کا مقابلہ کرسکیں۔ جہاں روایت پسندی اور قدامت پرستی افکار وخیالات کو فرسودہ کر دیتی ہے، ایسے معاشرے تاریخ کو بار بار دہراتے رہتے ہیں۔ پاکستانی سماج کے سلسلہ میں ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ اس میں جدید حالات وتقاضوں کا چیلنج قبول کرنے کے لئے کوئی فکری تحریک نہیں اٹھ رہی ہے اور راسخ العقیدگی وانتہا پسندی نے سوچ کی تمام راہوں کو بند کر دیا ہے۔

پاکستان کی تاریخ میں مذہب کو سیاسی اقتدار حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بنایا گیا ہے اس مقصد کے لئے مذہبی اور غیر مذہبی سیاسی پارٹیاں برابر کی شریک ہیں۔اس سلسلہ میں پہلے تو اس بات کو

بار بار دھرایا گیا کہ پاکستان کا قیام مذہب کے نام پر عمل میں آیا، اس لئے اسے ایک مذہبی ریاست ہونا چاہئے۔ مذہبی ریاست کا مطلب ہے کہ وہ تمام اقلیتیں کہ جن کا تعلق اکثریتی فرقے سے نہیں ہے انہیں قوم کی تشکیل اور اس کے دائرے سے نکال دیا جائے۔ ہم قوم نہ ہونے کے سبب سے ''ملک وقوم'' کے ساتھ ان کی وفاداری مشکوک ہو جاتی ہے، اس لئے انہیں نہ تو اعلیٰ انتظامی عہدوں پر مامور کیا جاتا ہے اور نہ فوج میں داخل کے جاتا ہے۔ اگر یہ مذہبی اقلیتیں اپنے حقوق کی جدوجہد کرتی ہیں تو اسے بغاوت اور شورش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آج کے جمہوری دور میں کہ جہاں ہر فرد کو بنیادی حقوق حاصل ہیں اور جہاں ریاست مذہبی معاملات میں غیر جانبدار ہے کوئی ریاست اس ڈھانچہ کے ساتھ اپنے استحکام کو برقرار رکھ سکتی ہے؟

اس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں مذہبی اقلیتوں کو جب پاکستان میں اپنا مستقبل محفوظ نظر نہیں آیا تو اس کے نتیجہ میں ان کے پروفیشنل اور ذہین افراد ملک چھوڑ کر چلے گئے جو باقی رہ گئے ہیں وہ مایوسی اور افسردگی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ انہیں قومی دھارے سے علیحدہ کر کے حاشیہ پر ڈال دیا ہے۔

پاکستان کی تاریخ میں مذہبی اقلیتوں کے صرف سیاسی حقوق ہی کو غصب نہیں کیا گیا بلکہ ان کی طاقت، اثر ورسوخ اور توانائی کو ختم کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً ان کے خلاف ہنگامے اور فسادات کرائے گئے تاکہ ان کی معاشی حالت کو تباہ کیا جائے اور نفسیاتی طور پر انہیں انتشار اور غیر یقینی کی کیفیت میں مبتلا رکھا جائے۔ ان فسادات میں گھروں کو لوٹنا، دکانوں کو جلانا، مذہبی عبادت گاہوں کی بے حرمتی کرنا، کاروبار کا بائیکاٹ کرنا اور قتل وغارت گری کے ذریعہ خوف وہراس پیدا کرنا ہوتا ہے۔

اس رپورٹ میں 1953ء میں فسادات کے جن اسباب کا ذکر کیا گیا ہے اس کے تسلسل کو ہم آج بھی دیکھتے ہیں، مثلاً مخالفوں کے خلاف فتوے دینا، اشتہارات، پمفلٹوں اور کتابوں کے ذریعہ ان کے نظریات کے بارے میں مبالغہ آمیزی سے پروپیگنڈا کرنا جلسوں، جلوسوں اور اجتماعات میں تقریروں کے ذریعہ لوگوں کے مذہبی جذبات کو مشتعل کرنا اور اب اضافے کے ساتھ ٹیپ اور ویڈیو فلموں کے ذریعہ مذہبی تعصب اور نفرت کو پھیلانا۔

جب بھی فسادات ہوتے ہیں تو اس کے نتیجہ میں جان ومال کا نقصان ہوتا ہے۔ لوگوں کی

توانائی ان کاموں میں صرف ہوتی ہے کہ جس سے فائدے کے بجائے نقصان ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی پولیس کے ادارے کو بے جا طاقت استعمال کرنے کے مواقع مل جاتے ہیں، ان کے اور عوام کے درمیان دشمنی اور نفرت کی خلیج حائل ہو جاتی ہیں۔ جب پولیس بھی فسادات کو روکنے میں ناکام ہو جاتی ہے تو فوج کو بلوایا جاتا ہے، لہٰذا پولیس اور فوج امن وامان کی علامتیں ہو جاتے ہیں جب کہ عوام شورش پسند اور غنڈے۔

اگر دیکھا جائے تو پاکستان میں پہلا مارشل لگانے کی ذمہ دار مذہبی جماعتیں تھیں جنہوں نے احمدی مخالف فسادات کرائے اور پنجاب میں فوج کو دعوت دی یہ مارشل لاء کی ابتداء تھی اس کے بعد سے مارشل لاء ہماری تاریخ کا اہم حصہ بن گئے۔

اس رپورٹ کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ 1950 کی دہائی تک پاکستان کی ریاست کو یہ احساس ضرور تھا کہ اس قسم کے فسادات کی تحقیق کرائی جائے۔ چنانچہ احمدی فسادات کے کمیشن نے نہ صرف ان فسادات کا تجزیہ کیا بلکہ اس وقت کے اہم علماء سے انٹرویو کر کے ان مذہبی مباحث کو بھی پیش کیا ہے کہ جو آج تک متنازعہ ہیں۔

اگرچہ فسادات اب بھی ہوتے ہیں، اور پہلے سے زیادہ ہی ہوتے ہیں، لیکن اب ان کا اس گہرائی کے ساتھ تجزیہ کیا جاتا ہے اور نہ ہی تحقیقاتی رپورٹوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال توہین آمیز کارٹونوں کی اشاعت اور فسادات ہیں، کہ جن کے بارے میں کسی قسم کی تحقیقات نہیں کی گئی۔

یہ رپورٹ ہمارے سامنے ایک اہم سوال رکھتی ہے کیا ہم آج کی دنیا میں مذہبی انتہا پسندوں کے ساتھ تنہا اور علیحدہ رہنا پسند کریں گے یا موجودہ حالات کے تحت خود کو بدل کر جمہوریت و مذہبی رواداری کے اصولوں کے تحت دوسری قوموں کے ساتھ چلنا چاہیں گے؟

ڈاکٹر مبارک علی

لاہور

ابتدائیہ

منجانب:۔

عدالت تحقیقات فسادات پنجاب۔لاہور

بخدمت:۔

جناب ہوم سیکرٹری صاحب حکومت پنجاب لاہور

لاہور،مؤرخہ ۱۰ر اپریل ۱۹۵۴ء

جناب والا!

ہم اس عدالت تحقیقات کے صدر اور رکن کی حیثیت سے جو فسادات پنجاب (تحقیقات عامہ) ایکٹ ۱۹۵۳ء کے تحت وجود میں لائی گئی۔آپ کی خدمت میں ذیل کی رپورٹ پیش کرتے ہیں:۔

عدالت کی ترکیب

مارچ ۱۹۵۳ء کے آغاز میں پنجاب کی سرزمین پر وسیع فسادات پھوٹ پڑے۔جو بعض مقامات پر اپریل ۱۹۵۳ء کے وسط تک جاری رہے۔ان فسادات نے ایسا ہولناک رنگ اختیار کیا اور ایسی پرخطر شکل پکڑ لی کہ متعدد مقامات پر ملٹری کو طلب کرنا پڑا اور لاہور میں تو مارشل لاء کا اعلان کیے بغیر چارہ نظر نہ آیا۔جو مئی ۵۳ء کے وسط تک نافذ رہا۔مارشل لاء کے اعلان سے پیشتر پولیس کو کئی مقامات پر گولی چلانی پڑی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو آدمی ۴ر مارچ کی رات کو اور دس نفوس ۵ر مارچ کو

مارے گئے، گولی چلنے سے مزید چھیاسٹھ افراد ضرور زخمی ہوئے ہونگے کیونکہ لاہور کے ہسپتالوں میں جو زخمی داخل کئے گئے ان میں چھیاسٹھ ایسے تھے جن کے جسموں پر گولی کے زخم تھے، لاہور کی آتش فسادات کو فرو کرنے میں ملٹری کو جو کچھ کرنا پڑا اس میں ملٹری کے اعتراف کے مطابق گیارہ ہلاک اور ۴۹ زخمی ہوئے۔ دوسرے شہروں میں بھی پولیس یا فوج کے گولی چلانے سے چند اشخاص ہلاک اور زخمی ہوئے۔

یہ فسادات کیوں ہوئے؟ بات یوں ہوئی کہ ۱۶ رجنوری سے لے کر ۱۸ رجنوری ۵۳ء تک کراچی میں آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن منعقد ہوئی۔ جس نے ایک مجلس عمل ترتیب دے دی۔ اس مجلس عمل نے چند علماء کو یہ اختیار دیا کہ وہ ایک وفد کی صورت میں وزیر اعظم پاکستان کو بتاریخ ۲۱ ر جنوری ۵۳ء بمقام کراچی ایک الٹی میٹم دے دیں چنانچہ اس وفد نے الٹی میٹم دے دیا جس کو خواجہ ناظم الدین (تب وزیر اعظم پاکستان) نے رد کر دیا۔ یہی استرادفسادات کے پھوٹ پڑنے کا باعث ہوا۔ الٹی میٹم یہ تھا کہ اگر ایک مہینے کے اندر اندر قادیانی احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار نہ دے دیا گیا، چوہدری ظفر اللہ خان احمدی وزیر خارجہ کو موقوف نہ کر دیا گیا اور دوسرے احمدی جو مملکت میں کلیدی عہدوں پر فائز ہیں ملازمت سے علیحدہ نہ کر دیئے گئے تو مجلس عمل ڈائرکٹ ایکشن (راست اقدام) کرے گی۔ ۲۷ رفروری کی صبح کی ابتدائی ساعتوں میں مرکزی حکومت کے وزرا اور مغربی پاکستان کے صوبوں کے نمائندہ حضرات کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ الٹی میٹم کو رد کر دیا جائے اور مجلس عمل کے ممتاز ممبروں کو کراچی میں اور تحریک کے بعض لیڈروں کو پنجاب میں گرفتار کر لیا جائے۔ اس فیصلے پر عمل ہونے کے ساتھ ہی فسادات شروع ہو گئے جو براہ راست ان گرفتاریوں کا نتیجہ تھے۔

۱۹ رجون ۱۹۵۳ء کو گورنر پنجاب نے آرڈی نینس (۳) ۱۹۵۳ء صادر کیا۔ جو ہماری تجویز کردہ بعض ترمیمات کے بعد فسادات پنجاب (تحقیقات عامہ) ایکٹ ۱۹۵۳ء بن گیا۔ جس میں یہ ہدایت کی گئی تھی کہ فسادات کے متعلق تحقیقات عامہ کرنے کی غرض سے ایک عدالت قائم کی جائے۔ آرڈینس کی دفعہ ۳ کی ذیلی دفعہ (۱) کے ماتحت جو اختیارات گورنر کو حاصل ہیں ان کو استعمال کرتے

ہوئے گورنر صاحب نے ہمیں اس عدالت تحقیقات کا ممبر مقرر کر دیا۔ اور ہدایت فرمائی کہ ہم مندرجہ ذیل دائرہ وشروط کے اندر رہ کر فسادات کی تحقیقات کریں۔

1- وہ کیا کوائف تھے جن کی وجہ سے ۶/مارچ ۱۹۵۳ء کو لاہور میں مارشل لا کا اعلان کرنا پڑا۔

2- فسادات کی ذمہ داری کس پر ہے۔ اور

3- صوبے کے سول حکام نے فسادات کے حفظ ماتقدم یا تدارک کے لئے جو تدابیر اختیار کیں، آیا وہ کافی تھیں یا ناکافی۔

ہم نے یکم جولائی ۱۹۵۳ء کو تحقیقات شروع کر دی اور کل 117 اجلاس کئے۔ جن میں 92 اجلاس شہادتوں کی سماعت اور اندراج کے لئے مخصوص رہے۔ شہادت ۲۳/جنوری ۱۹۵۴ء کو ختم ہوئی اور اس مقدمے پر بحث یکم فروری سے ۲۸/فروری ۱۹۵۴ء تک جاری رہی۔ پانچ ہفتوں میں ہم نے اپنے نتائج فکر مرتب کئے اور رپورٹ قلم بند کی۔

اس تحقیقات کا ریکارڈ تحریری بیانات کے ۳۶۰۰ صفحات اور شہادت کے ۲۷۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ تین سو انتالیس دستاویزیں رسماً عدالت میں پیش کی گئی ہیں اور شہادت اور بحث کے دوران میں کثیر التعداد کتابوں، کتابچوں، رسالوں اور اخباروں کے حوالے دیے گئے۔ علاوہ بریں ہمیں کثیر التعداد چٹھیاں بھی وصول ہوئیں جو کئی صفحوں پر لکھی ہوئی تھیں اور چند کی ضخامت تو سو صفحے سے بھی زیادہ تھی۔ ہم نے ایک ایک چٹھی کو نہایت احتیاط سے پڑھا۔

ضابطہ کار اور فریقان تحقیقات

چونکہ یہ تحقیقات عمومی نوعیت کی تھی۔ کسی خاص اور معین فرد یا جماعت کے خلاف نہ تھی اور چونکہ حکومت پنجاب کا اس معاملے میں اپنا کوئی نقطہ نگاہ نہ تھا اس لئے ہم نے اپنا ضابطہ کار خود تجویز کرلیا۔ تا کہ ہر قسم کا متعلقہ مواد ہمارے سامنے آجائے اور ہم ایکٹ کے مطابق اپنے وظائف ادا کر سکیں۔ ایکٹ کی دفعہ ۵ کی ذیلی دفعہ ۵ میں یہ لکھا تھا کہ ہم مجموعہ ضابطہ فوجداری کی شروط و قیود کے پابند نہ ہوں گے۔ اس سیکشن میں جو اختیار ہم کو دیا گیا تھا اس کو استعمال کر کے ہم نے یہ قاعدہ وضع کر لیا کہ ہم قانون شہادت کے بھی پابند نہ ہوں گے۔ اس قاعدے کا مقصد یہ تھا کہ یہ تحقیقات حتیٰ الامکان کم سے کم وقت میں مکمل ہو جائے اور اس کے ساتھ ہی ہم اپنے نتائج و مشاہدات کے لئے اس قدر قابل اعتماد اور مستند مواد فراہم کر سکیں جو بحالات موجود حیطۂ امکان میں ہو۔ لیکن اس قاعدے کے باوجود بھی ہم نے قانون شہادت کے اصول کی خاصی پیروی کی ہے اور کسی کے خلاف کسی ایسے مواد کی بنا پر جو قانون شہادت کے ماتحت غیر متعلق اور نا قابل قبول ہو کوئی سنگین و سنجیدہ رائے قلمبند کرنے سے اجتناب کیا ہے چونکہ ہمارا مواد بہت کثیر اور ہماری تحقیقات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ اس لئے ہم بعض موقعوں پر سنی سنائی شہادت کے خلاف قاعدے سے انحراف کئے بغیر نہ رہتے تھے۔ لیکن ہم نے سنی سنائی کو صرف اسی صورت میں قبول کیا ہے جب ہم نے یہ محسوس کر لیا کہ اس کے سچ ہونے میں کوئی شبہ کی گنجائش نہیں، تحقیقات کے بعض فریقوں اور بعض اہم افسروں سے ہم نے تحریری بیانات حاصل کئے ہیں لیکن ہمیشہ ان بیانات کے معائنہ کی اجازت دی ہے اور فریق متاثر کو یہ حق دیا ہے کہ وہ ان بیانات کے دینے والوں کو جرح کی غرض سے دوبارہ طلب کر لے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ضابطہ کار اختیار کرنے سے ہم نے غلطی کے عنصر کو حتیٰ الامکان خارج کر دیا ہے۔

بحث کے دوران میں ہم نے ان تقریروں کے بے شمار اقتباسات کا حوالہ دیا ہے جو کہ کہا جاتا ہے کہ بعض لوگوں نے خاص موقعوں پر کیں۔ یہ تقریریں جب تک اخباروں میں درج نہ ہوئی ہوں یا فریق متعلقہ کی کسی کتاب وغیرہ میں واقع نہ ہوئی ہوں یا ہمارے سامنے شہادت میں بطور ثبوت پیش نہ ہوئی ہوں رسماً ثابت شدہ نہیں سمجھی جاسکتیں۔ لیکن خواہ کوئی تقریر ثابت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ اگر اس کی روداد درج ہوئی ہے اور اس پر کوئی کاروائی کی گئی ہے تو اس کاروائی کے کافی و مناسب ہونے یا نہ ہونے کا تعین کرنے کے لئے وہ روداد بالکل کافی ہوگی۔ اس لئے اس رپورٹ میں جہاں جہاں تقریروں کے حوالے دیئے گئے ہیں ان کو مذکورہ بالا اشارے کی روشنی میں ہی پڑھنا چاہے۔

انگریزی کی رپورٹ میں ہم نے قرآن مجید کی بعض آیات کا ترجمہ نقل کیا ہے جو فریقوں کے نزدیک معتبر اور مسلم تھا۔ اس قسم کے تمام ترجمے علامہ عبداللہ یوسف علی کے ترجمہ قرآن مجید سے نقل کئے گئے ہیں۔

بعض اشخاص اور بعض اداروں کے متعلق ہماری عدالتی رائے یہ تھی کہ وہ اس تحقیقات کی شروط کا جواب دینے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہم نے ان کو کاروائی عدالت میں فریق بنالیا۔ اور ان کو ہدایت کی کہ وہ تحقیقات کے دائرہ شروط کے متعلق تحریری بیانات داخل کریں جن میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ جو ادارے اس طریق پر رفیق بنائے گئے وہ حسب ذیل تھے:۔

1- حکومت پنجاب
2- صوبہ مسلم لیگ
3- مجلس احرار
4- مجلس عمل (مقرر کردہ مجلس تحفظ ختم نبوت پنجاب)
5- جماعت اسلامی
6- صدر انجمن احمدیہ ربوہ
7- احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور

جس زمانے پر یہ تحقیقات حاوی ہے اس میں ۲۶ رنومبر ۱۹۵۱ء تک سردار عبدالرب نشتر

صوبے کے گورنر تھے۔ان کے بعد مسٹر آئی، آئی چندریگر مقرر ہوئے جو مارشل لاء کے اعلان کے بعد تک اس عہدے پر فائز رہے۔صرف چند مہینے مسٹر فدا حسین چیف سیکرٹری حکومت پنجاب کے عہدے پر متمکن ہوئے۔باقی عرصہ حافظ عبدالمجید چیف سیکرٹری رہے۔یہی صاحب ۳۰ ستمبر سے ۷/ دسمبر ۱۹۵۱ء تک ہوم سیکرٹری بھی تھے۔سید احمد علی ۱۷/ مارچ ۱۹۴۹ء سے ۳/ ستمبر ۱۹۵۱ء تک ہوم سیکرٹری رہے اور مسٹر غیاث الدین احمد ۷/ دسمبر ۱۹۵۱ء سے ہوم سیکرٹری چلے آتے ہیں۔مسٹر قربان علی خاں ۱۱/ فروری ۱۹۵۳ء تک انسپکٹر جنرل پولیس رہے۔ان کے عہدے کا چارج مسٹر انور علی نے لیا جو انسپکٹر جنرل پولیس کے فرائض کے ساتھ ساتھ اپنے اصلی عہدے یعنی ڈی آئی جی سی آئی ڈی کے وظائف بھی برابر ادا کرتے رہے۔حافظ عبدالمجید، مسٹر غیاث الدین، مسٹر انور علی، مسٹر ایس این عالم، سید اعجاز حسین شاہ اور مرزا نعیم الدین اپنے عام سرکاری فرائض کی بجا آوری کی وجہ سے فسادات کے آغاز اور ان کی ترقی کے متعلق تازہ ترین اور صحیح ترین معلومات کے حامل تھے اور آخری تین تو زمانہ متعلقہ میں ڈپٹی انسپکٹر جنرل لاہور رینج ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور اور سنیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔اس لئے ان سب افسروں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ تحقیقات کے دائرہ شروط کے متعلق اپنے بیانات پیش کریں۔مذکورہ بالا پولیس افسروں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ تحقیقات کے دائرہ شروط کے متعلق اپنے بیانات پیش کریں۔مذکورہ بالا پولیس افسروں کو یہ بیان کرنیکی بھی ہدایت کی گئی کہ فسادات کے دوران میں گولی بارود کی کتنی مقدار حقیقتاً دی گئی اور استعمال کی گئی اس کے علاوہ پولیس کی فائرنگ سے کتنے آدمی ہلاک و مجروح ہوئے۔سید اعجاز حسین شاہ کو ہدایت کی گئی کہ وہ ان مجسٹریٹوں کے متعلق مکمل بیان پیش کریں جن کے دوران فساد میں روزانہ ڈیوٹیاں لگائی گئیں۔ان کے نام کیا کیا ہدایات جاری کی گئیں اور انہوں نے کیا کیا رپورٹیں پیش کیں۔مزید براں شاہ صاحب سے یہ بھی کہا گیا کہ وہ ان تمام احکام کی نقلیں پیش کریں جو زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری صادر کئے گئے۔ان احکام کی کیا کیا خلاف ورزیاں کی گئیں اور ان پر کیا کاروائی کی گئی۔اس کے علاوہ ہم نے ان کو یہ بیان کرنے کا بھی حکم دیا کہ آیا زیر دفعہ ۱۲۹ ضابطہ فوجداری ملٹری طلب کی گئی یا نہیں۔اگر طلب کی گئی تو اس کا نتیجہ کیا نکلا۔اور اگر طلب نہیں کی گئی تو اس کی وجوہ کیا تھیں۔

ان افسروں کے بیانات کا معائنہ کرنے کے بعد ہم نے ضروری سمجھا کہ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ کو جو دورانِ فسادات میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے اپنی وزارت کی جانب سے ایک تحریری بیان داخل کرنے کی ہدایت کریں۔ اور ہم نے ان سے یہ بھی کہا کہ اگر وہ کاروائی مقدمہ میں ایک فریق کی حیثیت سے شامل ہونا چاہیں تو عدالت کو اپنی اس خواہش کی اطلاع دیں۔ اس نوٹس کے جواب میں میاں دولتانہ نے ایک درخواست کے ذریعے استدعا کی کہ انہیں ایک فریق قرار دیا جائے۔ ہمارے نزدیک ان کی یہ استدعا قدرتی تھی۔ چنانچہ ہم نے ان کو ایک فریق قرار دے دیا اور ہدایت کی کہ وہ ایک تحریری بیان پیش کریں۔

چونکہ فسادات سے راولپنڈی، سیالکوٹ، لائل پور، گوجرانوالہ اور منٹگمری کے اضلاع متاثر ہوئے تھے اس لئے ہم نے ان اضلاع کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں اور پولیس سپرنٹنڈنٹوں کو ہدایت کی کہ وہ اپنے اپنے اضلاع میں ہونے والے فسادات کے مفصل حالات پیش کریں اور یہ بھی بتائیں کہ فسادات کیونکر شروع ہوئے اور کس طرح بڑھ گئے ان کے دبانے کے لئے کیا کیا تدبیریں اختیار کی گئیں ان فسادات کے دوران میں اور ان سے متعلق کن کن جرائم کے ارتکاب کی اطلاعیں موصول ہوئیں۔ علاوہ ازیں ان تمام جرائم کی ابتدائی رپورٹوں کی نقلیں بھی پیش کریں۔ مزید براں ان افسروں سے یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ انہوں نے اینٹی احمدی شورش اور اس سے پیدا ہونے والے فسادات کے متعلق یکم جنوری ۱۹۵۳ء سے لے کر ۱۵ر مئی ۱۹۵۳ء تک جو روزانہ صورت حال کی رپورٹیں اور ہفتہ وار رپورٹیں حکومت کو یا کسی اعلیٰ حاکم کو ارسال کیں۔ ان کے اقتباسات کی نقلیں بھی پیش کریں ان سے بالخصوص یہ استدعا بھی کی گئی کہ افراد یا جماعتوں کی طرف سے تشدد پر اکسانے کے جو واقعات پیش آئے ان کا ذکر بھی کریں اور یہ بھی بتائیں کہ انہوں نے صورت حال کے متعلق کیا کیا اطلاعات حکومت کو دیں اور حکومت کی طرف سے کیا کیا ہدایات ان کو وصول ہوئیں۔

ہم نے میجر جنرل محمد اعظم خان جنرل آفیسر کمانڈنگ دہم ڈویژن سے بھی جنہوں نے اپنے آپ کو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر کر لیا تھا یہ استدعا کی کہ وہ مارشل لا کے اعلان کے وقت کی صورت حالات بے کم و کاست بیان کریں اور وہ وجوہ بتائیں جن کی بناء پر انہوں نے مارشل لا کا

اعلان کیا۔

اخباروں میں اشتہارات کے ذریعے سے عوام کو بھی اطلاع دی گئی کہ جو شخص تحقیقاتی عدالت کے دائرہ شروط کے متعلق عدالت کے سامنے شہادت دینے کا خواہاں ہو۔ وہ عدالت کے سیکرٹری کو اس شہادت کے متعلق جو وہ دینا چاہتا ہے مختصر بیان ارسال کر دے۔ یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ ایسی شہادت خفیہ رکھی جائے گی۔ سوائے اس حالات کے کہ شہادت پیش کرنے والا شخص خود عدالت میں حاضر ہونے اور اجلاس عام میں زبانی شہادت دینے پر آمادہ ہو۔

جس تحریک سے فسادات پیدا ہوئے اس کے اکثر لیڈر چونکہ جیل خانوں میں محبوس تھے ان میں سے بعض سزا یاب ہو چکے تھے اور بعض سیفٹی ایکٹ اور سیکورٹی ایکٹ کے ماتحت نظر بند تھے۔ اس لئے ہم نے حکومت پنجاب سے استدعا کی کہ وہ اپنے اثر و نفوذ سے کام لے کر ان قیدیوں کو جو پنجاب کے باہر کے جیلوں میں بند ہیں لاہور لانے کا بندوبست کرے۔ تاکہ وہ اپنے تحریری بیانات کی تیاری کے لئے اپنے نمائندوں کو ہدایات دے سکیں۔ حکومت پنجاب نے ہماری استدعا پر عمل کیا۔ اور ہمیں اس امر پر مسرت ہے کہ دوسری حکومتوں نے حکومت پنجاب کی استدعا کو قبول کر کے ایسے قیدیوں اور نظر بندوں کو لاہور بھیج دیا۔

حکومت پنجاب اور پنجاب مسلم لیگ کے سوا باقی تمام فریقوں نے جامع بیانات داخل کئے اور ان کے تحریری بیانات میں واقعات و حقائق اور دلیل و برہان کی جو وسیع تفصیلات ہمیں میسر ہوئیں، ہم ان کے لئے بے حد شکر گزار ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی نے بھی جو ایک فوجی عدالت سے عمر قید کی سزا پا چکے ہیں جماعت اسلامی کے سابق امیر کی حیثیت سے ایک تحریری بیان داخل کیا۔ اور جماعت نے جو تحریری بیان پیش کیا ہے وہ مولانا کے بیان کے بالکل مطابق ہے۔ مولانا عبدالستار نیازی بھی اسی قسم کے سزا یافتہ قیدی ہیں۔ انہوں نے درخواست دی کہ ان کو بھی کاروائی میں ایک فریق کی حیثیت دی جائے۔ لیکن ہم نے بحث کرنے والے فریقوں کے متعلق جس اصول کو اختیار کیا ہے اس کے ماتحت ہم ان کی درخواست کو منظور نہ کر سکے۔ البتہ ہم نے ان کو اس امر کی اجازت دے دی کہ اگر وہ چاہیں تو ایک تحریری بیان پیش کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں

نے صدہا صفحوں کا ایک بیان پیش کیا جسے ہم نے نہایت احتیاط سے پڑھ لیا۔

حکومت پنجاب کا تحریری بیان صرف چند سطر کا تھا جس میں عدالت کو بتایا گیا تھا کہ حکومت کا اس معاملے کے متعلق کوئی نقطہ نگاہ نہیں۔ لیکن وہ عدالت کی امداد کے لئے اس امر کا ذمہ لیتی ہے کہ جس قسم کا مواد عدالت کو مطلوب ہوگا وہ اس کی خدمت میں پیش کر دے گی۔ اس وعدے پر پوری پابندی سے عمل کیا گیا عدالت نے جب بھی حکومت پنجاب سے بعض دستاویزوں، بعض معلومات اور بعض عملیات کے لئے استدعا کی حکومت نے نہایت سرعت اور مستعدی سے اس پر عمل کیا۔ اگر حکومت ایسی مستعدی کا اظہار نہ کرتی تو خدا جانے ہماری تحقیقات کسقدر طول کھینچ جاتی۔ شہادت کے خاتمہ پر حکومت پنجاب کے وکیل مسٹر فضل الٰہی نے حکومت کے اس رویے کا اعادہ کیا، کہ وہ اس معاملے میں کوئی رائے یا کوئی نقطہ نگاہ نہیں رکھی۔ لیکن جو مواد ریکارڈ پر موجود تھا اس کی بناء پر وکیل مذکور نے تین دن کی بحث کے دوران میں اپنے ذاتی خیالات عدالت میں پیش کر دیے باقی رہی مسلم لیگ تو اس کے خلاف یہ الزامات لگائے گئے کہ ڈائریکٹ ایکشن کی فتنہ انگیز تحریک کے خلاف مسلم لیگ نے کوئی اصولی اور نظریاتی مزاحمت نہیں کی۔ ہم نے ان الزامات کو کافی حد تک صحیح پایا ہے بلکہ ہم پر یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ متعدد اضلاع میں لیگ کے عہدہ داروں نے خود بھی اس شورش میں نمایاں حصہ لیا۔ صوبہ مسلم لیگ کی طرف سے جو تحریری بیان داخل کیا گیا ہے وہ نہایت مایوس کن ہے کیونکہ اس میں صرف وہ قراردادیں نقل کر دی گئی ہیں جو پنجاب مسلم لیگ کی کونسل یا مجلس عاملہ نے اینٹی احمدی شورش کے متعلق اپنے خیالات کے اظہار کے لئے منظور کی تھیں۔

ایکٹ کی دفعہ ۵ کی ذیلی دفعہ ۲ کے رو سے اس عدالت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ کسی پولیس افسر کو جو سپرنٹنڈنٹ پولیس سے کم درجے کا نہ ہو کسی ایسی تفتیش کی ہدایت دے جو عدالت کے نزدیک تحقیقات کے مقاصد کے لئے ضروری ہو۔ ہم نے اس اختیار کو اکثر استعمال کیا ہے اور مسٹر محمد حسین سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی کو متعدد ایسے امور کی تفتیش پر مقرر کیا ہے جن کی براہِ راست سماعت اگر عدالت میں کی جاتی تو بہت سا روپیہ بھی صرف ہوتا اور خاصی تاخیر ہو جاتی۔ مسٹر محمد حسین نے حسب معمول مستعدی اور ہمہ گیری سے اپنے فرائض کو انجام دیا۔

دورانِ فسادات میں خواجہ ناظم الدین وزیراعظم تھے مسٹر چندریگر گورنر پنجاب تھے اور سردار عبدالرب نشتر مرکزی کابینہ کے ایک وزیر تھے ان کے علاوہ چوہدری ظفر اللہ خان وزیر خارجہ سردار بہادر خان وزیر مواصلات، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، وزیر اطلاعات ونشریات اور مسٹر مشتاق احمد گورمانی وزیر داخلہ تھے کسی نہ کسی فریق کی استدعا پر عدالت نے ان سب حضرات کو طلب کر کے ان کے بیانات قلم بند کئے۔ البتہ مسٹر دولتانہ نے خود اپنے آپ کو اپنے گواہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ ان تمام گواہوں کی شہادت بند کمرے میں قلمبند کی گئی لیکن اس کے بعض حصے اخباروں کو اشاعت کے لئے دے دیئے گئے۔

کون سے مضامین زیر بحث آئے

تحقیقات کی عقائدی حیثیت اور دوسرے متعلقہ مذہبی موضوعات کے متعلق ہم نے ایک طرف ممتاز علما کو اور دوسری طرف مرزا بشیرالدین محمود احمد (قادیانی احمدیوں کے موجودہ امام) کو عدالت میں طلب کیا۔ تحقیقات کے اس حصے میں علم انسانی کی تقریباً ہر شاخ اور ہر شعبے پر نظر ڈالی گئی۔ مذہب، فلسفہ، سائنس، اخلاقیات، صفات الٰہی، تشبیہ وحلول، عقل، الہام، تفسیر، علم کائنات، تخلیق، زمان ومکان، انسان کی ابتداء اوراس کی منزل مقصود زندگی کے مقصد، مملکت اور دینی اداروں کے وظائف، حاکمیت، جمہوریت، دینی حکومت، یہ تمام مضامین جیسا کہ تفصیل سے ظاہر ہوگا کسی اعتبار سے بھی تحقیقات سے بے تعلق نہ تھے، تحقیقات کے اندرونی امور تنقیح طلب جو اکثر اپنی پوری وضاحت اور اپنے تمام متعلقات کے ساتھ سامنے آئے، وہ اس قدر گہرے اور بنیادی ہیں کہ ان کے جوابات پاکستان کی نئی مملکت کو بنانے یا بگاڑنے کا باعث ہو سکتے ہیں اوراس کی تاریخ آئندہ رفتار کو کاملاً تبدیل کر سکتے ہیں۔

ہم نہ صرف ان تمام موجودہ اور سابقہ عزت مآب وزیروں کے شکر گزار ہیں جنہوں نے اپنے خیالات ہمارے سامنے پیش کرنے کیلئے طویل سفر کی زحمت برداشت کی، بلکہ وہ احکام اور علماء بھی ہمارے دلی شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے اس طویل تحقیقات کے دوران میں اول سے آخر تک ہماری امداد کی۔ مجلس عمل کی طرف سے مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش، احرار کی طرف سے مولانا

مظہر علی اظہر اور جماعت اسلامی کی طرف سے مسٹر سعید ملک نے یقیناً اس کام کی انجام دہی میں محنت شاقہ برداشت کی ہوگی، جو ان کی جماعتوں نے ان کے سپرد کیا تھا۔ ان فاضل حضرات کے ساتھ کام کرنا ہمارے لئے ایک بالکل نیا اور نہایت خوشگوار تجربہ تھا۔ جو ہمارے حافظہ میں مدت دراز تک محفوظ رہیگا، ہم پیشہ وکالت کے بعض حضرات کے بھی ممنون ہیں، مسٹر یعقوب علی خاں، مسٹر نذیر احمد خاں، مسٹر اسد اللہ خاں مسٹر عبدالرحمٰن خادم اور مسٹر فضل الٰہی اپنے اپنے موکلوں کے مقدمات پیش کرنے میں ہمارے لئے بیش بہا امداد و اعانت کا باعث ہوئے۔

ان اشارات کے بعد ہم اپنے قانونی کام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

حصوں میں تقسیم

بحث کے دلائل کی سماعت کے بعد ہم دونوں اس امر پر متفق ہو گئے کہ ہمیں شروط تحقیقات کے جوابات کس طریق سے دینے چاہئیں، اس کے بعد ہم نے کام تقسیم کر لیا یعنی ہم میں سے ایک تو عمومی ذمہ داری کے مسئلے پر غور و بحث کرے اور دوسرا خاص کر نظام حکومت کی کاروائیوں پر نظر ڈالے، پہلے تین حصوں میں ہم نے متعلقہ واقعات کے متعلق ایک واقعاتی بیان قلمبند کر دیا ہے۔ مثلاً

حصہ اول:۔ تقسیم ملک سے لیکر آل مسلم پارٹیز کنونشن منعقدہ لاہور مؤرخہ ۱۳ جولائی ۵۲ء تک

حصہ دوم:۔ کنونشن سے ۲۱ رجنوری ۱۹۵۳ء تک جب وزیر اعظم کو الٹی میٹم دیا گیا

حصہ سوم:۔ الٹی میٹم کی تاریخ سے لیکر فسادات کے خاتمے تک

حصہ چہارم:۔ وہ کوائف جو مارشل لا کا باعث ہوئے

حصہ پنجم:۔ فسادات کی ذمہ داری

حصہ ششم:۔ سول حکام کی انتظامی کاروائی کافی تھی یا نہیں

حصہ ششم کے مقاصد کے لئے مدت زیر مشاہدہ کو چار ذیلی حصوں میں تقسیم کیا گیا، ہر ذیلی حصہ جو خاص مسئلہ پیش کرتا ہے، اس کے اعتبار سے اس کو علیحدہ اور ممتاز رکھا گیا ہے۔

حصہ اول:

تقسیم ملک سے لاہور کنونشن تک

نزاع

جس نزاع کا نتیجہ فساد کی صورت میں رونما ہوا۔اس کی ابتدا اس مناقشہ سے ہوئی تھی جس کو سرکاری تحریروں میں احرار احمدی نزاع کے نام سے موسوم کیا گیا ہے یہ مناقشہ تقسیم سے بہت پہلے موجود تھا لیکن ہمارے سامنے تمام غیر احمدی فریقوں نے اس تعبیر کے خلاف اظہار ناراضی کیا۔اس بناء پر کہ احمدیوں سے اختلافات صرف احرار تک محدود نہیں ۔ بلکہ مسلمانوں کے تمام فرقے ان اختلافات پر متحد ہیں۔اسی طرح غیر احمدیوں نے اس امر کے خلاف بھی برہمی کا اظہار کیا کہ لفظ ''احمدی'' مخصوص طور پر مرزا غلام احمد کے پیرووں کے لئے استعمال کیا جائے اور تمام مسلمان احمدی ہیں کیونکہ وہ محمدؐ رسول اللہ صلعم کے پیرو ہیں (جن کا دوسرا نام احمدؐ ہے) غیر احمدیوں کا خیال ہے کہ مرزا غلام احمد کے پیرووں نے یہ لقب زبردستی مسلمانوں سے چھین رکھا ہے ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مسلمانوں کے سواد اعظم کو جو مرزا غلام احمد کو نہیں مانتا ممیّز وممتاز کرنے کے لیے لفظ ''مسلمان'' استعمال کریں اور احمدیوں کے قادیانی فرقے کیلئے جو مرزا غلام احمد کو نبی مانتا ہے احمدی قادیانی یا مرزائی کی اصطلاح اختیار کریں۔

احمدی

قادیانیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو عقائدی اور معاشرتی اختلافات ہیں،ان کے متعلق ہم حصہ پنجم میں تفصیل سے گفتگو کرینگے۔ یہاں ہمیں صرف تحریک احمدیت کی مختصر کیفیت بیان کرنا ہے،اس تحریک کی بنیاد مرزا غلام احمد نے رکھی، جو سکھ دربار کے ایک جرنیل مرزا غلام مرتضیٰ کے

پوتے تھے۔ مرزا غلام احمد ۱۳ر فروری ۱۸۳۵ء کو بمقام قادیان پیدا ہوئے۔ یہ ضلع گورداسپور کا ایک گاؤں ہے جس میں واحد مالک کی حیثیت اسی خاندان کو حاصل تھی۔ مرزا غلام احمد نے فارسی اور عربی زبانوں کی تعلیم گھر پر پائی۔ کسی قسم کی مغربی تعلیم کے حصول کا سراغ نہیں ملتا۔ ۱۸۶۴ء میں ان کو عدالت ضلع سیالکوٹ میں ایک نوکری مل گئی۔ جہاں وہ چار سال تک کام کرتے رہے۔ جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا تو انھوں نے اپنے آپ کو ازسرتا بہ دینیات کے مطالعہ کے لیے وقف کر دیا اور ۱۸۸۰ اور ۱۸۸۴ کے درمیان اپنی مشہور کتاب ''براہین احمدیہ'' چار جلدوں میں لکھی۔ کچھ مدت بعد چند اور کتابیں بھی تصنیف کیں اس زمانے میں شدید مذہبی مناقشے اور مناظرے جاری تھے۔ اسلام پر نہ صرف عیسائی مشنری ہی پے در پے حملے کر رہے تھے بلکہ ہندوؤں کی مقبول عام تحریک آریہ سماج کے پرچارک بھی اسی مشغلے میں مصروف تھے۔

مارچ ۱۸۸۲ء میں مرزا غلام احمد نے دعویٰ کیا کہ انہیں الہام ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک خاص مقصد تفویض کیا ہے دوسرے لفظوں میں گویا وہ مامور من اللہ ہیں۔ ۱۸۸۸ء میں انہوں نے پھر ایک الہام کی بناء پر اپنے مویدین سے بیعت کا مطالبہ کیا۔ ۱۸۹۰ء کے اواخر میں مرزا صاحب کو پھر الہام ہوا کہ یسوع ناصری (عیسیٰ ابن مریم) نہ صلیب پر فوت ہوئے نہ آسمان کی طرف اٹھائے گئے بلکہ وہ صلیب پر زخمی ہو گئے تو ان کے شاگردوں نے انہیں اسی مجروح حالت میں صلیب پر سے اتار لیا اور ان کے زخموں کا علاج کیا، اس کے بعد وہ کشمیر چلے گئے اور وہیں طبعی موت مر گئے۔ یہ عقیدہ غلط ہے کہ وہ روز قیامت کے قریب اپنے اصلی جسم عنصری کے ساتھ دوبارہ ظاہر ہوں گے۔ ان کے دوبارہ ظہور کے وعدے کا مطلب صرف یہ ہے کہ عیسیٰ ابن مریم کے صفات واخلاق رکھنے والا ایک اور شخص امت محمدیہ میں پیدا ہوگا یہ وعدہ پورا ہو چکا ہے اور مرزا غلام احمد ہی وہ مثیل عیسیٰ اور مسیح موعود واقع ہوئے ہیں، اس عقیدے کی اشاعت پر مسلمانوں میں اضطراب پیدا ہو گیا کیونکہ یہ اس عام مسلمہ عقیدے کے منافی تھا کہ عیسیٰ ابن مریم جسم عنصری کے ساتھ آسمان سے اتریں گے۔ چنانچہ علمائے دین نے اس کی شدید مخالفت شروع کر دی۔ اسکے بعد مرزا نے ''مہدی معہود'' ہونے کا دعویٰ بھی کیا اور اعلان کیا کہ میں ایسا مہدی نہیں جو جنگ وخونریزی میں مصروف ہو جاؤں بلکہ میں مہدی

معقول ہوں اور دلائل و براہین کی قوت سے اپنے مخالفین کو مغلوب کروں گا۔اس نئے دعوے سے مرزا صاحب کی مخالفت زیادہ بھڑک اٹھی اور علمائے دین ان کے خلاف کفر کے فتوے صادر کرنے لگے۔۱۹۰۰ء میں مرزا صاحب نے ایک اور عقیدے کا اظہار کیا کہ آج کے بعد جہاد بالسیف کا قصہ ختم ہے اب جہاد اسی پر موقوف ہے کہ مخالف کو دلیل و برہان سے قائل کرنے کی کوشش کی جائے۔۱۹۰۱ء میں مرزا صاحب نے ''ظلی نبی'' ہونے کا دعویٰ کیا اور ''ایک غلطی کا ازالہ'' کے عنوان سے ایک اشتہار شائع کیا۔جس میں بتایا کہ ختم نبوت کے عقیدے کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلعم کے انتقال کے بعد کوئی ایسا نبی پیدا نہ ہوگا جو کسی نئی شریعت کا حامل ہو۔لیکن کسی غیر تشریعی نبی کا ظہور عقیدہ ختم نبوت کے خلاف نہیں ہے، نومبر ۱۹۰۴ء میں مرزا صاحب نے سیالکوٹ کے ایک جلسہ عام میں ''میثل کرشن'' ہونے کا دعویٰ بھی کیا۔

جماعت احمدیہ ۱۹۰۱ء میں قائم کی گئی اور مرزا صاحب کی استدعا پر اسی سال مردم شماری کے کاغذات میں اس جماعت کو علیحدہ مسلم فرقہ ظاہر کیا گیا۔ جماعت کی موجودہ تعداد پاکستان میں دو لاکھ کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے اور احمدی دوسرے مسلم ممالک میں بھارت، یورپ اور امریکہ میں بھی پائے جاتے ہیں۔

اس نئی تحریک کو مرزا صاحب کی زندگی ہی میں خاصی تائید حاصل ہوگئی تھی اور متعدد اور ذی اثر لوگ بھی اس میں شامل ہوگئے تھے جب ۱۹۰۸ء میں مرزا صاحب کا انتقال ہوگیا تو مولوی نورالدین جماعت احمدیہ کے خلیفہ اول مقرر ہوئے۔۱۹۱۴ء میں خلیفہ نورالدین کا بھی انتقال ہوگیا اور مرزا غلام احمد کے بیٹے مرزا بشیرالدین محمود احمد (موجودہ امام جماعت) خلیفہ ثانی قرار پائے۔مرزا بشیرالدین محمود احمد کی مسند نشینی پر جماعت میں پھوٹ پڑ گئی۔ جماعت کا ایک حصہ خواجہ کمال الدین اور مولوی محمد علی کی سرکردگی میں الگ ہوگیا اور ایک علیحدہ پارٹی ''لاہوری پارٹی'' کے نام سے وجود میں آگئی۔دونوں پارٹیوں میں فرق یہ ہے کہ قادیانی پارٹی کے عقیدے میں مرزا غلام احمد ''نبی'' ہیں لیکن لاہوری پارٹی مرزا صاحب کو یہ درجہ دینے پر آمادہ نہیں۔اس کے نزدیک مرزا صاحب زیادہ سے زیادہ ایک ''مجدد'' یا ''محدث'' ہیں۔ان الگ ہونے والوں نے لاہور میں اپنی ایک تنظیم قائم کر

لی۔ جو احمدیہ انجمن اشاعت اسلام کہلاتی ہے دونوں پارٹیاں غیر ممالک میں وسیع پیمانے پر تبلیغ واشاعت کا کام کرنے میں مصروف ہیں۔

احرار

قوم پرست مسلمانوں کی ایک ٹولی نے کانگرس سے علیحدگی اختیار کر کے ۲۹ر مئی ۱۹۳۱ء کو لاہور میں ایک جلسہ منعقد کیا اور مجلس احرار اسلام کی بنیاد رکھ دی۔ احرار سب سے پہلے ۱۹۳۱ء کی تحریک کشمیر میں نمایاں ہوئے۔ اسی سال ۳۰ر اکتوبر کو مظہر علی کی سرکردگی میں ایک سو رضا کاروں کا ایک جتھا سیالکوٹ سے جموں کے علاقے میں داخل ہونے کے لئے روانہ ہوا تھا۔ پنجاب میں تحریک کشمیر اس لئے پیدا ہوئی کہ ڈوگرہ دربار نے کشمیری مسلمانوں کو انتہائی جبر وظلم کا نشانہ بنا رکھا تھا اور مسلمانانِ پنجاب کو ان سے نہایت گہری ہمدردی تھی۔ کشمیری مسلمانوں کی شکایات یہ تھیں کہ ریاست نے متعدد مسجدوں، قبرستانوں اور دوسرے مقدس مقامات پر قبضہ کر رکھا ہے مسلمانوں کو سرکاری دفاتر میں ملازمت نہیں دی جاتی۔ ان کی مذہبی رسوم کی بجا آوری پر قیود عائد کی جاتی ہیں اور ریاست میں کوئی با قاعدہ اور آئینی قانون ساز مجلس موجود نہیں جس میں مسلمان ریاست کے اندر اپنے تناسب اعداد کے مطابق نمائندگی حاصل کر سکیں۔ جب اخباروں میں ان شکایات کے تدارک کے لئے مہم جاری کی گئی تو نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو سری نگر میں بلوہ ہو گیا۔ اس بلوے سے جو شورش عام پیدا ہوئی اس کا چارج لینے کی کوشش دو جماعتوں نے کی جن میں ایک تو مجلس احرار تھی اور دوسری ایک اور انجمن موسومہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی تھی جو ۲۶ جولائی کو وجود میں آئی اور جس میں ڈاکٹر سر محمد اقبال، نواب سر ذوالفقار علی خاں، خواجہ حسن نظامی، نواب ابراہیم علی خان، مرزا بشیر الدین محمود احمد (موجودہ امام جماعت احمدیہ) شامل ہوئے۔ اور ایک احمدی عبدالرحیم درد اس کے سیکرٹری قرار پائے۔ چونکہ احرار اور احمدی شورش کشمیر کے دوران میں مخالف کیمپوں میں ہونیکی وجہ سے ایک دوسرے کے خلاف ہو رہے تھے، لہٰذا اس سے دوسرے دن با قاعدہ اعلان کر دیا کہ انہوں نے کشمیری مسلمان بھائیوں کی حمایت میں تحریک کا آغاز کر دیا ہے۔ چنانچہ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے

۳۰ر اکتوبر کو مظہر علی اظہر کی سرکردگی میں ایک سو رضا کاروں کا ایک دستہ علاقہ جموں میں داخل ہو گیا اس ڈرامائی اقدام سے احرار کی حیثیت بہت نمایاں ہو گئی۔

اگرچہ احراری کانگرس سے الگ ہو گئے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ تقسیم ملک تک برابر کانگرس سے ساز باز کرتے ہی رہے۔ مجلس احرار کی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس ۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو دہلی میں منعقد ہوا اس اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں پاکستان کی تجویز کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا اور بعد میں بعض احرار لیڈروں نے اپنی تقریروں میں پاکستان کو ''پلیدستان'' بھی کہا۔ ۲۰ر نومبر ۱۹۴۰ء کو مولانا داؤد غزنوی نے اخباروں میں ایک بیان شائع کرایا۔ جس میں احرار کے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ وہ اپنے آپ کو کانگرس میں جذب کر دیں گے پنجاب پراونشل احرار کانفرنس منعقدہ گوجرانوالہ (از ۱۷ر تا ۱۹ر مارچ ۴۳ء) میں ایک قرارداد منظور کی گئی۔ اور پھر اسی سال سہارنپور میں بھی ریزولیوشن پاس کیا گیا ان دونوں موقعوں پر احرار نے مجوزہ تقسیم کی مخالفت کی اور اس کو وطن کی چیر پھاڑ قرار دیا۔ احرار کے ہر لیڈر نے اپنی ہر اہم تقریر میں مسلم لیگ پر تنقید کی۔ اس کے لیڈروں پر نکتہ چینی کی۔ یہاں تک کہ قائداعظم کو بھی نہ چھوڑا۔ جن سے وہ سخت متنفر تھے حالانکہ ان کی شخصیت ان دنوں مسلمان قوم کے واحد اور مسلمہ رہنما کی حیثیت سے قلوب عوام میں گھر کر چکی تھی۔ چونکہ قائداعظم روشن خیال آدمی تھے اور مذہبی امور میں کسی نمود و نمائش کے قائل نہ تھے، اس لئے احرار نے ان کی اس خصوصیت سے ناواجب فائدہ اٹھا کر انہیں کافر کہنا شروع کر دیا۔ یہ شعر مولانا مظہر علی اظہر سے منسوب ہے جو تنظیم احرار میں ایک ممتاز شخصیت ہیں۔

اک کافرہ کے واسطے اسلام کو چھوڑا
یہ قائداعظم ہے کہ ہے کافر اعظم

مولانا مظہر علی اظہر نے ہمارے سامنے (عدالت میں) نہایت خیرہ چشمی سے یہ اظہار کیا کہ (قائداعظم کے متعلق) وہ اب تک اسی خیال پر قائم ہیں۔ احرار نے اپنی تقریروں میں صرف یہی نہیں کہا کہ قائداعظم نے ایک پارسی خاتون سے شادی کی تھی بلکہ یہ اعتراض بھی کیا کہ قائداعظم اب تک حج کے لئے مکہ معظمہ کیوں نہیں گئے۔ ۱۹۴۵ء میں انہوں نے شیعہ سنی تنازعہ کی آگ بھڑکانے کی

کوشش بھی کی۔ اور مولانا مظہر علی اور ان کے بیٹے قیصر مصطفیٰ تحریک مدح صحابہ کے احیاء کے لئے ۱۶ نومبر کو لاہور سے لکھنو روانہ ہوئے۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں تین احرار امیدوار مسلم لیگی امیدواروں کے مقابلے میں کھڑے ہوئے۔ لیکن ان سب کو شکست کھانی پڑی۔ اس کے بعد مسلم لیگ نے پنجاب میں جو ''ڈائریکٹ ایکشن'' شروع کیا اس سے احرار، کاملاً الگ رہے۔

احرار کی بڑی بڑی سرگرمیوں میں ایک یہ تھی کہ وہ کسی نہ کسی شکل میں احمدیوں کی مخالفت کرتے رہتے تھے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ احرار کی پیدائش ہی احمدیوں کی نفرت سے ہوئی۔ ابھی مجلس احرار کی تاسیس پر دو ہی سال گزرے تھے کہ انہوں نے ایک قرارداد منظور کی جس کا منشا یہ تھا کہ کوئی قادیانی کسی مجلس عامہ کا ممبر منتخب نہ کیا جائے۔ قادیان تقسیم سے پہلے تقریباً خالص احمدی قصبہ تھا۔ ۱۹۳۴ء میں احرار نے قادیان میں ایک کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا۔ لیکن جب اس جلسے کو ممنوع قرار دیا گیا تو انہوں نے اسی سال ۲۱/اکتوبر کو قادیان سے صرف ایک میل کے فاصلے پر ایک گاؤں اجادہ کے دیانند اینگلو ویدک ہائی سکول کی گراؤنڈ میں کانفرنس منعقد کر لی۔ جس میں حاضرین کی تعداد ہزاروں تک پہنچی۔ اس کانفرنس میں احرار کے مقبول عام خطیب سید عطا اللہ شاہ بخاری نے احمدیوں کے خلاف پانچ گھنٹے کی ایک نفرت آمیز تقریر کی، جس میں انہوں نے ایسی باتیں کہیں جن سے صرف یہ مقصود تھا کہ سننے والوں کے دلوں میں احمدیوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھے، انہوں نے اپنی تقریر میں امن و امان کے دعاوی کے ساتھ ہی ساتھ نہایت پست قسم کی دشنام طرازی اور مسخرگی سے کام لیا۔ اس تقریر کی بنا پر بخاری کے خلاف مقدمہ چلایا گیا۔ جس کی سماعت کے دوران میں اتنی سنسنی پیدا ہوئی اور احمدیوں کے خلاف جذبات اتنے برانگیختہ ہوئے کہ خود تقریر سے بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ اس مقدمے میں بخاری کو سزا دی گئی۔ وہ دن اور یہ دن ہر قابل ذکر احراری مقرر احمدیوں، ان کے رہنماؤں اور ان کے عقیدوں کے خلاف ہر قسم کی باتیں کہتا رہا ہے۔

۱۹۴۷ء کی تقسیم اور پاکستان کا قیام احرار کے لئے بہت بڑی مایوسی کا پیغام تھا۔ کیونکہ اس سے ہر قسم کا اقتدار کانگرس یا مسلم لیگ کی طرف منتقل ہو گیا۔ اور احرار کے لئے ہندوستان یا پاکستان میں سیاسی سرگرمی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ پاکستان کی نئی مسلم مملکت کے قیام سے انہیں شدید

صدمہ ہوا۔ ان کے نظام عقائد کی عمارت متزلزل ہوگئی اور وہ ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے بالکل ختم ہوگئے۔ کچھ مدت تک وہ اسی ناکامی و مایوسی کی حالت میں رہے۔ انہیں اپنے مستقبل کے متعلق کچھ نہ سوجھتا تھا۔ ان کے دو لیڈروں یعنی مولوی عبدالغنی ڈار اور مولانا حبیب الرحمٰن نے بھارت میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ایک اور اہم حیثیت کے لیڈر شیخ حسام الدین کچھ مدت تک تو گومگو کی حالت میں رہے آخر انہوں نے پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کیا اور لاہور میں ''ویرا ہوٹل'' کا چارج لے لیا جو ایک کانگریسی مسمی پر بودھ چندر نے ان کے سپرد کردیا تھا۔ ماسٹر تاج الدین لدھیانوی اور مولوی محمد علی جالندھری بھی پاکستان چلے آئے۔ ماسٹر صاحب نے سیالکوٹ میں اور مولوی صاحب نے ملتان میں سکونت اختیار کرلی۔ یہاں تک کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی جو گجرات کے رہنے والے ہیں ضلع مظفر گڑھ کے ایک گاؤں میں منتقل ہوگئے۔ مولانا مظہر علی اظہر سیاسیات سے دست بردار ہوگئے اور صاحبزادہ فیض الحسن نے اپنے گاؤں آلو مہار ضلع سیالکوٹ میں گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کرلی۔

نومبر ۱۹۴۷ء میں احرار نے اپنی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس خان گڑھ میں منعقد کیا جہاں سید عطاء اللہ شاہ بخاری مقیم ہوگئے تھے۔ اجلاس کا مقصد یہ تھا کہ احرار کے آئندہ پروگرام پر غور وخوض کیا جائے لیکن وہ کسی فیصلے پر نہ پہنچے یہی حشر اس اجلاس کا ہوا جو دسمبر ۱۹۴۷ء میں بمقام لاہور منعقد کیا گیا تھا۔ اس اجلاس میں تین ممکن راہ ہائے عمل پر غور کیا گیا۔ اول:۔ جماعت کو ختم کردیا جائے۔ دوم:۔ سیاسی سرگرمیوں کو ترک کرکے صرف مذہبی مشاغل اختیار کئے جائیں۔ سوم:۔ جماعت کو بدستور زندہ رکھا جائے۔ لیکن غور و بحث کے بعد فیصلہ صرف یہ ہوا کہ ایک ''آل پاکستان مجلس احرار'' کی بنیاد رکھی جائے۔ اس کے بعد مئی ۱۹۴۸ء میں بمقام لائل پور جو کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں احمدیوں کے متعلق ہلکے ہلکے اشارے کئے گئے اور پاکستان کے ساتھ وفاداری کا اظہار کیا گیا۔ جب اس کے بعد جون ۱۹۴۸ء میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ تو پاکستان کی حمایت میں زیادہ وضاحت سے اظہار جذبات کیا گیا اور اس کے ساتھ یہ اشارہ بھی کیا گیا کہ احرار مسلم لیگ میں شامل نہیں ہوسکتے کیونکہ اس میں چوہدری ظفر اللہ خان اور میاں افتخار الدین جیسے لوگ بھی ہیں جن کے عقائد اسلام کے خلاف

ہیں۔ تقسیم کے بعد احرار کا سب سے بڑا اور اہم اجتماع وہ تھا جو ''احرار ڈیفنس کانفرنس'' کے موقع پر ۱۲؍جنوری سے ۱۴ جنوری ۱۹۴۹ء تک بمقام لاہور منعقد ہوا۔ اس اجتماع میں احرار نے اپنے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ مجلس احرار اب ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے ختم کر دی گئی ہے اور آئندہ صرف ایک مذہبی گروہ کی حیثیت سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھے گی۔ انہوں نے اعلان کیا کہ سیاسی امور میں وہ مسلم لیگ کی پیروی کرینگے۔ اس کے بعد انہوں نے ''تبلیغ کانفرنس'' کے نام سے اپنی کانفرنسیں منعقد کرانا شروع کر دیں۔ چنانچہ اوکاڑہ، لائل پور، مکھیانہ، چنیوٹ، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، گجرات، پنڈ دادن خان، جہلم، شجاع آباد، بورے والا اور ملتان میں کانفرنسوں کا ایک سلسلہ جاری ہو گیا، احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ سب سے پہلے راولپنڈی کی ایک کانفرنس میں کیا گیا اور اس کے بعد یکم مئی ۱۹۴۹ء کو پنڈ دادن خاں کے ایک جلسہ عام میں اس کا اعادہ کیا گیا۔ بعد ازاں احرار اپنی تمام تقریروں میں جماعت احمدیہ کے بانی اور چوہدری ظفر اللہ خان پر باقاعدہ نکتہ چینی کرنے لگے اور محسوس کرنے لگے کہ انہیں مسلم لیگ کی امداد طلب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور وہ آئندہ ایک علیحدہ جماعت کی حیثیت سے اپنے وظائف بجالا سکتے ہیں۔ مسلم لیگ نے بھی احرار کے متعلق دوستانہ رویہ اختیار کیا۔ چنانچہ جب ۲۷؍دسمبر ۱۹۴۹ء کو کراچی میں پاکستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا تو جو انیس جماعتیں مسلم لیگیوں کے لئے ممنوع الداخلہ قرار دی جا چکی تھیں ان میں سے احرار کو مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ (یعنی مسلم لیگی مجلس احرار کے ممبر بن سکتے تھے)

دو احراری لیڈروں کی گرفتاری

احرار کو اس حقیقت کے احساس میں کوئی مشکل پیش نہیں آنی چاہے تھی کہ پاکستان قائم ہونے کے بعد ان کی سابقہ سیاست متروک ہو چکی ہے اور نئی مملکت میں ان کے لئے اپنی پرانی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن احراری اس مٹی کے بنے ہوئے نہ تھے وہ پرانے باراں دیدہ شورش پسند تھے جن کو اپنی مقبولیت اور ہر دلعزیزی میں اضافہ کرنے کے لئے بڑی بڑی

مہمیں چلانے اور ہنگامے برپا کرنے کا تجربہ حاصل تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایسے طریقوں پر غور وخوص شروع کر دیا جن سے کام لے کر وہ نئے ماحول میں اپنی سرگرمیوں کے لئے کوئی مخرج پیدا کر سکیں۔ کسی موجودہ شورش سے فائدہ اٹھانا کسی نئی شورش کی تخلیق کے مقابلے میں دوسرے درجے کی چال ہے۔ آگے چل کر معلوم ہو جائے گا کہ احراریوں نے اپنی ہستی کا ثبوت دینے اور جماعت کی حیثیت سے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کیلئے اسی چال سے کام لیا۔

ابھی قیام پاکستان پر ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ مخدوم شاہ بنوری سیکرٹری مجلس احرار پاکستان ۱۵ر جولائی ۱۹۴۸ء کو زیر دفعہ ۳ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ گرفتار کر لئے گئے۔ ان کی گرفتاری کے معین وجوہ تو شہادت میں واضح نہیں کئے گئے لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ ان پر کسی خلافِ عدالت سرگرمی کا شبہ تھا جو ان کی گرفتاری کا باعث ہوا۔ ان کے بعد ایک اور احراری لیڈر شیخ حسام الدین ۲۸ ستمبر ۱۹۴۸ء کو اسی ایکٹ کے ماتحت گرفتار کئے گئے آخر جب ان دونوں نے لمبے لمبے بیانات دے دیئے تو انہیں رہا کر دیا گیا۔

میجر محمود کا قتل

مرزا بشیر الدین محمود احمد ۱۹۴۸ء کے، موسم گرما میں بمقام کوئٹہ مقیم تھے۔ ان کی موجودگی میں ایک نوجوان فوجی افسر میجر محمود جو احمدی تھا، نہایت وحشیانہ طریقے سے قتل کر دیا گیا۔ ریلوے کے مسلم ملازمین کی ایسوسی ایشن نے ایک جلسہ عام کا اعلان کیا تھا جو ۱۱ اگست ۱۹۴۸ء کو منعقد ہوا۔ اس جلسے میں بعض مولویوں نے تقریریں کیں اور ہر شخص نے اپنی تقریر کے لئے ایک ہی موضوع یعنی ''ختم نبوت'' اختیار کیا۔ ان تقریروں کے دوران میں قادیانیوں کے کفر اور اس کے نتائج کی طرف بار بار اشارے کئے گئے۔ ابھی یہ جلسہ منعقد ہو رہا تھا کہ میجر محمود ایک مریض کو دیکھنے کے بعد واپس آتے ہوئے جلسہ گاہ کے پاس سے گزرے۔ اتفاق سے ان کی موٹر کار جلسہ گاہ کے قریب پہنچ کر خراب ہو گئی تھی اور اس کو دوبارہ چلانے کی ہر کوشش ناکام ہوگئی۔ عین اس موقع پر ایک ہجوم موٹر کار کی طرف بڑھا اور اس نے میجر محمود کو گھسیٹ کر نیچے اتار لیا۔ میجر محمود نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن ان کا تعاقب کیا گیا اور آخر پتھر اور چھرے مار مار کر ان کو ہلاک کر دیا گیا۔ ان کی پوری انتڑیاں پیٹ سے باہر نکل آئی

تھیں۔ان کی نعش کے پوسٹ مارٹم معائنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے جسم پر کند اور تیز دھار والے ہتھیاروں سے لگائے ہوئے چھبیس زخم تھے اور موت ایک تو صدمے سے اور دوسرے داخلی جریان خون سے واقع ہوئی۔ جو بائیں پھیپھڑے بائیں گردے اور جگر کے دائیں کنارے کے زخموں سے جاری ہوا تھا۔کوئی شخص بھی ''اسلامی شجاعت'' کے کارنامے کی نیک نامی لینے پر آمادہ نہ ہوا اور بے شمار عینی شاہدوں میں ایک بھی ایسا نہ نکلا جو ان غازیوں کی نشان دہی کرسکتا یا کرنے کا خواہشمند ہوتا جن سے یہ ''بہادرانہ فعل'' صادر ہوا تھا۔لہٰذا اصل مجرم شناخت نہ کئے جاسکے اور مقدمہ بے سراغ ہی دفتر کردیا گیا۔ پولیس کے کاغذات سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیظ سے بھرے ہوئے لوگ چھوٹی ڈاڑھیوں والے اشخاص کی تلاش میں دیوانے ہو رہے تھے تاکہ انہیں ہلاک کردیں۔(واضح رہے کہ احمدی چھوٹی ڈاڑھیاں رکھتے ہیں)

جب حکومت پاکستان کے انٹیلی جنس بیورو کو اس ہولناک قتل کی اطلاع ملی تو اس نے اپنی چھٹی نمبر p(6)- 48 / B / 10 مورخہ اکتوبر ۱۹۴۸ء بنام مسٹر ذوالقرنین خاں سپرنٹنڈنٹ پولیس (A) سی آئی ڈی پنجاب لاہور میں حکام صوبہ کی توجہ مجلس احرار کی خفیہ سرگرمیوں کی طرف مبذول کرائی جو بیورو کے نزدیک پاکستان کے مفاد کے لئے مضرت رساں تھیں۔ بیورو نے لکھا کہ مجلس احرار کے بڑے بڑے لیڈر اپنی تحریروں اور تقریروں میں مملکت کی وفاداری کے جو عہد پیمان باندھ چکے ہیں وہ سب محض لیپ پوت اور دھوکہ ہے۔آخر میں مرکزی حکومت کی اطلاع کے لئے حکومت صوبہ کی رائے طلب کی گئی تھی کہ آیا احرار کی ان سرگرمیوں کے پیش نظر بحالت موجودہ ان کے خلاف کسی سخت کاروائی کی ضرورت ہے یا نہیں۔اس کے جواب میں ملک حبیب اللہ نے اپنی چھٹی نمبر BDSB_۲۲۴۵۱ مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۴۸ء میں احرار کے متعلق پنجاب سی آئی ڈی کا رویہ نہایت تفصیل سے بیان کیا۔اس چٹھی میں اس تقریر کا اقتباس دیا گیا ہے جو عبدالرحمٰن میانوی نے چونڈہ ضلع سیالکوٹ میں ۷ مئی ۱۹۴۸ء کو کی تھی اور جس میں بتایا تھا کہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام کی ذمہ داری قائداعظم مرحوم پر ہے پھر صاحبزادہ فیض الحسن کی تقریر کا ذکر ہے جو انہوں نے موضع بھلر ضلع شیخوپورہ میں کی اور جس میں بیگم لیاقت علی خاں اور دوسری تعلیم یافتہ خواتین پر جو

پردے کی پابند نہیں۔ بازاری حملے کیے گئے تھے اس چٹھی میں یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ مخدوم شاہ بنوری اور شیخ حسام الدین کی گرفتاری کے بعد سے احراری لیڈروں کے دماغ درست ہو رہے ہیں اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ماسٹر تاج الدین پاکستان کے ساتھ اپنی وفاداری کے اعلان کا اعادہ کر کے حکومت کے ساتھ تعاون پر آمادہ ہیں۔ یہ بھی لکھا تھا کہ احرار کی شدید نگرانی کی جا رہی ہے اور جب کبھی ان سرگرمیوں میں ایسے آثار نظر آئے کہ وہ مفاد مملکت کے منافی ہیں ان کے خلاف فوری اقدام کیا جائے گا اور ان کی جمعیت توڑ دی جائے گی آخر میں حکومت پنجاب کا یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ موجودہ مرحلے پر احرار کی تنظیم کو ممنوع اور خلافِ قانون قرار دینے کی سخت کاروائی مناسب نہیں ہے۔

احرار لیڈروں کی تقریریں

صاحبزادہ فیض الحسن کی جس تقریر کا ذکر ملک حبیب اللہ کی چٹھی میں کیا گیا ہے اس کی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحبزادہ نے یہ تقریر ۲۷ اگست ۱۹۴۸ء کو موضع بھلر میں سید امام علی کے عرس کے موقع پر کی تھی۔ جس میں بتایا تھا کہ بیگم لیاقت علی خاں اور دوسری عورتیں جو پردہ نہیں کرتیں سب بازاری عورتیں ہیں۔ اور مشرقی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں نے جو ایک لاکھ مسلمان عورتوں کو اغوا کر لیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ قائداعظم پاکستان کے گورنر جنرل بننے کے لئے بے حد مضطرب تھے۔

۸/اگست ۱۹۵۰ء کو حکومت پاکستان کے انٹیلی جنس بیورو کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے اپنی چٹھی نمبری (۲۵)۔۵۰/B/9 بنام سپرنٹنڈنٹ پولیس (B) سی آئی ڈی پنجاب کے ساتھ مرزا بشیر الدین محمود احمد کے ایک خطبہ کی نقل بھیجی۔ جس میں انہوں نے اپنے پیروؤں کو آگاہ کیا تھا کہ وہ آج کل ایک نہایت خوفناک خطرے سے دوچار ہیں۔ اس خطبے میں امام جماعت احمدیہ نے یہ کہا تھا کہ صورت حالات کی پوری پوری اطلاع حکومت تک نہیں پہنچائی جا رہی ہے جماعت کو نیست و نابود کر دینے کا کھلم کھلا پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے حکومت اس پروپیگنڈا کی روک تھام کے لئے کوئی تدابیر اختیار نہیں کر رہی ہے ہمارے جان و مال سخت خطرے میں ہیں افراد جماعت کو چاہیے کہ اگر ضرورت

پڑے تو اپنے دفاع کے لئے نہایت چست و مستعد رہیں۔اس چٹھی کے جواب میں ملک حبیب اللہ نے اپنی خفیہ چٹھی نمبری BDSB-9931 مورخہ ۳۱ راگست ۱۹۵۰ء کے ذریعے سے بیورو کو اطلاع دی کہ مرزا بشیر الدین محمود احمد کے خطبے میں غالباً احرار کی ان تقریروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو مجلس احرار کو مسلم لیگ میں مدغم کر دینے کے بعد سے برابر جاری ہیں اور جن میں احمدیوں کے خلاف وشنام طرازی کی مسلسل مہم چلائی جارہی ہے۔اس چٹھی میں یہ بھی لکھا گیا کہ احرار کی ان سرگرمیوں کی اطلاع بارہا حکومت کو دی جا چکی ہے لیکن قانون وانتظام کے مشیر نے فوری کاروائی کرنے سے انکار کر دیا ہے کہ مبادا احرار اس گیرودار کی وجہ سے سستی شہادت حاصل کرلیں۔احراری لیڈر ماسٹر تاج الدین کو تنبیہ کی جا چکی ہے اور اس تنبیہ کا کوئی اثر اس لیڈر کی سرگرمیوں پر نہیں پڑا۔اب گورنر نے ایک تازہ تنبیہ کی ہے جس کے نتائج کا انتظام ہے۔

احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ سب سے پہلے یکم مئی ۱۹۴۹ء کو پنڈ دادن خان کے ایک احراری جلسے میں کیا گیا۔اس کے بعد سے احرار کے تمام جلسہ ہائے عام میں صرف احمدی ہی ہر تقریر کا موضوع قرار پائے۔اور نہ صرف احمدی جماعت کے لیڈر بلکہ چوہدری ظفر اللہ خان وزیر خارجہ بھی ان کی دشنام وبدگوئی کا سب سے بڑا نشانہ بن گئے۔۲۶، ۲۷ نومبر ۱۹۴۹ء کو احرار نے سیالکوٹ میں جو تبلیغ کانفرنس منعقد کی اس میں گیارہ ہزار حاضرین کے سامنے ماسٹر تاج الدین، مولوی محمد حیات، مولوی محمد علی جالندھری، شیخ حسام الدین، قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور سید عطا اللہ شاہ بخاری نے تقریریں کیں اور ان سب نے احمدیوں کو، احمدیت کے بانی کو، احمدی لیڈروں کو اور چوہدری ظفر اللہ خان کو گالیاں دیں۔اس جلسے میں جو تقریریں کی گئیں ان کا ایک نمونہ مولوی محمد حیات کی تقریر کی روداد میں ملے گا۔آپ نے کہا

> ”اگر چہ مرزا غلام احمد جھوٹا تھا لیکن ہم اس کو الزام نہیں دیتے کیونکہ صرف کبھی کبھی زنا کرتا تھا ہمارا اعتراض موجودہ خلیفہ پر ہے جو ہر روز زنا کاری کا مرتکب ہوتا ہے“۔

پراسیکیوٹنگ پولیس افسر نے جب قانونی کاروائی کی غرض سے اس تقریر کا مطالعہ کیا تو یہ

رائے دی کہ اس قسم کے بیانات تو سیاسی مقررین کا شیوہ عام ہیں جن سے کسی کی بھی دل آزاری نہیں ہوتی۔

اس کے بعد احرار نے ۷ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو نوشہرہ ورکاں میں اہل السنّت والجماعت کے نام سے ایک جلسہ عام منعقد کیا جس میں مولوی غلام اللہ خان نے یہ کہا کہ مرزا غلام احمد دجال تھا جس کو انگریز نے مسلمانوں کے اتحاد کے توڑنے کی غرض سے پیدا کیا تھا۔ قادیانی لوگ خصوصاً چوہدری ظفر اللہ خان پاکستان اور ملت مسلمہ کو سخت نقصان پہنچا رہے ہیں اور قادیان کے لئے کشمیر کو فروخت کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ یہ تقریر زیر دفعہ ۱۵۳ الف مجموعہ تعزیرات اور زیر دفعہ ۲۱ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ قانونی کاروائی کے قابل بتائی گئی اور میاں انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے یہ کیس ہوم سیکرٹری کی خدمت میں بھیجتے ہوئے دریافت کیا کہ آیا حکومت کا یہ ارادہ ہے کہ جو لوگ چوہدری ظفر اللہ خان کو گالیاں دے رہے ہیں اور جمہور کے ایک خاص حصے کے خلاف نفرت پھیلا رہے ہیں ان کے خلاف کوئی کاروائی کی جائے۔ مسٹر انور علی نے اپنے تبصرہ میں ایک معاہدے کا ذکر بھی کیا جس احراریوں کے قول کے مطابق ان کے اور وزیر اعظم کے درمیان ہو چکا ہے اور اس معاہدے کا مقصد یہ ہے کہ چوہدری ظفر اللہ خان جو ایک سیاسی خطرہ بن چکے ہیں وزارت مرکز سے نکال دیئے جائیں جب یہ کیس شعبہ قانون کے مشیر کے پاس پہنچا تو اس نے ایک اور کیس میں اپنی رائے کا حوالہ دیتے ہوئے حکم صادر کیا کہ فی الحال احرار لیڈروں کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی جائے گی اور حکومت ابھی حالات کا انتظار کرے گی۔

اس کے بعد مجلس احرار نے ایک اہم تبلیغ کانفرنس ۱۷، ۱۸ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو لائل پور میں منعقد کی جس میں کوئی پانچ ہزار حاضرین کے سامنے مولوی غلام غوث سرحدی، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، مولوی محمد علی جالندھری، شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین انصاری نے تقریریں کیں جو مسٹر انور علی کی یادداشت مؤرخہ ۳۰ دسمبر ۱۹۴۹ء کے رو سے زیر دفعہ ۱۵۳ الف مجموعہ تعزیرات اور زیر دفعہ ۲۱ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ قانونی کاروائی کے قابل تھیں۔ شعبہ قانون کے مشیر نے ۲ جنوری ۱۹۵۰ء کو اس کیس پر مندرجہ ذیل تبصرہ کیا۔

''ان لوگوں نے احمدیوں کو اپنے حملے کا نشانہ اس لئے بنایا ہے کہ عوام ان کی باتیں سن لیں یہ لوگ ان مذہبی جذبات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں جو عام مسلمانوں کے دلوں میں احمدیوں کے خلاف جاگزیں ہیں لیکن میری رائے فی الحال احرار کے خلاف کوئی اقدام مناسب نہ ہوگا کیونکہ مسلمان احمدیت کے معاملے میں بے حد حساس ہیں اور اگر احرار پر احمدیوں کو گالیاں دینے کی بنا پر مقدمات چلائے گئے تو یہ لوگ عوام کی نگاہوں میں شہادت کا مرتبہ حاصل کر جائیں گے، جس کے یہ بالکل مستحق نہیں، لہٰذا میں احرار لیڈروں کے خلاف کسی قسم کے اقدام کا مشورہ نہیں دے سکتا۔''

جب یہ کیس ۵؍جنوری ۱۹۵۰ء کو سردار عبدالرب نشتر (گورنر پنجاب) کے سامنے آیا تو انہوں نے اپنی یادداشت میں لکھا کہ چند روز ہوئے مولوی غلام غوث سرحدی مجھ سے ملنے آئے تھے تو میں نے ان کو آگاہ کر دیا تھا کہ حکومت کسی شخص کو اپنے مذہبی خیالات کی اشاعت سے روکنا نہیں چاہتی۔ لیکن وہ ایسی تقریروں کو برداشت نہ کرے گی جن سے نقص امن کا احتمال ہو۔

جب احراریوں نے ایسی تبلیغ کانفرنسیں شروع کر دیں جن میں احمدیوں کو گالیاں دی جاتی تھیں تو احمدیوں کو بھی عذر مل گیا اور وہ بھی اپنے جلسے منعقد کرنے لگے۔ ایسا ایک جلسہ ۱۵؍جنوری ۱۹۵۰ء کو سیالکوٹ میں ہوا۔ یہ جلسہ گویا اس تبلیغ کانفرنس کا جواب تھا جو ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو منعقد ہوئی تھی لیکن احراریوں نے خشت باری کر کے اس جلسے کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی اور پولیس کو ہلکا سا لاٹھی چارج کرنا پڑا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ موقع پر پہنچ گئے۔ جب پولیس نے بلوائیوں کو ہٹا دیا تو جلسہ پھر شروع ہو گیا لیکن فوراً وہاں سے ذرا فاصلے پر ایک بڑا ہجوم جمع ہو گیا جس نے لاؤڈ سپیکر بھی لگا لیا اور لوگ مطالبہ کرنے لگے کہ چار بلوائی جو گرفتار کئے گئے ہیں رہا کر دیئے جائیں اور وہ احمدی ہمارے حوالے کر دیا جائے جس نے ایک غیر احمدی کے چھرا مارا ہے۔

ملتان میں تبلیغ کانفرنس ۲۸، ۲۹ جنوری ۱۹۵۰ء کو ہوئی جس میں بہت سے مقررین نے

تقریریں کیں۔ ان مقررین میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی، غلام نبی جانباز اور مولوی محمد علی جالندھری بھی شامل تھے۔ اس جلسے میں حاضرین کی تعداد خاصی زیادہ تھی اس میں مقررین نے مرزا غلام احمد کو ماسٹر تارا سنگھ سے تشبیہ دی۔ چوہدری ظفر اللہ خان کے خلاف توہین آمیز اشارات کئے گئے اور انہیں مسلمان قوم کا غدار بتایا گیا۔ اس کے علاوہ جماعت احمدیہ کے بانی اور اس کے موجودہ امام کے متعلق فحش باتیں کہی گئیں۔ جنرل نذیر احمد کو بھی تبصرہ کا نشانہ بنایا گیا۔ سید عطا اللہ شاہ بخاری نے بیان کیا کہ ڈپٹی کمشنر ملتان نے بعض مسجدیں مسلمانوں سے چھین کر مرزائیوں کو دے دی ہیں۔ جب اس اجتماع کی روداد ۱۱ر فروری ۱۹۵۰ کو شعبہ قانون کے مشیر کے سامنے آئی تو انہوں نے اپنی وہی پرانی دلیل دہرادی کہ اگر وزیر خارجہ اور احمدیوں کو گالیوں دینے کی پاداش میں احراریوں کے خلاف کوئی اقدام کیا گیا تو احراری مرتبہ شہادت حاصل کرلیں گے اور عوام کو ان سے بے انتہا ہمدردی ہو جائے گی حالانکہ وہ عوام کی نگاہوں میں ایسا محترم مقام حاصل کرنے کے مستحق نہیں ہیں۔ جب ۱۳ر فروری ۱۹۵۰ء کو یہ کیس سردار عبدالرب نشتر نے ملاحظہ کیا تو لکھا کہ میرے نزدیک مجلس احرار کے صدر کو طلب کر کے اس کو آگاہ کر دیا جائے کہ احرار نے مملکت کے فوجی اور غیر فوجی معززین کے خلاف دشنام طرازی کی جو مہم جاری کر رکھی ہے اس کے نتائج اچھے نہ ہوں گے۔ آپ نے لکھا کہ کسی شخص کو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ مذہب کا نام لے کر مملکت کی بنیادوں کو کمزور کرے۔ میں نے مسئلے کے اس پہلو پر قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور مولوی غلام غوث سرحدی سے بات چیت کی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان پر اس اشارے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ آپ نے ہدایت کی کہ اب احراریوں کے ساتھ ذرا کھلی کھلی بات ہو جانی چاہیے اور اگر قانون کے مشیر صاحب احراریوں سے گفتگو کرنے میں کوئی دشواری محسوس کرتے ہوں تو میں خود ان سے بات کروں گا۔ چنانچہ ۲۰ فروری ۱۹۵۰ء کو شعبہ قانون کے مشیر نے ماسٹر تاج الدین صدر مجلس احرار کو طلب کر کے تنبیہ کی کہ چوہدری ظفر اللہ خان اور جنرل نذیر احمد جیسے معزز و مقتدر ارکان مملکت کو گالی گلوچ کا نشانہ بنانے کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ ماسٹر صاحب سے یہ بھی کہہ دیا گیا کہ حکومت اسی تنبیہ کے نتیجے کو دیکھے گی اور اگر اس کا کوئی اثر نظر نہ آیا تو حکومت مجبور ہوگی کہ احرار کے خلاف شدید اقدامات کا حکم دے۔

افغانستان میں احمدیوں کی سنگساری اور ''الشہاب''

بعض ممتاز علمانے ہمارے سامنے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اسلام میں ارتداد کی سزا موت ہے اس لئے اگر احمدی کافر ہیں تو جو شخص احمدی ہو جاتا ہے وہ گویا اپنے آپ کو سزائے موت کا مستوجب بنالیتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عقیدہ افغانستان میں قانون کی حیثیت سے نافذ ہے چنانچہ وہاں بہت سے اشخاص اپنے غیر اسلامی عقائد کی وجہ سے موت کے گھاٹ اتارے جا چکے ہیں۔ پہلا احمدی جس کو اس قانون کے ماتحت جان دینی پڑی ایک شخص عبدالرحمان خان تھا جو امیر عبدالرحمٰن خان کے عہد حکومت میں ہلاک کیا گیا۔ دوسرا عبداللطیف تھا جو ۱۹۰۳ء میں امیر حبیب اللہ خان کے دورِ حکومت میں سنگسار کیا گیا۔ عبداللطیف افغانستان کا باشندہ تھا اور کچھ مدت تک قادیان میں مرزا غلام احمد کی صحبت میں رہ کر خود احمدی ہو گیا تھا۔ جب وہ ۱۹۰۳ء میں افغانستان کو واپس آیا تو علمانے اس کو احمدی ہو جانے کی وجہ سے مرتد قرار دیا اور اس کو موت کی سزا دے دی۔ چنانچہ وہ کمر تک زمین میں زندہ گاڑ دیا گیا اور اس کے بعد پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ یہی حشر نعمت اللہ خان کا ہوا جس کو علمائے افغانستان نے احمدی ہونے کی وجہ سے مرتد قرار دیا۔ چنانچہ وہ ۳۱ راگست ۱۹۲۴ء کو بمقام شیرا کوٹ برسرعام سنگسار کر دیا گیا۔

نعمت اللہ خان کی سزائے موت پر ہندوستان میں اس امر کے متعلق نزاع پیدا ہوا کہ آیا اسلام میں مرتد کی سزا موت ہے یا نہیں۔ دیوبند کے ایک عالم مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس مسئلہ پر ایک کتابچہ ''الشہاب'' کے نام سے لکھا۔ جس کے پہلے حصے میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ احمدی مرتد ہیں اور دوسرے حصے میں اس دعوے کے دلائل دے گئے تھے کہ اسلام میں ارتداد کی سزا موت ہے۔

یہ کتابچہ کوئی تیس سال تک گوشۂ گمنامی میں پڑا رہا لیکن مارچ ۱۹۵۰ء سے کچھ پہلے قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے اس کے مصنف سے (جواب شیخ الاسلام پاکستان بن گئے تھے) اس کو دوبارہ چھاپ کر شائع کرنے کی اجازت طلب کی جو عطا کر دی گئی۔ اور اب احراریوں کی تقریروں

میں اس کتابچہ کے مندرجات بطور فتوئ بیان کئے جانے لگے۔۱۴ سے ۱۶ اپریل ۱۹۵۰ء تک کمپنی باغ راولپنڈی میں ایک جلسہ عام ہوا جس میں قریب قریب ہر مقرر نے حاضرین سے اپیل کی کہ ''الشہاب'' کی کاپیاں خریدیں۔ جب یہ اطلاع مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی کے پاس پہنچی تو انہوں نے اپنی یادداشت مورخہ ۲۰/مارچ ۱۹۵۰ء میں چیف سیکرٹری کو اس امکان کی طرف توجہ دلائی کہ شاید کوئی شخص اس فتوے سے مشتعل ہوکر کسی احمدی کو ہلاک کردے۔ لیکن مسٹر انور علی نے یہ رائے ظاہر کی کہ بعض بین وجوہ کی بنا پر اس کتابچے کی اشاعت کے خلاف کوئی کاروائی کرنا مناسب نہ ہوگا۔ آخر میں مسٹر انور علی نے اسی تجویز پر اکتفا کیا کہ ماسٹر تاج الدین انصاری اور دوسرے احرار لیڈروں کو جو سخت بدلگام ہورہے ہیں طلب کرکے تنبیہ کردی جائے۔ چیف سیکرٹری مسٹر فدا حسن نے ڈی آئی جی سی آئی ڈی سے اتفاق کیا کہ کتابچے کو ممنوع قرار دینے سے احراری اور بھی زیادہ چمکیں گے لہٰذا ایک زبردست تنبیہ کافی ہوگی۔ شعبہ قانون کے مشیر نے اس تجویز پر صاد کیا اور جب فائل ۳۰/جون کو سردار عبدالرب نشتر گورنر کی خدمت میں پیش ہوئی تو انہوں نے لکھا۔

> گزشتہ تنبیہات موثر ثابت نہیں ہوئیں ان لوگوں کو نہایت شدید تنبیہ کرنی چاہیے اور بتادینا چاہے کہ کسی فرد یا گروہ کے خلاف خصوصاً جبکہ افراد متعلقہ ممتاز سرکاری عہدے دار ہوں اور مملکت کے اہم فرائض ادا کرنے میں مصروف ہوں اشتعال انگیز تقریریں کرنا ہرگز برداشت نہیں کیا جاسکتا اگر احراری اپنے اس طرز عمل سے باز نہ آئے تو حکومت ان کے خلاف کاروائی کرنے پر مجبور ہوجائے گی۔

اس فیصلے کے مطابق گورنر صاحب نے بنفس نفیس ماسٹر تاج الدین انصاری کو شدید تنبیہ کی۔ تاہم اس کتابچے کے اقتباسات عام جلسوں میں برابر سنائے جاتے رہے۔ یہاں تک کہ وزیر داخلہ پاکستان نے اس کتابچے کو دیکھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس کتابچے کے بیان کردہ عقاید کے امکانات کا اندازہ کرکے سخت صدمہ ہوا ہے۔ چنانچہ انہوں نے تجویز کی کہ حکومت پنجاب اس کتابے کو فوراً ضبط کرلے۔

اسی اثناء میں احرار کانفرنس منعقدہ حافظ آباد میں ہونے والی تقریروں کی رپورٹ موصول

ہوئی۔اس کانفرنس میں محمد علی جالندھری نے چوہدری ظفر اللہ خان کو ’’دیوانہ کتا‘‘ کہا، ملک حبیب اللہ نے یہ رپورٹ ۱۹؍جون ۱۹۵۰ء کو ڈی آئی جی،سی،آئی،ڈی کو بھیجی اور لکھا کہ اگر احرار کی تقریروں کے لہجے پر کوئی قید عائد نہ کی گئی تو عنقریب حکومت کو بلوے اور قتل کے چند واقعات کا سامنا کرنا پڑے گا۔مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے یہ کیس شعبہ قانون کے مشیر کو بھیجا،مشیر نے اس کو سردار عبدالرب نشتر گورنر کی خدمت میں پیش کر دیا۔اور گورنر صاحب نے ڈی آئی جی سی آئی ڈی کو اس مسئلے پر گفتگو کرنے کیلئے طلب فرمایا۔اس مرحلے پر مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے پوری صورت حال کا جائزہ لیا اور ذیل کی یادداشت لکھی:

مجلس احرار احمدیت کے بانی اور اس کے موجودہ امام کے متعلق فحش اور غلیظ باتیں تو کرتی ہی ہے اب اس نے دانستہ بھی اور نادانستہ بھی تشدد کی حمایت شروع کر دی ہے۔ یاد ہوگا کہ پچھلے سال ایک نوجوان احمدی افسر جو کپتان کا درجہ رکھتا تھا کوئٹہ میں نہایت وحشیانہ طور پر قتل کر دیا گیا کیونکہ اس نے احمدیت کے خلاف بعض مظاہرہ کرنے والوں کے کردار پر اعتراض کیا تھا۔مجلس احرار برصغیر ہند کی تقسیم کے خلاف تھی احرار لیڈروں پر کانگرس اعتبار کرتی تھی اور احراری ہمیشہ کانگرس کے کارکنوں سے خلا ملار رکھتے تھے تقسیم کے بعد یہ لوگ منقار زیر پر ہو گئے۔کچھ مدت تک وہ عوام کے غیظ و غضب سے خائف رہے۔اور کبھی کبھی اس مطلب کے بیانات دیتے رہے کہ وہ پاکستان کے وفادار ہیں ان کی حکمت عملی اس زمانے میں خالص دفاعی تھی اور وہ پناہ گیروں کے کیمپوں اور دوسرے مرکزوں میں خدمت اور امداد کا کام کر رہے تھے چونکہ ممبر ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے اس لئے کچھ مدت تک پارٹی شکستہ و منتشر رہی۔سید عطاء اللہ شاہ بخاری لاہور سے اٹھے اور ضلع مظفر گڑھ کے ایک گاؤں میں پناہ گزیں ہو گئے۔شیخ حسام الدین نے اعلان کیا کہ ان کی سیاسی زندگی ختم ہو چکی ہے اور پھر انہوں نے بھارت اور پاکستان کے درمیان تجارت کرنے کے لئے مشترک راس المال کی ایک کمپنی قائم کر لی کچھ مدت تک شیخ حسام الدین زیر دفعہ ۳ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ نظر بند رکھے گئے

کیونکہ پاکستان سے ان کی وفاداری مشتبہ تھی۔ ان کا ایک رفیق کار مخدوم شاہ بنوری بھی کچھ مدت تک نظر بند رہا۔

۲۔ جب اس صوبے کی مسلم لیگ میں اختلافات بڑھ گئے اور اس کے اثر و اقتدار کو شدید صدمہ پہنچا تو احرار نے خیال کیا کہ سیاسی میدان میں ان کے داخلے کا یہ وقت نہایت مناسب ہے۔ چنانچہ اسی خیال سے انہوں نے پے در پے تبلیغ کانفرنسیں منعقد کرنی شروع کر دیں۔ اب احراری مقررین کی تقریروں کے خصوصی نکات یہ تھے کہ ہم پاکستان کے وفادار ہیں، مسلم لیگ کو ملک بھر کی واحد سیاسی جماعت تسلیم کرتے ہیں، جہاد کشمیر بالکل حق بجانب تھا اور ملک کے دفاع کو مضبوط کرنے کے لئے عوام کی سعی و جہد کو منظّم کرنا چاہیے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے احمدیوں کے خلاف بھی تقریریں شروع کر دیں۔ مجلس میں بعض نہایت موثر خطیب شامل ہیں چنانچہ سید عطاءاللہ شاہ بخاری اپنے گوشہ عزلت سے نکل آئے اور انہوں نے ایک دفعہ پھر اپنی شعلہ بیانی سے جماعت میں جوش عمل پیدا کر دیا۔ جتنا وقت گزرتا گیا تقریروں کا لہجہ بد سے بدتر ہوتا چلا گیا۔ پروگرام کے دوسرے نکات فراموش کر دیئے گئے۔ احرار نے اپنی پوری توجہ احمدیوں کی بدگوئی پر مرتکز کر دی اور نہایت شرمناک دشنام طرازی کا آغاز کر دیا۔ جب ان کی ساکھ کسی قدر عود کر آئی تو انہوں نے سر ظفر اللہ خان پر حملہ کرنا اور انہیں غدار بتانا شروع کر دیا اب احرار کا رویہ مدافعانہ نہیں رہا بلکہ قطعی طور پر جارحانہ ہو چکا ہے حالات بہت زیادہ بگڑ چکے ہیں اور شائستگی اور سیاسی اخلاق کی حدود و قیود توڑی جا چکی ہیں اب تک مندرجہ ذیل قابل ذکر باتیں ظہور میں آئی ہیں:۔

(۱) مرزا غلام احمد کی تحریروں کے اقتباسات ناگوار حد تک نقل کئے جا رہے ہیں اور ان کو توڑ مروڑ کر ان سے فحش اور غلیظ مطالب نکالے جاتے ہیں۔

(۲) مرزا غلام احمد اور موجودہ خلیفہ کو زنا کار اور خلاف وضع فطرت حرکات کا امرتکب ظاہر کیا جا رہا ہے۔

(۳) احمدیوں کو غدار کہا جار ہا ہے اور دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ وہ پاکستان کے وفادار نہیں ہیں۔

(۴) سر ظفر اللہ کے خلاف بدگوئی اور دشنام طرازی جاری ہے ان کو اکثر ''گدھا'' اور ''مکار'' بتایا جاتا ہے اور ان پر یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ وہ قادیان میں احمدی مفادات کے تحفظ کی خاطر کشمیر کو فروخت کر دیں گے۔

(۵) یہ کہہ کر عوام کو دہشت زدہ کیا جا رہا ہے کہ پاکستان پر احمدیوں کی حکومت ہے جو ملک کے غدار ہیں۔

اس مقصد کی خاطر فوجی اور غیر فوجی احمدی عہدہ داروں کی فہرستیں اکثر شائع کی جاتی ہیں۔

(۶) سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے بارہا کہا ہے کہ اگر مرزا غلام احمد نے ان کی زندگی میں نبوت کا دعویٰ کیا ہوتا تو وہ ان کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیتے۔

(۷) پچھلے دنوں احراریوں کے ایک جلسے میں جذبات اس قدر مشتعل کئے گئے کہ حاضرین میں سے ایک شخص نے اٹھ کر اعلان کیا کہ میں مرزا بشیر الدین کو قتل کرنے کے لئے اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔

(۸) ملتان کے ایک جلسے میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر سن کر ایک شخص اٹھا اور کہنے لگا کہ اگر حکم ہو تو میں جا کر سر ظفر اللہ کو قتل کر دوں۔

(۹) ''الشہاب'' کے نام سے ایک کتابچہ مولانا شبیر احمد عثمانی نے لکھا تھا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ احمدی مرتد ہیں لہٰذا ہر مسلمان ان کو قتل کر سکتا ہے یہ کتابچہ دوبارہ چھپ کر شائع کیا جا رہا ہے (یہ کتابچہ مولانا مرحوم نے اس زمانے میں لکھا تھا جب افغانستان میں دو احمدیوں کے ہلاک کیے جانے پر ملک میں ایک بحث چھڑ گئی تھی)

(۳) احرار نے ان بے شمار اقتصادی معاشرتی اور سیاسی مسائل کے متعلق جو پاکستان کو درپیش ہیں کبھی کوئی تعمیری خدمت انجام نہیں دی۔ عملاً ان کے پاس کوئی سیاسی پروگرام نہیں سوائے اس خواہش کے کہ آئندہ انتخابات میں انہیں عوام کی حمایت حاصل ہو جائے۔

(۴) عوام کا حافظہ دردناک حد تک کمزور ہوتا ہے باوجود اس کے کہ آج سے دو سال پہلے

احرار لیڈر شک وشبہ اور بے اعتباری کی نظر سے دیکھے جاتے تھے آج وہ جب کبھی عام جلسوں میں تقریریں کرتے ہیں تو بے شمار حاضرین ان کو سننے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں۔ بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جو ان احرار لیڈروں کی نیت پر اعتراض کریں یا ان سے اتنا ہی پوچھ لیں کہ آخر وہ احمدیوں کے خلاف اتنا شور کیوں مچا رہے ہیں۔ احرار جزوی طور پر اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے ہیں انہوں نے اپنے آپ کو دوبارہ عوام کی نظروں میں مقبول بنالیا ہے اور وہ عنقریب ایک سیاسی جماعت کی [illegible]

مقاصد کی تکمیل کے سوا کچھ نہ تھا۔ دوسرے مضمون میں بعض قراردادوں پر تنقید کی گئی اور بتایا گیا کہ اس تحریک کو اپنے بعض رہنماؤں کی حماقت اور خودغرضی سے نقصان پہنچنے کا احتمال ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ بعض ناکام سیاست دان اور پاکستان کے پرانے مخالف صرف اپنے مقاصد کی تکمیل میں کوشاں ہیں اور علمائے دین کی مقدس قباؤں کے سائے میں اپنے کھوئے ہوئے سیاسی اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنیکی کوشش کرر ہے ہیں۔ اس مضمون میں یہ بھی لکھا گیا کہ تحفظ ختم نبوت کو اپنے ذاتی یا سیاسی اغراض کے لئے استعمال کرنا جرم ہے اور سیاسی منافقت ہے۔ اسی سلسلے میں بعض علماء کے اعلانات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا کہ وہ سیاسی اغراض کے لئے مذہب کو استعمال کرنیکی اجازت نہیں دینگے۔ اس مضمون میں مطالبات کی تائید کی گئی لیکن یہ بھی بتایا گیا کہ بعض قراردادوں سے ایک بدنام سیاسی جماعت کو اہمیت دینا اور بدنظمی پیدا کرنا مقصود ہے۔ ایک قرارداد میں دفعہ ۱۴۴ کے احکام کے نفاذ کو مداخلت فی الدین قرار دیا گیا تھا اور ایک قرارداد کا منشا یہ تھا کہ احرار لیڈروں کے خلاف ان احکام کی خلاف ورزی کی بنا پر جو مقدمات دائر ہیں وہ واپس لے لئے جائیں۔ اس مضمون میں یہ ظاہر کیا گیا کہ ان قراردادوں سے احرار کو ضرور مقبولیت حاصل ہوگی۔ ایک اور قرارداد کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا جس میں گجرات کے مقام پر لاٹھی چارج کی مذمت کی گئی۔ ایک اور قرارداد میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ۱۸ ر جولائی کو ''یوم مطالبات'' منایا جائے۔ اس پر بھی مضمون میں سخت نکتہ چینی کی گئی اور کہا گیا کہ ''یوم مطالبہ'' منانے کا کوئی موقع نہیں کیونکہ یہ مطالبات دستور ساز اسمبلی کے دائرہ اختیار میں ہیں اور قرارداد میں جو طریقہ تجویز کیا گیا ہے اس سے حکومت اور رہنمایانِ تحریک کے درمیان تصادم کا امکان ہے۔

''مغربی پاکستان'' نے اپنی اشاعت مؤرخہ جولائی میں ''مبصر'' کی طرف سے ایک مضمون شائع کیا جس کا عنوان تھا ''ختم نبوت اور تحریک مرزائیت''۔ اس میں یہ ثابت کرنیکی کوشش کی گئی تھی کہ قادیانی کافر ہیں اور ان کا سوشل مقاطعہ کرنا چاہیئے۔

''آزاد'' احراریوں کا اخبار ہے جس کے ایڈیٹر ماسٹر تاج الدین انصاری ہیں۔ اس اخبار نے اپنے آغاز ہی سے اپنے کالموں میں احمدیوں اور ان کے عقائد اور ان کے لیڈروں کے خلاف

نہایت بازاری، ناشائستہ اورزہریلی مہم جاری کررکھی تھی۔ چونکہ حکومت پنجاب نے اس کی سرگرمیوں کو روکنے کے لئے کوئی اقدام نہ اٹھایاتھا اس لئے مرکزی حکومت نے اپنی چٹھی نمبر 4/1/51-Poll-1+ مؤرخہ ۲۴ رمئی ۱۹۵۲ء میں اس اخبار کے مضامین کے تراشے منسلک کر کے ان کی طرف حکومت پنجاب کی توجہ مبذول کرائی اور پوچھا کہ آیا وہ ان مضامین کے خلاف کوئی کاروائی کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ ڈائریکٹر تعلقات عامہ نے حکم دیا کہ اس اخبار کے ان مضامین اور ان سے پہلے شائع ہونیوالے مضامین کا جائزہ لیا جائے جس افسر نے ان مضامین کا جائزہ لیا اس کی رپورٹ یہ تھی کہ ان مضامین میں ایسے حصے موجود ہیں جو شر انگیز ہیں اور جن میں احمدیوں کے خلاف بدگوئی اور دشنام طرازی کی گئی ہے۔ ڈائریکٹر تعلقات عامہ نے اپنی یاداشت مؤرخہ ۲۲ راگست ۱۹۵۲ء میں لکھا کہ یہ اخبار احمدیوں کے خلاف جو پروپیگنڈا کرتا رہا ہے وہ ازسرتا پا نفرت وعناد سے لبریز ہے اور اس کے خلاف زیر دفعہ ۴(۱)(D) پریس (ایمرجنسی پاورز) ایکٹ کاروائی کی جاسکتی ہے لیکن اس کے باوجود ڈائریکٹر نے لکھا کہ میرے نزدیک کوئی کاروائی نہ کرنی چاہئے اور مزید سمجھانے بجھانے اور تنبیہ کرنے کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ ہوم سیکرٹری نے کہا کہ یہ طریقہ اب تک بالکل بے اثر ثابت ہوا ہے۔ لہٰذا کوئی زیادہ موثر طریقہ سوچنا چاہئے لیکن انہوں نے بھی کوئی مؤثر طریقہ تجویز نہ کیا اور اگرچہ چیف منسٹر صاحب ۲۸ راگست کو اس کیس کا معائنہ کر چکے تھے۔ لیکن اس اخبار کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی گئی اور حکومت پنجاب نے اپنی چٹھی ڈی او نمبر 788PR52 مؤرخہ ۳۰ راگست ۱۹۵۲ء میں مرکزی حکومت کو صرف یہ اطلاع دے دی کہ اخبار مذکورہ کو شدید تنبیہ کر دی گئی ہے۔

ایک اردو اخبار ''مزدور'' ملتان سے شائع ہوتا ہے جس کا ایڈیٹر سید ابوذر بخاری ہے جو مشہور احراری لیڈر سید عطا اللہ شاہ بخاری کا بیٹا ہے۔ اس اخبار کی غالب توجہ صرف احمدیوں کے خلاف تحریک پر مرتکز رہی ہے۔ اس نے اپنی اشاعت مؤرخہ ۱۳ رجون ۱۹۵۲ء میں ایک مضمون شائع کیا۔ جس میں جماعت احمدیہ کے امام کے متعلق عربی خط میں ایک ایسی پست اور بازاری بات لکھی کہ ہماری شائستگی ہمیں اس کی تصریح کی اجازت نہیں دیتی۔ اگر یہ الفاظ احمدی جماعت کے کسی فرد کے

سامنے کہے جاتے اور نتیجہ یہ ہوتا کہ کسی کی کھوپڑی توڑ دی جاتی تو ہمیں اس پر ذرا بھی تعجب نہ ہوتا جو الفاظ استعمال کئے گئے وہ پرلے درجے کے مکروہ اور متبذل ذوق کا ثبوت ہیں اور ان میں اس مقدس زبان کی نہایت گستاخانہ تضحیک کی گئی ہے جو قرآن مجید اور نبی کریم صلعم کی زبان ہے۔ اس مضمون کو بھی ڈائریکٹر تعلقاتِ عامہ نے پڑھا اور صرف یہی فیصلہ کیا کہ اخبار کو تنبیہ کردی جائے۔ تین دن بعد اس اخبار نے اپنی اشاعت مؤرخہ ۱۶ر جون ۱۹۵۲ء میں مرکزی حکومت کو گالیاں دیں۔ اگرچہ اس موقع پر اس اخبار سے تین ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی لیکن چیف منسٹر نے ایک دفعہ کی عرض معروض پر ضمانت کا حکم منسوخ کردیا۔

محکمہ اسلامیات

۱۴ر مئی ۱۹۵۱ء کو ایک اجلاس ہوا۔ جس میں چیف منسٹر، چیف سیکرٹری، فنانس سیکرٹری اور ڈائریکٹر تعلقاتِ عامہ شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں قرار پایا کہ ایک محکمہ ''اسلامیات'' قائم کیا جائے چھ علما کا ایک بورڈ مرتب کیا گیا اور چیف سیکرٹری اس محکمے کے حاکم اعلیٰ قرار پائے۔ اس کی نگرانی اور مصارف کا انتظام ڈائریکٹر تعلقات عامہ کے سپرد کیا گیا اور مولوی ابراہیم علی چشتی چھ سو پچاس روپے ماہانہ پر ڈپٹی سیکرٹری مقرر کئے گئے۔ اس محکمے کے حقیقی اخراجات ۱۹۵۲ء میں ۴۹۸۱۵ روپے اور ۵۱-۱۹۵۲ء میں ۴۳۵،۰۵،۱۰ روپے ہوئے۔ ستمبر ۱۹۵۱ء سے لیکر فروری ۱۹۵۳ء تک بہتر (۷۲) اشخاص کو مختلف اخباروں اور رسالوں میں مضامین لکھنے کے لئے معاوضے پیش کئے گئے۔ ان اشخاص میں سے مولانا ابوالحسنات محمد احمد اور مولانا محمد بخش مسلم نے احمدیوں کے خلاف تحریک میں نمایاں حصہ لیا کیونکہ اول الذکر پنجاب کی مجلس عمل کے صدر اور آخر الذکر ممبر تھے۔ اس محکمے نے اٹھارہ اشخاص کو اس کام پر مقرر کیا کہ سکولوں، کالجوں اور جیلوں میں دینیات پر لکچر دیا کریں۔ ان میں ذیل کے گیارہ افراد نے تحریک میں نہایت سرگرم حصہ لیا:۔

(۱) مولانا محمد بخش مسلم (۲) مولوی غلام دین (۳) مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادر

(۴) صاحبزادہ فیض الحسن (۵) علامہ علاؤالدین صدیقی (۶) مولانا غلام محمد ترنم (۷) قاضی مرید احمد (۸) حافظ کفایت حسین (۹) پروفیسر عبدالحمید (۱۰) مولانا سلیم اللہ (۱۱) مفتی محمد حسن

ان حضرات میں سے چھ شورش کے سلسلے میں اپنی سرگرمیوں کی وجہ سے گرفتار کئے گئے۔ قاضی مرید احمد، پروفیسر عبدالحمید اور مفتی محمد حسن کے سوا باقی سب مجلس عمل کے ممبر تھے جو اس شورش کی سربراہ تھی۔ قاضی مرید احمد مجلس عمل ضلع سرگودھا اور حافظ کفایت حسین مجلس عمل ضلع لاہور کے صدر تھے۔ ممبروں کے بورڈ میں سے مندرجہ ذیل چار اشخاص نے تحریک میں نمایاں حصہ لیا ان میں سے پہلے دو اپنی سرگرمیوں کی وجہ سے گرفتار بھی ہوئے۔

(۱) مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری

(۲) مولانا غلام محمد ترنم

(۳) مولانا محمد بخش مسلم

(۴) مفتی محمد حسن

حصہ دوم:

لاہور کنونشن سے لے کر کراچی اور پنجاب میں علماء کی گرفتاری تک

از ۱۴ار جولائی ۱۹۵۲ء تا ۲۷ر فروری ۱۹۵۳ء

دفعہ ۱۴۴ کے احکام واپس لے لئے گئے

سرگودھا میں جو مقدمات احکام زیر دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کی بنا پر دائر کئے گئے تھے ان کی پیروی محنت سے کی گئی اور ہم بتا چکے ہیں کہ ان میں سے ایک میں ملزموں کو سزا ہوگئی۔ ایک مقدمہ گوجرانوالہ میں اور دوسرا سرگودھا میں زیر سماعت تھا یہ دونوں بعد میں واپس لے لئے گئے اور جن ملزموں کی مقدمہ سرگودھا میں سزا ہوگئی تھی ان کی رہائی کے احکام صادر کر دیئے گئے۔

ہوم سیکرٹری کی دو یادداشتیں ہیں۔ ایک مؤرخہ ۱۷ر جولائی ۱۹۵۲ء بر صفحہ ۷ فائل نمبر ۹۹ (2)16۔ جلد اول اور دوسری مؤرخہ ۱۸ر جولائی ۱۹۵۲ء بر صفحہ ۴۶ فائل نمبر 93(2)16- جلد اول، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ گوجرانوالہ کا مقدمہ واپس لینے کا فیصلہ یقیناً چیف منسٹر کے حکم سے کیا گیا ہوگا اول الذکر یادداشت کے الفاظ یہ ہیں:۔

''اجلاس منعقدہ ۱۵ر جولائی ۱۹۵۲ء کے فیصلے کے مطابق میں نے منسلکہ لاسلکی پیغام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ گوجرانوالہ کو بھیجا۔ وہ کل مجھ سے ملے۔ میں نے ان کو بتایا کہ احرار کے دو

بڑے سرغنے یعنی ماسٹر تاج الدین اور شیخ حسام الدین چونکہ مقدمہ سرگودھا میں سزایاب ہو چکے ہیں اس لئے حکومت نے گوجرانوالہ کے مقدمہ کو واپس لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ انہوں نے گوجرانوالہ واپس پہنچنے پر کل یا آج یہ مقدمہ ضرور واپس لے لیا ہوگا۔

دوسری یاداشت کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:۔

''گوجرانوالہ کا مقدمہ کل واپس لے لیا گیا میں نے چیف منسٹر صاحب کے ساتھ گفتگو کے فوراً بعد ۱۵ر تاریخ کو ڈپٹی کمشنر کو بلا بھیجا تھا جب وہ ۱۶ر کو مجھ سے ملنے آئے تو میں نے حکومت کا فیصلہ ان کو بتا دیا تھا''

اگرچہ مسٹر دولتانہ تسلیم نہیں کرتے تھے کہ مقدمے کی واپسی کا فیصلہ انہوں نے کیا تھا لیکن مذکورہ بالا دو یادداشتوں میں سے یہ بالکل واضح ہے کہ مقدمے کی واپسی کا فیصلہ حکام کے اس اجلاس میں کیا گیا تھا جس میں چیف منسٹر موجود تھے۔ ایک تو بڑی عجلت کے ساتھ مقدمے کی واپسی کا فیصلہ ڈپٹی کمشنر تک پہنچایا گیا اور پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ اتنا اہم فیصلہ کوئی افسر بھی اپنی ذمہ داری پر نہیں کر سکتا تھا۔ ان دو باتوں سے یہ بالکل واضح ہے کہ مقدمہ واپس لینے کا فیصلہ چیف منسٹر صاحب نے خود ہی کیا تھا۔ فائل سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵ر جولائی ۱۹۵۲ء کو ہوم سیکرٹری نے دفتر ڈپٹی کمشنر گوجرانوالہ کو ایک لاسلکی پیغام بھیجا جس میں ان سے کہا کہ وہ دوسرے ہی دن ہوم سیکرٹری سے ملیں۔ ڈپٹی کمشنر نے آکر ۱۶ر جولائی کو ہوم سیکرٹری سے ملاقات کی جنہوں نے ان کو بتایا کہ حکومت نے اس مقدمے کو واپس لینے کا فیصلہ کیا ہے ان سب واقعات سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مقدمہ چیف منسٹر کے حکم سے واپس لیا گیا۔

ہم ذکر کر چکے ہیں کہ مولانا اختر علی خاں اور مولوی غلام غوث سرحدی (مجلس احرار کے نئے صدر) نے ۵ر جولائی ۱۹۵۲ء کو مسٹر انور علی سے ملاقات کر کے ان کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ اگر وہ لوگ جو احکام زیر دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کی بنا پر گرفتار کئے گئے ہیں رہا کر دیئے جائیں اور احکام زیر دفعہ ۱۴۴ واپس لے لئے جائیں تو احرار من حیث الجماعت ایک اعلان عام کر دینگے کہ وہ آئندہ ایسی تقریریں نہیں کرینگے جن سے صوبے کے امن وسکون میں خلل پڑنے کا احتمال ہو۔ یہ

پیشکش بعد میں چیف منسٹر کے سامنے دہرائی گئی۔ جس پر چیف منسٹر نے ڈائرکٹر تعلقاتِ عامہ کو ہدایت کی کہ احراری لیڈروں سے مل کر معلوم کریں کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ میر نور احمد نے چیف منسٹر کو اطلاع دی کہ احراری لیڈر حکومت کے ساتھ تصادم سے بچنے اور اپنی تحریک کو آئینی طریقے سے جاری رکھنے کے خواہشمند ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض احراری لیڈر ۱۹ر جولائی کو چیف منسٹر سے ملے اور ایک ایسا اعلان عام شائع کرنے پر رضامند ہو گئے جس میں یہ یقین دلایا جائے کہ وہ لاقانونی اور تشدد کو روا نہ رکھیں گے اور قانون شکنی نہیں کرینگے۔ دوسری طرف چیف منسٹر نے کہا کہ اگر اس قسم کا اعلان شائع کر دیا گیا تو وہ اس مسئلے پر ہمدردانہ غور کرینگے کہ احرار کے جلسوں پر زیر دفعہ ۱۴۴ جو پابندی عائد کی گئی ہے وہ اٹھالی جائے اور ان کے سزایاب لیڈروں کو رہا کر دیا جائے۔ اس گفت وشنید کے مطابق ''آفاق'' مؤرخہ ۲۱ر جولائی ۱۹۵۲ء میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولوی محمد علی جالندھری ناظم اعلیٰ مجلس احرار، صاحبزادہ فیض الحسن ممبر مجلس عاملہ احرار اور مولانا محمد حسین غازی سالار اعلیٰ جیوش احرار اسلام کی طرف سے ایک بیان شائع کیا گیا جس کا مضمون یہ تھا کہ احرار نے احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دلانے اور چوہدری ظفر اللہ خان کو وزارت خارجہ سے برطرف کرانے کی جدوجہد کے دوران میں اب تک کوئی خلاف قانون حرکت نہیں کی اور وہ آئندہ بھی ایسا کوئی اقدام کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے جس سے تشدد بدنظمی اور قانون شکنی کا خطرہ پیدا ہونے کا احتمال ہو، وہ حکومت پنجاب کو اپنی حکومت سمجھتے ہیں اور اس حکومت پر قانون وانتظام کے قیام کی جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ احرار کی اپنی ذمہ داری ہے جس کو پورا کرنے میں وہ حکومت سے مکمل تعاون کرینگے۔ یہ احرار کا نہ صرف شہری بلکہ مذہبی فرض ہے کہ بلاامتیاز مذہب وملت پاکستان کے تمام شہریوں کی جان مال آبرو اور آزادی کی حفاظت کریں۔ اس بیان کے شائع ہونے پر چیف منسٹر نے ۲۲ر جولائی ۱۹۵۲ء کے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں مندرجہ ذیل بیان شائع کرایا۔

''مجلس احرار پنجاب کے لیڈروں نے اپنی پالیسی کے متعلق ایک تازہ اعلان کیا ہے جس میں یقین دلایا ہے کہ وہ قانون وانتظام کے قیام میں میری حکومت کے ساتھ مکمل تعاون کرینگے۔ میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں''

مجلس احرار کے لیڈروں نے اس حقیقت پر بجا زور دیا ہے کہ پاکستان میں مسلم اکثریت کا قومی ہی نہیں بلکہ مذہبی فرض بھی ہے کہ وہ بلا امتیاز عقیدہ و ذات اس ملک کے ہر شہری کے جان و مال، آبرو اور شہری حقوق کے تحفظ کے ضامن ہوں۔

کچھ مدت سے پنجاب کے مختلف اضلاع میں احراری کارکنوں کے عام جلسوں اور مظاہروں پر قیود عائد ہیں۔ ان قیود کے عائد کرنے کا واحد مقصد یہ تھا کہ صوبے میں امن عامہ اور انتظام محفوظ رہے۔ اب احراری لیڈروں کے اعلان کے پیش نظر یہ ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ جہاں تک اس جماعت کے ممبروں کا تعلق ہے ان قیود کو جاری رکھا جائے۔ لہٰذا متعلقہ حکام اضلاع کے نام ہدایات جاری کی جارہی ہیں کہ وہ احکام زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کو واپس لے لیں یا ان میں مناسب ترمیم کر دیں۔

عین اسی وقت ہوم سیکرٹری کی طرف سے ایک برقی پیغام تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کے نام بھیجا گیا جس میں انہیں ۲۱ر جولائی ۱۹۵۲ء کو اطلاع دی گئی کہ چونکہ مجلس احرار پاکستان نے چیف منسٹر صاحب سے ایک وعدہ کیا ہے اور چیف منسٹر صاحب نے اس وعدے کو قبول کر لیا ہے اس لئے عام جلسوں کے امتناع کے جو احکام زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری صادر کئے گئے تھے، واپس لے لئے جائیں۔ ۲۶ر جولائی کو ہوم سیکرٹری نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ جیل میانوالی کو ایک لاسلکی پیغام کے ذریعے سے اطلاع دی کہ حکومت نے ماسٹر تاج الدین کی باقی سزائے قید کو معاف کر دیا ہے اس لئے ان کو فوراً رہا کر دیا جائے۔ اسی دن اس قسم کا ایک پیغام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ جیل جھنگ کو بھیجا گیا جس میں شیخ حسام الدین کو رہا کر دینے کی ہدایت کی گئی۔

۵ر جولائی کی کانفرنس میں جو فیصلہ کیا گیا وہ گویا اس امر کا اعتراف تھا کہ حکومت اس مسئلے کو حل کرنے سے عاجز ہے کہ آیا مسلمان مسجدوں میں ختم نبوت پر کھلم کھلا تقریریں کرنے کے حقدار ہیں یا نہیں۔ اسی طرح اب جو فیصلہ کیا گیا کہ دفعہ ۱۴۴ کے احکام منسوخ کئے جائیں، ان کی خلاف ورزی کی بنا پر جو مقدمات زیر سماعت ہیں وہ واپس لے لئے جائیں اور جو لوگ ان احکام کی خلاف ورزی کے مرتکب ثابت ہو چکے ہیں ان کو رہا کر دیا جائے تو اس فیصلے کا اثر یہ ہوا کہ اس سے پیشتر جو فیصلے کئے

گئے تھے کہ احراریوں کو جمہور سے منقطع کر دیا جائے اور ان کے خلاف جو کیس قابل دست اندازی پولیس اور نا قابل ضمانت قرار دیئے جا چکے ہیں ان کی پیروی زور وشور سے کی جائے وہ فیصلے بھی بیکار ہو گئے۔ ۵/ جولائی کے فیصلوں کے ماتحت مساجد کے اندر گرفتاریاں کرنے یا مساجد کے اندر اور باہر جلسوں کو منتشر کرنے کے متعلق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کے اختیارات محدود کر دیئے گئے تھے اور ۲۱/ جولائی کے فیصلے سے گویا سرکاری طور پر یہ پوزیشن تسلیم کر لی گئی کہ احراری احمدیوں پر حملہ کرنے ان کا مال لوٹنے اور ان کی بے آبروئی کرنے سے محترز رہیں تو ان کو پوری آزادی ہے کہ اپنے مطالبات کو مقبول عام بنانے کے لئے جو چاہیں کریں اور احمدیوں کے خلاف اور ان کے رہنماؤں اور عقیدوں کے خلاف جتنی شدت سے چاہیں تقریریں کرتے رہیں۔ اس کے بعد یہ سوال ہی باقی نہ رہا کہ نفرت کے اس سیلاب کو جو احمدیوں کے خلاف جاری ہے روکا جائے یا اس طوفان کے انسداد کے لئے کوئی تدبیر اختیار کی جائے۔

شہادت میں اس تاریخ کے متعلق کسی قدر اختلاف ہے جس پر احراریوں نے وہ اقرار کیا تھا جو ۲۱/ جولائی کے اخباروں میں شائع ہوا۔ مسٹر دولتانہ کا بیان ہے کہ احراریوں کا ایک وفد مولوی محمد علی جالندھری کی سرکردگی میں غالباً ۱۸/ جولائی کو مسٹر دولتانہ کے دفتر میں ان سے ملا جب کہ بعض حکام بھی موجود تھے؟ لیکن ایک سوال سے جو مسٹر یعقوب علی نے میر نور احمد سے کیا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وفد نے چیف منسٹر سے ۱۹/ جولائی کو ملاقات کی تھی۔ جب حکومت اور ارکانِ وفد کے درمیان سمجھوتا ہو چکا ہے تو ایک موزوں مسودہ تیار کرنے کا مسئلہ سامنے آیا۔ میر نور احمد اور مسٹر ابراہیم علی چشتی کا بیان ہے کہ انہوں نے احراری رہنماؤں سے گفتگو کر کے سمجھوتے کا مسودہ تیار کیا۔ جو بعد میں اخبارات میں شائع کیا گیا۔ مولانا محمد بخش مسلم کا بیان ہے کہ اس کانفرنس میں مولانا ابوالحسنات، سید عطا اللہ شاہ بخاری صاحبزادہ فیض الحسن مولانا غلام محمد ترنم اور خود مولانا محمد بخش مسلم شامل تھے اور یہ کانفرنس ملتان میں گولی چلنے کے بعد یعنی ۱۹/ جولائی کو یا اس کے بعد ہوئی تھی۔ یہ کانفرنس بادامی باغ کے ایک کارخانے کے احاطے میں منعقد ہوئی تھی چونکہ نہ چیف منسٹر سے لیڈروں کی ملاقات کا اور نہ اس کے بعد ہونے والی کانفرنس کا کوئی ریکارڈ محفوظ ہے اور مسٹر دولتانہ بھی تاریخ کے متعلق متعین نہیں ہے۔

اس لئے ہم مولانا محمد بخش مسلم کے اس بیان کو تسلیم کر لینے پر مائل ہیں کہ میر نور احمد اور مولوی ابراہیم علی چشتی کی ملاقات لیڈروں کے ساتھ ملتان فائرنگ کے بعد ہوئی۔ یہ نہ صرف اغلب ہے بلکہ اس کی تصدیق حکومت پنجاب کی اس چٹھی سے بھی ہوتی ہے جو کپ کے واقعہ کے متعلق وزیر اعظم پاکستان کے استفسار پر یہاں سے بھیجی گئی تھی چونکہ احرار کے ساتھ تصفیہ کا اعلان واقعہ کپ کے بعد ہوا تھا اس لئے اس کا مطلب یہی تھا کہ حکومت ہر قیمت پر احرار سے سمجھوتا کرنے کی خواہش مند ہے۔

کُپ کا واقعہ

اس مقام پر کُپ کا مختصر حال بیان کرنا ضروری ہے۔ اگرچہ حکام ضلع کا عام خیال یہ تھا کہ گو دفعہ ۱۴۴ کے ماتحت عام جلسے اور جلوس ممنوع ہیں لیکن ان کو منتشر کرنے کی اجازت نہیں۔ تاہم ملتان کے تھانہ کُپ کے ایک سب انسپکٹر پولیس نے یہ محسوس کیا کہ احکام کا نفاذ اور پھر ان کی مسلسل خلاف ورزی نہایت لغو بات ہے۔ چنانچہ اس نے ۱۸ جولائی کو ملتان میں ایک جلسہ عام اور جلوس کو بزور منتشر کر دیا۔ اس پر عام احساس یہ ہوا کہ یہ سب انسپکٹر نہایت گستاخ اور بے ادب ہے اور اس نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے اگلے دن پانچ ہزار انسانوں کے غضبناک ہجوم نے تھانہ کُپ کو گھیر لیا اور اس گستاخ افسر کے تبادلہ کا مطالبہ کیا۔ جو اعلیٰ حکام اس وقت موجود تھے انہوں نے ہجوم کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ تھانے کا جنگلہ ہجوم کے بوجھ سے ٹوٹ گیا اور یہ مجمع تھانے کے احاطے کے اندر داخل ہو گیا۔ پندرہ پیدل کانسٹیبلوں کا ایک دستہ مداخلت بیجا کرنے والے مجمع پر لاٹھی چارج کرنے کے لئے باہر نکلا۔ لیکن اس پر اینٹوں کی بوچھاڑ برسا دی گئی اور وہ واپس ہو گیا۔ اس کے بعد کسی نے عمارت کو آگ لگا دینے کی کوشش کی جس پر پولیس نے گولی چلا دی۔ تین ہلاک اور تیرہ زخمی ہوئے۔ اور ان زخمیوں میں سے تین ہسپتال میں فوت ہو گئے۔

ملتان فائرنگ کے خلاف احتجاج اور مقتول و مجروح لوگوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کے لئے

متعدد مقامات پر جلسے منعقد ہوئے اور بالآخر ہائیکورٹ کے ایک جج صاحب نے اس واقعہ کی تحقیقات کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ گولی چلانا بجق جانب تھا، اگر چہ مقتول و مجروح اشخاص ایک مجمع خلاف قانون کے شرکا اور قانون ملکی کی رو سے مجرم تھے۔ لیکن وہ بہت سے جلسوں میں علی الاعلان شہدا قرار دیئے گئے اور احرار نے اشتہار دیا کہ ۲۰ راگست ۱۹۵۲ء کو ملتان میں ایک جلسہ ہوگا جس میں شہداء کا چہلم منایا جائے گا۔ ڈی آئی جی، سی آئی ڈی نے تجویز پیش کی کہ یہ جلسہ ممنوع قرار دیا جائے لیکن چیف منسٹر صاحب نے اس تجویز کو ناپسند کیا اور صرف اس امر پر رضامند ہوئے کہ احراریوں کو ایک تنبیہ کر دی جائے۔ تجویز کی گئی کہ تنبیہ کرنے کے بعد حکومت کو ایک پریس نوٹ شائع کرنا چاہئے، لیکن اس کو بھی چیف منسٹر نے منظور نہ کیا۔ پھر جب ہوم سیکرٹری نے دریافت کیا کہ احراری لیڈروں کو ایک عام تنبیہ کر دی جائے تو چیف منسٹر نے جواب دیا کہ حکومت کو اس مرحلے پر کسی عام تنبیہ کے متعلق کوئی فکر نہ کرنی چاہئے۔

مسلم لیگ

اب مسلم لیگ بھی علی الاعلان مطالبات کی حمایت کرنے لگی اور بہت سے پوسٹر اور دستی اشتہارات جن پر لیگ کے ممبروں اور عہدہ داروں کے دستخط ثبت تھے لاہور، لائل پور، جھنگ اور شیخوپورہ کے اضلاع میں شائع ہوئے۔ احرار ختم نبوت کے متعلق جو جلسے منعقد کرتے تھے ان کی صدارت بھی مسلم لیگیوں نے شروع کر دی تھی۔

پنجاب صوبہ مسلم لیگ کے صدر صاحب کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ لیگ کے ممبر دوسری سیاسی جماعتوں کے جلسوں کی صدارت کر رہے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے اس بارے میں مسلم لیگ کی پالیسی کو معین کرنا ضروری سمجھا اور یکم اپریل ۱۹۵۲ء کو ذیل کا بیان جاری کیا:۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ صوبے کے اندر بعض مقامات پر مسلم لیگ کے ممتاز ارکان نے جن میں بعض ضلعی مسلم لیگیوں کے صدر بھی شامل ہیں احرار کی کانفرنسوں کی صدارت کی ہے۔ میں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ دوسری انجمنوں کی کانفرنسوں کی صدارت

کرنا مسلم لیگ کے نظم وضبط کی خلاف ورزی ہے لہٰذا میں ہدایت کرتا ہوں کہ آئندہ مسلم لیگ کا کوئی ممبر مسلم لیگ کے سوا کسی دوسری جماعت کے منعقد کیۓ ہوئے جلسوں کی صدارت نہ کرے۔ بلاشبہ اس میں ان تقریبات میں شرکت شامل نہیں ہے جن کی نوعیت خالص مجلسی یا غیری سیاسی ہو لیکن سیاسی کی تعریف ڈھیلی ڈھالی نہیں بلکہ کڑی ہونی چاہیۓ۔ یہ قطعی طور پر ضروری ہے کہ مسلم لیگ کے ممبر کسی ایسی سرگرمی میں حصہ نہ لیں جس سے پاکستان کے شہریوں کے درمیان منافرت ومخالفت پیدا ہونے کا احتمال ہو یا جس میں پاکستانی شہریوں کے بعض خاص طبقوں یا گروہوں کو دشنام وملامت کا نشانہ بنایا جائے۔

اس بیان کی بنیاد پر ۳؍اپریل ۱۹۵۲ء کو ایک گشتی مراسلہ تمام ضلعی اور شہری مسلم لیگیوں کے نام بھیجا گیا۔ جس میں مسلم لیگ کے ممبروں کو غیر مسلم لیگی جلسوں کی صدارت سے منع کیا گیا۔ (مجلسی اور غیر سیاسی جلسے اس سے مستثنیٰ قرار دیۓ گئے) اور اس امر پر زور دیا گیا کہ مسلم لیگیوں کو ایسی سرگرمیوں میں کوئی حصہ نہ لینا چاہیۓ جن سے پاکستانی شہریوں کے مختلف طبقات کے درمیان بیگانگی یا عداوت پیدا ہونے کا احتمال ہو یا جن کا رخ پاکستانی رعایا کے کسی خاص گروہ یا طبقے کے خلاف ہو۔

لیکن اس ہدایت کے باوجود اضلاع اور شہروں میں مسلم لیگ کی شاخیں اس تحریک کی معاون بننے لگیں، جو نہایت سرعت سے پھیل رہی تھی۔ اس سے پیشتر بتایا جا چکا ہے کہ سرگودھا اور گوجرانوالہ میں بعض اشخاص کے خلاف احکام زیر دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی اور مساجد میں احراریوں کے منعقد کردہ جلسوں میں شرکت کے الزام میں مقدمات دائر تھے۔ ۱۷؍جولائی ۱۹۵۲ء کو سٹی مسلم لیگ گوجرانوالہ نے ایک جلسہ منعقد کر کے ذیل کی قراردادیں منظور کیں:۔

(۱) کہ عقیدہ ختم نبوت مسلمانوں کا بنیادی عقیدہ ہے۔

(۲) کہ سٹی مسلم لیگ اس امر کی سخت مذمت کرتی ہے کہ احکام زیر دفعہ ۱۴۴ کا اطلاق مساجد پر کیا گیا۔ اور اس قسم کے احکام کو نہ صرف غیر ضروری بلکہ عوام کے فرائض مذہبی کی بجا آوری میں مداخلت خیال کرتی ہے اور پر زور مطالبہ کرتی ہے کہ حکومت ایسے احکام کو واپس لے لے۔

(۳) کہ سٹی مسلم لیگ حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ دفعہ ۱۴۴ کے احکام کی خلاف ورزی

میں مساجد کے اندر جمع ہونے کی وجہ سے گرفتار کئے گئے ہیں۔

اس سے تین دن بعد یعنی ۲ر جولائی ۱۹۵۲ء کو سٹی مسلم لیگ سرگودھا نے بھی ذیل کی قرار دادیں منظور کیں:۔

(۱) کہ سٹی مسلم لیگ اتفاق آرا سے اس مطالبہ کی تائید کرتی ہے کہ احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔

(۲) کہ سٹی مسلم لیگ صوبہ مسلم لیگ اور آل پاکستان مسلم لیگ سے استدعا کرتی ہے کہ وہ احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیں تاکہ ملت میں مزید انتشار پیدا نہ ہو۔

(۳) کہ ان مطالبات کی اہمیت، ان کے متعلق اتفاق آرا، ان کی نازک نوعیت اور ملک کے عام احساس کے پیش نظر مرکزی اور صوبائی مسلم لیگیوں کو اس معاملے میں کچھ عملی قدم اٹھانا چاہیئے۔

سٹی مسلم لیگ کامونکے نے بھی اس مطلب کی ایک قرارداد منظور کی کہ چونکہ پنجاب کے علماء نے اتفاق آرا سے احمدیوں کو خارج از اسلام قرار دیا ہے۔ اس لئے اب احمدی مسلم لیگ کے ممبر نہیں بن سکتے۔ لہٰذا مسلم لیگ کے احمدی ممبروں کو خارج کر دیا جائے اور آئندہ کوئی احمدی مسلم لیگ کی ممبری کا مستحق نہ سمجھا جائے۔ مسٹر دولتانہ صدر پنجاب مسلم لیگ نے ایک بیان دیا جو ''آفاق'' مؤرخہ ۱۸ر جولائی میں شائع ہوا اس بیان میں آپ نے لیگ کے ممبروں سے اپیل کی کہ وہ ان مذہبی اور سیاسی مسائل کے حل میں لیگ کی امداد کریں جو مسئلہ ختم نبوت کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں۔ آپ نے مسلم لیگیوں کو صبر وسکون کی تلقین کی تاکہ صوبہ لیگ کی مجلس عاملہ اور کونسل میں ان مسئلوں پر غور کر سکے کیونکہ یہی وہ منظمات ہیں جو صوبہ لیگ کے آئندہ اجلاس میں جمہور کی صحیح رہنمائی کر سکتی ہیں۔ یہ اجلاس ۲۶، ۲۷ر جولائی کو منعقد ہوگا۔

پنجاب صوبہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس منعقدہ ۲۸ر جون ۱۹۵۲ء میں فیصلہ کیا گیا کہ لیگ کا آئندہ اجلاس ۲۶، ۲۷ جولائی ۱۹۵۲ء کو، لاہور میں کیا جائے۔ یکم جولائی ۱۹۵۲ء کو اس مطلب

کے لئے ایک عارضی ایجنڈا مرتب کرلیا گیا لیکن اس میں مسئلہ ختم نبوت شامل نہ تھا۔ یہ ایجنڈا کونسل کے تمام ممبروں کے نام بھیج کر ان سے استدعا کی گئی کہ جو قراردادیں وہ پیش کرنا چاہیں، ۱۵ر جولائی تک ارسال کردیں چنانچہ مندرجہ ذیل قراردادیں لیگ کے جائنٹ سیکرٹری کو وصول ہوئیں۔

1- قرارداد مؤرخہ ۱۴ر جولائی ۱۹۵۲ء محرک قاضی مرید احمد ایم ایل اے کونسلر پنجاب مسلم لیگ موید صاحبزادہ محمود شاہ گجراتی کونسلر پنجاب مسلم لیگ۔

کہ پنجاب مسلم لیگ کونسل کا یہ اجلاس حکومت پاکستان سے مطالبہ کرتا ہے کہ مرزائی ایک علیحدہ غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جائیں اور مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ جلد از جلد پنجاب اسمبلی میں ایک قرارداد منظور کرے جس میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے یہ مطالبہ کیا گیا ہو کہ مرزائی ایک علیحدہ غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جائیں۔

2- قرارداد، مؤرخہ ۱۴ جولائی ۱۹۵۲ء محرک صاحبزادہ سید محمود شاہ گجراتی کونسلر پنجاب مسلم لیگ موید قاضی مرید احمد کونسلر پنجاب مسلم لیگ کہ

پنجاب صوبہ مسلم لیگ کے اس اجلاس کو شبہ ہے کہ چوہدری ظفر اللہ خان مملکت کے وفادار نہیں ہیں اور یہ اجلاس یقین کرتا ہے کہ چوہدری ظفر اللہ خان نے وزیر خارجہ کے عہدے سے فائدہ اٹھا کر عقیدہ مرزائیت کی تبلیغ کی ہے اور سرکاری عہدوں پر مرزائیوں کو مقرر کیا ہے اس جلسے کی رائے میں کشمیر کے مسئلے کے حل میں ہماری ناکامی کا باعث صرف چوہدری ظفر اللہ خان کی ناقابلیت ہی نہیں بلکہ برطانیہ عظمیٰ کے ساتھ ان کی اور ان کی جماعت کی روایتی وفاداری بھی اس ناکامی کی ذمہ دار ہے۔ لہٰذا پاکستان، ممالک اسلامی اور کشمیر کے مفادات کا تقاضا یہ ہے کہ چوہدری ظفر اللہ خان کو حتی الامکان جلد سے جلد ان کے عہدے سے برطرف کردیا جائے۔

3- قرارداد۔ مؤرخہ ۱۵ر جولائی ۱۹۵۲ء محرک:۔ محمد اسلام الدین ایم ایل اے وہاڑی ضلع ملتان کہ

چونکہ مرزائی پیغمبر اسلام صلعم کی خاتمیت پر یقین نہیں رکھتے، بلکہ اس کے برعکس اس خاتمیت

کے ماننے والوں کو کافر خیال کرتے ہیں۔ اس لئے ان کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ یہ مطالبہ مذہبی، جمہوری اور دستوری اصولوں کا تقاضا ہے۔

کہ پنجاب صوبہ مسلم لیگ مرکزی حکومت پر عقیدہ ختم نبوت کی اہمیت واضح کرے اور اس حکومت سے مطالبہ کرے کہ اس عقیدے کے مخالفین کو اقلیت قرار دے۔

4- قرار داد مؤرخہ ۱۲ر جون ۱۹۵۲ء محرک:۔مولانا سید احمد سعید کاظمی ممبر صوبہ مسلم لیگ کونسل، ملتان۔موید: خواجہ عبدالحکیم صدیقی صدر سٹی مسلم لیگ ملتان، موید ثانی: صوفی محمد عبدالغفور لدھیانوی، اعزازی آفس سیکرٹری ضلع مسلم لیگ ملتان، کونسلر صوبہ مسلم لیگ۔

کہ چونکہ قادیانی بالاتفاق خارج از اسلام سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے ان کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے اور حکومت کو اس اعلان میں تاخیر نہ کرنی چاہیئے۔

کہ چونکہ چوہدری ظفراللہ خان قادیانی ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے نمائندہ نہیں ہیں اس لئے پنجاب صوبہ مسلم لیگ کی کونسل کو حکومت پاکستان سے یہ مطالبہ کرنا چاہیئے کہ وہ اپنے عہدے سے برطرف کردیئے جائیں اور ان کی جگہ کوئی قابل اعتبار مسلمان مقرر کیا جائے۔

5- قرار داد مؤرخہ ۱۴ر جولائی ۱۹۵۲ء محرک: محمد ابراہیم قریشی جنرل سیکرٹری سٹی مسلم لیگ جھنگ، کونسلر پنجاب مسلم لیگ

کہ کونسل کو یہ اعلان کرنا چاہیئے کہ احمدیوں کو ان کے اپنے اظہارات اور تحریرات کی بنا پر ایک علیحدہ غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ لیکن ان کے ساتھ حتی الامکان فیاضانہ سلوک کیا جائے؟ کہ کونسل کو پیغمبر اسلام صلعم پر ختم نبوت کے عقیدے کی حفاظت کے لئے ضروری تدابیر اختیار کرنی چاہئیں اور آئندہ جماعت احمدیہ کے کسی ممبر کو کسی کلیدی عہدے پر مقرر نہ کرنا چاہیئے۔ کہ مسلم لیگ کو عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کا مسئلہ اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیئے تاکہ آئندہ کوئی ظلی یا بروزی اس عقیدے کے خلاف کوئی نظریہ پیش کر کے مملکت کی سالمیت کو خطرے میں نہ ڈال سکے۔

مجلس عاملہ کا دوسرا اجلاس ۲۵ر جولائی ۱۹۵۲ء کو مسٹر دولتانہ صدر پنجاب صوبہ مسلم لیگ کی

صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں صاحب صدر نے اعلان کیا کہ میں نے اور دوسرے عہدیداروں نے ۱۵ر جولائی تک وصول ہونے والی قرار دادوں کا جائزہ لیا ہے اوراس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کونسل میں صرف آٹھ قرار دادیں پیش کی جائیں گی۔ کمیٹی نے اس کو قبول کیا اور منظور قرار دادوں کی فہرست میں نمبر۳ ''قرارداد ختم نبوت'' کے متعلق فیصلہ کیا کہ اس کو سید مصطفیٰ شاہ خالد گیلانی پیش کرینگے۔

کونسل کا دوسرا اجلاس ۲۷ر جولائی کو آٹھ بجے صبح شروع ہوا جس میں ذیل کی قرارداد آٹھ ووٹوں کے مقابلے میں ۲۸۴ ووٹوں کی اکثریت سے منظور ہوئی۔

''پنجاب مسلم لیگ کونسل اس صداقت کا پورا شعور رکھتی ہے کہ ختم نبوت دین اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے جس نے مسلمانانِ عالم کو ایک روحانی اخوت کے رشتے میں جکڑ رکھا ہے اور جو پاکستان میں ملت مسلمہ کے اتحاد و سالمیت کی مستحکم بنیاد کا حکم رکھتا ہے۔ اس صداقت کا یہ واضح اور طبعی نتیجہ ہے کہ عقیدہ ختم نبوت کے نہ ماننے والے اسلام کے دینی عقائد سے بنیادی اختلاف رکھتے ہیں۔

اس موقف کی بنیاد پر جس کے متعلق نہ کوئی اختلاف موجود ہے نہ ہوسکتا ہے۔ ایک تجویز پیش کی گئی ہے جو سیاسی اقدام اور دستوری قانون سازی کے دائرے سے تعلق رکھتی ہے کہ احمدی جو ایک دینی مسئلے پر اساسی اختلافی رویہ رکھتے ہیں دستور پاکستان میں ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جائیں، کونسل کی رائے میں یہ تجویز کسی حد تک مسلمانوں کے اس ردعمل کو ظاہر کرتی ہے جو احمدیوں کے رویے سے پیدا ہوئے کیونکہ احمدیوں نے نہ صرف مذہبی معاملات میں بلکہ شہری اور مجلسی زندگی میں بھی اکثر علیحدگی کے قوی رجحانات کا اظہار کیا ہے۔

تاہم اس تجویز میں دستوری اور قانونی نوعیت کے بعض سنگین اور اہم امور شامل ہیں جو پاکستان کے شہریوں کے حقوق و فرائض پر اثر انداز ہوں گے اور اس دستوری نظام کی نوعیت کو معین کرینگے جو پاکستان کے لئے تجویز کیا گیا ہے ان امور پر طبعاً پرسکون اور غیر

جانبدارانہ انداز سے نہایت محتاط اور گہرا غور وخوض ضروری ہے جو جذباتیت اور شورش انگیزی سے بالکل غیر متاثر ہو، اس لئے پنجاب مسلم لیگ کونسل کی رائے یہ ہے کہ اس دستوری مسئلے کو پورے اعتماد کے ساتھ پاکستان مسلم لیگ کے لیڈروں اور پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے ممبروں کی پختہ اور صائب دانشمندی چھوڑ دیا جائے اور اس اثنا میں مسلم لیگ کی تنظیم کے ہر ممبر کو چاہئے کہ سکون وسنجیدگی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرے کیونکہ ایسی ہی فضا میں بنیادی دستوری پالیسی پر اثر ڈالنے والے فیصلے بوجہ احسن کئے جا سکتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی کونسل اس اصول پر اپنے غیر متزلزل ثبات کا اظہار کرتی ہے کہ مسلمانانِ پاکستان کا نہ صرف جمہوری بلکہ دینی فرض یہ ہے کہ اس مملکت کے ہر شہری کے جان و مال آبرو اور شہری حقوق کی حفاظت بلا امتیاز مسلک وعقیدہ بلکہ اپنے حقوق کی مانند کریں۔ یہ کونسل پنجاب کی مسلم لیگی وزارت سے توقع رکھتی ہے کہ وہ تمام حالات میں اس اصول کی تائید وحمایت کرے گی"۔

اس کے بعد مجلس عاملہ کا ایک اجلاس ۲۲/اگست کو ہوا جس میں قرار دیا گیا کہ مسلم لیگ کا کوئی ممبر یا عہدہ دار آل مسلم پارٹیز کنونشن کی مجلس عمل کے جلسوں کی صدارت نہیں کرے گا۔

اب مسٹر دولتانہ اس رویے کی تصریح میں مصروف ہو گئے جو صوبہ مسلم لیگ نے اپنی قرارداد مؤرخہ ۲۷/جولائی ۱۹۵۲ء میں اختیار کیا تھا۔ چنانچہ ۳۰/اگست ۱۹۵۲ء کو حضوری باغ میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"آج دنیا بھر میں پاکستان ہی ایک ایسا ملک ہے جو اسلامی حکومت قائم کرنے کا دعویدار ہے۔ تمام دنیا ہمارے اس تجربے کو غور سے دیکھ رہی ہے اور اگر ہم اس ذمہ داری کی تکمیل میں ناکام رہ گئے تو دنیا کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ دنیا میں حکومت کی اسلامی ہیئت کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ ختم نبوت کے مسئلے میں میرا وہی عقیدہ ہے جو ایک مسلمان کا ہونا چاہئے میرے نزدیک وہ تمام لوگ خارج از اسلام ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی نہیں مانتے ہیں، اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہتا ہوں کہ عقیدہ ختم نبوت پر کوئی

بحث اٹھانا کفر کے مترادف ہے کیونکہ بحث کی گنجائش صرف اس مسئلے میں ممکن ہے جس میں کسی قسم کا شبہ وارد ہوتا ہو۔ عقیدہ ختم نبوت ہمارے ایمان کا جزو ہے اس لئے ہر بحث اور ہر منطق سے بالاتر ہے۔ مرزائیوں کے خلاف جونفرت پیدا کی گئی ہے اس کی ذمہ داری خود انہی پر ہے۔ کیونکہ ان کے رجحانات علیحدگی پسندانہ ہیں۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں ہم سے علیحدہ ہیں اور انہوں نے اپنی ذاتی سیاسی اور مجلسی سرگرمیوں کو صرف اپنی جماعت تک محدود کر رکھا ہے۔ قادیانی افسر اپنی جماعت کے آدمیوں کی طرفداری کے مجرم ہیں کیونکہ انہوں نے بہت سی الاٹمنٹیں محض اس بنیاد پر کی ہیں کہ الاٹی مرزائی تھا گویا انہوں نے اپنی سرکاری حیثیت کا ناجائز استعمال کیا۔

اس صورت حال کا علاج جذباتی تقریروں اور عام جلسوں سے نہیں ہوسکتا۔ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے میں فرقہ وارو جوہ کی بنا پر جانبداری کے مجرموں کے خلاف شدید کاروائی کرونگا اور جہاں اس قسم کی کوئی شکایت کی جائے گی اس کی پوری تحقیقات کراؤنگا، میں آپ لوگوں سے احکام اسلام کا واسطہ دے کر اور ملت کی آبرو کے نام پر اپیل کرتا ہوں کہ ہر اس شخص کے جان و مال اور آبرو کی حفاظت کیجئے جو اپنے آپ کو پاکستانی شہری کہتا ہے۔ جب تک میں چیف منسٹر ہوں میں اپنے صوبے میں بے گناہوں کا خون گرانا ہرگز برداشت نہ کرونگا۔ ہر شہری کی آبرو کے تحفظ میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا اور ہر قیمت پر اپنا یہ دینی اخلاقی اور سرکاری فرض بجالاؤنگا۔ مرزائیوں کو اقلیت قرار دینا ایک دستوری مسئلہ ہے۔ ہمارا دستور اب تک وضع نہیں کیا گیا اور دستور ساز اسمبلی نے اب تک اس امر کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا کہ اکثریت اور اقلیتوں کے درمیان کیا فرق و امتیاز ملحوظ رکھا جائیگا لہٰذا اس مسئلے کو دستور ساز اسمبلی پر چھوڑ دینا چاہئے۔ لیکن اگر بحث کی غرض سے یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ مرزائیوں کو اقلیت قرار دے دیا گیا۔ اگر اس کے بعد انہوں نے آپ اپنے آپ کو مرزائی کہنا بند کر دیا تو پوزیشن کیا ہوگی؟ کسی قوم یا گروہ کو اقلیت قرار دینے کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ نہ صرف اس قوم یا گروہ کے حقوق معین کئے جائیں بلکہ ان حقوق کی حفاظت بھی کی

جائے اوران کو سرکاری ملازمتوں اور قانون ساز اسمبلیوں میں رعایات دی جائیں۔ اگر مرزائی اقلیت قرار دے دیئے تو ہم مجبور ہوں گے کہ ان کو وہ تمام رعایات وحقوق دیں جو بحالت موجودہ ہم انہیں نہیں دینا چاہتے۔ یہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے جس پر گہرے اور سنجیدہ غور وخوض کی ضرورت ہے یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس کو عام جلسے منعقد کرنے، فساد مچانے، پتھر پھینکنے اور اسی قسم کی دوسری ناواجب حرکات سے حل کیا جاسکے۔ میں ان لوگوں سے جو ختم نبوت کی حریک کے سلسلے میں جلسے منعقد کر رہے ہیں یہ سوال کرتا ہوں کہ جس حالت میں ہم سب عقیدہ ختم نبوت پر قائم ہیں ان جلسوں کی کیا ضرورت ہے۔ ان غیر ضروری جلسوں کو دیکھ کر بعض اوقات میرے دل میں جلسے منعقد کرنے والوں کی نیت پر شبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' مؤرخہ ۱۳ر ستمبر ۱۹۵۲ء میں مسٹر دولتانہ کی اس تقریر کی رپورٹ درج ہے۔ جوانہوں نے راولپنڈی میں کی۔ آپ نے کہا:۔

''میں اس ملک کو ایک صحیح اسلامی جمہوریہ بنانا چاہتا ہوں جس میں ہر شخص بلاامتیاز عقائد سیاسی مساوی حقوق رکھتا ہو جس میں ہر چیز کا فیصلہ بہترین عدل وانصاف سے کیا جائے۔ جس میں لوگوں کی اقتصادی اور اخلاقی حالت بہت اچھی ہو اور جس کے لوگ ملک کی مشترکہ بہبود کے حصول کے لئے سنجیدگی، ہوشمندی اور خلوص سے کام کریں۔

میرا پختہ ایمان ہے کہ نبی کریم صلعم آخری نبی ہیں جس شخص کا یہ عقیدہ نہیں وہ مسلمان نہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو شخص یہ عقیدہ نہ رکھتا ہو اسے اس ملک میں رہنے کا حق نہیں۔ تمام وہ لوگ جو پاکستان میں رہتے ہیں اور پاکستان کے وفادار ہیں خواہ وہ ہندو ہوں عیسائی ہوں یا کسی اور فرقے یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، اس ملک کی حکومت اور اس ملک کے باشندوں کی حفاظت میں ہیں۔ اہل وطن میں سے ایک ایک فرد کی حفاظت مسلمان کا اور حکومت کا بھی اولین فریضہ ہے جب تک امور حکومت کی عنان میرے ہاتھ میں ہے میں پورا انتظام کرونگا کہ کسی وفادار پاکستانی کو محض اس بنا پر کوئی ضرر نہ پہنچنے پائے کہ اس کا مذہب

اس کی ذات پات یا اس کا مسلک ہم سے جداگانہ ہے۔

احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کا مسئلہ کوئی دینی مسئلہ نہیں۔ بلکہ ایک دستوری معاملہ ہے جس کو یہی حیثیت دینی چاہیئے اور اس پر ٹھنڈے دل سے بحث کرنی چاہیئے۔ میں احرار اور دوسری مذہبی انجمنوں سے اپیل کرتا ہوں کہ اس مسئلے پر غور وخوض کے لئے پرسکون فضا پیدا کریں۔

نظام آباد کے مقام پر ۲۵ر اکتوبر ۱۹۵۲ء کو مسٹر دولتانہ نے فرقہ بندی کی مخالفت کی اور کہا کہ جو لوگ مسلمانوں کے درمیان افتراق پیدا کر رہے ہیں وہ نہ صرف اتحاد اسلامی کو بلکہ پاکستان کی سالمیت کو برباد کر رہے ہیں آپ نے عوام کو مشورہ دیا کہ فرقہ پرستوں کی افتراق انگیز سرگرمیوں میں شریک ہونے سے اجتناب کریں۔

ان تقریروں میں جن نکات پر زور دیا گیا وہ یہ ہیں کہ جو شخص عقیدہ ختم نبوت پر ایمان نہیں رکھتا، وہ مسلمان نہیں، احمدیوں کے متعلق جو مطالبہ ہے وہ اسی دینی مؤقف کا تقاضا ہے۔ مطالبات کی نوعیت دستوری اور سیاسی ہے جس پر صرف مرکزی اربابِ اختیار (دستوری یا مسلم لیگی) ہی غور کر سکتے ہیں۔ صوبے کو ان مطالبات سے کوئی تعلق نہیں اور احرار کو اس معاملے پر پنجاب میں کوئی گڑبڑ نہ کرنی چاہیئے۔

بعد کے واقعات

جب تمام امتناعی احکام واپس لے لئے گئے۔ ان کی خلاف ورزی کے مقدمات بھی ختم کر دیئے گئے، اس خلاف ورزی کے ماخوذین کی سزائیں بھی معاف کر دی گئیں اور مطالبات کا وجود سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا تو احرار اور ان کے رفقا کو کھلی چھٹی مل گئی کہ وہ اپنے مطالبات پر زور دینے اور ان کی حمایت میں پروپیگنڈا جاری رکھنے کے لئے جن طریقوں کو آئینی سمجھیں ان کو اختیار کر لیں۔ چنانچہ انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی مہم کو تیز تر کر کے اپنے پروپیگنڈا کی شدت اور وسعت میں اضافہ کر دیا۔ سیکرٹ انٹیلی جنس ایبسٹرکٹ (خلاصۂ اطلاعات خفیہ) ایک سرکاری تحریر

ہے جو چیف منسٹر کو بغرض اطلاع ارسال ہوا کرتی تھی۔اس تحریر سے معلوم ہوا کہ مارشل لاء کے اعلان مؤرخہ ۶ر مارچ سے پہلے صوبے بھر میں ۳۹۰ جلسے منعقد ہوئے۔جن میں سے ۱۶۷،ایسے تھے جن کا اہتمام خالصۃً احراریوں نے کیا تھا۔سید مظفر علی شمسی، شیخ حسام الدین ،صاحبزادہ فیض الحسن ، ماسٹر تاج الدین انصاری اور محمد علی جالندھری نے جو مجلس احرار کے ممتاز ممبر تھے۔اپنے آپ کو اس تحریک کا دائمی مبلغ بنا دیا۔گویا احمدیوں کی مخالفت ہی ان کی زندگیوں کا واحد مقصد تھا۔جلسوں میں احمدیوں کے خلاف ہر قسم کے دلائل دہرائے جاتے تھے اور احمدیوں اور ان کے لیڈروں کو گالیاں دی جاتی تھیں۔تقریری مہم کے ساتھ ہی ساتھ پوسٹر اشتہار، کتابچے اخباروں میں مضامین اور جلوس بھی جاری تھے۔۲۴ جولائی ۱۹۵۲ء کو مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے حکومت کو اطلاع دی کہ صوبے کے مختلف مقامات پر چوہدری ظفر اللہ خان کے جنازے نکالے جا رہے ہیں۔لہٰذا پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۲۳ کے ماتحت کاروائی کرنی چاہیے۔لیکن ہوم سیکرٹری نے کہا کہ یہ ایکٹ ایسے معاملات میں استعمال نہیں ہوسکتا اور اس کے بجائے یہ تجویز کی کہ چیف منسٹر صاحب احراری لیڈروں سے بات چیت کریں اور انہیں اس وعدے کی پابندی کی طرف متوجہ کریں جو انہوں نے کر رکھا ہے۔یہ تجویز چیف سیکرٹری کی وساطت سے چیف منسٹر کی خدمت میں پیش کی گئی جس پر انہوں نے ۳۰ جولائی کو اپنے مختصر دستخط ثبت کر دیئے۔

ایم بی ہائی سکول وزیر آباد کے طالب علموں نے ایک جلوس نکالا جس میں ایک چار پائی کے ساتھ کتا بندھا ہوا تھا اور اس کو چوہدری ظفر اللہ خان ظاہر کیا گیا تھا۔

اور ایک جلوس ۲۵ر جون ۱۹۵۲ء کو قصور کے بازاروں میں بعد نماز جمعہ نکالا جس کی رپورٹ ایڈیشنل سپرنٹنڈنٹ پولیس قصور نے اپنی ڈائری مؤرخہ ۲۶ر جولائی ۱۹۵۲ء میں قلمبند کی اور وہ بھی چیف منسٹر صاحب کے علم میں لائی گئی۔اس جلوس میں جو نعرے لگائے گئے ان میں چوہدری ظفر اللہ خان کو نہایت ذلیل گالیاں دی گئیں۔مثلاً ''ظفر اللہ کنجر، ظفر اللہ کتا، ظفر اللہ سور'' اور بعد میں شرکائے جلوس ایک گدھی کو پکڑ لائے جس پر ''بیگم ظفر اللہ'' لکھا تھا۔اس گدھی پر ایک آدمی سوار تھا جس کے سر پر ٹاپ ہیٹ اور گلے میں جوتیوں کا ہار تھا اور اس پر مرزا غلام احمد کا نام لکھا تھا۔جب مسٹر قربان علی

خان کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو انہوں نے لکھا کہ یہ واقعہ شورش کا قدرتی نتیجہ ہے جو قانون کے خلاف جاری ہے۔ ایک لاقانونی حرکت سے دوسری لاقانونی حرکت پیدا ہو رہی ہے۔ اور اگر کوئی انسدادی طریقہ دریافت نہ کیا گیا تو اس کا انجام انقلاب ہوگا اور یہ تاریخ کا وہ سبق ہے جس میں تاخیر تو ہو سکتی ہے لیکن اس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ چیف منسٹر صاحب نے اس کیس کا معائنہ تو کیا لیکن اس واقعہ پر کوئی توجہ نہ کی گئی۔

اس دوران میں لاقانونی کے متعدد اور واقعات کی اطلاعات بھی موصول ہوئیں۔ ان سب کا ذکر سرکاری کاغذات میں موجود ہے اور وہ حسب ذیل ہے:۔

(۱) ۲۰؍ جولائی ۱۹۵۲ء کو لائل پور میں ایک احمدی کی دکان پر رائفل چلائی گئی اور احمدیوں کی ایک مسجد پر پتھر پھینکے گئے۔

(۲) ۵؍ اگست ۱۹۵۲ء کو مصری شاہ لاہور میں ایک احمدی پر حملہ کیا گیا۔

(۳) چک نمبر ۴۹۷ جھنگ میں احمدیوں اور غیر احمدیوں میں لڑائی ہوگئی۔

(۴) ۲؍ ستمبر ۱۹۵۲ء کو ایک جھگڑے کے دوران میں مسماۃ طالع بی بی پر حملہ کیا گیا کیونکہ وہ احمدی عورت تھی۔

(۵) ۱۸؍ ستمبر ۱۹۵۲ء کو منڈی جڑانوالہ میں ڈاکٹر محمد حسین خان احمدی پر ایک شخص نے حملہ کیا جو احمدیت کے خلاف ایک کتابچے سے قابل اعتراض اشعار پڑھ رہا تھا اور ڈاکٹر نے اس کو اس حرکت سے روکا تھا۔

(۶) ۱۶؍ فروری ۱۹۵۳ء کو جب خواجہ ناظم الدین لاہور آئے تو ہڑتال ہوئی۔ جو لوگ ہڑتال کرنے کے خلاف تھے ان کے منہ کالے کئے گئے۔ دیال سنگھ کالج کا محاصرہ کر کے اس پر خشت باری کی گئی۔ تعلیم الاسلام کالج پر پتھر پھینکے گئے اور اس کا بڑا دروازہ توڑ دیا گیا۔

(۷) ۲۷؍ جولائی کو مسلم لیگ کے دفتر کے باہر بلوہ ہوگیا جس میں ۴۶ پولیس کے آدمی زخمی ہوئے اور کاریں توڑ دی گئیں۔

(۸) محلّہ اراضی یعقوب سیالکوٹ میں احمدیوں کی ایک مسجد کو آگ لگانے کی کوشش کی گئی۔

اخبارات

اس زمانے میں اخبارات کے ذریعے مسلسل ومتواتر پروپیگنڈا جاری رہا۔ ’’زمیندار‘‘ جوان چار اخباروں میں سے ایک تھا جن کی مربی گیری حکومت کر رہی تھی اور جن کو بعض معاملات کے ماتحت حکومت سے بہت بڑی رقم مل چکی تھی مطالبات کی حمایت اور احمدیت کی مخالفت میں برابر لکھ رہا تھا احراریوں کے اخبار ’’آزاد‘‘ کا بھی یہی حال تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ احمدیوں کی مخالفت اس اخبار کے کالموں کا واضح موضوع تھا۔

’’آزاد‘‘

اس اخبار کی اشاعت مؤرخہ ۹ ستمبر ۱۹۵۲ء میں ایک مضمون چھپا جس کا جائزہ لینے پر خیال کیا گیا کہ اخبار کے خلاف مقدمہ چلایا جانا ضروری ہے۔ لیکن ہوم سیکرٹری چیف سیکرٹری اور چیف منسٹر نے یہ رائے دی کہ اخبار کو ایک اور تنبیہ کی جائے اور دیکھا جائے کہ اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔

اس اخبار کی اشاعت مؤرخہ ۱۱ ستمبر ۱۹۵۲ء کا نام ’’مطالبہ نمبر‘‘ تھا۔ یہ پرچہ کاملاً احمدیوں کی مخالفت کے لئے وقف کیا گیا تھا۔ اس میں ایک اہم چیز ایک نظم تھی ’’ملتان پوچھتا ہے‘‘ جس میں ان اشخاص کی مدح سرائی کی گئی تھی جو کپ کے واقعہ میں مارے گئے تھے۔ ڈائریکٹر تعلقات عامہ نے ۱۲ ستمبر ۱۹۵۲ء کو اور لیگل ریممبرنسر نے ۷ ستمبر ۱۹۵۲ء کو اس نظم کا جائزہ لیا اور دونوں نے اتفاق کیا کہ اس کے خلاف کارروائی ہونی چاہئے۔ لیکن اس کے متعلق کچھ بھی نہ کیا گیا۔

اس اخبار نے اپنے صفحہ اول پر ایک کارٹون شائع کیا۔ اس کا جائزہ لینے والے افسر نے اس کی حسب ذیل تصریح کی:۔

سرورق پر اس اخبار نے ایک رنگا رنگ کارٹون شائع کیا ہے جس میں جان بل کو ایک سپیرا ظاہر کیا گیا ہے جو احمدیت کی ٹوکری سے سانپ نکال رہا ہے۔ ایک بڑا سانپ اس ٹوکری سے اٹھ کر قادیان پر (جس کو ایک بلند مینار سے ظاہر کیا گیا ہے۔) چھا گیا ہے، وہاں سے وہ ایک سوراخ میں

داخل ہوکر ربوہ میں مرزا البشیر الدین محمود احمد کی صورت میں نمودار ہوگیا ہے۔ مرزا البشیر الدین محمود احمد کو اپنے منہ سے تین سانپ خارج کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ان سانپوں میں سے ایک تو راولپنڈی میں قائد ملت مرحوم کو ڈس رہا ہے۔ دوسرا ایک ہوائی جہاز کو تباہ کر رہا ہے۔ (جنگ شاہی کے ہوائی حادثے کی طرف اشارہ) اور تیسرا چوہدری ظفر اللہ خان کی شکل میں وزیر اعظم پاکستان کو ڈسنے کے درپے ہے۔

مرکزی حکومت نے اپنی چٹھی نمبر (۱)28/43/52poll مؤرخہ ۱۱/اکتوبر ۱۹۵۲ء میں حکومت پنجاب کی توجہ اس کارٹون کی طرف مبذول کرائی۔ اس چٹھی میں لکھا تھا کہ غالباً حکومت پنجاب اس کارٹون کو ملاحظہ کر چکی ہے اور اس کے خلاف مناسب کاروائی کر کے مرکزی حکومت کو اطلاع دے گی۔ اس کے جواب میں ڈائریکٹر تعلقات عامہ نے اپنا چھٹی نمبر 3754 P.B-52/985- مؤرخہ ۲۳/اکتوبر ۱۹۵۲ء میں مرکزی حکومت کو صرف یہ اطلاع دی کہ حکومت صوبہ نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ہدایت کی ہے کہ اس اخبار کے پرنٹر پبلشر کو طلب کر کے تنبیہ کر دیں کہ اگر وہ اس قسم کا مواد شائع کرنے سے باز نہ آئیگا تو حکومت اس کے اخبار کو بند کر دے گی۔

اس اخبار نے اپنی اشاعت مؤرخہ ۱۲/نومبر ۱۹۵۲ء میں ایک افتتاحیہ شائع کیا جس کا عنوان صرف ایک استفہامی علامت (؟) تھی اس مضمون میں جماعت احمدیہ کے موجودہ امام کو گندی گالیاں دی گئی تھیں اور حکومت پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ کفر وارتداد کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے اس اخبار نے جو الفاظ اس سلسلے میں استعمال کئے۔ وہ ہو بہو درج ذیل ہیں:۔

آخر کب تک ایک زانی وشرابی ایک غنڈے اور بدمعاش مفتری وکاذب اور دجال کو اس ملک میں ہمارے کان نبی مسیح موعود اور احمد ومحمد کے نام سے پکارے جاتے سنتے رہیں گے اور کب تک امت کی مقدس ومطہر ماؤں کو ایک ننگ انسانیت عورت کے لئے اپنی قبروں میں بے چین ہونا پڑے گا اور کب تک انبیاء اولیا کی توہین وتذلیل اور عقائد وشعائر دین کی رسوائی کا تماشائے بے حمیتی جاری رہے گا۔ آخر یہ زندگی بے حیائی وبے غیرتی اور دیوثی کی زندگی نہیں تو اور کیا ہے؟ قوم آج مجسم طور پر ایک سوالیہ نشان بن کر خداوندانِ حکومت اور

قومی ذمہ داروں کا منہ تک رہی ہے لہٰذا ان کا فرض ہے کہ وہ ان کے جانے پہچانے سوال کا جلد از جلد کوئی مفصل و مدلل اور دوٹوک جواب دیں۔ ورنہ سمجھ لیں کہ یہ خاموشی یہ بے اعتنائی و بے نیازی یہ مداہنت وتغافل۔ یہ کفر و ارتداد پروری اور غدار نوازی کا سوچا سمجھا ہوا شرمناک رویہ زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکے گا۔

مرکزی حکومت نے اپنی چھٹی مؤرخہ ۲۱ نومبر ۱۹۵۲ء کے ذریعے سے حکومت صوبہ کو اس مضمون کی طرف توجہ دلائی اور اس کے متعلق منٹگمری کی احمدی جماعت کی شکایتی قرارداد بھی بغرض کاروائی منسلک کردی جو مرکزی حکومت کو موصول ہوئی تھی۔ یہ مضمون زیر دفعہ ۱۵۳ الف تعزیرات پاکستان اور زیر دفعہ ۲۱ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ قابل اقدام سمجھا گیا لیکن مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے یہ عجیب رائے ظاہر کی کہ مرکزی حکومت نے اس بارے میں کوئی رہنمائی نہیں کی اور حکومت پنجاب کچھ مدت سے مرکزی حکومت کے اس رویے پر اظہار تاسف کررہی ہے۔ آپ نے کہا کہ مرکزی حکومت کی اس بے پروائی کے پیش نظر حکومت صوبہ کو چاہئے کہ کوئی کاروائی نہ کرے۔ اور میں خود اس اخبار کے ایڈیٹر ماسٹر تاج الدین انصاری سے بات چیت کرونگا۔ ہوم سیکرٹری نے اس رائے سے اتفاق کیا اور چیف منسٹر صاحب نے کیس پر دستخط کردیئے۔

پھر ۱۰ دسمبر ۱۹۵۲ء کو وزارت داخلہ نے اپنی ڈی او نمبر (۱)44/9/52poll بنام ہوم سیکرٹری حکومت پنجاب میں حکومت پنجاب کو اس اخبار کی سرگرمیوں کی طرف توجہ دلائی، اس چٹھی میں ہوم سیکرٹری کی سابقہ چٹھی ڈی او نمبر 273-ST(HS)52 مؤرخہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۵۲ء اور مسٹر نور احمد کی چٹھی بجواب چٹھی وزارت داخلہ نمبر (۱)28/43/52-Poll ۱۱/ اکتوبر ۱۹۵۲ء کا حوالہ دے کر یہ لکھا گیا کہ حکومت پنجاب کے بیان کے مطابق اس اخبار کو کئی دفعہ تنبیہ کی جاچکی ہے لیکن اس کے باوجود وہ ایسا مواد شائع کررہا ہے جس سے پاکستانیوں کے ایک طبقے کے مذہبی جذبات کو قطعی طور پر صدمہ پہنچتا ہے اور جس کا مقصد ہی یہ ہے کہ جمہور کے مختلف طبقات کے درمیان دشمنی پیدا ہو۔ ایسی حالت میں مرکزی حکومت کی رائے یہ ہے کہ چونکہ گزشتہ تنبیہات کا کوئی اثر نہیں ہوا لہٰذا حکومت صوبہ دوسرے متبادل طریق کو اختیار کرنے میں تامل نہ کرے یعنی اس اخبار کے خلاف

مقدمہ چلائے ،حکومت صوبہ سے یہ بھی التماس کی گئی کہ وہ جلد سے جلد مرکزی حکومت کو اطلاع دے کہ اس بارے میں کیا اقدام کیا گیا ہے۔اس چٹھی پر بھی کوئی اقدام نہ کیا گیا اور وزارت داخلہ نے اپنی چٹھی نمبر (ا) 44/9/52-Poll مؤرخہ ۲۷ دسمبر ۱۹۵۲ء میں ہوم سیکرٹری کو دوبارہ یاددہانی کرائی۔اس چٹھی میں وزارت وزارت کی سابقہ چٹھی مؤرخہ ۱۰؍۱۹۵۲ء کا حوالہ دے کر یہ بتایا گیا تھا کہ اس چٹھی کے ارسال کے بعد بھی اس اخبار کی اشاعت مؤرخہ ۲۱ ؍دسمبر ۱۹۵۲ء میں ایک اور قابل اعتراض نظم ''دردمندان قوم'' کے عنوان سے شائع ہوئی جو نہ صرف پریس ایکٹ (ایمر جنسی پاورز) اور پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت بلکہ ملک کے مستقبل قانون فوجداری کے ماتحت بھی قابل اقدام ہے۔اس چٹھی میں حکومت صوبہ سے دوبارہ التماس کی گئی کہ اس مضمون پر جو کاروائی کی جائے اس سے مرکزی حکومت کو مطلع کیا جائے یہ چٹھی چیف سیکرٹری اور ڈائیکٹر تعلقات عامہ کی نظر سے گزری لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس پر کوئی توجہ نہیں کی گئی۔

''آفاق''

''آفاق'' مؤرخہ ۱۹؍جولائی میں ''قادیانیوں کے امام کی ایک نہایت افسوس ناک تقریر'' کے عنوان سے امام جماعت احمدیہ کا ایک خطبہ نقل کیا گیا جو ''الفضل'' مؤرخہ ۱۱؍جنوری ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا۔''آفاق'' نے اس خطبے پر مخالفانہ تبصرہ کیا اور ۲۰ جولائی کے پرچے میں صوبے کے مختلف مقامات پر ''یوم مطالبہ'' منانے کی اطلاعات درج کیں۔

اس اخبار نے اپنی اشاعت مؤرخہ ۳۰ جولائی میں ایک افتتاحیہ لکھا جس میں ختم نبوت کے متعلق مسلم لیگ کی قرارداد پر بحث کی۔اس مضمون میں بتایا گیا کہ صوبہ مسلم لیگ سے ایک مطالبہ یہ کیا گیا ہے کہ مرزائیوں کے خارج از اسلام ہونے کا اعلان کیا جائے۔مسلم لیگ اس مطالبہ کی صحت کو تسلیم کر چکی ہے اور مسٹر دولتانہ اپنی تقریر میں صاف صاف اعلان کر چکے ہیں کہ مسلم لیگ میں اس معاملے پر اتفاق رائے ہے کہ مرزائی مسلمان نہیں ہیں کیونکہ وہ عقیدہ ختم نبوت کے منکر ہیں۔اس

مضمون میں اس اعلان کی تعریف کی گئی اور کہا گیا کہ اور کسی ذمہ دار لیڈر نے ایسا واضح اعلان نہیں کیا اور اس معاملے میں پنجاب مسلم لیگ اور اس کے صدر محترم قابل تحسین ہیں۔ مضمون میں تصریح کی گئی کہ مسلم لیگ نے مطالبات کی حمایت کرنے کے باوجود اس موضوع پر کوئی فیصلہ اس لئے نہیں کیا کہ یہ مسئلہ دستوری ہے، جس کا تعلق صرف پنجاب سے نہیں بلکہ پورے پاکستان سے ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس مسئلے کا فیصلہ آل پاکستان مسلم لیگ اور دستور ساز اسمبلی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ مضمون میں یہ امید ظاہر کی گئی کہ اب پاکستان مسلم لیگ اور دستور ساز اسمبلی قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے میں تامل نہ کرینگی اور قرارداد کے اس حصے کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی گئی جس میں مسلمانوں کو تاکید کی گئی تھی کہ پاکستان کے تمام شہریوں کے جان و مال اور آبرو کی حفاظت ان کا مذہبی فریضہ ہے۔

۱۹ر جولائی ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں ایک اور مضمون شائع ہوا، جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ آج کل ملک میں جو تشویش انگیز اور خطرناک صورت حال پیدا ہو رہی ہے یہ مرزا بشیر الدین محمود احمد کی تقریروں اور خطبوں اور احمدیوں کے جارحانہ منصوبوں کی پیداوار۔ ہے۔

۶ر اگست ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں ''الفضل'' کے قابل اعتراض اقتباسات کا ایک انتخاب شائع کیا گیا جس میں موجودہ امام جماعت احمدیہ کے بعض بیانات شامل تھے۔ یکم ستمبر کے پرچے میں مسٹر دولتانہ کی حضوری باغ والی تقریر درج کی گئی۔

۲۸ر فروری ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں ایک نامہ نگار اکبر مراد پوری کا ایک مراسلہ شائع ہوا جس میں بعض سوالات اور احمدی تحریروں سے ان کے جوابات شائع کر کے یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ احمدی ایک علیحدہ امت ہیں۔

''احسان''

۲۱ر جولائی ۱۹۵۲ء کے ''احسان'' میں آل مسلم پارٹیز کنونشن کی مجلس عمل کی طرف سے ایک اپیل شائع ہوئی۔ جس میں لوگوں کو تلقین کی گئی تھی کہ احمدیوں کی اشتعال انگیزی کے باوجود پر امن

رہیں اور مساجد کے اماموں سے استدعا کی گئی تھی کہ آئندہ نماز جمعہ کے موقع پر نمازیوں کو ہر قسم کی بدنظمی پیدا کرنے سے اجتناب کی نصیحت کریں۔اس اپیل میں یہ بتایا گیا تھا کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دینے اور چوہدری ظفر اللہ خان کو برطرف کرنے کے مطالبات بالکل آئینی ہیں۔ان پر ایسی فضا میں زور دینا چاہئے جو قانون شکنی سے بالکل پاک ہو۔

۳/اگست ۱۹۵۲ء کے احسان میں ان قراردادوں کی رپورٹ شائع ہوئی جو یکم اگست کو جمعہ کے دن مختلف مساجد میں منظور کی گئی تھیں ان قراردادوں میں آل مسلم پارٹیز کنونشن کے موقف کی حمایت کی گئی۔تحریک کو کاملاً پرامن رکھنے کے عزم کا اظہار کیا گیا اور مطالبات کی تکمیل پر اصرار کیا گیا۔مساجد میں جو تقریریں کی گئیں ان میں بھی پنجاب مسلم لیگ کی اس قرارداد کی تعریف کی گئی جس میں مرزائیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا تھا لیکن قرارداد کے اس حصے کے متعلق بے اطمینانی کا اظہار کیا گیا جس میں مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ تسلیم نہیں کیا گیا تھا،اس مضمون میں یہ تشویش انگیز خبر بھی درج کی گئی کہ ایک چٹھی موصول ہوئی جس میں مولانا ابوالحسنات،مولانا مودودی،سید عطا اللہ شاہ بخاری،مولانا احمد علی اور مولانا مسلم کو قتل کی دھمکی دی گئی ہے۔

۸/اگست ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں ’’قادیانی نبوت‘‘ کے عنوان سے سید فقیر حسین بخاری ایم اے بی ٹی پروفیسر اسلامیہ کالج کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں احمدیہ عقائد پر نقطہ چینی کی گئی تھی اور وعدہ کیا گیا تھا کہ آئندہ اشاعت میں ایک اور جامع مقالہ درج کیا جائے گا۔

۱۰/اگست ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں جماعت احمدیہ اور چوہدری ظفر اللہ خان کے خلاف ایک نہایت شدت آمیز افتتاحیہ درج کیا گیا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ قادیانی پاکستان کے لئے حقیقی خطرہ ہیں اور وہ ملت مسلمہ کے ممبر نہیں ہیں۔اس میں یہ خبر بھی درج تھی کہ خواجہ ناظم الدین نے وعدہ کیا ہے کہ وہ یوم پاکستان یعنی ۱۴/اگست کی تقریر میں ان مطالبات کو تسلیم کر لیں گے جو مرزائیوں کے خلاف کئے گئے ہیں اور لوگ اس تاریخی اعلان کا نہایت بیتابی سے انتظار کر رہے ہیں۔

۱۸/اگست ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں وزیر اعظم کی تقریر (یوم پاکستان)) پر تبصرہ کیا گیا ہے اور

اس امر پر مایوسی کا اظہار کیا گیا کہ وزیراعظم مسئلہ مرزائیت کا ذکر حذف کر گئے حالانکہ یہ مسئلہ پاکستان کے لئے حقیقی داخلی خطرہ بن چکا ہے۔حکومت پاکستان کے اس سرکاری اعلان کی تعریف کی گئی کہ کوئی مرکزی یا صوبائی وزیر اپنے ماتحتوں میں فرقہ وار عقائد کی تبلیغ کرنے کا مجاز نہیں۔ان جلسوں جلسوسوں اور ہنگاموں کی مذمت کی گئی جو مرزائیت کے خلاف جاری ہیں۔تجویز کی گئی کہ یہ مسئلہ آئینی طریقے سے مجلس دستور ساز پاکستان میں اور ایک قرارداد کی شکل میں آل پاکستان مسلم لیگ کی کونسل کے آئندہ اجلاس ڈھاکہ میں پیش کرنا چاہئے۔

۳۱/جنوری ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں ایک شخص عتیق الرحمٰن چشتی کی کتاب ''قادیانی فتنہ'' پر ریویو شائع کیا گیا،اس ریویو میں بیان کیا گیا کہ مرزائیت کو انگریزوں نے دانستہ پیدا کیا تھا اور اب یہ اسلام کو تباہ کر رہی ہے اور اس کتاب میں ایک مرتد فرقے کی غلط عقائد کی قلعی کھولی گئی ہے اور اس فرقے کے جھوٹے نبی کے چال چلن کی نفرت انگیز تصور کھینچی گئی ہے۔اسی طرح ۵/فروری کی اشاعت میں پروفیسر الیاس برنی کی کتاب ''قادیانی مذہب'' پر ایک کالم کا ریویو درج کیا گیا۔یہ کتاب درحقیقت قادیانی عقائد پر ایک بلاواسطہ تبصرہ ہے۔

مغربی پاکستان

اس اخبار نے اپنی اشاعت مؤرخہ ۳/اگست ۱۹۵۲ء میں حکومت پاکستان کی خارجہ حکمت عملی پر تنقید کی اور بتایا کہ چوہدری ظفر اللہ خان کی ذاتی حکمت عملی ہے اور چوہدری ظفر اللہ خاں تنازعہ کشمیر کے سلجھانے میں ناکام رہے ہیں۔''سنگ وخشت'' کے عنوان سے اس اخبار نے چوہدری ظفر اللہ خاں کو ازراہِ طعن یہ مشورہ دیا کہ آئندہ جب وہ لاہور آئیں تو پولیس کی حفاظت طلب کرنے کے بجائے حضرت صاحب (امام جماعت احمدیہ) سے کہیں کہ وہ ان کی سلامتی کی دعا مانگیں۔پھر ۱۰/اگست کی اشاعت میں چوہدری ظفر اللہ خاں کے استعفے کی خبر پر طنزیہ اشارے کئے گئے کہ انہوں نے غالباً پیغمبرزادے (امام جماعت احمدیہ) کے مشورے کے بعد استعفا دیا ہو کیونکہ انہوں نے اپنی

وزارت کے دوران میں جو کچھ کیا ہے ہمیشہ اپنے امام جماعت کے مشورے کے بعد کیا ہے۔اسی اشاعت میں آل مسلم پارٹیز کنونشن کا ایک بیان شائع کیا گیا جس میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ کنونشن کی مساعی بارآور ہورہی ہے اور اپیل کی گئی تھی کہ تبلیغ کانفرنسوں کے انعقاد ووفود کی ترسیل اور سرمائے کی فراہمی کے ذریعے وسیع پروپیگنڈا کر کے اس کی تائید وحمایت کی جائے۔اس اشاعت میں زیر اہتمام مجلس عمل ایک جلسہ کا اعلان بھی کیا گیا۔جس میں مقررین کے نام درج کئے گئے اور لوگوں سے اپیل کی گئی کہ وہ جوق در جوق اس جلسے میں شامل ہوں۔

اشاعت مؤرخہ ۱۵ راگست ۱۹۵۲ء میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی یہ رائے درج کی گئی کہ مرزا غلام احمد نبوت کا دعویٰ کرنے کی وجہ سے مرتد ہے۔

۱۸ راگست کی اشاعت میں حکومت پاکستان کے سرکاری اعلان مؤرخہ ۱۴ اگست پر تبصرہ کیا گیا اور کہا گیا کہ حکومت نے احمدیوں کے متعلق مسلمانوں کے مطالبات کو غلط سمجھا ہے۔ مسلمانوں کو اس بات کا اندیشہ نہیں ہے کہ چوہدری ظفر اللہ خان اپنے ماتحتوں کو قادیانی مذہب میں شامل کرنے کی کوشش کرینگے۔ بلکہ ان کی برطرفی کے مطالبہ کی یہ وجوہ ہیں۔اول:۔کہ وہ مرزائی ہیں۔دوم:۔کہ وہ کاملاً خلیفہ قادیان کے قبضے میں ہیں۔سوم:۔کہ وہ پاکستان کے وفادار نہیں ہوسکتے۔چہارم:۔کہ مسلمانوں کے ساتھ ان کے کوئی روابط نہیں ہیں۔

یکم ستمبر کی اشاعت میں مسٹر دولتانہ کی اس تقریر کی رپورٹ درج ہے جو انہوں نے ۳۰ راگست کو حضوری باغ میں کی تھی اور جس میں دوسرے امور کے علاوہ انہوں نے عقیدہ ختم نبوت کے متعلق یہ اعلان کیا تھا کہ ان کا اس عقیدے پر ایمان ہے بلکہ ان کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ جو شخص پیغمبر اسلام صلعم کو آخری نبی نہیں مانتا وہ مسلمان نہیں ہے۔

۲۷ رستمبر کی اشاعت میں ایک نظم شائع کی گئی جس میں شاعر نے مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ختم نبوت کے پاکیزہ مقاصد کے لئے جدوجہد کرنے کی غرض سے کفر اور دشمن کے خلاف متحدہ محاذ قائم کریں۔

۲۹ رستمبر کی اشاعت میں مجلس عمل کے بعض ارکان اور چیف منسٹر کی ایک ملاقات کا حال

درج کیا گیا جس کے دوران میں وفد مجلس نے مولانا ابوالحسنات کی سرکردگی میں ایک تحریری عرضداشت پیش کی تھی جس میں یہ شکایات مندرج تھیں کہ ربوہ کی زمین مرزائیوں کے ہاتھ فروخت کی گئی ہے۔ مرزائیوں کے حق میں اندھا دھند الاٹمنٹیں کی گئی ہیں، مرزائیوں کی تبلیغی سرگرمیاں قابل اعتراض ہیں، ان کا لٹریچر اشتعال انگیز ہے اور وہ اسلام کی وہ خاص اصطلاحات اپنے لئے استعمال کررہے ہیں جواب تک صرف اسلام کی بعض مخصوص مقدس ہستیوں کے لئے مخصوص رہی ہیں۔

مسٹر دولتانہ نے دعویٰ کیا ہے کہ جولائی کے قریباً تیسرے ہفتے سے ''آفاق'' ''احسان'' اور ''مغربی پاکستان'' نے جن سے ہر ایک کو حکومت سے بڑی بڑی رقمیں وصول ہوئی تھیں، احمدیوں کے خلاف شورش کی کوئی خبر نہیں چھاپی، لیکن جو کچھ ہم نے اب تک لکھا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تینوں اخبار اس عرصے میں برابر اس موضوع پر لکھتے رہے۔ جب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وزیر اطلاعات ونشریات جولائی ۱۹۵۲ء کے نصف آخر میں لاہور آئے تو ان سے شکایت کی گئی کہ حکومت پنجاب خود احمدیوں کے خلاف شورش کی حوصلہ افزائی کررہی ہے اور مسٹر حمید نظامی ایڈیٹر ''نوائے وقت'' نے کھلم کھلا میر نور احمد ڈائریکٹر تعلقات عامہ پر اس سازش میں شریک ہونے کا الزام عائد کیا۔ مسٹر نظامی کا بیان ہے کہ جب ڈاکٹر قریشی جولائی یا اگست میں لاہور آئے تو انہوں نے بعض مقامی اخباروں کے ایڈیٹروں کو ایک پرائیویٹ چائے پر دعوت دی جس میں بعض افسر جن میں میر نور احمد بھی شامل تھے اور لاہور کے کے تمام اہم روزناموں کے ایڈیٹر بھی شریک ہوئے۔ اس پارٹی میں احمدیوں کے خلاف شورش پر گفتگو ہوئی اور ڈاکٹر قریشی نے کہا کہ چوہدری ظفر اللہ خان کے خلاف جو مہم اخبارات میں جاری ہے وہ ملک کے مفاد کے لئے مضرت رساں ہے اور اس سے سنگین نتائج کا احتمال ہے۔ پارٹی میں جو مہمان شریک تھے انہوں نے اس معاملے کے متعلق اپنی آرا کا اظہار کیا۔ مسٹر حمید نظامی خاموش رہے۔ ڈاکٹر قریشی نے ان سے پوچھا کہ آپ اپنی رائے کیوں ظاہر نہیں کرتے۔ مسٹر نظامی نے جواب دیا کہ میری کوئی رائے ظاہر کرنا بالکل بے کار ہے، کیونکہ یہ مہم ان اخباروں نے جاری کررکھی ہے جن کو حکومت سے مالی امداد مل رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اپنا مطلب واضح طور پر بیان کیجئے۔ اس پر مسٹر نظامی نے کہا کہ یہ پوری شورش حکومت کے ایما سے

ہورہی ہے اور اگر حکومت چاہے تو یہ شورش ایک لمحے کے اندر بند ہوسکتی ہے کیونکہ جو اخبارات اس مہم میں مصروف ہیں وہ حکومت کی ہدایت کی خلاف ورزی کی جرأت نہیں کر سکتے، ڈاکٹر قریشی نے کہا میں نے اس قسم کی افواہیں پہلے بھی سنی ہیں لیکن مجھے اس سلسلے میں حقائق میسر نہیں ہو سکے۔ مسٹر حمید نظامی نے اس پر میر نور احمد کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس معاملے میں سب سے بڑے مجرم یہ ہیں کیونکہ یہی اس تحریک کے متعلق تمام مضامین لکھوا رہے ہیں۔ ڈاکٹر قریشی نے مسٹر حمید نظامی سے پوچھا کہ کیا آپ اپنے اس بیان کا کوئی ثبوت مہیا کر سکتے ہیں۔ مسٹر نظامی نے کہا۔ کہ اگر میر نور احمد میرے الزام کی صحت سے انکار کر دیں تو میں ثبوت مہیا کر دونگا۔ میر نور احمد نے یہ سب کچھ سنا اور خاموش رہے۔ ڈاکٹر قریشی نے حمید نظامی سے پوچھا کہ آیا آپ اس الزام کو وزیر اعظم پاکستان کے سامنے دہرانے پر آمادہ ہیں۔ مسٹر نظامی نے کہا کہ میں بالکل آمادہ ہوں اس کے ایک ماہ بعد مسٹر نظامی کراچی گئے اور وزیر اعظم سے ملے۔ وزیر اعظم نے ان سے پوچھا۔ آیا آپ ان مضامین کی فہرست مہیا کرنے کو تیار ہیں جو میر نور احمد نے لکھوائے تھے۔ مسٹر نظامی نے کہا کہ میں آئندہ کراچی آؤنگا، تو فہرست پیش کر دونگا۔ جب مسٹر نظامی ایک ماہ بعد دوبارہ کراچی گئے تو اپنے ساتھ ان مضامین کی ایک فائل لیتے گئے جو ان کے نزدیک میر نور احمد نے لکھوائے تھے۔ مسٹر نظامی نے یہ فائل مسٹر مشتاق احمد گورمانی کے حوالے کر دی تاکہ وہ وزیر اعظم کی خدمت میں پیش کر دیں۔ جب اس کے بعد ایک موقع پر ہوم سیکرٹری نے مسٹر نظامی کو طلب کیا تو انہوں نے ہوم سیکرٹری کے سامنے بھی اس الزام کا اعادہ کیا۔ ایک یا دو دن بعد انہوں نے مسٹر قربان علی خان کے سامنے بھی یہی الزام دہرایا اور یہ بھی کہا کہ اگر حالات بدستور جاری رہے تو صوبہ بالکل تباہ ہو جائے گا، جب ہوم سیکرٹری نے ۲۸ رفروری کو اخباروں کے ایڈیٹروں کا ایک اجلاس طلب کیا تو مسٹر نظامی نے دوبارہ یہی شکایت ہوم سیکرٹری سے بیان کر دی۔ مسٹر نظامی نے گورنر صاحب کے سامنے بھی اپنے الزام کا اعادہ کیا۔

مسٹر حمید نظامی نے اس موضوع پر ستمبر ۱۹۵۲ء میں مسٹر دولتانہ سے بھی بات چیت کی۔ مسٹر دولتانہ نے کہا کہ میر نور احمد حکومت کو تباہ کر رہا ہے اور میں چند ہی روز میں اس کو برطرف کرنے والا ہوں۔ لیکن مسٹر نظامی نے جواب دیا کہ یہ بالکل جھوٹ ہے اور میں مسٹر دولتانہ کے بیان پر یقین نہیں

کرتا۔ کیونکہ میر نور احمد جو کچھ کر رہے ہیں خود مسٹر دولتانہ ہی کے ایما پر کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر قریشی کی شہادت سے مسٹر نظامی کی شہادت کی پوری تائید ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ میں جولائی ۱۹۵۲ء کے نصف آخر میں لاہور آیا۔ کیونکہ مجھے یہاں الیکشن پٹیشن کی سماعت کی غرض سے دستور ساز اسمبلی کی کریڈنشل کمیٹی کے ایک اجلاس میں شامل ہونا تھا۔ وزیر اطلاعات و نشریات کی حیثیت سے میرا معمول ہے کہ غیر رسمی طور پر اخباروں کے ایڈیٹروں سے ضرور ملاقات کیا کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ ایک ملاقاتی نے مجھ سے بیان کیا کہ ڈائریکٹر تعلقات عامہ اخباروں کو ایسے مضامین مہیا کرتے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ احمدیوں کے خلاف شورش کی آگ کو ہوا دی جائے۔ ملاقاتی نے یہ بھی کہا کہ میں کسی اخبار کے دفتر سے ایک مضمون لا کر آپ کو دوں گا جو مسٹر چشتی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہوگا جو محکمہ تعلقات عامہ کے ایک ملازم ہیں اس سے ثابت ہو جائے گا کہ حکومت خود اخباروں کو مضامین مہیا کرتی رہی ہے۔ مجھے اخلاقی طور پر تو اس اطلاع کی صداقت پر پورا یقین تھا لیکن میں نے سوچا کہ میرے لئے یہ زیبا نہ ہوگا کہ اپنے اطلاع دہندہ کو اس مقصد کے لئے استعمال کروں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ میرے لئے کسی اخبار کے دفتر سے کاغذات چوری کر کے لائے۔ اس سے کچھ عرصہ بعد میر نور احمد مجھ سے ملنے آئے۔ میں نے میر نور احمد سے کہا کہ محکمہ اسلامیات جو ان کے ماتحت کام کر رہا ہے اخباروں کو احمدیوں کے خلاف مضامین مہیا کرتا رہا ہے اور اس کے بعد میں نے یہ حقیقت بھی ان کے سامنے پیش کر دی کہ "آفاق" جو عملاً ڈائریکٹر تعلقات عامہ کے ماتحت ہے اپنے کالموں میں برابر اس مطالبہ پر زور دے رہا ہے کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دیا جائے۔ میر نور نے سوال کو ٹالنے کی کوشش کی لیکن میں نے اصرار کیا۔ اور بالآخر میر نور احمد نے اعتراف کیا کہ میں نے اس شورش کو خاص راستوں پر لگانے کی کوشش ضرور کی ہے۔ اس پر میں نے میر نور احمد سے کہا کہ یہ راستے پر لگانا نہیں بلکہ بھڑکانا ہے چونکہ یہ ایک سنگین معاملہ تھا اس لئے میں نے سوچا کہ اس کا ذکر مسٹر دولتانہ سے کرنا چاہئے۔ مسٹر دولتانہ نے ۱۹؍ جولائی کو مجھے چائے پر بلایا۔ میں نے مسٹر دولتانہ سے اس شکایت کا ذکر کیا اور کہا کہ اگر صوبائی حکومت نے ایک خاص طرز عمل اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا جو نشر و اشاعت کی سابقہ پالیسی

سے مختلف تھا تو آپ کے لئے مناسب تھا کہ جب ہم چندروز پہلے نتھیا گلی میں تھے آپ اس معاملے کے متعلق مجھ سے گفتگو کر لیتے۔ مسٹر دولتانہ نے کہا کہ میر نور احمد نے تحریک کو راستے پر لگانے کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ میرے علم کے بغیر کیا ہے۔ مجھے یہ بات بہت ہی عجیب معلوم ہوئی کہ مسٹر دولتانہ اس امر سے بے خبر تھے کہ ڈائریکٹر تعلقات عامہ شورش کو بھڑکا رہے ہیں۔ کیونکہ اس اہم مسئلے کے متعلق اخباروں کے تراشے ان کے سامنے پیش کئے جاتے ہوں گے اورانہوں نے دیکھا ہوگا کہ جواخبارات براہِ راست حکومت کے زیر اقتدار ہیں وہ بھی اس نزاع میں مصروف ہیں۔ اورانہوں نے بھی ایک خاص راہ عمل اختیار کر رکھی ہے۔ اس لئے جب مسٹر دولتانہ نے مجھ سے کہا کہ ڈائریکٹر تعلقات عامہ نے یہ رویہ ان کے علم کے بغیر اختیار کیا ہے تو مجھے بے انتہا تعجب ہوا۔

ڈاکٹر قریشی نے مسٹر نظامی کے اس بیان کی بھی تصدیق کی ہے۔ جوانہوں نے ٹی پارٹی کے واقعہ کے متعلق دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ حمید نظامی نے اس پارٹی میں میر نور احمد پر یہ الزام عائد کیا تھا کہ اخبارات میں مہم کے جاری کرنے کی ذمہ داری ان پر ہے اور میر نور احمد نے اس الزام کی تردید میں خاموشی اختیار کی تھی۔

جب ڈاکٹر قریشی کراچی واپس گئے تو انہوں نے اس واقعہ کا ذکر وزیراعظم سے کیا اور یہ رائے ظاہر کی کہ پنجاب کی شورش کو ڈائریکٹر تعلقات عامہ بھڑکا رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس گفتگو کا ذکر بھی کیا جو مسٹر دولتانہ سے ہوئی تھی۔ اوراس پر تعجب کا اظہار کیا کہ صوبائی حکومت کا ایک محکمہ ایک ایسے اہم مسئلے میں ایک خاص پالیسی اختیار کرے اور مرکزی حکومت کے حکام کی کوئی ضرورت محسوس نہ کرے۔ ڈاکٹر قریشی نے اس واقعہ کا ذکر ارکان کابینہ سے بھی کیا۔

اس شہادت کی تصدیق خواجہ ناظم الدین کی شہادت سے بھی ہوتی ہے۔ خواجہ صاحب کا بیان ہے کہ مسٹر دولتانہ نے ان سے پہلے پہل ۴/اگست کو قادیانی مسئلہ کے متعلق گفتگو کی۔ اس بحث کے دوران میں (خواجہ صاحب) نے مسٹر دولتانہ کو بتایا کہ وزیر اطلاعات سے مجھے جو رپورٹ ملی ہے اس کے مطابق میر نور احمد قادیانیوں کے خلاف تحریک کی حمایت میں مختلف اخباروں کو مواد مہیا کرتے رہے ہیں۔ خواجہ ناظم الدین نے مسٹر دولتانہ کو یہ بھی بتایا کہ اپوزیشن کے تمام اخبارات یعنی ”پاکستان

ٹائمز، امروز، نوائے وقت اور سول اینڈ ملٹری گزٹ'' اس مسئلہ کے متعلق خاموش ہیں لیکن جن اخباروں پر حکومت کا اور خود مسٹر دولتانہ کا اقتدار ہے وہ اس شورش کو بھڑکانے میں مصروف ہیں اور ان میں بدترین مجرم ''زمیندار'' ہے جس کو اگر دولتانہ صاحب چاہتے تو اپنے قابو میں لا سکتے تھے۔ مسٹر دولتانہ نے کہا کہ اردو اخباروں کی ہستی کا دارومدار ان کی اشاعت پر ہے اور چونکہ یہ موضوع مقبول عام ہے اور اس سے ان کی اشاعت میں اضافہ ہوتا ہے اس لئے ان کو اس سے روکنا بے حد مشکل ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ان کے محکمہ نشرواشاعت کا مقصد یہ ہے کہ اخبارات میں جو مہم جاری ہے اس رفتار اور اس کے زہریلے پن کو اپنے مشورے سے ضبط اور قاعدے کے ماتحت لائے۔ خواجہ ناظم الدین نے مسٹر دولتانہ کو اچھی طرح سمجھایا کہ صورت حال کے مداوا کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اخباروں کو شورش کے بھڑکانے سے باز رکھا جائے اور مسٹر دولتانہ یہ کام آسانی سے کر سکتے ہیں؟ کیونکہ یہ اخبارات ان کی امدادواعانت پر انحصار رکھتے ہیں۔

مسٹر مشتاق احمد گورمانی کا بیان ہے کہ ایک موقع پر ڈاکٹر قریشی نے ارکان کابینہ سے ذکر کیا کہ انہیں شکایات موصول ہوئی ہیں جن کا مفاد یہ ہے کہ پنجاب کے اخباروں میں جو مختلف مضامین شائع ہو رہے ہیں وہ ایسے ذرائع سے مہیا کئے گئے ہیں جو حکومت کے زیر اقتدار یا ممنونِ اعانت ہیں۔ گواہ نے اخباروں کا ایک فائل بھی پیش کیا جس میں احمدیوں کے خلاف شورش کی حمایت میں متعدد مضامین شامل تھے۔ گواہ کا بیان ہے کہ یہ فائل انہیں کراچی میں مسٹر حمید نظامی نے دیا تھا۔

مسٹر دولتانہ اس سے انکار کرتے ہیں کہ انہوں نے کبھی خواجہ ناظم الدین کے سامنے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ حکومت پنجاب کا محکمہ نشرواشاعت اخبارات کی تحریروں کے لہجے کو ضبط کے ماتحت لانے کی غرض سے انہیں مضامین مہیا کرتا رہا ہے۔ مسٹر نور احمد اس امر سے خاص طور پر انکار نہیں کرتے کہ انہوں نے ڈاکٹر قریشی سے گفتگو کرتے ہوئے راستے پر لگانے کی اصطلاح استعمال کی تھی لیکن وہ اس سے انکار کرتے ہیں کہ احمدیوں کے خلاف تحریک کے موضوع پر انہوں نے اخباروں کو کوئی مضمون بھیجا یا اپنے محکمے کے کسی آدمی کو ایسے مضامین لکھنے کی ہدایت کی۔ ان وجوہ کی بناء پر جن کو ہم اپنے آخری نتائج کے سلسلے میں کاملاً قلمبند کرینگے ہمیں اس امر میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ میر نور احمد

نے تحریک کو ''راستے پر لگانے'' کی یقیناً کوشش کی اور مسر دولتانہ نے ان کی اس پالیسی سے بے خبر نہیں ہو سکتے تھے۔

اب شورش کی رفتار سرعت سے تیز ہو گئی اور اس نے تشویش انگیز وسعت اختیار کر لی۔ اب حکومت حملے کا نشانہ بن گئی اور اس کی رشوت ستانی نا قابلیت اور عوام کے حالات سے بے پروائی کے متعلق بالواسطہ اور مبہم اشارات کئے جانے لگے۔ حکومت پنجاب کے ہوم سیکرٹری نے ڈی او نمبر 14682-BDSB مؤرخہ ۱۲ر اکتوبر ۱۹۵۲ء کے ذریعے موجود صورت حالات کی مندرجہ ذیل کیفیت ڈپٹی سیکرٹری وزارت داخلہ کو ارسال کی:۔

''سابقہ یادداشت تیار کردہ ملک حبیب اللہ مؤرخہ ۳۰ر جولائی ۱۹۵۲ء کے تسلسل میں پنجاب کی احراری احمدی شورش کے متعلق یکم اگست ۱۹۵۲ء سے اب تک حالات کے متعلق یادداشت ارسال ہے۔

ا۔ ۲۰ر جولائی کو ملتان میں جو گولی چلائی گئی اس سے احراری شورش پسندوں اور ان کے حامیوں کو مزید موقع مل گیا کہ مسئلہ ختم نبوت پر احمدیوں کے خلاف شورش کو شدید تر کر دیں۔ چنانچہ صوبے بھر میں ان کے جلسوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا جب دوسری جماعتوں مثلاً جماعت اسلامی، اسلام لیگ اور فرقہ شیعہ نے دیکھا کہ احرار ختم نبوت کے مسئلے پر رائے عامہ کو اپنے حق میں کر کے ان جماعتوں پر بازی لے جا رہے ہیں تو گزشتہ اگست کے آغاز میں وہ بھی احمدیوں کی مذمت و مخالفت میں ان کے ساتھ دل و جان شامل ہو گئے۔ جماعت اسلامی نے اپنے آٹھ مطالبات پر ایک نویں مطالبہ کو اضافہ کر دیا کہ مرزائیوں کو علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے اور چوہدری ظفر اللہ خان کو ان کے عہدے سے برطرف کیا جائے۔ اسلام لیگ کے کارکنوں نے بھی اپنی تقریروں میں اس پر زور دینا شروع کیا کہ مرزائی علیحدہ اقلیت قرار دیئے جائیں اور چوہدری ظفر اللہ خان کو برطرف کیا جائے۔ شیعہ لیڈر بھی اپنے جلسوں میں یہی کہنے لگے کہ وہ مرزائیوں کو علیحدہ اقلیت قرار دینے اور چوہدری ظفر اللہ خان کو برطرف کرنے کے مطالبے میں احراریوں کے ہم زبان ہیں۔

۲۔شہروں اور قصبوں کی تمام مساجد کے خطیبوں نے اپنا معمول بنالیا کہ جمعہ کے خطبات میں احمدیوں کے خلاف ان مطالبات کا اعادہ کریں کہ مرزائیوں کو علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے۔ چوہدری ظفر اللہ خان کو ان کے عہدے سے برطرف کیا جائے، ربوہ تمام مسلمانوں کے لئے کھلا شہر قرار دیا جائے اور اس کی اراضی مہاجرین میں تقسیم کردی جائے کوئی ایسی اہم مسجد باقی نہ تھی جس میں نماز جمعہ کے موقع پر یہ مطالبات دہرائے نہ جاتے ہوں۔

۳۔مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری، شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین مظفر علی شمسی اور مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش ۱۶؍اگست کو کراچی میں عزت مآب وزیراعظم کی خدمت میں بصورت وفد حاضر ہوئے اور احمدیوں کے متعلق اپنے مطالبات سے ان کو مطلع کیا۔ واپسی پر انہوں نے ۱۹؍اگست کو ملتان میں اور ۲۳؍اگست کو لاہور میں عام جلسے منعقد کئے۔ جن میں یہ انکشاف کیا کہ وزیراعظم نے ان سے کہا تھا کہ احمدیوں کے خلاف شورش صرف پنجاب تک محدود ہے اور دوسرے صوبے اس سے بالکل پاک ہیں۔ چنانچہ آل مسلم پارٹیز کی مجلس عمل نے فیصلہ کیا کہ مزید سرمایہ فراہم کیا جائے اور احمدیوں کے خلاف پروپیگنڈا صوبہ سرحد سندھ اور مشرقی بنگال میں بھی پھیلا دیا جائے تاکہ مرکزی حکومت کو ان مطالبات کی منظوری پر مجبور کیا جاسکے۔ اس فیصلے کے مطابق ماہ اگست میں سید عطا اللہ شاہ بخاری اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے صوبہ سرحد کا دورہ کیا اور احمدیوں کے خلاف مسلسل تقریریں کیں شورش کی اس گرما گرمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ احمدی بدحواس ہونے لگے اور انہیں اپنا موقف بہت دشوار معلوم ہونے لگا۔ احراری کارکنوں اور ملاؤں نے اپنی تقریروں اور وعظوں میں احمدیوں کے مجلسی اور تجارتی مقاطعہ پر بھی زور دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مرحلے پر احراریوں کی جاری کی ہوئی تحریک ملاؤں کے ہاتھوں میں منتقل ہوگئی اور انہوں نے مسئلہ ختم نبوت کو اپنی مسجدوں میں خطبات جمعہ کا نہایت محبوب موضوع بنالیا۔

۴۔جب گزشتہ اگست کے نصفِ اول کے خلاف احرار کی شورش درجہ کمال کو پہنچی ہوئی تھی تو ایک خفیہ اطلاع موصول ہوئی کہ احراری شورش کے دباؤ اور جان و مال کے خطرات کی وجہ

سے بعض احمدی اپنے فرقے سے قطع تعلق کر رہے ہیں۔ اور اس صوبے کے اضلاع سے جو اطلاعات موصول ہوئیں وہ مظہر تھیں کہ جولائی اور اگست کے دوران میں ۱۱۵ ر احمدیوں نے اپنے فرقے کو ترک کر کے سنی مذہب اختیار کر لیا ہے اور گیارہ احمدی اپنے گھروں کو چھوڑ کر ربوہ یا دوسرے مقامات کو منتقل ہو گئے ہیں احمدیوں کو زبردستی غیر احمدی بنانے کے واقعات اگست کے آخر تک کم ہو گئے۔

۵۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس گوجرنوالہ کی مرسلہ رپورٹ سے معلوم ہوا کہ دو احمدی مرد مدرس اور چار احمدی استانیاں یہ چھ افراد وزیر آباد کے میونسپل بورڈ ہائی سکول اور مڈل سکول میں ملازمت کر رہے تھے۔ ۲۷ر جولائی کو انہیں وزیر آباد میونسپلٹی نے نوٹس دے دیا کہ ان کی ملازمت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے یہ احراری شورش کا نتیجہ تھا لیکن ڈپٹی کمشنر گوجرانوالہ نے ۴ر مورچ ۱۹۵۳ء کو وزیر آباد میونسپل کمیٹی کی اس قرارداد کو معطل کر دیا۔

۶۔ احمدیوں کے خلاف احراری شورش کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام اہم شہروں اور قصبوں میں متعدد نئی انجمنیں ''مجلس تحفظ نبوت'' مجلس خدام رسول اور آل مسلم پارٹیز کنونشن کے نام سے قائم ہو گئیں تا کہ مسئلہ ختم نبوت پر احمدیوں کے خلاف شورش کو تیز تر کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان تمام انجمنوں کا یہ مقصد بھی تھا کہ تحریک کے سرمایہ کے لئے چندہ فراہم کیا جائے۔ ''زمیندار'' کے مولانا اختر علی خاں نے اپنے وطن کرم آباد میں عیدالاضحی کے موقع پر حاضرین سے ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے کی اپیل کی۔ تا کہ تحریک ختم نبوت کو کامیاب بنایا جائے۔ آل مسلم پارٹیز کی مجلس عمل (لاہور) تحریک ختم نبوت کو چلانے کے لئے گزشتہ جولائی میں قائم کی گئی تھی۔ اس کے نام پر گزشتہ ستمبر میں ۴۲۴، ۱۱ روپے ۲ آنے کی رقم انڈسٹریل کوآپریٹو بنک لاہور میں موجود تھی۔

۷۔ احراریوں اور ان کے حامیوں نے اپنی شورش کی مالی تقویت کے لئے گزشتہ عیدالضحیٰ کے موقع پر پورے صوبے میں قربانی کے جانوروں کی بے شمار کھالیں جمع کیں جن کی مالیت ۴۰۲، ۴۶ روپے تھی اس کے علاوہ دوسرے ذرائع سے انہوں نے گزشتہ چھ ماہ کے دوران

میں کوئی ۱۰۷،۱۵۱ روپے جمع کئے۔

۸۔احراریوں اور ان کے حامیوں کو بڑی امیدیں تھیں کہ ان کی شورش بارآور ہوگی اور عزت مآب وزیراعظم پاکستان ۱۴ راگست کی تقریر میں اعلان کردیں گے کہ احمدیوں کے خلاف ان کے مطالبات تسلیم کرلئے گئے ہیں۔لیکن جب عزت مآب وزیراعظم نے اپنے نشریہ مؤرخہ ۱۴ راگست میں یہ اعلان کیا کہ مملکت پاکستان کی سالمیت اوراس کے استحکام کا تقاضا ہے کہ طبقہ آرائی اور فرقہ بندی سے کامل اجتناب کیا جائے تو احراری اوران کے حامی بے حد دل شکستہ ہوئے۔احراریوں اوران کے حامیوں کو مزید مایوسی اس وقت ہوئی جب عزت مآب وزیراعلیٰ پنجاب نے لاہور میں ۳۰ راگست کو اور پھر راولپنڈی میں ۱۱ رستمبر کو تقریریں کرتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا۔کہ احمدیوں کو علیحدہ اقلیت قرار دینے کے لئے کوئی دلیل جواز نہیں اور طبقہ آرائی اور فرقہ بندی سے انتشار پیدا ہوتا ہے، لہٰذا ایسے رجحانات کو دبا دینا چاہیئے۔

۹۔مسٹر جسٹس کیانی نے ملتان فائرنگ پر جورائے ظاہر کی اس سے احراری اوران کے حامی اور بھی زیادہ دل شکستہ ہوئے اور عوام الناس اور حکام پراس کا نہایت صحت مند اثر ہوا۔

۱۰۔موجودہ صورت یہ ہے کہ احمدیوں کے خلاف احرار نے جس شورش کی قیادت کی تھی اس میں پہلے کا سازور باقی نہیں رہا۔نہ عوام میں اس تحریک کی دلکشی باقی ہے اور مُلا لوگ جو اس تحریک کے بڑے علم بردار تھے مایوسی وناکامی محسوس کررہے ہیں تاہم احرار آج کل صوبے بھر میں مسلسل کانفرنسیں منعقد کررہے ہیں تا کہ اپنی تحریک کو زندہ رکھیں اور حتیٰ الامکان زیادہ سے زیادہ روپیہ جمع کرلیں تا کہ انہیں ادھر ادھر گھومنے اور مزے اڑانے کی سہولت حاصل رہے۔اطلاعات کے مطابق بعض احراری مقررین نے اپنی تقریروں میں کہا ہے کہ مرزائی مرتد ہیں اوراحکام اسلام کے مطابق واجب القتل ہیں۔

۱۱۔منٹگمری کے ایک رسوائے عام احراری کارکن مفتی ضیاء الحسن نے جو حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا چچیرا بھائی ہے۔۳۰ مارچ ۱۹۵۲ء کو اے ڈی ایم منٹگمری کی عدالت میں مرزا

محمود احمد امام جماعت احمدیہ، روشن دین تنویر ایڈیٹر روزنامہ ''الفضل'' مؤرخہ ۱۵ر جولائی ۱۹۵۲ء میں ایک مضمون ''خونی مُلّا کے آخری دن'' کے عنوان سے شائع کیا ہے جو دفعہ ۳۰۲، ۱۵۵۔۵، ۵تعزیراتِ پاکستان کے ماتحت آتا ہے۔ یہ مقدمہ عدالت میں زیر سماعت ہے۔ اب تک چھ گواہان استغاثہ پیش ہو چکے ہیں اور اس کی آخری پیشی ۸ر اکتوبر ۱۹۵۲ء کو ہوئی تھی۔

۱۲۔ احراریوں اور ان کے حامیوں نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ مرزا غلام احمد کذاب اور جھوٹا نبی تھا، گزشتہ دو مہینے کے دوران میں کثیر التعداد کتابچے اور پوسٹر شائع کئے ہیں۔ اسی طرح احمدیوں نے بھی یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ رسول پاک صلعم کے خاتم النبین ہونے پر ایمان رکھتے ہیں اور احراری پاکستان کے دشمن ہیں بے شمار پوسٹر اور کتابچے شائع کئے۔ ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ر ستمبر کو جناح عوامی مسلم لیگ کے زیر اہتمام لاہور اور لائل پور میں دو عام جلسے منعقد ہوئے جس میں بعض مقررین نے فرقہ احمدیہ کے خلاف نکتہ چینی کی۔ چوہدری ظفر اللہ خان کی پالیسی بحیثیت وزیر خارجہ کو ناکام بتایا اور ان کو وزارت سے برطرف کرنے پر زور دیا لیکن صاف لفظوں میں مرزائیوں کو علیحدہ اقلیت قرار دینے کی حمایت نہیں کی۔

۱۴۔ ایک تازہ خفیہ اطلاع مظہر ہے کہ آل پارٹیز کی مجلس عمل لاہور کے سرگرم ارکان، مستقبل کی راہ عمل پر متفق نہیں ہیں جو گروہ حکومت کے خلاف براہِ راست اقدام کر کے اس کو مطالبات کی منظوری پر مجبور کرنے کا حامی ہے اس میں آل پاکستان مجلس احرار کے شیخ حسام الدین جماعت اسلامی کے نصر اللہ خاں عزیز اور امین احسن اصلاحی اہل حدیث کے مولانا داؤدی غزنوی اور جمعیۃ علمائے اسلام کے عبدالحلیم قاسمی شامل ہیں۔ دوسرا گروہ جو آئینی اور پرامن طریق سے تحریک کو جاری رکھنے کا حامی ہے اس میں آل پاکستان مجلس احرار کے ماسٹر تاج الدین انصاری، جمعیۃ العلمائے پاکستان کے مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری اور غلام محمد ترنم، حزب الاحناف کے مولانا محمد ارشد پناہوی شیعہ جماعت کے حافظ کفایت حسین اور مظفر علی شمسی اور ''زمیندار'' کے مالک مولانا اختر علی شریک ہیں۔ شیخ حسام الدین

نے ۲۸ اگست کو اس مسئلہ پر ماسٹر تاج الدین سے گفتگو کی اور ان کو اپنے گروہ کے ممبروں کے خیالات بتائے۔ انہوں نے ماسٹر تاج الدین کو بتایا کہ جماعت اسلامی جمعیۃ العلمائے اسلام اور انجمن اہل حدیث کے ممبر آل مسلم پارٹیز کی مجلس عمل کی موجودہ پالیسی کو پسند نہیں کرتے اور صاف طور پر کہہ دیا کہ اگر آل مسلم پارٹیز کی مجلس عمل کسی کمزور پالیسی پر کاربند ہونا چاہتی ہے تو ہمارا اس سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ ماسٹر تاج الدین نے جواب دیا کہ اگر احمدیوں کے خلاف پروپیگنڈا پاکستان کے دوسرے صوبوں تک وسیع کر دیا جائے تو مرکزی حکومت احمدیوں کے خلاف ہمارے مطالبات منظور کرلیگی۔ ماسٹر تاج الدین نے شیخ حسام الدین سے یہ بھی کہا کہ ہم کو جماعتِ اسلامی کی ہدایات سے دھوکے میں آ کر احمق نہیں بننا چاہتے کیونکہ اس جماعت کی تو پالیسی یہ ہے کہ حکومت وقت کے لئے مشکلات پیدا کی جائیں۔ شیخ حسام الدین کی رائے یہ تھی کہ حکومت کے فیصلے پر مجبور کرنے کے لئے جلوس نکالنے چاہئیں اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کرنا چاہئے۔ آخر وہ دونوں اس پر متفق ہوئے کہ نیا پروگرام مجلس عمل کے سامنے بغرض غور پیش کر دیا جائے۔ آل مسلم پارٹیز کی مجلس عمل کے ممبروں کی اکثریت کو ماسٹر تاج الدین پر اعتماد ہے۔ اس مقام پر یہ بھی بیان کر دینا چاہئے کہ شیخ حسام الدین ایک شعلہ مزاج آدمی ہے اور پاکستان مجلس احرار کے اس گروہ کا نمائندہ ہے جو مسلم لیگ سے انقطاع اور کھلم کھلا مخالفت کا حامی ہے جو عناصر راست اقدام کے حامی ہیں ان کی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھی جائے گی۔ کیونکہ ان کا سب سے بڑا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ برسر اقتدار سیاسی جماعت کو بدنام کریں اور اس کی قیمت پر اپنی ساکھ میں اضافہ کریں۔ کسی قسم کی آئینی سرگرمی کے خلاف خواہ وہ کتنی ہی لاحاصل اور بیہودہ ہو کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن کوئی حکومت اس امر کی اجازت نہیں دے سکتی کہ اختیارِ حکومت کو چیلنج دیا جائے اور راست اقدام کی دھمکیاں دی جائیں۔ موجودہ پالیسی کے مطابق ان احراری مقررین اور ملاؤں کے خلاف قانونی اقدام نہیں کیا جارہا ہے جو مساجد کے اندر گھناؤنی اور اشتعال انگیز تقریریں کرتے ہیں۔

۱۵۔ بحالات موجودہ عام خیال یہی ہے کہ احراری شورش کی تندی ختم ہو چکی ہے لیکن اس کے علمبردار جلسے منعقد کر کے اور اپنے پامال دلائل اور مطالبات دہرا دہرا کر اس کو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں مولانا اختر علی خاں مالک ''زمیندار'' ماسٹر تاج الدین اور شیخ حسام الدین آج کل اس سکیم سے کھیل رہے ہیں کہ تحریک ختم نبوت کے لئے سرمایہ فراہم کرنے کی غرض سے ایک کروڑ روپیہ جمع کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے وہ ایک ایک روپے کی مطبوعہ رسیدیں فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ دنیا کے سب کام روپے سے چلتے ہیں اور تحریک احرار بھی روپے ہی سے جاری رہ سکتی ہے۔ جب تک اس کے لیڈر لوگوں سے پیسہ جمع کرتے رہیں گے ان کی شورش ختم نہ ہوگی۔

۱۶۔ آل مسلم پارٹیز کی مجلس عمل کی ہدایت کے ماتحت ۳/اکتوبر ۱۹۵۲ء کو بروز جمعہ پورے پنجاب میں ''یوم احتجاج'' منایا گیا اور اہم مساجد کے خطیبوں نے اپنے خطبات جمعہ میں ان مطالبات کو دہرایا کہ مرزائیوں کو اقلیت قرار دیا جائے۔ چوہدری ظفر اللہ خاں اپنے موجودہ عہدے سے برطرف کئے جائیں اور انہیں کوئی دوسرا اہم عہدہ بھی نہ دیا جائے۔ ربوہ تمام مسلمانوں کے لئے کھلا قصبہ قرار دیا جائے۔ ربوہ کی اراضی مہاجرین میں تقسیم کی جائے۔ مرزائی بڑے عہدوں سے علیحدہ کر دیئے جائیں اور قابل اعتراض مرزائی لٹریچر ضبط کیا جائے۔ یہی مطالبات ان عام جلسوں میں دہرائے گئے جو ۳/اکتوبر کو لاہور میں زیر اہتمام آل مسلم پارٹیز کنونشن منعقد ہوئے۔

۱۷۔ احراری اخبار ''آزاد'' اور ''زمیندار'' (لاہور) احمدیوں اور ان کے فرقے کے خلاف برابر دشنام آمیز مضامین لکھ رہے ہیں۔

۲۲/اکتوبر ۱۹۵۲ء کو مسٹر انور علی ڈی آئی جی، سی آئی ڈی نے صورت حالات کا خلاصہ ذیل کے الفاظ میں پیش کیا۔

اس شورش کے نمایاں خط و خال حسب ذیل ہیں۔

(۱) مولانا اختر علی خاں اس شورش کی مادی اور موثر حمایت کر رہے ہیں انہی کے ایماء پر یہ

فیصلہ کیا ہے کہ ایک کروڑ روپے کے نوٹ (رسیدیں) چھاپے جائیں جن کو عوام کے ہاتھ فروخت کر کے احمدیوں کے خلاف شورش کے لئے ایک فنڈ قائم کیا جائے۔

(۲) تقریروں کے لہجے کی یہ عام کیفیت ہے کہ ان میں احمدیوں کے خلاف فحش دشنام آمیز اور ناشائستہ باتیں کہی جاتی ہیں۔

(۳) مجلسی مقاطعہ اور دوسرے طریقوں سے ایذا پہنچانے کی تائید بھی کی گئی ہے۔ کبیر والہ میں مقامی نائب تحصیلدار کے نوکروں کو روزانہ ضرورت کی چیزیں خریدنے سے روک دیا گیا۔ وزیر آباد کی میونسپلٹی نے احرار کے اکسانے پر دو احمدی استانیوں کو موقوف کر دیا۔ ڈپٹی کمشنر اس قرارداد کی منسوخی کے لئے تدبیر کر رہے ہیں۔

(۴) جماعت احمدیہ کے خلاف جو نفرت پھیلائی گئی اس کی وجہ سے متعدد احمدیوں نے مجبور ہو کر اپنے بال بچوں کو ربوہ بھیج دیا ہے اور ایک خاصی تعداد احمدیت کو ترک بھی کر چکی ہے یہ معلوم نہیں کہ ان کے یہ فیصلے کس حد تک رضا کارانہ اور کس حد تک مجبورانہ تھے۔

(۵) اضلاع کے جاہل اور ناخواندہ ملاؤں نے جرأت پا کر صوبے کے دور دست مقامات پر بھی احمدیوں پر حملے شروع کر دیئے ہیں یہ تحریک آئینی نہیں ہے اور اس کے پھیلانے کے لئے قابل اعتراض طریقے استعمال کئے جا رہے ہیں۔

(۶) چند احمدی عورتوں اور بچوں نے انڈین ڈپٹی ہائی کمشنر سے بھارت میں مستقل طور پر آباد ہونے کے پرمٹ حاصل کر لئے ہیں اور وہ پاکستان سے ہمیشہ کے لئے جا رہے ہیں۔ یہ عورتیں اور بچے ان احمدیوں کے پاس پہنچنا چاہتے ہیں جو بعد تقسیم کے بلووں کے باوجود قادیان میں رہ گئے تھے حکومت ہند نے ان کے لئے بلا تامل مستقل آبادی کے پرمٹ جاری کر دیئے۔

(۷) حکومت کے مخالف عناصر مثلاً جماعت اسلامی (جس نے اپنے آٹھ مطالبات پر نویں مطالبے کا اضافہ کر دیا ہے کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دیا جائے) اور اسلام لیگ (جس کا راولپنڈی میں خاص زور ہے) اور حکومت کے مخالف افراد مثلاً عبدالستار نیازی نے شورش

پسندوں کی تائید وحمایت اختیار کر لی ہے۔

(۸) تحریک کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ اکثر مقررین احمدیوں پر حملہ کرنے کے بعد حکومت کی مذمت کرتے ہیں؟ اور اس کو نا قابلیت، رشوت خواری اور خوراک کی کمی وغیرہ کے لئے مواد والزام قرار دیتے ہیں۔

(یہ بات بہت اہم اور قابل توجہ ہے)

(دستخط) قربان علی خان ۲۳/ اکتوبر

اس سے یہ خیال ظاہر ہوتا ہے کہ احمدیوں کے خلاف شورش کو محض رائے عامہ کو منظم کرنے کے لئے ایک آلہ کار کا طور پر استعمال کیا جارہا ہے تاکہ بالآخر حکومت کے خلاف نفرت وحقارت کی آگ مشتعل کی جاسکے۔

(۹) راولپنڈی میں پچھلے دنوں بہت شرارت برپا کی گئی۔ کیونکہ ایک خفیہ چٹھی جس میں ایک خاص کمانڈنگ آفیسر نے احمدیوں پر نکتہ چینی کی تھی۔ دفتر سے چرا کر کھلم کھلا شائع کر دی گئی۔ ایک کلرک نے (جو ڈی ڈی ایم آئی کے دفتر سے تعلق رکھتا ہے) اپنے بیان میں احمدی افسروں کے خلاف نہایت اوٹ پٹانگ الزامات لگائے۔

(یہ رجحانات پھیلیں گے اور اپنے ساتھ تباہی و بربادی لائیں گے۔ ہماری ساری مشینری ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگی (دستخط) قربان علی خاں

(۱۰) اگرچہ تازہ ترین اطلاعات یہ ہیں کہ احراری لیڈر اپنی تحریک سے کسی قدر تھک چکے ہیں۔ لیکن بیرونجات کے جن جلسوں میں وہ تقریریں کر رہے ہیں ان کی تعداد میں ابھی کوئی کمی نہیں آئی۔

میری رائے یہ ہے کہ احراری شورش میں نہایت خطرناک ممکنات پوشیدہ ہیں اس نے سادہ لوح اور بے علم عوام کی توجہ کو ان بنیادی مسئلوں کی طرف سے منحرف کر دیا ہے جو پاکستان کو درپیش ہیں یہ شورش قطعی طور پر تخریبی ہے۔ اس نے ایک ایسے وقت میں فرقہ وارا ختلافات کو نمایاں کیا ہے جب قوم کی تمام صفوں کو ایک دوسرے سے قریب تر آجانا چاہئے''۔

مسٹر قربان علی خاں انسپکٹر جنرل نے اس یادداشت پر بعض اہم تبصرے کئے۔ جو حاشیے پر درج ہیں اور اسکے بعد اس کو یہ لکھ کر گورنر صاحب کی خدمت میں بھیج دیا کہ اس شورش کو اسی طریق سے جاری رہنے دیا گیا تو حکومت کو ایک دن سخت ابتری کا سامنا کرنا پڑے گا آج اس ابتری پر قابو پانا آسان ہے۔ لیکن بعد میں یہ مسئلہ سخت دشوار ہو جائے گا۔ گورنر صاحب نے اس یادداشت کو ملاحظہ کیا۔ اس پر دستخط بھی کئے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔

مسٹر انور علی نے لاہور کے روزنامچہ مؤرخہ ۵ر دسمبر پر تبصرہ کرتے ہوئے دوبارہ صورت حال کا جائزہ لیا اور بتایا کہ جو صورت حال اس روزنامچے میں ظاہر کی گئی ہے وہی سارے ملک میں جاری و ساری ہے۔ انہوں نے لکھا:۔

''لاہور کی روزانہ ڈائری مؤرخہ ۱۵ دسمبر ۱۹۵۲ء غالباً اب تک حکومت کی نظر سے گزر چکی ہوگی۔ یہ نمونہ ہے ان واقعات کا جو اس وقت پورے ملک میں پیش آ رہے ہیں کچھ عرصے سے حکومت کے خلاف پروپیگنڈا تیز کر دیا گیا ہے اور غذائی صورتحال کو شدت سے استعمال کیا جا رہا ہے حکومت کو نہایت سختی سے بدگوئی دشنام طرازی اور رسوائی کا نشانہ بنایا جا رہا ہے عوام کے اطمینان و اعتماد کو تباہ کیا جا رہا ہے چنانچہ ہر طرف ابتری اور اضطراب کا دور دورہ ہے تمام حلقوں میں (کاروبار، ملازمت وغیرہ) کے حکومت کے خلاف شدید نکتہ چینی جاری ہے۔ ریلوے ٹرینوں میں پرائیوٹ مجمعوں میں معاشرتی تقریبوں میں صرف ایک ہی موضوع ہے جس سے لوگوں کو گہری دلچسپی ہے اور وہ موضوع حکومت کے خلاف باتیں کرنا ہے۔ لیگ کے ممبر یا سرکاری ملازم بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں اور خود کھلم کھلا اس قسم کی گفتگو میں شامل ہوتے ہیں۔ کراچی سے واپس آنے والے لوگ نہایت مہیب تصویر کھینچتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سیکرٹریٹ کے افسروں اور دوسرے حکام اعلیٰ کو مستقبل پر کوئی ایمان نہیں رہا۔ اور وہ اس انداز سے گفتگو کرتے ہیں گویا حکومت کا خاتمہ قریب ہے صورت حال سخت مایوس کن ہے اور اگر قوم کو بربادی اور انارکی سے بچانا ہے تو جلد سے جلد مؤثر تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ یہ صحیح ہے کہ ملک کے سامنے بعض مسائل ایسے بھی ہیں جو بے حد دشوار معلوم ہوتے ہیں لیکن بہر کیف کوشش کرنا اشد ضروری ہے۔ صورت حال اتنی مایوس کن نہیں ہے جیسے بعض لوگ

سمجھے بیٹھے ہیں...........................

مستقبل پر ایمان:

اگر کسی مریض کو معلوم ہو کہ اس کا مرض قابل علاج ہے۔ اور اس کو جلد سے جلد بیماری سے نجات دلانے کی ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے تو اس کی ہمت بندھ جاتی ہے اور وہ مرض کا بہتر مقابلہ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے لیکن اگر اس کے برعکس مریض کو یہ احساس ہو کہ اس کا مرض نا قابل علاج بھی ہے اور اس کے مناسب علاج کی کوئی تدبیر بھی نہیں کی جارہی ہے تو وہ جلد موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ حکومت کے خلاف جو پراپیگنڈا حکومت کے مخالفین اور دوسرے تخریبی عناصر نے جاری کر رکھا ہے اس نے مستقبل پر ایمان کو تباہ کر دیا ہے۔ عوام کا خاصہ حصہ امید سے بیگانہ ہو رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ صورت حال حد سے زیادہ خراب ہو چکی ہے اور اب اس کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ لیکن نشر و اشاعت کی مدد سے امید افزا پروپیگنڈا آسانی سے منظم کیا جا سکتا ہے اور مستقبل پر ایمان دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے۔

ملائیت:

اس میں کوئی شک نہیں کہ مُلا زیادہ تر ایسے طبقے سے پیدا ہوتے ہیں جن کو تعلیم سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور جن کا دائرہ نظر انتہائی طور پر تنگ ہوتا ہے ملاؤں کو دراصل اربابِ سیاست ہی نے بنایا ہے لیکن اب وہ ان کی حمایت کرنے کے بجائے ان قوتوں پر حملہ آور ہو رہے ہیں جنھوں نے ان کو پیدا کیا تھا۔ وہ اب خود اقتدار حکومت پر قابض ہونے کے درپے ہیں اور ترقی کے دشمن بھی ہیں اس لئے ملاؤں کی ایک ذہین و فطین اور تعلیم یافتہ جماعت پیدا کرنی چاہئے اور اس اثنا میں لیڈروں کو چاہئے کہ تقریریں کرتے ہوئے مذہبی دوائر کے متعلق کوئی وعدے نہ کیا کریں۔ جن کا ایفا ان کے بس کا روگ نہیں ہے...........................

....

مزید تقریریں: پالیسی پر نظر ثانی

اس مرحلے پر بعض مقدمات کا جائزہ لینا ضروری ہے کیونکہ ۲۴ دسمبر ۱۹۵۲ء کو افسروں کی ایک کانفرنس میں ایک ہی حکم کے ماتحت ان تمام مقدمات کا فیصلہ کیا گیا تھا مقدمات یہ ہیں: مقدمہ میلہ گلوشاہ فائل نمبر (129(2)16) اور مقدمہ شجاع آباد فائل نمبر (130(2)16)

ضلع سیالکوٹ کے تھانہ ستراہ کے علاقے میں ایک گاؤں ہے کوریکے۔ اس گاؤں میں ہر سال ایک میلہ مویشیاں ہوتا ہے جسے گلوشاہ کا میلہ کہتے ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں یہ میلہ ۳/ اکتوبر سے ۱۰/ اکتوبر ۱۹۵۲ء تک ہوا۔ جس میں بہت سے لوگ اپنے مویشوں کے ساتھ جمع ہوئے۔ احراریوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر یہاں آل مسلم پارٹیز کنونشن کا ایک جلسہ منعقد کر لیا۔ جس میں میلے کے مجمع کے سامنے حسب معمول زہر چکانی کی۔ بعض لیڈروں نے ۳ کو اور بعض نے ۷/ اکتوبر کو تقریریں کیں۔ تقریروں کا موضوع وہی احمدیت تھا اور چونکہ ان سے فرقہ وارانہ منافرت پھیلانا ہی مقصود تھا اور یہ تقریریں قابل اقدام تھیں۔ اس لئے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مسٹر عبدالسعید ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو حکم دیا کہ ان کا جائزہ لیں مسٹر عبدالسعید نے نہایت احتیاط سے ہر تقریر کو دیکھ پرکھ کر حسب ذیل رائے پیش کی۔

(۱) مولوی کرامت علی نے ۷/ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو ایک تقریر کی جس میں یہ کہا کہ مرزا غلام احمد نے مسلمانوں کو فاحشہ عورتوں کی اولاد، ان کی عورتوں کو کتیاں اور مرزا کو نہ ماننے والوں کو طوائفوں کی اولاد بتایا ہے۔ یہ تقریر زیر دفعہ ۲۱ (۳) پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ قابل اقدام ہے کیونکہ اس سے غیر احمدی مسلمانوں کی طرف سے مزید ایسی سرگرمیوں کا احتمال ہے جو سلامتی عامہ اور قیام امن وانتظام کے لئے مضر ہونگی۔

(۲) اسی موقع پر مولانا بشیر احمد صدر مجلس احرار پسرور نے تقریر کی۔ جس میں انہوں نے ایک مبینہ واقعہ کا ذکر کیا کہ ایک شخص ڈاکٹر احسان علی نے مرزا بشیر الدین محمود احمد کی سالی

سلمیٰ بیگم کے ساتھ زنا بالجبر کیا اور اس کو مرزا بشیر الدین محمود احمد کے حکم سے دس ضرب پاپوش کی سزا دی گئی۔ اس تقریر کے دوران میں یہ بھی کہا گیا کہ آیا کسی اور شخص کو بھی اس جرم میں دس جوتوں کی سزا دینا مناسب ہوگا کہ اس نے ایک اور شخص کے کنبے کی ایک عورت سے زنا بالجبر کیا تھا۔ مقرر نے مرزائیوں کو مرتد قرار دیا جو شرع اسلام کی رو سے واجب القتل ہیں۔ یہ تقریر پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے دفعہ ۲۱ کی شق (۱)(۳) کے ماتحت مستوجب سزا ہے۔

(۳) اس موقع پر ۳/اکتوبر ۱۹۵۲ء کو قاضی منظور احمد نے ایک تقریر کی۔ جس میں اس نے مرزا غلام احمد کے بعض اقوال کو کسی قدر بگاڑ کر نقل کیا۔ جن میں ایک قول یہ بھی تھا کہ مرزا غلام احمد کو اللہ کی طرف سے حمل ہوا تھا اور جو مسلمان ان کو نہیں مانتے وہ سور ہیں اور جو عورتیں ان کے دعوے کو تسلیم نہیں کرتیں وہ کتیاں ہیں۔ اور وہ مرزائیوں کے حامی ہیں یہ تقریر پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۲۱ کی شق (۱)(۲) اور (۳) کے ماتحت قابل اقدام ہے۔

مسٹر عبدالسمیع پبلک پراسیکیوٹر نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ اس قانونی رائے کو حاصل کر لینے کے بعد سپرنٹنڈنٹ پولیس نے یہ معاملہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر کے اس سے درخواست کی کہ ۵/جولائی ۱۹۵۲ء کو چیف سیکرٹری کے زیر صدارت حکام کی کانفرنس میں جو فیصلے ہوئے تھے ان کے پیراگراف ۲ اور ۷ کی مشمولہ ہدایات کے مطابق آپ حکومت پنجاب سے ان تقریروں کے خلاف مقدمات دائر کرنے کی منظوری حاصل کریں۔ مسٹر غلام سرور خاں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اپنی چٹھی مورخہ ۱۸ نومبر ۱۹۵۲ء کے ذریعے سے بوساطت کمشنر صاحب یہ تجویز حکومت کو بھیج دی۔ مسٹر نذیر احمد سپرنٹنڈنٹ پولیس (B) نے اس کیس کا جائزہ لیا اور اپنی یادداشت مؤرخہ ۱۸/نومبر ۱۹۵۲ء میں یہ تجویز پیش کی کہ بشیر احمد اور منظور احمد کے خلاف مقدمات دائر کرنے کے بجائے ان کو زیر دفعہ ۳ پنجاب پبلک سیفٹی گرفتار کر لینا چاہئے۔ مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے ان دونوں آدمیوں کے ریکارڈ کا معائنہ کیا اور ۲۲ نومبر ۱۹۵۲ء کو یہ کیس ہوم سیکرٹری کو بھیج دیا۔ مسٹر انور علی نے یہ رائے ظاہر کی کہ جو تفرقہ انگیز لوگ مملکت کے استحکام کو نقصان پہنچا رہے ہیں ان کے خلاف مقدمات دائر کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دینا چاہئے اور اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ خلاف قانون

تقریروں کے متعلق کوئی نہ کوئی کاروائی ضرور کی جائے گی تو وہ آئندہ مزید ضبط کا ثبوت دینگے۔اس پر ہوم سیکرٹری نے ۲۱رنومبر ۱۹۵۲ء کو لکھا کہ چیف منسٹر صاحب کراچی سے واپسی پر احمدیوں کے خلاف شورش کے متعلق پوری صورت حال پر حکام سے گفتگو کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔اس لیئے اس کیس پر بھی اسی موقع پر بات چیت ہوگی۔اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی لکھا کہ اس سلسلے میں اور بھی بہت سی قابل اعتراض تقریریں ہمارے علم میں آچکی ہیں جن کے متعلق یہی مناسب سمجھا گیا ہے کہ ان کو نہ چھیڑا جائے۔

لائل پور میں ۲۶، ۲۷رستمبر کو زیر اہتمام آل مسلم پارٹیز کنونشن ایک ختم نبوت کانفرنس منعقد ہوئی اور کنونشن ہی کے زیر اہتمام ۲۸ ستمبر ۱۹۵۲ء کو سمندری میں بھی ایک جلسہ عام کیا گیا۔لائل پور کے مقررین میں مرزا غلام نبی جانباز، ماسٹر تاج الدین انصاری، صاحبزادہ فیض الحسن، شیخ حسام الدین، تاج محمد لائل پوری، مظفر علی شمسی اور مولانا داؤد غزنوی شامل تھے۔صاحبزادہ فیض الحسن نے اپنی تقریر میں یہ کہا کہ مرزا غلام احمد نہایت پست اخلاق کا آدمی تھا اس نے حضرت بی بی فاطمہ کی پاکیزگی پر حملہ کیا۔جس کی بنا پر وہ اس امر کا مستحق تھا کہ اس کے خلاف غنڈا ایکٹ کے ماتحت مقدمہ چلایا جاتا۔اس مقرر نے چوہدری ظفر اللہ خاں کو بھی غنڈا کہا اور یہ بھی کہا کہ مرزا مظفر احمد جو احمدی ہے اور مرزا محمود احمد کا داماد ہے حکومت پنجاب کا فنانس سیکرٹری مقرر نہ ہونا چاہیئے۔شیخ حسام الدین نے کہا کہ چوہدری ظفر اللہ خاں خبیث ہے اور جب تک وہ وزیر خارجہ ہے پاکستان کی بہتری کی کوئی صورت نہیں۔سید عطا اللہ شاہ بخاری نے ملکہ وکٹوریہ اور ملکہ الزبتھ کے متعلق جو کچھ کہا بہتر یہی ہے کہ اس کا ذکر نہ کیا جائے۔اس نے کہا کہ لاہور چھاؤنی کے پاس اور جنگ شاہی کے قریب ہوائی جہازوں کے جو حادثے پیش آئے اور جن میں جنرل افتخار خاں اور جنرل شیر خاں ہلاک ہو گئے ان کی ذمہ داری مرزائیوں پر ہے۔سمندری کانفرنس میں سید مظفر علی شمسی، ماسٹر تاج الدین شیخ حسام الدین، سید عطا اللہ شاہ بخاری، غلام نبی جانباز اور چک نمبر ۴۲۳ کے غازی محمد حسین نے تقریریں کیں۔سید عطا اللہ شاہ بخاری نے بیان کیا کہ مرزا غلام احمد کے والد حکیم غلام مرتضٰی نے بالاکوٹ کی لڑائی میں مسلمان بادشاہ بہادر شاہ کے خلاف جنگ کرنے کے لئے سردار نونہال سنگھ کو پچاس سوار مہیا

کئے تھے۔

مسٹر انور علی ڈی آئی جی، سی آئی ڈی نے ۲۸/ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو ان تقریروں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ملکہ وکٹوریہ اور ملکہ الزبتھ کا ذکر قابل اعتراض ہے اور یہ بیان بالکل جھوٹ ہے کہ جنگ شاہی یا لاہور چھاؤنی کے ہوائی حادثوں میں مرزائیوں کا ہاتھ تھا کیونکہ جنگ شاہی کے حادثے میں جو اشخاص ہلاک ہوئے ان میں جنرل شیر خاں بھی تھے جو خود مرزائی تھے۔ احرار کی تقریریں صرف زہریلی ہی نہیں بلکہ ناشائستہ اور مکروہ ہیں کانفرنسوں کی تعداد میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ نفرت کی اشاعت برابر جاری ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ان شرانگیز تقریروں سے بہت بیزار ہو رہا ہے جو پوری قوم کے خیالات کو خراب کر رہی ہیں۔ ہوم سیکرٹری نے ۲۹/ اکتوبر کو رائے دی کہ اب وقت آ گیا ہے کہ حکومت پوری صورتحال پر نظر ثانی کرے۔ کیونکہ احراری لیڈروں کی تقریریں اب شرانگیزی اور سخت قابل اعتراض نوعیت کے اعتبار سے بہت نمایاں ہو رہی ہیں۔ آپ نے تجویز پیش کی کہ چیف منسٹر صاحب کو لائل پور کی مسلم لیگ کانفرنس سے فراغت پاتے ہی حکام کی ایک کانفرنس منعقد کرنی چاہیئے اور اس وقت تک ہر قسم کا اقدام ملتوی رکھا جائے۔ ۳۱/ نومبر ۱۹۵۲ء کو چیف منسٹر کے سیکرٹری نے فائل پر لکھا کہ چیف منسٹر صاحب کی خواہش ہے کہ لائل پور سے ان کی واپسی پر یہ کیس ان کے سامنے پیش کیا جائے۔

۱۴ سے ۱۶/ نومبر ۱۹۵۲ء تک راولپنڈی میں زیر اہتمام آل مسلم پارٹیز کنونشن ایک جلسہ عام منعقد ہوا جس کے ممتاز مقررین ماسٹر تاج الدین انصاری، شیخ حسام الدین، سید عطاء اللہ شاہ بخاری احسان احمد شجاع آبادی اور محمد علی جالندھری تھے۔

ماسٹر تاج الدین انصاری نے اپنی تقریر میں چوہدری ظفر اللہ خاں پر یہ الزام لگایا کہ ان کی سرگرمیاں مملکت اور اسلام کے خلاف ہیں اور کہا کہ ان کو عدالت میں ان الزامات کی جواب دہی کرنی ہوگی مقرر نے یہ بھی کہا کہ چوہدری ظفر اللہ خاں انگریزوں کا ایجنٹ اور مرتد ہے۔ وہ خواجہ ناظم الدین کا مخلص رفیق نہیں اور مرزائیوں کا مجلسی اور اقتصادی مقاطعہ ہونا چاہیئے۔ احسان احمد شجاع آبادی نے کہا کہ یہ تحریک وفاداروں اور غداروں کے درمیان اور صداقت کفر کے مابین جنگ ہے اور

یہ رائے بھی ظاہر کی کہ اگر چہ تبلیغ اسلام کے لئے تشدد کا استعمال جائز نہیں۔ لیکن حفاظت اسلام کے لئے جائز ہے۔ حافظ محمد سعید نے کہا کہ خواجہ ناظم الدین بھی میری طرح ''ہاتو'' (کشمیریوں کے لئے تحقیری لفظ) ہے وہ انگریزوں کی تائید کر کے اس مقام پر پہنچا ہے اور بنگال کے قحط میں ڈھائی لاکھ جانوں کی تباہی کا ذمہ دار ہے۔ اس مقرر نے چوہدری ظفر اللہ خاں کو کافر بھی کہا اس نے یہ بھی بیان کیا کہ پاکستان میں شراب خوری، بددیانتی، بداخلاقی اور رشوت روز بروز ترقی پر ہیں اور وزرا، بلاٹکٹ سفر کر رہے ہیں۔

اس نے حکام کو تنبیہ کی کہ اگر مسلمانوں کے متفقہ مطالبات تسلیم نہ کئے گئے تو روز قیامت ان کا حشر مرزا غلام احمد کے ساتھ ہوگا۔ بالکل اسی طرح جیسے فرعون کو خنزیر کی سواری کرنی پڑیگی۔ شیخ حسام الدین نے کہا کہ ۱۸۵۷ء کے غدر میں، مرزائیوں نے، ہتھیاروں اور سواروں سے انگریزوں کی امداد کی تھی اور مرزا غلام احمد کے آباؤ اجداد بالاکوٹ کے مقام پر شاہ اسماعیل شہید کے خلاف سکھوں کے لشکر میں شامل ہوئے تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے کہا کہ مرزائی بھارت اور پاکستان کو دوبارہ متحد کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ محمد علی جالندھری نے بیان کیا کہ مرزا غلام احمد اور اس کے پیروکار زندیق ہیں جن کے متعلق رسول پاک کا ارشاد ہے کہ جو شخص زندیقوں کو قتل کریگا، اسے سو شہیدوں کے برابر ثواب ملے گا۔ اس نے تجویز پیش کی کہ مرزا غلام احمد کے نام کے ساتھ کذاب کا لفظ استعمال کرنا چاہئے۔ یہ بھی کہا کہ جس زمانے میں چوہدری ظفر اللہ خاں حکومت ہند کے ریلوے ممبر تھے ۲۲۷ مسلمان مرزائی ہو گئے تھے اور مسٹر اعجاز احمد افسر درآمد و برآمد کراچی اور مسٹر فاروقی چیف سیکرٹری حکومت سندھ اپنے سرکاری فرائض کے دوران میں مرزائیت کی تبلیغ کرتے ہیں۔ جب یہ کیس مسٹر نذیر احمد سپرنٹنڈنٹ پولیس (B) کے سامنے آیا تو انہوں نے ۲۴ر نومبر ۱۹۵۲ء کو لکھا کہ محمد علی جالندھری نے ضلع منٹگمری میں ایک تقریر کی تھی جس کی بناء پر اس کے خلاف زیر دفعہ ۲۱ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کیس زیر تفتیش ہے اور میں ایس پی منٹگمری سے دریافت کر رہا ہوں کہ اس کیس کا کیا ہوا۔ کیونکہ ایک بدآہنگ سیاسی مقرر کے خلاف کیس درج کرنا اور مدت دراز تک اس کا چالان عدالت میں نہ بھیجنا نظم حکومت کی امداد کرنا نہیں ہے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ

محمد علی جالندھری کے خلاف جو احراریوں میں بدترین مقرر ہے مقدمہ دائر کیا جائے یا اس کو پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت نظر بند کیا جائے۔ ۲۵/نومبر ۱۹۵۲ء کو مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے یہ کیس حکومت کو بغرض اطلاع ارسال کیا اور لکھا کہ چیف منسٹر صاحب کا ارشاد ہے کہ وہ کراچی سے واپسی پر اس مسئلے کے متعلق گفتگو کرینگے کہ فرقہ بندی کے متعلق جنگجویانہ تقریریں کرنے والوں کے متعلق کیا اقدام کیا جائے۔

شجاع آباد ضلع ملتان میں ۱۹، ۲۰/نومبر کو ختم نبوت کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس موقع پر اہم مقررین یہ تھے: مولوی محمد علی جالندھری، مرزا غلام نبی جانباز، شیخ حسام الدین، مولوی غلام غوث سرحدی، قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری مولوی غلام غوث نے اپنی تقریر میں کہا کہ مرزا غلام احمد عورتوں سے ٹانگیں دبوایا کرتے تھے۔ ان عورتوں میں سے ایک کا نام بھانو تھا، مرزا صاحب ننگی عورتوں کو دیکھنے کے بہت مشتاق تھے اور یہ تو ان کا بیٹا (مرزا بشیر الدین محمود احمد) بھی تسلیم کر چکا ہے کہ وہ شراب پیا کرتے تھے۔ مولوی محمد علی جالندھری نے مرزا غلام احمد کو ''اُلو کا پٹھا'' بتایا اور کہا کہ خواجہ ناظم الدین کی ماں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھ سکتی ہے کہ اس کا بیٹا وزیراعظم بن گیا لیکن ملک بدقسمت ہے کیونکہ وزیراعظم امور و معاملات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے یہاں پھر ملکہ وکٹوریہ کے متعلق فحش اشارات کئے۔

یہ کیس مسٹر انور علی کے پاس پہنچا تو انہوں نے ۸/دسمبر ۱۹۵۲ء کو اس پر مندرجہ ذیل یادداشت لکھی:۔

(۱) میں ایک دفعہ پہلے بھی حکومت کے علم میں لا چکا ہوں کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے لائل پور میں تقریر کرتے ہوئے ملکہ وکٹوریہ کے خلاف ناشائستہ اور بدتمیزانہ باتیں کیں اب شجاع آباد میں بھی اس نے ملکہ وکٹوریہ کے متعلق فحش اور مکروہ اشارات کئے ہیں۔

(۲) محمد علی جالندھری یہاں تک پہنچ گئے کہ انہوں نے جماعت احمدیہ کے بانی کو ''اُلو کا پٹھا'' کہہ دیا اگر احمدی ایسی باتوں پر برہم ہوں اور جوش میں آجائیں تو کیا ہم انہیں الزام دے سکتے ہیں؟ اگر وہ غصے میں بھر کر کچھ کر بیٹھیں تو احراری احمدیوں کی آزاد رسانی میں اور

بھی زیادہ شدت اختیار کر لیں گیا یک واقعہ سے مزید تلخی پیدا ہوگی اور یہ چکر کبھی ختم نہ ہوگا۔

(۳) حکومت ایک دفعہ اور احراری لیڈروں خصوصاً سید عطا اللہ شاہ بخاری اور محمد علی جالندھری کو تنبیہ کرنے پر آمادہ ہو جائے گی۔حکومت کو اس قسم کی فتنہ انگیز تقریریں ہرگز برداشت نہ کرنی چاہئیں کیونکہ عوام کے خیالات مسموم کئے جا رہے ہیں۔مناسب طرز عمل تو یہی ہے کہ ان دونوں لیڈروں کے خلاف مقدمات چلائے جائیں۔لیکن چونکہ مرکزی حکومت احراریوں کے متعلق اپنے رویے کو متعین کرنے سے انکار کر رہی ہے اور حکومت پنجاب یکطرفہ اقدام نہیں کر سکتی۔اس لئے میں تجویز کرتا ہوں کہ ہوم سیکرٹری یا چیف سیکرٹری ان مقرروں کو تنبیہ کر دیں۔

(۴) مجھے روز بروز اس امر کا یقین ہوتا جاتا ہے کہ احراری پاکستان اور اسلام کی امداد کرنے میں فعال نہیں ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ آئندہ انتخابات کے لئے زمین تیار کریں اس وقت یہ لوگ یا تو لیگ کی مخالف پارٹی کی حیثیت اختیار کر لیں گے یا لیگ کے اندر ایک علیحدہ گروپ بنائیں گے۔

ہوم سیکرٹری نے یہ کیس بغرض اطلاع چیف منسٹر کو بھیجا اور لکھا کہ اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور وخوض کرنے کی غرض سے حکام کے ایک اجلاس کا انعقاد قرار پا چکا ہے۔جب فائل میاں انور علی کو موصول ہوئی تو انہوں نے ایس پی (A) اور ایس پی (B) کو گفتگو کے لئے طلب کیا تا کہ حکام کے اس اجلاس کے لئے جو چند روز میں ہونے والا تھا ضروری نکات کی ایک فہرست تیار کر لی جائے۔اس حکم کی تعمیل میں مسٹر نذیر احمد ایس پی (B) نے مندرجہ ذیل یادداشت لکھی۔

"اس فائل کے ساتھ ایک اور فائل ذیل میں منسلک ہے جس کے ساتھ دو اشتہار شامل ہیں۔ان اشتہاروں میں مرزائیوں کے بائیکاٹ اور ان کے لئے الگ برتن رکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ان کے علاوہ مندرجہ ذیل فائلیں بھی شامل کی گئی ہیں:۔

(۱) وہ فائل جس میں ضلع سیالکوٹ کے بشیر احمد، منظور احمد اور کرامت علی کی تقریریں مندرج ہیں جن میں بشیر احمد نے یہ کہا تھا کہ ڈاکٹر احسان علی نے مرزا بشیر الدین محمود احمد کی سالی

سے زنا بالجبر کیا۔ جس پر اسے صرف دس جوتوں کی سزا دی گئی اور اگر دولتانہ احمدیوں کی مدد کریگا تو اس کو بھی جوتوں کا سامنا کرنا پڑے گا دوسرے مقررین نے مرزا غلام احمد کو کھلم کھلا گالیاں دیں۔

(۲) وہ فائل جس میں افتخار الحسن لائل پور کی تقریریں شامل ہیں اس نے اپنی ۸ر اگست کی تقریر میں کہا کہ ہم کو ممتاز محمد دولتانہ، سر ظفر اللہ خاں اور خواجہ ناظم الدین جیسوں کی غدار حکومت کے افسروں پر کوئی اعتماد نہیں۔ ۲۹ر اگست کو مولوی افتخار الحسن نے اپنی تقریر میں کہا کہ شمس الحق لیاقت علی خاں اور صاحبزادہ اعتزاز الدین احمد خاں تینوں کے قتل کا ذمہ دار نجف خاں ہے۔ ہوم سیکرٹری کی تجویز پر افتخار الحسن کو ڈپٹی کمشنر لائل پور نے تنبیہ کی۔

(۳) وہ فائل جس میں ضلع کیمبل پور کے مولوی عبدالحنان کی تقریر درج ہے جس میں اس نے کہا کہ مرزائی واجب القتل ہیں اور خواجہ ناظم الدین کافر مرتد احمق اور جاہل آدمی ہے اس مولوی کو بھی ڈپٹی کمشنر کیمبل پور کی وساطت سے تنبیہ کی گئی۔

(۴) وہ فائل جس میں خاں عبدالستار خاں نیازی ایم ایل اے کی وہ تقریر شامل ہے جو اس نے ۲۰ر ستمبر ۱۹۵۲ء کو جھنگ میں کی تھی اس نے نہ صرف احمدیوں پر نکتہ چینی کی۔ بلکہ یہ بھی کہا کہ پولیس کانسٹیبلوں اور سرکاری کلرکوں کی تنخواہیں بہت کم ہیں جن میں ان کا گزارا نہیں ہوسکتا یہ بھی کہا کہ دولتانہ ڈاکو ہے اور ملت کو لوٹ رہا ہے۔ حکومت کا آخری فیصلہ یہ تھا کہ خاں عبدالستار خاں نیازی کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی جائے۔

(۵) وہ فائل جس میں اس جلسہ عام کی کاروائی درج ہے جو راولپنڈی میں زیر اہتمام آل مسلم پارٹیز کنونشن ۱۴، ۱۵ اور ۱۶ر نومبر ۱۹۵۲ء کو منعقد ہوا۔ اس جلسے میں ماسٹر تاج الدین اور محمد علی جالندھری نے تیز و تند تقریریں کیں۔ اور محمد علی جالندھری نے کہا کہ مرزا غلام احمد اور اس کے تمام پیرو زندیق ہیں اور جو شخص نبوت کے جھوٹے دعویدار کو قتل کرتا ہے اسے سو شہیدوں کے برابر ثواب ملتا ہے۔

۲۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ احرار مقررین کو چوہدری ظفر اللہ خاں اور بانی جماعت احمدیہ

کے خلاف علی الاعلان توہین آمیز باتیں کہنے سے روکا جائے۔ وہ عام طور پر اپنی تقریروں میں مرزا غلام احمد کو دجال، کذاب اور زانی اور چوہدری ظفر اللہ خاں کو غدار اور دشمن پاکستان کہتے ہیں۔

۳۔ احرار مقررین عوام پر یہ اثر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر بعض لوگ مثلاً احمدی مرزا غلام احمد کو نبی خیال کریں تو یہ رسول پاک صلعم کی سخت توہین ہے۔ اس طریقے سے عام آدمی کے جذبات سے کھیلا جاتا ہے اور اس کو احمدیوں کے خلاف متشددانہ اقدام پر مشتعل کیا جاتا ہے۔

۴۔ اب احراری مقررین اپنی توجہات اس امر پر صرف کررہے ہیں کہ احمدیوں کا مجلسی اور اقتصادی بائیکاٹ کیا جائے کیونکہ وہ غیر مسلم ہیں یہ لوگ دکانداروں سے کہتے ہیں کہ اپنی دوکانوں پر مرزائیوں کے لئے علیحدہ برتن رکھو اور اس کا اعلان بورڈ لگا کر کرو۔

۵۔ احرار مقررین مسلمانوں کو اس امر پر بھی اکسا رہے ہیں کہ وہ اپنے قبرستانوں میں احمدیوں کی نعشوں کو دفن ہونے کی اجازت نہ دیں۔

۶۔ احرار مقررین عوام کے ذہنوں میں یہ نقش بٹھانے کی کوشش کررہے ہیں کہ وزیر اعظم پاکستان اور وزیر اعلیٰ پنجاب احمدیوں کے حامی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اب تک احمدیوں کو علیحدہ قوم قرار نہیں دیا اور چوہدری ظفر اللہ خاں کو کابینہ پاکستان سے موقوف نہیں کیا۔

۷۔ احرار مقررین اپنی تقریروں میں اس امر پر زور دیتے ہیں کہ مرزائیوں کو پاکستانی فوج اور دوسری ملازمتوں میں کلیدی عہدے ہرگز نہ دیئے جائیں۔ اس طریقے سے وہ ملازمتوں کے اندر احمدیوں اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان فرقہ واری پیدا کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔

۸۔ احراری مقررین کھلم کھلا یہ اعلان کرتے رہے ہیں کہ ربوہ کے مرزا محمد احمد اور ان کے پیرو مملکت پاکستان کے وفادار نہیں ہیں اور وہ بھارت اور پاکستان کو دوبارہ متحد کردینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ قادیان جہاں ان کا بانی مدفون ہے بھارت میں واقع ہے اور مرزائی واپس قادیان جانے کے بے حد خواہاں ہیں۔

۹۔احراری مقررین کئی دفعہ اپنی تقریروں میں کہہ چکے ہیں کہ مرزا محمود احمد اور چوہدری ظفر اللہ خاں کی غداری ہی کی وجہ سے ضلع گورداسپور بھارت میں شامل ہوگیا اور پاکستان کو نہ مل سکا۔

۱۰۔احراری مقررین یہ بھی کہتے رہے ہیں کہ مسئلہ کشمیر صرف چوہدری ظفر اللہ خاں کے عدم خلوص کی وجہ سے اب تک حل نہیں ہوسکا اور پاکستان وافغانستان کے تعلقات کی کشیدگی کا باعث بھی یہی ہے کہ چوہدری ظفر اللہ خاں کابینہ پاکستان میں شامل ہیں۔

۱۱۔احراری مقررین اپنی تقریروں میں اس امر کی اشاعت بھی کرتے رہے ہیں کہ چوہدری ظفر اللہ خاں انگریزوں کے ایجنٹ ہیں اور فرقہ احمدیہ کی حوصلہ افزائی اور ترقی بھی حکومت برطانیہ ہی نے کی تھی کیونکہ اس فرقے کا بانی ''جہاد'' کا مخالف تھا روزنامہ ''زمیندار'' اور ''آزاد'' (احرار کا اخبار) دونوں قریب قریب روزانہ ایسے مضامین شائع کررہے ہیں جو احمدیوں کے خلاف فرقہ احمدیہ کے بانی کے خلاف اور چوہدری ظفر اللہ خاں کے خلاف شدید بدگوئی اور دشنام طرازی سے لبریز ہوتے ہیں۔

۱۲۔احراریوں کی اس شورش کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں اور احراریوں کے تعلقات بہت کشیدہ ہوگئے ہیں اور عام لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اس ملک کے ارباب اختیار کو لوگوں کے احساسات سے کوئی ہمدردی نہیں اور وہ احمدیوں کے حامی ہیں۔اس طریقے سے مملکت کو نقصان پہنچا ہے اور احراری لیڈروں کی حیثیت عوام کی نظروں میں بہتر ہوگئی ہے۔اس شورش کا ایک اور نتیجہ یہ ہوا کہ ملاؤں کا پورا طبقہ اپنی روزانہ تقریروں اور جمعہ کے خطبوں میں بے حد تیز وتند لہجہ اختیار کر چکا ہے، وہ اپنے وعظوں کو دینی معاملات تک محدود رکھنے کی بجائے اب خالص سیاسیات کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں۔خصوصاً ان کے خطبات جمعہ اسی موضوع سے لبریز ہوتے ہیں۔

۲۴ر دسمبر ۱۹۵۲ء کو چیف منسٹر صاحب کے کمرے میں کانفرنس ہوئی جس میں مسٹر قربان علی خاں انسپکٹر پولیس ہوم سیکرٹری اور مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے حصہ لیا۔اس گفتگو میں صرف ایک فیصلہ کیا گیا کہ جہاں کوئی تقریر قانون کے خلاف ہو وہاں قانونی کاروائی کی جائے اور کسی مزید

اقدام کی ضرورت نہیں۔اس حکم کی تعمیل میں سپرنٹنڈنٹ پولیس سیالکوٹ کو ایک چٹھی لکھی گئی جس میں انہیں بتایا گیا کہ منظور احمد، کرامت علی اور بشیر احمد جن کے خلاف میلہ گلو شاہ پر تقریریں کرنے کی وجہ سے مقدمہ چلانے کی تجویز ایس پی اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے کر رکھی ہے بے حقیقت سے آدمی ہیں۔اس لئے ان کے خلاف اس موقع پر مقدمہ چلانا مفید نہ ہوگا۔

۹۔ (۱۰رفروری ۱۹۵۳ء کو) سیالکوٹ میں زیر اہتمام آل مسلم پارٹیز کنونشن ایک کانفرنس منعقد ہونے والی تھی۔اگر چہ اس کانفرنس کا اشتہار ایک شخص علامہ محمد یعقوب خاں نے دیا تھا۔لیکن اس کے پس پشت احرار ہی تھے۔۶رنومبر ۱۹۵۲ء کو مسٹر غلام سرور خاں ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ نے کمشنر کو لکھا کہ اگر چہ ڈی او چٹھی نمبر 6469-84-BDBS مؤرخہ ۵رجون ۱۹۵۲ء میں حکومت کی واضح ہدایات موجود ہیں کہ دفعہ ۱۴۴۔ضابطہ فوجداری نافذ کر دینی چاہئے۔لیکن چونکہ اس کے بعد ۵رجولائی ۱۹۵۲ء کو ہفتے کے دن چیف سیکرٹری کے دفتر میں ان کے زیر صدارت حکام کی کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ۱۳رجولائی کی کنونشن منعقدہ لاہور میں کوئی مداخلت نہ کی جائے۔اس لئے میں اس فیصلے کا مطلب یہ سمجھتا ہوں کہ حکام اضلاع کو اس قسم کے جلسوں میں کوئی مداخلت نہ کرنی چاہئے۔ایسی کانفرنسیں گوجرانوالہ اور لاہور میں منعقد ہو چکی ہیں جن کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی گئی۔اس لئے میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آیا ضلع سیالکوٹ میں بھی اسی پالیسی پر عمل کرنا مقصود ہے۔اس چٹھی کی ایک نقل نیک سرکاری حیثیت سے چیف سیکرٹری حکومت پنجاب کو بھیجی گئی۔جو ۹رنومبر ۱۹۵۲ء کو ہوم سیکرٹری کے سامنے پیش کی گئی۔کمشنر نے ڈپٹی کمشنر کی یہ یادداشت ۹رنومبر ۱۹۵۲ء کو چیف سیکرٹری کے پاس بھیجی اور لکھا کہ ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ کی یہ تجویز صحیح معلوم ہوتی ہے کہ کانفرنس میں مداخلت نہ کی جائے۔ہوم سیکرٹری نے لکھا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جو کچھ کرنا چاہیں اس کے خلاف حکومت کوئی احکام صادر کرنے کی خواہش نہیں رکھتی اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی چٹھی کے آخری فقرے کے پیش نظر کوئی کاروائی ضروری نہیں۔

علما کی سرگرمیاں اور وزیراعظم اور وزیراعلیٰ سے ان کی ملاقاتیں

پہلا شخص جس نے خواجہ ناظم الدین وزیراعظم کی توجہ قادیانی تحریک کی سنگینی کی طرف مبذول کروائی وہ قاضی احسان احمد شجاع آبادی تھا۔ قادیانیت کی مخالفت اس شخص کی زندگی کا واحد مقصد معلوم ہوتا ہے اور وہ جہاں کہیں بھی جاتا ہے اپنے ساتھ ایک بڑا چوبی صندوق لے جاتا ہے جس میں احمدیوں کا اور احمدیوں کے خلاف لٹریچر بھرا ہوا ہوتا ہے۔ زیادہ اہم سیاسی واقعات کا ذکر تو درکنار پاکستان یا کسی اور شخص کو کوئی آفت پیش آجائے کوئی افسوسناک واقعہ رونما ہو جائے۔ قائد ملت قتل کر دیئے جائیں یا ہوائی جہاز گر پڑیں۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی کے نزدیک وہ ہمیشہ احمدیوں کی سازش کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ مارچ ۱۹۵۰ء میں شجاع آبادی کراچی کے ایک اور مولانا احتشام الحق تھانوی کو کسی نہ کسی طرح آمادہ کر کے خواجہ ناظم الدین کے پاس لے گیا۔ تاکہ وہ ان کو اس غیظ و غضب سے مطلع کریں جو احمدیوں کے خلاف ملک بھر میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ دونوں ۳؍مارچ ۱۹۵۰ء کو خواجہ ناظم الدین سے ملے۔ شجاع آبادی کا چوبی صندوق اس کے ساتھ ہی تھا اس نے اس صندوق میں سے کچھ قادیانی لٹریچر نکالا جسے پڑھ کر خواجہ ناظم الدین سخت پریشان ہوئے۔

اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کے احمدیوں کے خلاف مطالبات علما نے جون ۵۲ء میں بمقام کراچی اور ۱۳ جولائی ۵۲ء کو بمقام لاہور وضع کیے تھے۔ اور اسی وقت ان مطالبات کی منظوری کے لیے تدابیر سوچنے کی غرض سے مجلس عمل مرتب کی گئی تھی۔ مجلس عمل کے ارکان نے جو طریقے اختیار کیے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ خواجہ ناظم الدین وزیراعظم سے ایک وفد ملاقات کرے اور ان کو مطالبات کی معقولیت کا قائل بنائے۔ وزیراعظم سے پہلی ملاقات مولانا اختر علی خاں نے جولائی ۱۹۵۲ء میں کی جب وہ ایک پریس کانفرنس کی غرض سے کراچی میں مقیم تھے۔ مولانا نے خواجہ ناظم الدین سے مطالبات کا ذکر کیا اور دیکھنے لگا کہ خواجہ صاحب پر ان کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔ مولانا نے

ایک میمورنڈم (EXD.E16) پیش کر دعویٰ کیا ہے خواجہ ناظم الدین نے ان سے جو کچھ کہا تھا وہ بے کم و کاست اس میں درج ہے:۔

''مجھے ملک کے جذبات اور احساسات کا پورا علم ہے میں جانتا ہوں کہ مسلمان کیا چاہتے ہیں لیکن میں ان سے کہوں گا کہ حکومت ان کے جذبات کا پورا پورا احترام کرتی ہے۔لیکن ان کے مطالبات کو پورا کرنے کے راستے میں کچھ آئینی دشواریاں ہیں۔ان دشواریوں کو پورا کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔اس لیے مسلمانوں کو توقف اور اطمینان سے کام لینا چاہیئے۔امن اور قانون کو برقرار رکھنے میں حکومت سے تعاون کرنا چاہیئے۔ہم جو بھی فیصلہ کریں گے وہ مسلمانوں کو قابل قبول ہوگا۔آپ نے کہا کہ یہ فیصلہ علمائے کرام کی عین مرضی کے مطابق ہوگا۔میری حکومت ۱۴ اگست کو بنیادی حکمت عملی کا اعلان کر دے گی۔مجھے امید ہے کہ یہ وضاحت ملک کی رائے عامہ کو مطمئن کرے گی''۔

خواجہ ناظم الدین کا بیان اس ملاقات کے واقعات کے متعلق مختلف ہے۔انہوں نے کہا ہے کہ میں نے تو مولانا اختر علی خان سے صرف اتنا کہا تھا کہ میں مسئلے کے متعلق یوم پاکستان مورخہ ۱۴۔اگست کو اپنی تقریر میں کچھ بیان کروں گا۔مولانا اختر علی خاں نے کراچی سے واپس آکر ''زمیندار'' مورخہ ۴/اگست میں جلی قلم اعلان شائع کیا کہ قادیانیوں کے متعلق مرکزی حکومت کی پالیسی کا اعلان وزیراعظم صاحب یوم پاکستان پر اپنی تقریر میں کر دیں گے اور یہ اعلان شریعت اور علما کی خواہش کے مطابق ہوگا۔مولانا نے اس خبر میں یہ غلط بیانی کی کہ انہوں نے وزیراعظم کی خدمت میں تحریک ختم نبوت کے ایک وفد کی قیادت کی تھی۔حالانکہ واقعہ صرف اتنا تھا کہ مولانا کسی پریس کانفرنس کے ممبر کی حیثیت سے کراچی گئے تھے۔اور اسی سلسلے میں کانفرنس کے بعض دیگر ممبروں کی معیت میں وزیراعظم سے ملے تھے۔احمدیوں کے مسئلے کا ذکر صرف ضمنی حیثیت سے ہوا تھا۔۱۳ اگست ۱۹۵۲ء کو ایک وفد وزیراعظم کی خدمت میں حاضر ہوا جس کے ارکان یہ تھے: ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا ابوالحسنات محمد احمد، مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش، شیخ حسام الدین، مولانا احتشام الحق تھانوی اور مولانا عبدالحامد ایونی۔اس وفد نے ایک تحریری یادداشت پیش کی جس میں احمدیوں کے

خلاف شکایات درج تھیں اور ان کے متعلق مندرجہ ذیل مطالبات کیے گئے تھے:

(۱) احمدیوں کو اقلیت قرار دیا جائے

(۲) چودھری ظفر اللہ خاں وزیر خارجہ کے عہدے سے برطرف کیے جائیں۔

(۳) احمدیوں کو مملکت کے کلیدی عہدوں سے موقوف کر دیا جائے۔

خواجہ ناظم الدین نے بیان کیا کہ وہ اس وقت دوسرے دن کے لیے (جو یوم پاکستان تھا) بعض مصروفیتوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ اس لیے اس مسئلے پر گفتگو کے لیے وقت نکال نہیں سکتے۔ اس لیے انہوں نے تجویز کی کہ ارکان وفد ان سے اس وقت ملیں جب یوم پاکستان کی مصروفیتوں سے فراغت ہو جائے۔ یوم پاکستان کی تقریر میں وزیر اعظم نے احمدیوں کے متعلق یا ان کے خلاف مطالبات کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ بلکہ اس کے برعکس اس تقریر میں اخبارات کی غلط افواہوں کا اشارتاً ذکر کر کے ان کی مذمت کی گئی اور اندورونی افتراق انگیز عناصر کا تذکرہ بھی کیا گیا جن کو اگر روکا نہ گیا تو ملک پارہ پارہ ہو جائے گا۔

تاہم اس دن مرکزی حکومت نے یہ پراسرار سرکاری اعلان شائع کیا:۔

''حکومت پاکستان نے فیصلہ کیا ہے کہ صوبائی یا مرکزی وزارتوں کا کوئی رکن ان اشخاص میں جن کے ساتھ ان کا واسطہ پڑتا ہے کسی فرقہ وار عقیدے کی تبلیغ کے لیے اپنی سرکاری پوزیشن کو استعمال نہ کرے گا۔ ہر گورنر کو ہدایت کی گئی ہے کہ یہ فیصلہ تمام تر متعلقہ وزیروں تک پہنچا دیں اور حکومت توقع رکھتی ہے کہ آئندہ کوئی وزیر اس قائدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔

حکومت پاکستان کو اکثر اس امر کی شکایات موصول ہوئیں ہیں کہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے بعض افسر جو ایک خاصے فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنے ماتحتوں اور دوسرے اشخاص کے درمیان جن سے سرکاری حیثیت میں ان کا واسطہ پڑتا ہے اپنے فرقہ وار عقائد کی تبلیغ کے لیے اپنی سرکاری حیثیت کا ناجائز استعمال کر رہے ہیں۔ حکومت اس معاملے کو سخت نامناسب خیال کرتی ہے۔ چنانچہ اس نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپسندیدہ سرگرمی کو فی الفور

ختم کر دیا جائے اور آئندہ کے لیے اس قابل اعتراض طریقے سے فرقہ وار عقائد کی تبلیغ کو ممنوع قرار دیا جائے۔

گورنمنٹ سروس کنڈکٹ رولز (قوائد کردار ملازمان سرکاری) میں اس منشا کے مطابق ترمیم کر دی گئی ہے۔

حکومت اعلان عام کر دینا چاہتی ہے کہ جو شخص خواہ وہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتا ہو اس قائدے کی خلاف ورزی کرے گا۔ اس کے خلاف شدید کاروائی کی جائے گی۔ پاکستان کی صوبائی اور ریاستی حکومتوں کو بھی اسی قسم کے اقدامات کی ہدایت کی گئی ہے۔''

چونکہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس سرکاری اعلان کا روئے سخن چودھری ظفر اللہ خاں اور دوسرے احمدی افسروں کی طرف ہے، اس لیے چودھری ظفر اللہ خاں نے فوراً مندرجہ ذیل بیان اخبارات میں شائع کروایا:۔

''میں ان تعلیمات اسلامی کے مطابق جو قرآن مجید میں مندرج ہیں اور جن کا نمونہ رسول پاکؐ کی حیات طیبہ میں موجود ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے آزادی ضمیر پر پورا اعتقاد رکھتا ہوں میرے خیال میں سرکاری اثر و نفوذ کا استعمال بھی براہ راست دباؤ یا تشدد ہی کی مانند آزاد ضمیری میں مداخلت کا حکم رکھتا ہے۔ بلکہ اسلام نے تو ہر مسلمان پر یہ فرض قرار دیا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں قول و فعل سے احکام اسلامی کی تعمیل کا ثبوت دے۔ یہ وہ فرض ہے جس کی طرف سے مسلمانوں نے اپنے دور زوال میں افسوسناک غفلت برتی۔ جس کے نتائج ان کی انفرادی اور قومی زندگیوں پر بالکل واضح ہیں۔

خود میرے عقائد میرے جاننے والوں سے (خواہ وہ مجھے شخصاً جانتے ہوں یا میری شہرت کی وجہ سے واقف ہوں) کبھی پوشیدہ نہیں رہے گا۔ گو پچھلے دنوں بعض حلقوں میں ان کو بگاڑ کر پیش کرنے اور ان کے متعلق غلط بیانی کرنے کی مسلسل کوششیں کی گئیں ہیں۔ جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں میں اس امر کو خلاف دیانت اور خلاف تعلیمات اسلامی سمجھتا ہوں کہ کوئی شخص اپنے سرکاری عہدہ و اختیار کو بالواسطہ یا بلاواسطہ استعمال کر کے اپنے مذہبی عقائد کو دوسروں

پر زبردستی منڈھ دے۔ یا اسی قسم کے اثر ونفوذ سے کام لے کر کسی شخص کو اس کے حقیقی عقائد کے ترک پر مجبور کرے۔ میں جس جماعت سے تعلق رکھتا ہوں اس میں اس اصول کی وسیع تعلیم دی جاتی ہے۔ اور اس کو مسلمہ اصول سمجھا جاتا ہے۔ اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ اس جماعت کا کوئی فرد اس صحیح اور مفید اصول کی خلاف ورزی کر رہا ہے تو مجھے بے حد حیرت اور انتہائی اذیت ہو گی۔ یہ صحیح ہے کہ جہاں تک ہمارے محدود وسائل اجازت دیتے ہیں ہمارے خیالات وعقائد کی وسیع تبلیغ کی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اس فریضے کی بجا آوری میں کیا جاتا ہے جو صحیح الخیال لوگوں پر عائد ہوتا ہے کہ وہ جن عقائد کو تہہ دل سے صحیح سمجھیں ان کی مسلسل اور مخلصانہ نشر واشاعت اپنے قول فعل سے کرتے ہیں تا کہ راست بازی پھیل جائے اور نیکیاں قائم ہو جائیں۔ اگر اس مقصد کے لیے کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے گا جس سے جبر اور دباؤ اور ناواجب وسائل کے استعمال کی بو آتی ہو تو خود یہ مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ جس شخص کے متعلق ایسا طریقہ اختیار کیا جائے گا اس کا ردعمل لازماً مخالفانہ ہو گا اور محسوس کرے گا کہ اس کو آزادی اور خوشدلی سے بنیادی صداقتوں کے مطالعہ اور ان پر غور وحوض کرنے کی دعوت نہیں دی جا رہی ہے بلکہ ایسے عقیدے کے ظاہری قبول پر مجبور کیا جا رہا ہے جس کو اس کا ضمیر تسلیم نہیں کرتا۔

اس معاملے کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے جس جماعت کے خلاف بعض حلقے جو عظیم اکثریت ہونے کے دعویدار ہیں برابر غلط بیانی اور جبر وظلم میں مصروف ہیں۔ اس جماعت کے ارکان اس قسم کے طور طریقے اختیار ہی نہیں کر سکتے۔ جب انہیں ایسی باتوں کے لیے اتہام، اِستہزا اور نفرت کا نشانہ بنایا جا رہا ہے جو ان کے عقائد میں بھی شامل نہیں اور جن پر انہوں نے کبھی عمل ہی نہیں کیا تو پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ ان طور طریقوں کو اختیار اور استعمال کرنا شروع کر دیں گے جو نہ صرف اسلام کے بلکہ عقل صحیح کے بھی خلاف ہیں۔ اور جن سے ان کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ پھر ایسی حالت میں وہ شدید سزا اور شدید مذمت سے بچنے کی کیونکر توقع رکھ سکتے ہیں۔

حکومت کی طرف سے جو اعلان کیا گیا ہے میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے باشندگان پاکستان کے طبقے اس اعلان کو ہر دم پیش نظر رکھیں گیا اور دین وایمان کے متعلقہ امور میں سکون ومتانت اور سنجیدگی اور رواداری کی فضا قائم کرنے میں معاون ہونگے۔ جن موضوعات سے انسانی ذہن کا تعلق ہے اور جن کا اثر ذہن قبول کرتا ہے ان میں بلند ترین موضوعات ایمان واعتقاد ہیں۔ اس دائرے میں انتہائی حزم واحتیاط لازمی ہے۔ مبادا اللہ کی نظروں میں ہم اس گناہ کے مرتکب قرار پائیں کہ ہم نے کسی شخص کو ایسے عقیدے کے اعلان پر مجبور کیا جسے اس کا ضمیر مجبور نہیں کرتا تھا۔ اور ان عقائد سے انکار کی ترغیب دی جن کو اس کا قلب وضمیر مخلصانہ قبول کرتا تھا کوئی شخص جو اس قسم کے فعل کا مرتکب ہے وہ وزیر ہو یا حاکم ہو۔ یا کوئی غیر سرکاری فرد ہو حقیقت میں مومنین مخلصین کی نہیں بلکہ منافقین کی جماعت پیدا کرنے کے خواہاں ہیں''۔

مجلس عمل کے وہ ممبر جو ۱۳ اگست کو خواجہ ناظم الدین سے ملے تھے۔ ۱۶ اگست کو پھر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس موقع پر سردار عبدالرب نشتر، مسٹر گورمانی اور مسٹر فضل الرحمٰن بھی موجود تھے۔ اس ملاقات کا نتیجہ ارکان وفد کے لیے واضح طور پر دل شکن تھا۔ خواجہ ناظم الدین نے کہا کہ احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مسئلہ دستور ساز اسمبلی کے دائرہ اختیار میں ہے۔ اور اس معاملے میں کسی اقدام پر آمادہ نہیں ہوں۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ چودھری ظفر اللہ خاں کو خود قائداعظم نے مقرر کیا تھا۔ اس لیے میں انہیں برطرف کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ احمدی افسروں کو کلیدی عہدوں سے الگ کیا جائے تو اس سے متعلق ارکان وفد کو دلائل وبراہین کی مدد سے کیس تیار کرنا چاہیے اور ربوہ کے متعلق جو شکایات ہیں وہ صوبائی حکومتوں کے سامنے پیش کرنی چاہیں۔

مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری، مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش، شیخ حسام الدین اور مولانا داؤد غزنوی نے ۲۹ ستمبر ۱۹۵۲ء کو چیف منسٹر پنجاب سے ملاقات کی اور احمدیوں کے خلاف اپنی شکایات ان کے سامنے پیش کیں جن میں امور یہ شامل تھے ربوہ میں خالص احمدی بستی کے لیے اراضی کا عطیہ، ناواجب الاٹمنٹیں اور وہ مسئلہ جس کو ارکان وفد گولی بارود کی سازش سے موسوم کرتے

تھے چیف منسٹر نے ان امور پر غور کرنے کا وعدہ کیا۔

آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ جہانگیر پارک کراچی میں چودھری ظفر اللہ خاں کی تقریر (مئی ۱۹۵۲ء) کے بعد مختلف مکاتب خیال کے علماء کا ایک اجلاس ۲ جون کو بمقام کراچی منعقد ہوا جس میں احمدیوں کے خلاف مطالبات مرتب کیے گئے۔ اور علما کا ایک بورڈ مقرر کیا گیا ۱۵ اگست کو اس بورڈ کا اجلاس ہوا۔ جس میں خاص دعوت پر شیخ حسام الدین، مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد، ماسٹر تاج دین انصاری اور مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش بھی شریک ہوئے۔ یہ پنجاب سے آنے والے ایک وفد کے ارکان تھے۔ بورڈ نے فیصلہ کیا کہ آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن ۱۵، ۱۶ اور ۱۷ ستمبر کو منعقد کی جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ستمبر میں اس کنونشن کے انعقاد کی کوئی تدبیر نہ کی گئی اور بورڈ کے بعض ممبر اضطراب کا اظہار کرنے لگے۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۵۲ء کو بورڈ کا ایک اجلاس ہوا۔ جس میں خاص دعوت پر شیخ حسام الدین، سید مظفر علی شمسی اور سید منور علی شاہ بھی شریک ہوئے۔ اس اجلاس کے فیصلوں کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔

۲۳ دسمبر ۱۹۵۲ء کو مولانا داؤد غزنوی نے مولانا احتشام الحق کو ایک چٹھی لکھی جس میں کنونشن کے انعقاد میں تاخیر ہونے کی شکایت کی اور بتایا کہ اس کا جلد سے جلد منعقد ہونا اشد ضروری ہے انہوں نے اس چٹھی میں یہ بھی لکھا کہ اگر کنونشن کے انتظامات میں کچھ مالی مشکلات حائل ہوں تو پنجاب کی مجلس عمل پوری مالی ذمہ داری اٹھانے پر آمادہ ہے۔ مولانا محمد شفیع نے بھی ۲۲ اکتوبر کو مولانا داؤد غزنوی ہی کی طرح مولانا احتشام الحق تھانوی کو مکتوب لکھا جس میں یہ تجویز پیش کی کہ کنونشن کی تاریخ ان ایام میں پیش کرنی چاہیے جن میں علما اس کانفرنس کے سلسلے میں جو مجلس اصول اساسی کی تجاویز کی پر غور کرنے کے لیے منعقد ہو رہی ہے کراچی میں موجود ہونگے۔ چنانچہ مولانا احتشام الحق (کنویز) نے ۱۱ دسمبر ۱۹۵۲ء کو دعوت نامے جاری کر دیے کہ آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کا اجلاس

۱۶ ۔۱۷ اور ۱۸ جنوری ۱۹۵۳ء کو منعقد ہوگا۔

اس کنونشن کی کاروائی کے متعلق دو بیانات ہیں ایک طرف مجلس عمل اور احرار کا بیان ہے اور دوسری جماعت اسلامی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا۔ اور دونوں میں کچھ فرق ہے مجلس عمل کے تحریری بیان یہ لکھا ہے کہ کنونشن کا اجلاس ۱۶ جنوری ۱۹۵۳ء کو بعد نماز جمعہ منعقد ہوا جس میں پاکستان کے بڑے بڑے علما شریک ہوئے۔ مسئلہ احمدیت پر بحث ہوئی اور سبجیکٹس کمیٹی مرتب کی گئی۔ اس تحریری بیان میں مندرجہ ذیل علما کے نام درج ہیں جو اس اجلاس میں شریک تھے:۔

(۱) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صدر جماعت اسلامی لاہور

(۲) حاجی محمد امین امیر جماعت ناجیہ

(۳) خلیفہ حاجی ترنگ زئی پشاور

(۴) حضرت پیر سر سینہ شریف امیر حزب اللہ ڈھاکہ۔ بنگال

(۵) مولانا راغب احسن ایم اے۔ ڈھاکہ

(۶) مولانا عزیز الرحمٰن ناظم حزب اللہ۔ ڈھاکہ

(۷) مولانا اطہر علی۔ ڈھاکہ

(۸) مولانا سخاوت الانبیا ڈھاکہ

(۹) مولانا محمد یوسف بنوری، صدر مدرس دار العلوم ٹنڈو الہ یار

(۱۰) مولانا شمس الحق وزیر معارف۔ قلات

(۱۱) مولانا ابراہیم میر سیالکوٹ

(۱۲) مولانا احمد علی صدر جمعیۃ العلمائے اسلام۔ شیرانوالہ گیٹ۔ لاہور۔

(۱۳) مولانا محمد حسن جامعہ اشرفیہ، نیلا گنبد۔ لاہور

(۱۴) مولانا محمد ادریس صدر مدرس جامعہ اشرفیہ، نیلا گنبد۔ لاہور۔

(۱۵) مولانا ظفر احمد عثمانی سیکرٹری تعلیمات اسلامی بورڈ۔ کراچی

(۱۶) مولانا سید سلیمان ندوی صدر تعلیمات اسلامی بورڈ۔ کراچی

(۱۷) مولانا محمد شفیع مفتی دیوبند۔ ممبر تعلیمات اسلامی بورڈ۔ کراچی۔

(۱۸) مولانا سلطان احمد امیر جماعت اسلامی کراچی وسندھ

(۱۹) مولانا مفتی صاحب داد خاں مدرس عربی۔ سندھ مدرسہ کراچی۔

(۲۰) مولانا عبدالحامد بدایوانی صدر جمعیت العلمائے کراچی۔

(۲۱) مولانا محمد یوسف کلکتوی صدر جمعیت اہل حدیث۔ کراچی

(۲۲) مولانا محمد اسماعیل ناظم جمعیت اہل حدیث

(۲۳) مولانا سید داؤد غزنوی ایم ایل اے صدر جمعیت اہل حدیث۔ مغربی پاکستان

(۲۴) مولوی محمد علی جالندھری جنرل سیکرٹری مجلس احرار۔ ملتان

(۲۵) مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری امیر شریعت

(۲۶) مولانا متین، ناظم جمعیت علمائے اسلام کراچی۔

(۲۷) مولانا احتشام الحق کنویز آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن۔ کراچی۔

(۲۸) مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صدر جمعیت علمائے پاکستان وصدر مجلس عمل۔

۱۷ جنوری ۱۹۵۳ء کو نماز مغرب کے بعد سبجیکٹیس کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ ۱۸ جنوری کو کنونشن کی دوسری نشست ہوئی جس میں حسب ذیل قراردادیں منظور کی گئیں۔

(۱) چونکہ خواجہ ناظم الدین وزیراعظم پاکستان کے رویے کے پیش نظر اس امر کی کوئی امید نہیں کہ مرزائیوں کے متعلق مطالبات تسلیم کر لیے جائیں گے۔ اس لیے پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ان حالات میں مطالبات کو تسلیم کرانے کی غرض سے راست اقدام ناگزیر ہو گیا ہے۔

(۲) چونکہ حکومت مرزائیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دینے پر آمادہ نہیں ہے اس لیے ایسی تدابیر اختیار کرنا ضروری ہو گیا ہے کہ فرقہ مرزائیہ کو ملت اسلامیہ سے خارج کر دیا جائے۔ ان تدابیر میں سے ایک یہ ہے کہ اس فرقے سے کامل مقاطعہ کیا جائے۔

(۳) چونکہ مرزائی وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خاں کی برطرفی کا مطالبہ اب تک منظور نہیں

کیا گیا۔اس لیے کنونشن خواجہ ناظم الدین سے استعفےٰ کا مطالبہ کرتی ہے تا کہ مسلمانان پاکستان اپنے دینی عقائد پر عمل کرنے اور اسلامی روایات کی حفاظت کرنے کے قابل ہو جائیں۔

(۴)مذکورہ بالا مطالبات کو عملی صورت دینے کی غرض سے کنونشن تجویز کرتی ہے کہ معزز و مقتدر مسلمانوں اور مختلف مذہبی جماعتوں کے نمائندوں کو جنرل کونسل کا ممبر بنائے۔

(۵)جنرل کونسل اپنے پندرہ ممبروں کو منتخب کرے۔جو مجلس عمل کے ممبر قرار پائیں۔

(۶)جنرل کونسل مندرجہ ذیل آٹھ اصحاب کو مجلس عمل کا ممبر منتخب کرتی ہے:۔

(۱)مولانا سید ابوالحسنات محمد احمد قادری

(۲)امیر شریعت سید عطاءاللہ شاہ بخاری

(۳)مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

(۴)مولانا عبدالحامد بدایونی

(۵)حافظ کفایت حسین

(۶)مولانا احتشام الحق تھانوی

(۷)ابو صالح محمد جعفر پیر صاحب سرسینہ شریف مشرقی پاکستان

(۸)مولانا محمد یوسف کلکتوی۔

اوران ممبروں کو اختیار دیتی ہے کہ بقیہ سات ممبروں کو اپنی مرضی سے نامزد کرلیں۔

(۷)مجلس عمل کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ مطالبات کے منظور کروانے کے لیے لائحہ عمل مرتب کرلے

(۸)مجلس عمل کو ہدایت کی جاتی ہے کہ کوئی عملی پروگرام اختیار کرنے سے پیشتر ایک نمائندہ وفد مقرر کرے جو مرکزی حکومت سے ملاقات کرکے اس کو لوگوں کے آخری فیصلے سے مطلع کردے۔اس وفد کو اختیار ہوگا کہ کابینہ کو آخری جواب کے لیے مزید وقت دے دے۔

اس دن نماز مغرب کے بعد مجلس عمل کے آٹھ ممبروں کا اجلاس ہوا اور مندرجہ ذیل سات

مزید ممبر شامل کرلیے گئے:۔

(۱) پیر غلام مجدد سرہندی

(۲) مولانا نور الحسن

(۳) ماسٹر تاج الدین انصاری

(۴) مولانا اختر علی خاں

(۵) مولانا اسماعیل گوجرانولوی

(۶) صاحبزادہ فیض الحسن

(۷) حاجی محمد امین سرحدی

اسی اجلاس میں مجلس عمل نے ایک وفد مرتب کیا تاکہ خواجہ ناظم الدین سے ملاقات کرے۔ چنانچہ ایک وفد جس کے رئیس مولانا عبدالحامد بدایوانی اور جس کے شرکا (۱) پیر صاحب سرسینہ شریف (۲) سید مظفر علی شمسی سیکرٹری ادارہ تحفظ حقوق شیعہ لاہور اور (۳) ماسٹر تاج دین انصاری صدر مجلس احرار تھے۔۲۲ جنوری ۱۹۵۳ء کو خواجہ ناظم الدین سے ملاقی ہوا۔خواجہ صاحب نے مطالبات سے ہمدردی کا اظہار کیا لیکن یہ کہا کہ میں ان مطالبات کو تسلیم کرنے سے قاصر ہوں۔

مجلس احرار کے تحریری بیان کا مطلب بھی یہی ہے۔بجز اس کے کہ مجلس احرار کے نزدیک وہ وفد ۶ جنوری کو مرتب کیا گیا تھا جو ۲۱ جنوری کو خواجہ ناظم الدین کی خدمت میں حاضر ہوا۔

تحریری بیان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ آٹھ منتخب ممبروں کا اجلاس ۱۸ جنوری کی شام کو ہونا قرار پایا تھا اور اس دن کے دوران میں ایک کھانے کی دعوت پر جو مفتی محمد شفیع کے ایک دوست نے دی تھی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے دوسرے ممبروں کو بتایا کہ وہ شام کے اجلاس میں شریک نہ ہوسکیں گے کیونکہ انہیں مجوزہ دستوری تجاویز کی ترمیمات کو مکمل کرنا ہے اور دوسرے دن کی صبح کو لاہور جانا ہے آپ نے مشورہ دیا کہ منتخب ممبر شام کو اپنا اجلاس منعقد کرلیں اور باقی سات ممبروں کو نامزد کر کے شامل کرلیں۔ایک اور نکتہ جس پر مجلس کا تحریری بیان مختلف ہے یہ ہے کہ ماسٹر تاج دین انصاری، مولانا محمد یوسف کلکتوی کے عوض میں نہیں بلکہ بنگال کے مولانا اطہر علی کی بجائے شامل کیے گئے تھے۔

جماعت اسلامی کا بیان حسب ذیل ہے:

جنوری ۱۹۵۳ء میں کراچی کے مقام پر مجلس اصول اساسی کی دستوری سفارشات پر غور کرنے کے لیے ایک کنونشن منعقد ہوئی جس میں مختلف خیالات وعقائد کے تینتیس (۳۳) مقتدر علما شریک ہوئے۔ اس کنونشن کے فوراً بعد ایک آل مسلم پارٹیز کنونشن منعقد کی گئی تا کہ تحریک ختم نبوت سے پیدا ہونے والی صورتحال پر غور کرے۔ مولانا ابوالا اعلیٰ مودودی نے اس کنونشن میں حصہ لیا اور سبجیکٹس کمیٹی میں یہ تجویز پیش کی کہ علما نے چونکہ قادیانی مسئلے کو اپنی ان ترمیمات میں شامل کر لیا ہے جوانہوں نے مجلس اصول اساسی کی رپورٹ میں تجویز کی ہیں۔ اس لیے اس معاملے پر اب کسی علیحدہ اقدام کی ضرورت نہیں۔ طویل بحث و مباحثہ کے بعد مولانا کی تجویز منظور کر لی گئی لیکن بدقسمتی سے اس کو کھلے اجلاس میں پیش کرنے کی اجازت نہ مل سکی کیونکہ اس کے متعلق صدر اجلاس نے ایک اصطلاحی رولنگ دے دیا تھا۔ مولانا نے اس کوشش میں ناکام رہنے بعد یہ تحریک پیش کی کہ ایک مرکزی مجلس عمل مرتب کی جائے جس کو قادیانی مسئلے کے آئینی حل کے لیے پروگرام وضع کرنے کا واحد مختار قرار دیا جائے اور کسی دوسرے فرد یا ادارے کو اس مسئلے کے متعلق کوئی طرز عمل اختیار کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ بدقسمتی سے مجلس عمل کے ارکان کی فہرست مکمل نہ ہوئی اور مجوزہ مجلس رسماً وجود میں نہ آسکی۔ لہذا جماعت کی رائے یہ ہے کہ کنونشن کی ممبر انجمنوں کی تمام سرگرمیاں ۱۷ جنوری سے ۲۶ فروری ۱۹۵۲ء تک خلاف آئین اور بے اثر تھیں۔ اس لیے جس وفد نے ۲۲ جنوری کو وزیراعظم سے ملاقات کر کے انہیں راست اقدام کا الٹی میٹم دیا وہ غیر مستند و غیر مختار تھا اور بہر حال کنونشن کا صحیح نمائندہ نہ تھا۔ اس وفد نے ایک مہینے کا جونوٹس وزیراعظم کو دیا اس کا اختیار بھی انہیں کسی آئینی جماعت نے نہ دیا تھا۔ جماعت اسلامی نے اپنے امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی وساطت سے ان غیر آئینی حرکات پر نکتہ چینی کی اور ۱۳ فروری کو مجلس عمل پنجاب سے مطالبہ کیا کہ فوراً مرکزی مجلس عمل کا اجلاس طلب کیا جائے اور اس معاملے میں تمام سرگرمیاں روک دی جائیں۔ یہ مطالبہ پہلے ملک نصر اللہ خاں عزیز کے ذریعے سے اور اس کے بعد ان کے اور میاں طفیل محمد جنرل سیکرٹری جماعت اسلامی کے توسط سے کیا گیا۔ ۱۹ فروری ۱۹۵۳ء کو جماعت کے سیکرٹری نے ممبروں

کے نام ہدایت جاری کی کہ ان فارموں پر دستخط نہ کریں جو مجلس عمل نے راست اقدام کے لیے رضا کاروں کی بھرتی کی غرض سے جاری کیے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ جب تک مرکزی مجلس عمل کسی پروگرام کی منظوری نہ دے جماعت کے کسی ممبر کو ان سرگرمیوں میں حصہ نہ لینا چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ دو ممبران ہدایت کی خلاف ورزی کی پاداش میں جماعت سے خارج کر دیے گئے۔ ۲۶ فروری ۱۹۵۳ء کو مرکزی مجلس عمل کا اجلاس کراچی میں ہوا جس میں مولانا مودودی نے اپنے نمائندہ مولانا سلطان احمد امیر جماعت اسلامی کراچی وسندھ کی وساطت سے یہ واضح کر دیا کہ راست اقدام کے پروگرام کا فیصلہ چونکہ غیر آئینی طریقے سے کیا گیا ہے اس لیے اس سلسلے میں تمام سرگرمیاں روک دی جائیں اور اس معاملے کے متعلق صرف مرکزی مجلس عمل کے احکام کی تعمیل کی جائے۔ مولانا سلطان احمد کو اختیار دیا گیا کہ اگر مرکزی مجلس عمل مولانا مودودی کی تجویز قبول نہ کرے تو وہ جماعت اسلامی کو اس مجلس عمل سے منقطع کر لیں۔ یہ تقدیر کی ستم ظریفی ہے کہ عقل کی بات سننے کی بجائے خود مرکزی مجلس عمل ہی ختم کر دی گئی اور ایک بالکل نئی راست اقدام کمیٹی قائم کر دی گئی جس نے دوسرے ہی دن راست اقدام شروع کر لیا۔ جماعت اسلامی من حیث الجماعت اس نئی کمیٹی یا کسی اور راست اقدام کمیٹی کی ممبر نہ تھی۔ نہ جماعت کے کسی فرد کو یہ اجازت دی گئی کہ وہ راست اقدام کے ورکر کی حیثیت سے بھرتی ہو، مولانا نے اپنے احکام سے اور اس عمل سے کہ انہوں نے جماعت کے دو ممبروں کو اس حکم کی خلاف ورزی کی پاداش میں خارج کر دیا۔ یہ حقیقت ہر شخص پر روشن کر دی کہ جماعت کسی اعتبار سے نہ راست اقدام پر یقین رکھتی ہے نہ اس کی حمایت کرتی ہے اور اپنے آپ کو ایسی تمام سرگرمیوں سے کاملاً منقطع کرتی ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا تحریری بیان مظہر ہے کہ احراریوں نے ۱۹۵۳ء میں قادیانی مسئلے پر شورش کا آغاز کیا تھا۔ اس وقت جماعت اسلامی کی رائے یہ تھی کہ قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ صحیح ہے لیکن چونکہ دستور وضع کیا جا رہا ہے لہٰذا مسلمانوں کے لیے یہ مناسب نہیں کہ اپنی توجہ کو کسی غیر آئینی شورش کی طرف منعطف کر لیں۔ اس وقت تمام کوششیں اس امر پر مرتکز کر دینی چاہئیں کہ ایک صحیح اسلامی دستور منظور ہو جائے اور قادیانیوں کا مسئلہ بھی ترتیب دستور کے دوران ہی

حل کرلیا جائے۔ جماعت کے اس خیال کا اظہار مجلس شوریٰ کی قرارداد مورخہ ۸ جولائی ۱۹۵۲ء میں کر دیا گیا تھا۔ احرار نے جولائی ۱۹۵۲ء میں تمام مذہبی جماعتوں کی ایک کنونشن منعقد کی جس کا دعوت نامہ جماعت اسلامی کو بھی موصول ہوا۔ جس نے مولانا امین حسن اصلاحی اور ملک نصر اللہ خاں عزیز کو اس کام پر مقرر کیا کہ کنونشن میں شامل ہو کر جماعت کے نقطۂ نگاہ کو پیش کریں۔ کنونشن میں ایک مجلس عمل مرتب کی گئی جس میں دو نشستیں جماعت اسلامی کو پیش کی گئیں۔ لیکن جماعت نے ان کو قبول نہ کیا۔ مولانا ابوعلیٰ مودودی ان تینتیس علما میں شامل تھے جو مجلس اصول اساسی کی رپورٹ پر غور کرنے کے لیے جنوری ۱۹۵۳ء میں کراچی میں جمع ہوئے تھے۔ اس رپورٹ کی ترمیمات میں ایک ترمیم یہ تھی کہ قادیانی بھی ان اقلیتوں میں شامل کیے جائیں جن کے لیے جداگانہ انتخاب اور جداگانہ نشستیں محفوظ کی جائیں گی۔ جنوری کے وسط میں ایک آل مسلم پارٹیز کنونشن بمقام کراچی منعقد کی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ تحفظ ختم نبوت کے مسئلے پر غور کیا جائے اس میں ایک مرکزی مجلس عمل کے قیام کی تجویز خود مولانا ابوعلیٰ مودودی نے پیش کی تھی لیکن ۲۶ فروری تک مجلس عمل کا کوئی اجلاس نہ ہوا۔ باقی سات ممبر بھی شامل نہ گئے۔ اس لیے کنونشن کی ممبر جماعتوں نے ۱۷ جنوری سے ۲۷ فروری تک جو کاروائی بھی کی وہ سب ناجائز تھی۔ چنانچہ اس وفد کی ترتیب جو ۲۳ جنوری کو وزیراعظم سے ملا پھر ایک مہینے کا نوٹس پھر راست اقدام کا اعلان اور پھر وہ قدم جو پنجاب میں راست اقدام کے سلسلے میں اٹھائے گئے، یہ سب کاروائیاں ناجائز اور خلاف آئین تھیں۔ جب ۱۳ فروری کو لاہور میں پنجاب کی مجلس عمل کا اجلاس ہوا تو مولانا نے ملک نصر اللہ خاں عزیز کی وساطت سے تحریری اعتراضات بھیج کر ان بے ضابطگیوں کے خلاف احتجاج کیا اور مطالبہ کیا کہ مرکزی مجلس عمل کا اجلاس طلب کیا جائے اور اس اثنا میں تمام کاروائیاں معطل رکھی جائیں۔ اس پر فیصلہ ہوا کہ مرکزی مجلس عمل کا ایک اجلاس ۱۷ فروری کو طلب کیا جائے۔ لیکن کوئی اجلاس منعقد نہ ہوا اور مولانا نے دوبارہ میاں طفیل محمد اور ملک نصر اللہ خاں عزیز کی وساطت کی سے مجلس عمل کے پاس تحریری اعتراض ارسال کیا۔ اس کے بعد ۲۶ فروری کو مرکزی مجلس عمل کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں جماعت کی طرف سے مولانا سلطان احمد کو یہ بھی ہدایت کی گئی کہ اگر مرکزی مجلس عمل اس کو منظور نہ کرے تو وہ جماعت اسلامی کو اس کی کاروائی سے

علیحدہ کرلیں۔لیکن کراچی میں خودمرکزی مجلس عمل ہی توڑ دی گئی اور اس کی جگہ ایک راست اقدام کمیٹی بنالی گئی جس نے دوسرے ہی دن راست اقدام کا اعلان کردیا۔جماعت اسلامی کا کوئی ممبر اس راست اقدام کمیٹی کاممبر نہ تھا۔جماعت نے مجلس شوریٰ منعقدہ ۴/۵ مارچ میں ایک قرارداد منظور کی جس میں اپنے آپ کو راست اقدام سے بے تعلق ظاہر کیا۔مولانا کے تحریری بیان کا باقی حصہ وہ ہے جو جماعت کا ہے۔

اب گویا مجلس عمل پنجاب اور احرار ایک طرف اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی دوسری طرف ہیں اور فریقین کے درمیان امر تنقیح طلب یہ ہے کہ آیا جماعت اسلامی راست اقدام کی قرارداد میں اور پھر اس قرارداد کے مطابق اقدام میں شامل تھی یا نہیں۔ہم نے اس مرحلے پر دونوں فریقوں کے درمیان صرف نکات اختلاف کو بیان کردیا ہے۔جس وقت ہم ذمہ داری کے مسئلے کو لیں گے تو کیس کے حصے کی پوری شہادت پر بحث کریں گے تاکہ یہ امر متعین ہو جائے کہ راست اقدام کی قرارداد اور اس کے پروگرام کی وجہ سے جو فسادات ہوئے۔ان کی ذمہ داری جماعت اسلامی پر کس حد تک عائد ہوتی ہے۔

وزیراعظم اور وزیراعلیٰ سے مزید ملاقاتیں

خواجہ ناظم الدین ۱۶ فروری ۱۹۵۳ء کو لاہور آئے۔اس وقت ایک وفد ان سے یہ دریافت کرنے کے لیے ملا کہ مطالبات کے متعلق کیا رویہ اختیار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔اس وفد میں مولانا اختر علی خاں،مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری،سید مظفر علی شمسی،ماسٹر تاج الدین انصاری اور حافظ خادم حسین شامل تھے۔خواجہ ناظم الدین نے جواب دیا کہ ان کی راہ میں بعض مشکلات حائل ہیں جن کا علم ارکان وفد کو نہیں۔اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ مطالبات تسلیم نہیں کیے جاسکتے۔تاہم انہوں یہ بھی کہہ دیا اگر وہ مزید گفت وشنید کے خواں ہیں تو کراچی آسکتے ہیں۔

۲۰ فروری کو ایک اور وفد جس میں مولانا محمد بخش مسلم،صوفی غلام محمد ترنم،سید مظفر علی شمسی اور

حافظ کفایت حسین شریک تھے وزیر اعلیٰ پنجاب سے ملا اور انہیں احمدیوں کے خلاف وہ شکایات یاد دلائیں جن کا تدارک صوبائی حکومت کر سکتی ہے۔وزیر اعلیٰ نے جواب دیا کہ وہ اس معاملے کے متعلق تحقیق کر رہے ہیں۔

۲۱ فروری ۱۹۵۳ء کو علما کا ایک اور وفد خواجہ ناظم الدین کی خدمت میں حاضر ہوا۔اس میں مولانا سلیمان ندوی، مولانا احتشام الحق تھانوی، مفتی محمد شفیع، مولانا اختر علی خاں اور مولانا عبدالحامد بدایونی شامل تھے۔ارکان وفد نے خواجہ صاحب کو بتایا کہ الٹی میٹم کا ایک مہینہ گزر چکا ہے اور ان کے مطالبات کے متعلق اب تک کوئی جواب نہیں دیا۔اس ملاقات میں سردار عبدالرب نشتر بھی موجود تھے۔گفتگو کے دوران میں مولانا احتشام الحق نے کاغذ کے ایک پرزے پر کچھ لکھ کر دوسروں کو دکھایا۔جس پر مولانا عبدالحامد بدایونی کے سوا باقی سب نے قبولیت کے اظہار کے طور پر سر ہلائے۔

دوسرے دن مولانا عبدالحامد بدایونی کی طرف سے خواجہ ناظم الدین کو ایک ٹیلیفون موصول ہوا مولانا نے بتایا کہ پنجاب کے بعض علما خواجہ صاحب سے ملاقات کرنے کے لیے آ رہے ہیں اور جو علماء اس سے پہلے دن خواجہ صاحب سے مل چکے ہیں، ان کو علمائے پنجاب کی ملاقات کے وقت طلب نہ کیا جائے۔اس دن کسی دوسرے وقت مولانا عبدالحامد بدایونی خواجہ ناظم الدین کے ہاں پہنچے اس وقت ماسٹر تاج دین انصاری، مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری اور سید مظفر علی شمسی ان کے ساتھ تھے۔سردار عبدالرب نشتر اس ملاقات کے وقت بھی موجود تھے۔مولانا اختر علی خاں بہاول پور جا چکے تھے۔جب ان سے کراچی آنے کے لیے ٹیلیفون کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں کراچی صرف اسی صورت میں آ سکتا ہوں کہ میرے لیے گورنر جنرل کا وائیکنگ طیارہ بھیجا جائے۔اس ملاقات میں بھی مطالبات کا اعادہ کیا گیا۔لیکن اس دفعہ ارکان وفد کو زیادہ واضح طور پر بتا دیا گیا کہ نہ مطالبات تسلیم کیے جا سکتے ہیں اور نہ خواجہ صاحب ان کو دستور ساز اسمبلی میں پیش کرنے پر آمادہ ہیں۔

ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ

۲۶ فروری ۱۹۵۳ء کو مرکزی مجلس عمل کا ایک اجلاس کراچی میں ہوا۔ اس اجلاس میں حسب ذیل اشخاص حاضر تھے (۱) ماسٹر تاج دین انصاری (۲) صاحبزادہ فیض الحسن (۳) سید نور الحسن بخاری (۴) مولانا سلطان احمد امیر جماعت اسلامی سندھ وکراچی (۵) مولانا سید ابوالحسنات محمد احمد قادری (۶) مولانا محمد عبدالحامد بدایونی (۷) مولانا احتشام الحق تھانوی (۸) سید عطاء اللہ شاہ بخاری (۹) مولانا محمد یوسف کلکتوی (۱۰) سید مظفر علی شمسی۔

اس اجلاس کی صدارت مولانا ابوالحسنات نے کی۔ اس میں اس مطلب کی ایک قرارداد منظور کی گئی کہ ۱۸ جنوری کی کنونشن میں مرکزی حکومت کو جو نوٹس دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ وہ چونکہ مجلس عمل کے ایک وفد نے اس حکومت کے حوالے کر دیا تھا۔ اور ۲۲ فروری کو اس نوٹس کی معیاد ختم ہو گئی۔ بلکہ مزید چار دن بھی گزر چکے ہیں۔ اس لیے اب پرامن راست اقدام کی شکل کا فیصلہ کیا جانا ضروری ہے۔ راست اقدام کی شکل کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا کہ پانچ رضا کار جو ایسے جھنڈے اٹھائے ہوئے ہونگے جن پر مطالبات ثبت ہونگے۔ شارع عام پر نہیں بلکہ چھوٹی سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے وزیراعظم کی کوٹھی پر جائیں گے۔ اگر وہاں سنتری ان رضا کاروں کو روکے گا تو وہ اس سے کہیں گے کہ وزیراعظم کی خدمت میں مطالبات پیش کرنے اور ان کو تسلیم کرنے کی درخواست کرنے آئے ہیں۔ اور وہ اسی صورت میں واپس جائیں گے کہ وزیراعظم ان مطالبات کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیں۔ اگر یہ رضا کار گرفتار کر لیے جائیں گے تو مجلس عمل پانچ اور رضا کاروں کا دستہ بھیجے گی اور یہ سلسلہ پرامن طریقے پر اس وقت تک جاری رہے گا جب تک مطالبات تسلیم نہ کیے جائیں گے۔ گورنر جنرل کی کوٹھی پر بھی اسی قسم کا پہرہ لگایا جائے گا تا کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ اس تحریک کا رخ خواجہ ناظم الدین کی طرف اس لیے ہے کہ وہ بنگالی ہیں۔ مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری اس متبرک تحریک کے ڈکٹیٹر مقرر کیے گئے تھے۔ اور انہیں گرفتاری کی صورت میں اپنے جانشین کی نامزدگی کا اختیار دیا گیا۔ یہ بھی قرار دیا گیا کہ اسی دن شام کو آرام باغ میں جو جلسہ ہو رہا ہے۔ اس میں

عوام کو یہ مشورہ دیا جائے کہ وہ حسب معمول اپنے کاروبار میں مصروف رہیں اور رضا کاروں کے ساتھ نہ جائیں۔

ڈائریکٹ ایکشن کی دھمکی کے مقابلے کی تیاریاں

پنجاب میں یہ اطلاعات موصول ہونے لگیں کہ ڈائریکٹ ایکشن کی دھمکی عمل میں لائی جا رہی ہے۔اور عنقریب سول نافرمانی کی پوری تحریک کا آغاز ہونے والا ہے۔١٦فروری یا اس کے لگ بھگ سی آئی ڈی برانچ پنجاب کو انٹیلی جنس بیورو کراچی کی طرف سے مندرجہ ذیل اطلاع موصول ہوئی

کراچی۔١٤رفروری ١٩٥٣ء

گشتی یاداشت

ذرائع خبر رسانی کی ایک رپورٹ جو کسی قدر قرین حقیقت معلوم ہوتی ہے مظہر ہے کہ تحریک ختم نبوت کے علمبردار پنجاب اور کراچی میں ٢٢ فروری ١٩٥٣ء سے اپنے پانچ مطالبات کے سلسلے میں سول نافرمانی کی ایک تحریک جاری کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ان کے مطالبات یہ ہیں:(١) عزت مآب چودھری ظفر اللہ خاں کو وزیر خارجہ کے عہدے سے برطرف کیا جائے (٢) قادیانیوں کو ایک اقلیت قرار دیا جائے (٣) قادیانیوں کو جو اراضی ربوہ میں دی گئی ہے وہ ان سے واپس لے کر مہاجرین کی آبادکاری میں صرف کی جائے (٤) قادیانیوں کو حکومت کے کلیدی عہدوں سے الگ کر کے ان کی جگہ مسلمان مقرر کیے جائیں (٥) دستور پاکستان خالص اسلامی خطوط پر وضع کیا جائے۔

٢۔اس شورش کے سلسلے میں پہلا شخص جو پنجاب میں اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کرے گا وہ غالباً صاحبزادہ فیض الحسن ہوگا جس کے تیس ہزار مرید ہیں۔کہا جاتا ہے کہ اس کے تمام مرید تحریک میں اس کی پیروی کریں گے۔

(٣) کراچی میں لال حسن اختر کے بجائے جو ایک اطلاع کے مطابق اب نامقبول ہو چکا

ہے کیونکہ اس نے پچھلے سال کوئی چوبیس ہزار روپیہ صرف کر دینے کے باوجود کوئی کامیابی حاصل نہیں کی ایک شخص محمد جوہر نائب ناظم اعلیٰ جماعت ختم نبوت اس شورش کے آغاز کے منصوبوں کی تکمیل کرے گا۔ لیکن محمد جوہر اس عمل کے شروع کرنے میں مشکلات محسوس کر رہا ہے کیونکہ رضا کار کافی تعداد میں دستیاب نہیں ہوتے۔ آئندہ چند روز کے دوران میں اس کی واحد کوشش یہ ہوگی کہ زیادہ سے زیادہ رضا کار بھرتی کرے جو اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کرسکیں۔ کل اس نے ایک شخص نیاز احمد کو بولٹن مارکیٹ کی میمن مسجد میں جمع کر کے نمازیوں کے سامنے تقریر کرنے کے لیے بھیجا۔ لیکن نیاز احمد تقریر کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ خداداد اور قائد آباد کالونیوں کے بعض باشندوں کے متعلق اطلاع ملی ہے کہ وہ بطور رضا کار بھرتی ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی پوری تعداد اب تک معلوم نہ ہوسکی ہے۔ تجویز یہ ہے کہ آئندہ چند روز کے اندر جہانگیر آباد میں جو عثمانیہ کالونی کے قریب ہے رضا کاروں کو بھرتی کرنے کی غرض سے ایک جلسہ منعقد کیا جائے۔

۴۔ معلوم ہوا ہے کہ محمد علی جالندھری نے ہدایت جاری کی ہے۔ اور رضا کاروں کو حکم جاری کیا ہے کہ ۲۱ اور ۲۲ فروری ۱۹۵۳ء کی درمیانی نصف شب کے وقت روانگی کے لیے تیار ہو جائیں۔

(۵) ذریعہ خبر رسانی کی اطلاع مذکورہ بالا ان اقدامات کے متعلق ہے جن کا منصوبہ کراچی میں تیار کیا جا رہا ہے۔ یہ معلوم نہیں ہوا کہ پاکستان کے دوسرے مقامات پر کیا منصوبے تیار کیے گئے ہیں لہذا استدعا کی جاتی ہے کہ تماصوبوں کی سی آئی ڈی از راہ نوازش ضروری ہے اقدام کی غرض سے فوری تحقیقات کرے''۔

مندرجہ ذیل انتہائی خفیہ نہایت فوری اور مرموز حروف میں ایک تار 'فارن کراچی' کی طرف سے ۱۹ فروری ۱۹۵۳ء کو پنجاب میں موصول ہوا:۔

زمیندار' اور آزاد' لاہور میں عنوانات مضامین اور تبصروں کے ذریعے سے احمدیوں کے خلاف شورش کو برابر تیز کیا جا رہا ہے۔ بعض تازہ مثالیں یہ ہیں: 'زمیندار' مورخہ ۱۶، ۱۷

فروری میں علی الترتیب مقالہ افتتاحیہ اور احمدیوں کے خلاف مضامین درج ہیں۔ اور ۴، ۸ اور ۱۱ فروری کے ’آزاد‘ میں ایک سلسلہ مضامین اور نظمیں شائع ہوئیں ہیں۔ اس سے قبل ’آزاد‘ میں جو قابل اعتراض مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی طرف صوبائی حکومت کو توجہ دلائی جا چکی ہے۔

۲۔ اب ایک اطلاع ہمارے علم میں آئی ہے کہ احمدیوں کے مخالف عناصر پنجاب میں اپنی شورش کو تیز تر کرنے کی غرض سے ۲۲ فروری سے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کریں گے۔ مرکزی حکومت کو مسرت ہوگی اگر صوبائی حکومت اس اطلاع پر اپنے خیالات کا اظہار کرے اور مرکزی حکومت کو یقین ہے کہ اخبارات کو شورش کی آگ بھڑکانے سے روکنے کی ضروری تدابیر اختیار کی جائیں‘‘۔

اس تار کے موصول ہونے پر چیف منسٹر، ہوم سیکرٹری اور مسٹر انور علی نے (جواب مسٹر قربان علی خاں کی جگہ انسپکٹر جنرل پولیس تھے) گفت وشنید کی جس کا نتیجہ ۲۰ فروری ۱۹۵۳ء کو مسٹر انور علی نے ان الفاظ مین قلمبند کیا:۔

’’اس کیس پر آج صبح میں نے اور ہوم سیکرٹری نے چیف منسٹر صاحب سے گفتگو کی چیف منسٹر صاحب نے مسودے پر جو ترمیمات تجویز کیں وہ کر دی گئی ہیں۔ کیا چیف سیکرٹری صاحب ازراہ کرم اس پر دستخط کر دیں گے۔ تاکہ اسے فوراً جاری کر دیا جائے؟

۲۔ چونکہ پرسوں اتوار ہے اس لیے ممکن ہے کراچی میں مسودے پر کاروائی میں تاخیر ہو جائے اس لیے میری تجویز یہ ہے کہ تار موصولہ ۱۹ فروری ۱۹۵۳ء کے جواب میں ایک مرموز تار بھیج دیا جائے۔ مسودہ شامل ہے۔

۳۔ چیف منسٹر صاحب کی تجویز ہے کہ ذیل کے خطوط پر مزید کاروائی کی جائے:۔

(ا) گزشتہ مہینے دو مہینے کے اندر صوبے میں جو مکروہ واقعات رونما ہوئے ہیں اور جن کا ذکر حکومت پاکستان کی چٹھی میں کیا گیا ہے ان کی مناسب اشاعت ہونی چاہیے۔ چیف منسٹر کی خواہش ہے کہ ہوم سیکرٹری ’’آفاق‘‘ ’’مغربی پاکستان‘‘ اور ’’احسان‘‘ کے ایڈیٹروں کو طلب

کر کے انہیں مناسب ہدایات دیں۔ان کی یہ بھی کہ خواہش ہے کہ ڈی پی آر صاحب ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے ایڈیٹر سے بات کر کے ان کو مشورہ دیں کہ وہ صورتحال کے متعلق زیادہ مقصدی انداز میں ایسے مضامین لکھیں جن سے عوام بہت زیادہ بے رخی کا اظہار نہ کریں۔

(II) آل پارٹیز مسلم کنونشن کے جن کارکنوں نے اس شورش کی حمایت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے ان کو ہوم سیکرٹری صاحب طلب کریں اور بتائیں کہ ان کی شورش اب پرامن رہی اور ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں جن سے عوام کے دلوں میں حقیقتاً خوف و دہشت کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ان کو یہ بتا دیا جائے گا کہ اگر امن و قانون کی حدوں کو توڑا گیا تو صوبائی حکومت اس کے لیے براہ راست اس شورش کے علمبرداروں کو ذمہ دار قرار دے گی۔

(III) چیف سیکرٹری صاحب ڈائریکٹر تعلقات عامہ کو ہدایت دیں کہ وہ مولانا ابوالحسنات، مولانا ترنم اور مولانا محمد بخش مسلم کو طلب کر کے انہیں ایسی تقریریں کرنے سے پرہیز کرنے کا مشورہ دیں۔جن میں عوام کو قانون و انتظام کی خلاف ورزی پر اکسایا گیا ہو۔ڈائریکٹر تعلقات عامہ، مولانا اختر علی خاں کو علیحدہ طلب کر کے ان سے مناسب گفتگو کریں۔

۴۔ہوم سیکرٹری نے اس یادداشت کو پڑھ لیا ہے اور وہ اس کے مطابق عمل کر رہے ہیں۔چیف سیکرٹری صاحب از راہ کرم ڈائریکٹر تعلقات عامہ کو ہدایت دیں''۔

جو مرموز (سائیفر) تار ۱۹ فروری کو کراچی سے موصول ہوا تھا۔اس کے جواب میں چیف سیکرٹری نے ۲۱ فروری کو مندرجہ ذیل تار ارسال کیا:۔

''جس شورش کی دھمکی دی گئی ہے وہ غالباً کراچی میں شروع کی جائے گی لیکن اس کے اثرات اس صوبے (پنجاب) اور دوسرے صوبوں میں بھی رونما ہو سکتے ہیں صوبائی حکومت صورتحال سے برابر مطلع ہے۔آپ کی رہنمائی حاصل کی غرض سے مفصل چٹھی آج ارسال کی جارہی ہے''۔

اس تار کے ساتھ چیف منسٹر کی منظوری سے مندرجہ ذیل چٹھی بھی ارسال کی گئی:۔

''نمبر 2249-BDSB

پنجاب سول سیکرٹریٹ لاہور

۲۱ فروری ۱۹۵۳ء

مکرمی احمد صاحب

ازراہ کرم غیاث الدین احمد کی ڈی او چٹھی نمبر 14682-BDSB مورخہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۵۲ء بنام حمید الدین احمد احرار شورش کے موضوع پر لکھی گئی تھی۔ بغرض حوالہ پیش نظر رکھ لیجئے۔

۲۔ کچھ وقت کے لیے شورش کی رفتار نرم پڑ گئی تھی لیکن حال ہی میں عوام کی دلچسپی کو تیز کرنے کی کوششیں خاصی شدت کے ساتھ دوبارہ جاری کر دی گئی ہیں۔ صوبے بھر میں بیشمار کانفرنسیں اور جلسے منعقد کیے گئے ہیں اور آتش ریز تقریریں کی گئی ہیں۔ ملاؤں کی تائید و حمایت حاصل کر لی گئی ہے اور احمدیوں کے خلاف زہر اگلا جا رہا ہے۔ گوجرانوالہ میں مطبوعہ اشتہارات نشر کیے گئے ہیں۔ جن میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ احمدیوں سے اچھوتوں کا سا سلوک کیا جائے اور کھانے پینے چیزوں کی دکانوں پر ان کے لیے علیحدہ برتن رکھیں جائیں۔ کچھ مدت تک ضلع گوجرانوالہ میں اس امر پر بھی زور دیا گیا ہے کہ احمدیوں کو مسلمانوں کے قبرستانوں میں دفن کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ صرف پولیس کی مداخلت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ ایسے واقعات نہ ہونے پائے۔ احمدیوں نے جو اس نئی حرکت سے بہت زیادہ مضطرب ہو گئے تھے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو درخواست دی کہ انہیں اپنا علیحدہ قبرستان بنانے کے لیے زمین الاٹ کی جائے۔ یکم فروری ۱۹۵۳ء کو سرگودھا میں مسلمانوں کے قبرستان میں ایک احمدی میّت کی تدفین کے خلاف مزاحمت کی گئی۔ پولیس موقع پر پہنچ گئی جس سے صورتحال پر قابو پالیا گیا۔ احمدیوں کے مجلسی مقاطعہ کی تلقین کھلم کھلا کی جا رہی ہے۔ منٹگمری میں ایک مقرر نے کہا کے احمدیوں کی دکانوں پر پکٹنگ کی جائے۔ اور ان کو عوامی کنووں سے پانی بھرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ شورش کا لہجہ قطعی طور پر نہایت پست اور متبذل صورت اختیار کر گیا ہے۔ صوبے بھر میں رضا کاروں کی بھرتی کے لیے ایک مہم کا آغاز کر دیا

گیا ہے۔اور صاحبزادہ فیض الحسن پہلا ڈکٹیٹر مقرر کیا گیا ہے۔رضا کاروں سے ایک حلف نامے پر دستخط کرائے جاتے ہیں۔کہ اگر رسول پاکؐ کی عزت کے لیے جان دینے کی ضرورت پڑے گی تو وہ اس میں دریغ نہیں کریں گے۔کہا جاتا ہے کہ بعض رضا کاروں نے حلف نامہ اپنے خون سے لکھ کر پیش کیا ہے۔لاہور میں کوئی ڈیڑھ سو اشخاص بھرتی ہوئے ہیں۔صوبے کے دوسرے کے حصوں میں اب تک جو رضا کار بھرتی ہوئے ہیں۔ان کی تعداد کا اندازہ پانچ سو کے قریب لگایا جاتا ہے۔صوبے بھر میں پچاس ہزار رضا کاروں کو بھرتی کرنا مقصود ہے۔ماسٹر تاج الدین انصاری (صدر آل پاکستان مجلس احرار) سید مظفر علی شمسی (سیکرٹری ادارہ تحفظ حقوق شیعہ) اور صاحبزادہ فیض الحسن کا رویہ خصوصاً جارحانہ ہو رہا ہے۔

۳۔آل پارٹیز کنونشن جو گزشتہ ماہ جولائی میں احراریوں نے مرتب کی تھی۔اس کا ایک اجلاس ۱۶ جنوری سے ۱۸ جنوری تک کراچی میں منعقد ہوا۔جس میں حسب معمول مطالبات کی قرار دادیں منظور کی گئیں۔اس کنونشن کے مندوب جب سے پنجاب واپس آئے ہیں۔ان کا طرز عمل پہلے کی نسبت زیادہ سرکشانہ ہو گیا ہے۔ظاہر ہے کراچی میں علما کی کانفرنس نے احمدیوں کو ایک اقلیت قرار دینے کی جو حمایت کی اس سے ان لوگوں کو بہت تقویت پہنچی ہے۔ان کا بیان ہے کہ وزیر اعظم نے،جن سے ملاقات کر چکے ہیں ان کے مطالبات سے ہمدردی نہیں کی۔لہٰذا صاحب موصوف کو الٹی میٹم دے دیا ہے کہ ۲۳ فروری کو راست اقدام کریں گے وہ ظاہر کر رہے ہیں کہ کراچی کے عوام ان کے حامی ہیں اور اگر تحریک شروع ہو گئی تو وہ جوق در جوق اس کی حمایت کریں گے۔وہ مرکزی حکومت کے ارکان پر الزام عائد کر رہے ہیں کہ انہوں نے وعدے کیے لیکن ان کا ایفا نہ کیا۔کراچی سے مندوبین کی واپسی کے بعد اس شورش میں ایک نئے پہلو کا اضافہ ہو گیا ہے۔یعنی عزت مآب وزیر اعظم پاکستان کے خلاف بدگوئی اور دشنام طرازی کی مہم شروع کر دی گئی ہے۔شورش کے ابتدائی مرحلوں میں سر ظفر اللہ خاں کی موقوفی کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔لیکن اب بعض

مقررین یہ کہہ رہے ہیں کہ عزت مآب وزیر اعظم کو اپنے عہدے سے مستعفی ہو جانا چاہیے۔

۴۔کہا جاتا ہے کہ ڈائریکٹ ایکشن' کراچی میں شروع کیا جائے گا اور اس کے لیے رضا کار پنجاب اور دوسرے صوبوں سے بھیجے جائیں گے'ڈائریکٹ ایکشن احمدیوں کی دکانوں پر پکٹنگ کی شکل اختیار کرے گا۔یہ دھمکی بھی دی گئی ہے کہ اگر دفعہ ۱۴۴ کے ماتحت احکام جاری کیے گئے تو ان کی خلاف ورزی کی جائے گی۔مطالبات حسب ذیل ہیں:۔

(I) سر ظفر اللہ خاں کو وزیر خارجہ کے عہدے سے برطرف کیا جائے۔

(II) احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔

(III) جو احمدی حکومت کے کلیدی عہدوں پر قابض ہیں ان کو عہدوں سے موقوف کیا جائے۔

۵۔اس شورش کو جماعت اسلامی ،اہلسنت و الجماعت ،اہلحدیث اور شیعوں کی حمایت حاصل ہے۔پیر صاحب گولڑہ شریف (ضلع راولپنڈی) پیر صاحب سیال شریف (ضلع سرگودھا) پیر صاحب علی پور سیداں (سیالکوٹ) پیر شوکت حسین (سجادہ نشین پیر صاحب ملتان) اور بعض دیگر حضرات نے اس شورش کو برکت کی دعا دی ہے سرمایہ جمع کیا جارہا ہے اور ایک روپے کے نوٹ (رسیدیں) چھاپ کر فروخت کیے جارہے ہیں۔بازاری اور غنڈا عناصر نے بھی شورش پسندوں کی تائید وحمایت اختیار کر لی ہے۔آزاد پاکستان پارٹی کی شاخ بہاولپور نے شورش پسندوں کو ایک ہزار روپے کی رقم عطا کی ہے۔

۶۔جب یہ معلوم ہوا کہ عزت مآب وزیر اعظم ۱۶ تاریخ کو لاہور آرہے ہیں تو ایک جلسہ عام منعقد کیا گیا۔جس میں اعلان کیا گیا کہ وزیر اعظم کے دورہ کی تاریخ کو ہڑتال کی جائے اور مکانوں کی چھتوں پر کالی جھنڈیاں لگائی جائیں۔مقررین نے احتیاطاً اس بات پر زور دیا کہ تشدد سے کام نہ لیا جائے۔لیکن علما عوام کے احساسات کو مشتعل کرنے میں برابر مشتعل رہے۔بعض مقررین نے اپنی تقریروں میں کہا کہ نافرمانی شروع ہونے کی حالت میں پولیس کے جن ملازموں کو گرفتاریاں کرنے کا حکم دیا جائے انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ روز

قیامت انہیں افعال کے لیے جوابدہی کرنی پڑے گی جوان کے فرائض مذہبی کے منافی ہونگے۔ ۱۶ تاریخ کی صبح کوسکولوں کے لڑکوں اور بازاروں کے لونڈوں کے دستے ادھر اُدھر بھیج دیئے گئے۔ اور دوکانداروں کو دکانیں بند کرنے کی ہدایت کی گئی۔ بہت سے لوگ اپنی دکانیں کھلی رکھنا چاہتے تھے لیکن ان کو دھمکایا گیا۔ اور وہ غریب ان لڑکوں اور دوسرے لوگوں کے سامنے جو بازار میں چکر کاٹ رہے تھے عاجز آکر دکانیں بند کرنے پر مجبور ہو گئے۔ چند سکول بھی بند کر دیئے گئے۔ دو ایسے واقعات بھی ہوئے جن میں تشدد اور خونریزی تک نوبت پہنچ گئی۔ ایک واقعہ دیال سنگھ کالج کے باہر اور دوسرا تعلیم الاسلام کالج (احمدیوں کی درسگاہ) میں رونما ہوا جب ان کالجوں کے طلبہ نے ہڑتال کرنے سے انکار کر دیا تو طرفین کی طرف سے خشت باری ہوئی۔ سر ظفر اللہ خاں کا ایک جنازہ بھی نکالا گیا اور متعدد چھوٹے چھوٹے جلوس بازاروں میں چکر لگانے لگے۔ پابندِ قانون شہری ان مظاہروں کو پسند نہ کرتے تھے۔ لیکن محض خوف سے ناپسندیدگی کا اظہار نہ کرتے تھے کہ مبادا ان کو بھی احمدی قرار دے دیا جائے۔

۷۔ کہا گیا ہے کہ کراچی میں 'ڈائریکٹ ایکشن' شروع کرنے کے لیے آخری تاریخ ۲۳ مقرر کی گئی تھی۔ احراری لیڈروں نے عوام کے غیظ وغیض وغضب کو اس حد تک مشتعل کر دیا ہے کہ اب ان کے لیے پیچھے ہٹنا بے حد مشکل ہے وہ بڑی تیز وتند اور جنگجویانہ تقریریں کرتے رہے ہیں۔ اور انہیں محض اپنی عزت سلامت رکھنے کی خاطر بھی ۲۳ تاریخ کو کوئی نہ کوئی ڈرامائی اقدام کرنا پڑے گا۔

۸۔ لاہور میں قریب قریب ہر شب کو جلسے ہو رہے ہیں جن میں احمدیوں کے خلاف عوام کے احساسات کو مشتعل کرنے کے لیے تقریریں کی جاتی ہیں۔ ۱۶ تاریخ کو بعض دکانداروں کے منہ کالے کر دیے گئے کیونکہ انہوں نے دکانیں بند کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ دیال سنگھ کالج کے قریب مظاہرین نے ایک موٹر کار کو بھی کسی قدر نقصان پہنچایا۔ ۱۸ تاریخ کو نارتھ ویسٹرن ریلوے کی ورکشاپ میں ایک احمدی جو کئی روز سے طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا جا رہا

تھا، غصے میں بھر گیا اور اس نے ایک غیر احمدی کو لوہے کی ایک سلاخ مار کر بیہوش کر دیا۔ اس وقت سے یہ احمدی مفرور ہے۔ اور اس کا کوئی اتا پتہ معلوم نہیں۔ لاہور کے ایک ڈپو ہولڈر نے ایک احمدی عورت کے ہاتھ گیہوں فروخت کرنے سے انکار کر دیا اور آخر اس وقت مہربان ہوا جب اس عورت نے یہ وعدہ کر لیا کہ احمدیوں کے خلاف جو تحریک شروع ہوگی وہ اس میں شامل ہوگی۔ سنت نگر کے پرائمری سکول کے ایک طالب علم کو اس کے ہم جماعت نے گھیر لیا اس کو تھپڑ مارے اور مرزائی کتا کے نعرے لگائے۔

۹۔ یہ شورش صرف اسی صوبے تک محدود نہیں۔ نہ وہ مطالبات جن پر بظاہر یہ شورش مبنی ہے صوبائی حکومت کے دائرہ اختیار میں داخل ہیں۔ اس لیے حکومت کو اس صورتحال کا مداوا کرنے میں سخت دقت محسوس ہو رہی ہے اور وہ سمجھتی ہے کہ اگر مرکزی حکومت ان مطالبات کے متعلق ایک مضبوط پالیسی اختیار کرنے کا اعلان کرے تو صوبائی حکومت کے ہاتھ کافی مضبوط ہو جائیں گے۔ وہ پالیسی کچھ بھی ہو لیکن اس کے اعلان کے بعد کسی کو اس بارے میں کوئی شبہ باقی نہ رہے گا۔ کہ حکومت پاکستان کا ارادہ کیا ہے۔ اور کیا رویہ اختیار کرنا چاہتی ہے۔ صوبائی حکومت محسوس کرتی ہے کہ وہ صوبے کے اندر اس پالیسی پر عملدر آمد کرانے کے لیے کافی طاقتور ہے۔

آپ کا مخلص

(دستخط) ایچ۔اے۔ مجید

بخدمت جی۔ احمد۔ صاحب

سیکرٹری حکومت پاکستان۔ وزارت داخلہ۔ کراچی

اسی دن مسٹر انور علی انسپکٹر جنرل پولیس نے چیف سیکرٹری کو یادداشت لکھ کر ارسال کی:۔

''حکومت غالباً اس تقریر کی روداد پر مطلع ہونے خواہاں ہوگی۔ جو مولوی محمد علی جالندھری نے ۵/فروری ۱۹۵۳ء کو لاہور کے ایک جلسے میں کی۔ ایک بات خاص طور پر قابل ملاحظہ

ہے کہ ایک دفعہ زور فصاحت میں اس مقرر نے اعتراف کیا کہ وہ اور ان کی جماعت تقسیم ملک کے خلاف تھے، وہ لوگوں پر ظاہر ہونے چاہئیں لیکن اگر اب تک انہیں ان کا شعور حاصل نہیں ہوا تو ایک یا دو سال کے اندر انہیں سب معلوم ہو جائے گا۔ اس نے حکومت کی شدید مذمت کی اور اس کے حملوں کا سب سے بڑا ہدف وزیر اعظم پاکستان تھے۔ اس جلسے میں مقررین پاکستان نے پنجاب اور صوبہ سرحد کے چیف منسٹروں کو بھی برا بھلا کہا۔ وزیر اعظم پاکستان کو کھلم کھلا مرزائی کہا جا رہا ہے۔ ایک اور جلسہ میں عطا اللہ شاہ بخاری نے ان کو 'بدھوالذین احمقون کہا'۔ ان تقریروں کی خصوصیت صرف تحقیر تھی۔

۲۔ جس زمانے میں غذا کی کمی ہو، بیروزگاری عام ہو، کاروبار کی کساد بازاری ہو اور کشمیر کے متعلق عام خیال یہ ہو اس کو ہم کھو چکے ہیں۔ جو شخص بد نظمی اور ابتری پھیلانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ پاکستان کا دوست نہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ احرار اور دیگر علما جو ان کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ عوام کی توجہ ان سنگین مسائل کی طرف سے جو آج ملک کو درپیش ہیں۔ منحرف کرنے میں خاص طور پر کامیاب ہوئے ہیں۔ اس ابتری کی وجہ سے عوام کا وہ عزم کمزور ہو جائے گا۔ جو ان مسائل کا مقابلہ اور ان کا مداوا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ ہمارے پاس اس امر کی شہادت موجود ہے کہ احرار نے آزاد پاکستان پارٹی کی شاخ بہاولپور سے روپیہ لیا۔ یہ لوگ پاکستان کی بیخ کنی کر رہے ہیں۔ حکومت کو کمر ہمت باندھ کر اس خطرے کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ حکومت پڑھے لکھے طبقے کی ہمدردی کھو چکی ہے اور اب غیر ملکی لوگوں پر بھی ظاہر کر رہے ہیں کہ غالباً حکومت اس بحران کا مقابلہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی جو علما نے پیدا کر رکھا ہے۔ 'لندن ٹائمز' کے نمائندے نے حکومت پنجاب کے ایک افسر سے یہ کہا کہ مرکزی حکومت کمزور ہے اور موجودہ مسائل کے موثر مداوا کی اہلیت نہیں رکھتی۔ رات لاہور کے برطانوی ڈپٹی ہائی کمشنر نے مجھے بتایا کہ ایسی اطلاعات موصول ہوئی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک کی صورتحال بیحد تشویش انگیز ہے۔ اور ایک عام ہنگامہ عنقریب برپا ہونے والا ہے۔ حسین شہید سہروردی، ملک خضر حیات خاں اور نواب ممدوٹ برطانوی ڈپٹی

کمشنر سے ملاقات کر چکے ہیں۔ہم نے مرکزی حکومت کو صورتحال کی نزاکت سے مطلع کر دیا ہے۔امید ہے کہ وہ کوئی مضبوط طرزِ عمل اختیار کرے گا۔

۳۔مولوی محمد علی جالندھری پہلے بھی قابل اعتراض تقریریں کرتا رہا ہے اور اس منشا کے احکام جاری کیے گئے تھے کہ اس نے منٹگمری میں جو تقریر کی تھی ،اس کی بنا پر اس کے خلاف زیر دفعہ ۱۲۴۔الف مقدمہ چلایا جائے۔میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہ کیس اب کس مرحلے پر ہے''۔چونکہ اب یہ واضح تھا کہ ''ڈائریکٹ ایکشن'' کسی وقت بھی عملی صورت اختیار کرے گا۔اس لیے مسٹر انور علی نے پولیس کے تمام سپرنٹنڈنٹوں اور سی آئی ڈی کے گروپ افسروں کو حکم دے دیا تھا کہ چوکنے رہیں اور صورتحال کا مطالعہ احتیاط سے کرتے رہیں ان افسروں سے یہ استدعا بھی کی گئی تھی کہ رضا کاروں کی بھرتی کے متعلق معلومات فراہم کریں۔بعد میں جو اعداد و شمار موصول ہوئے وہ مظہر تھے کہ صوبے بھر میں پچپن ہزار سے زائد رضا کار بھرتی ہو چکے ہیں۔جب وزیر اعظم پر حقیقت واضح ہو گئی کہ صورتحال روز بروز نازک ہوتی جا رہی ہے اور قانون و انتظام کو جو خطرہ درپیش ہے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کچھ تدابیر فوری طور پر اختیار کرنی چاہئیں۔تو انہوں نے مرکزی کابینہ کا ایک اجلاس منعقد کرانے کا فیصلہ کیا۔پنجاب اور صوبہ سرحد کے نمائندوں کو بھی اس اجلاس میں شامل ہونی کی ہدایت کی گئی۔چنانچہ یہ اجلاس ۲۶ فروری کو شام کو منعقد ہوا اور اس میں صوبہ سرحد سے خواجہ شہاب الدین گورنر اور خان عبدالقیوم خان وزیر اعلیٰ اور پنجاب سے مسٹر محمد حسین چٹھہ وزیر مال، مسٹر غیاث الدین احمد ہوم سیکرٹری اور مسٹر انور علی انسپکٹر جنرل پولیس شامل ہوئے۔مسٹر آئی آئی چندریگر گورنر پنجاب اور مسٹر محمد ممتاز خان دولتانہ وزیر اعلیٰ دونوں اس اجلاس میں مدعو کیے گئے تھے لیکن چونکہ انہیں لاہور میں بعض دوسری مصروفیتیں لاحق تھیں اس لیے کراچی نہ جا سکے۔لیکن انہوں نے وزیر مال پنجاب اور افسروں کو پوری ہدایات دیں اور پرواز کر کے کراچی پہنچ گئے۔

اس اجلاس کے مسائل زیر بحث یہ تھے۔ایک تو وہ تین مطالبات جو ۲۲ جنوری ۱۹۵۳ء کو وزیر اعظم تک پہنچائے گئے تھے۔دوسرے وہ خطرہ جو قانون و انتظام کو ''ڈائریکٹ ایکشن'' کے اس پروگرام سے لاحق ہو رہا تھا جو مرکزی مجلس عمل نے تجویز کر رکھا تھا۔پنجاب کے نمائندوں کو یہ ہدایت

کی گئی تھی کہ مرکزی حکومت کو بتادیں کہ حکومت پنجاب کی رائے میں مطالبات غیر معقول ہیں اور سختی سے ان کی مزاحمت ہونی چاہیے۔کابینہ کا اجلاس ۹ بجے شب تک جاری رہا۔لیکن کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ بعد کی صبح کو دو بجے کابینہ کا ایک اور اجلاس طلب کیا گیا۔کیونکہ یہ اطلاع موصول ہوئی تھی کہ اس دن صبح کو رضا کار گورنر جنرل اور وزیراعظم کی کوٹھیوں پر پکٹنگ کریں گے۔اس اجلاس میں گورنر سندھ، گورنر صوبہ سرحد، وزیراعلیٰ صوبہ سرحد، چیف کمشنر اور انسپکٹر جنرل پولیس کراچی۔سیکرٹری وزارت داخلہ اور ڈپٹی چیف سٹاف شریک تھے۔اس میں مندرجہ ذیل فیصلے کیے گئے:۔

(۱)اس شورش کے تمام نمایاں لیڈر بشمول مولانا اختر علی خاں مالک ''زمیندار'' گرفتار کر لیے جائیں۔

(۲)''آزاد''، ''زمیندار'' اور ''الفضل'' کی اشاعت روک دی جائے۔

(۳)مرزا بشیر الدین محمود کو تنبیہ کی جائے کہ وہ ربوہ سے باہر نہ جائیں۔نہ کوئی ایسا فعل کریں جس سے ہیجان واشتعال پیدا ہونے کا احتمال ہو۔

(۴)رضا کاروں کو کراچی آنے سے روکا جائے ان کے خلاف اسی سٹیشن پر کاروائی کی جائے جہاں سے وہ سوار ہورہے ہوں۔ان فیصلوں سے مسلّح ہونے کے بعد مسٹر چھٹہ وزیر مال، مسٹر غیاث الدین احمد ہوم سیکرٹری اور مسٹر انور علی انسپکٹر جنرل پولیس اسی دن لاہور واپس چلے آئے۔

ابتدائی تدابیر

مجلس عمل پنجاب میں جس دن قائم ہوئی تھی۔اس نے تیاریاں شروع کر دیں تھیں تاکہ اگر حکومت سے تصادم ناگزیر ہو جائے تو بڑے پیمانے پر مقابلہ کیا جاسکے۔چنانچہ جب ۲۲ جنوری کو وزیراعظم کے سامنے الٹی میٹم پیش کیا گیا۔اس وقت سول نافرمانی کا سارا ساز وسامان تیار تھا۔رضا کار، سرمایہ، مورچے کے مقامات، مجالس عمل، ڈکٹیٹروں کی فہرست ہر چیز مکمل تھی۔عوام حکومت اور احمدیوں کی نفرت سے لبریز تھے اور کسی قسم کی نظریاتی مزاحمت کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ڈائریکٹ

ایکشن شروع کرنے کا اصل فیصلہ ۲۶ جنوری کی رات کو کراچی میں علما نے کیا تھا۔اور آدھی رات کے بعد صبح سے پہلے مرکزی حکومت نے اپنے آپ کو مجبور پایا کہ اس فیصلے کا مقابلہ کرے۔جب پنجاب کے نمائندے ۲۷ فروری کو لاہور واپس آئے تو انہوں نے اپنی حکومت کو کراچی کے فیصلوں سے آگاہ کیا مسٹر انور علی انسپکٹر جنرل پولیس نے ان فیصلوں اور مرکزی حکومت کی اختیار کردہ پالیسی کو عمل میں لانے کے لیے اپنی تجاویز کا مسودہ تیار کیا۔یہ تجاویز ایک اجلاس میں پیش ہو کر منظور ہوئیں۔جس میں چیف منسٹر، وزیر مال، ہوم سیکرٹری، انسپکٹر جنرل پولیس، اے ڈی آئی جی، سی آئی ڈی اور سپرنٹنڈنٹ پولیس (A) سی آئی ڈی شریک تھے۔تجاویز حسب ذیل ہیں۔

(i) احراریوں کے تمام سرگرم رکن اور دوسرے افراد جو ڈائریکٹ ایکشن کی حمایت کے ذمہ دار ہیں (بروئے فہرست منسلکہ) آج رات صوبے بھر میں گرفتار کر لیے جائیں۔

(ii) لاہور کے سوا دوسرے اضلاع میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں اور پولیس سپرنٹنڈنٹوں کو اپنے صوابدید کے مطابق زیر دفعہ ۳ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ یہ گرفتاریاں کرنی چاہئیں۔لاہور میں نظر بندی کے احکامات مناسب وقت کے اندر اندر حکومت کی طرف سے بھیج دیے جائیں گے۔

(iii) ذیل کے اخباروں کی اشاعت ممنوع قرار دی جائے:۔

(الف) 'زمیندار'　　　(ب) 'آزاد'　　　(ج) 'الفضل'

(iv) ہوم سیکرٹری خواجہ نذیر احمد کو جو سول اینڈ ملٹری گزٹ کی پالیسی کے نگران ہیں طلب کر کے یہ سمجھا دیں کہ ان گرفتاریوں پر اظہار مسرت نہ کیا جائے اور آئندہ ایک یا دو ماہ کے دوران میں انتہائی ضبط سے کام لیا جائے۔

(v) ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جھنگ اصالتاً خلیفہ بشیر الدین محمود کو تنبیہ کر دیں کہ وہ اپنی جماعت کے ممبروں کو خصوصاً اپنے سیکرٹریٹ کے عملے کو ہر قسم کی اشتعال انگیزی سے باز رہنے کی تلقین کریں۔

(vi) جو رضا کار لاہور سے روانہ ہوں ان کے متعلق سندھ پولیس اور کراچی پولیس دونوں کو

اطلاع دی جائے تاکہ سربراہ ان کی گرفتاریوں کا انتظام کیا جاسکے۔

(vii) ہوم سیکرٹری ۲۸ تاریخ کو ایک پریس کانفرنس منعقد کریں جس میں اخباروں کو حکومت کا نقطہ نگاہ سمجھائیں اور ان سے اپیل کریں کہ وہ لوگوں کو صبر وسکون اور ضبط کی تلقین کریں۔

(viii) ایک گشتی مراسلہ تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں اور پولیس سپرنٹنڈنٹ کو بھیجا جائے جس میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے اس اقدام کا پس منظر واضح کی جائے۔ان افسروں کو یہ بھی کہا جائے کہ وہ معقول وسنجیدہ عناصر کی امداد سے عوام کو قانون وانتظام کی اہمیت کا قائل بنائیں''۔

ہوم سیکرٹری نے مندرجہ ذیل لاسلکی پیغام فی الفور اضلاع راولپنڈی، گجرات، سیالکوٹ، لائل پور، منٹگمری، ملتان، سرگودھا اور شیخوپورہ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں اور پولیس سپرنٹنڈنٹوں کو ارسال کر دیا ہے:۔

''چونکہ احمدیوں کے خلاف شورش بدترین صورت اختیار کر گئی ہے۔اس لیے ذیل کے اشخاص کو زیر دفعہ ۳ پبلک سیفٹی ایکٹ چودہ دن کے لیے گرفتار کر لیجیے۔مزید نظر بندی کے احکامات حکومت جاری کرے گی اور مناسب وقت کے اندر اندر ارسال کر دے گی۔آپ دونوں میں جسے جو صاحب بھی صدر مقام پر موجود ہیں وہ ۲۷۔۲۸ فروری کی درمیانی رات کو یہ کاروائی کر کے تعمیل کی رپورٹ بھیج دیں۔چٹھی اس پیغام کے ساتھ بھیجی جارہی ہے۔

صرف پولیس سپرنٹنڈوں کے لیے:۔تااحکام ثانی آپ روزانہ ضمنیاں ڈی آئی جی سی آئی ڈی کو لاسلکی کے ذریعے بھیجا کریں۔یہ ضمنیاں مختصر ہونی چاہیں۔ان میں ہر قسم کی اہم معلومات جو دستیاب ہو سکے درج ہونی چاہیے۔یہ بھی بتایا جائے کہ حکومت کے اقدام کا عام ردّعمل کیا ہے۔خصوصاً اگر لاہور یا کراچی کو رضا کار بھیجنے یا مقامی طور پر سول نافرمانی کرنے یا اس سلسلے میں سرمایہ فراہم کرنے کی سرگرم کوشش نظر آئے تو اس کی پوری اطلاع دی جائے۔

راولپنڈی: مولوی غلام اللہ خاں خطیب مسجد پرانا قلعہ۔راولپنڈی

گوجرانوالہ: مولوی محمد اسماعیل گوجرانوالہ شہر

سیالکوٹ: (۱) قاضی منظور احمد رنگپورہ سیالکوٹ شہر۔ (۲) غازی محمد حسین سالار تاندلیانوالہ (۳) مولوی عبیداللہ لائل پور۔

منٹگمری:۔ (۱) مولوی عبیداللہ جامعہ رشیدیہ منٹگمری (۲) مولوی لطف اللہ خاں منٹگمری۔

ملتان: (۱) محمد علی جالندھری ملتان (۲) قاضی احسان احمد شجاع آبادی ضلع ملتان (۳) شیخ محمد سعید خانیوال ضلع ملتان

سرگودھا:۔ مولوی عبداللہ۔ سرگودھا۔

شیخوپورہ: قاضی محمد امین۔ شیخوپورہ''

ایک اور لاسلکی پیغام کے ذریعے سے ضلع گجرات، جہلم، کیمبل پور، جھنگ، ڈیرہ غازی خاں، میانوالی، مظفر گڑھ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں اور پولیس سپرنٹنڈنٹوں کو اطلاع دی گئی ہے کہ دوسرے اضلاع میں احمدیوں کے خلاف شورش کے سلسلے میں جماعت احرار کے بعض ممبروں اور بعض غیر احراریوں کی گرفتاری کے احکام صادر کیے گئے ہیں۔ لہٰذا آپ لوگ چوکنے رہیے اور اگر آپ کے اضلاع میں کوئی اہم واقعہ رونما ہو یا ہونے کی توقع ہو تو فی الفور حکومت کو اطلاع دیجیے۔

ایک ''نہایت فوری'' انتہائی مُرجح ''۔خفیہ'' او ٹی پی مرموز تار مورخہ ۲۷ فروری ۱۹۵۳ء مرکزی حکومت کی طرف سے حکومت پنجاب کو موصول ہوا جس میں اول الذکر نے مطالبات کے متعلق اپنا نظریہ پیش کیا تھا:۔

۲ (۱) احمدی ہوں یا پاکستانیوں کا کوئی دوسرا طبقہ ہو اس کو اسکی خواہشات کے خلاف اقلیت قرار نہیں دیا جاسکتا یہ امر حکومت کے وظائف میں داخل نہیں ہے کہ وہ کسی گروہ کو زبردستی اقلیت بن جانے پر مجبور کرے۔

(۱۱) احمدیوں کو صرف اس بنا پر کہ وہ احمدی ہیں حکومت کے کلیدی عہدوں سے برطرف نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کسی وزیر کو عہدے سے برطرف کرنے کے لیے ایک آئینی مشینری مہیا ہے۔ جب تک کسی وزیر کو اپنے رفقائے کار کا اور مرکزی اسمبلی میں منتخب نمائندگان جمہور کا

اعتماد حاصل رہے، اس کو عہدے سے برطرف نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی وزیر صرف اس لیے عہدے سے برطرف نہیں کیا جاسکتا کہ عوام کا ایک طبقہ 'ڈائرکٹ ایکشن' کی دھمکی دے کر اس کی برطرفی کا مطالبہ کر رہا ہے۔ کوئی سرکاری ملازم خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم حکومت کے کسی ماتحت عہدے سے محض اپنے مذہب کی وجہ سے موقوف نہیں کیا جاسکتا۔

(III) حکومت کے کلیدی عہدوں سے احمدیوں کی برطرفی کا مطالبہ بظاہر اس اندیشے کی بنا پر کیا جارہا ہے کہ غالباً وہ لوگ اپنے مخصوص فرقہ وار عقائد کی تبلیغ کی غرض سے اپنی پوزیشن کا ناجائز استعمال کریں۔ اس اندیشے کو دور کرنے کے لیے حکومت نے سخت ہدایات جاری کر دیں ہیں کہ کوئی وزیر یا سرکاری افسر اپنے فرقے کے عقائد کی تبلیغ نہ کرے۔

(۳) مرکزی حکومت پیراگراف ۲ کے مطابق کوئی سرکاری اعلان کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی تا کہ وقتی صورتحال اس قسم کے اعلان کی متقاضی نہ ہو لیکن صوبائی حکومتوں سے استدعا کی جاتی ہے کہ فی الفوران خطوط پر نشر و اشاعت کا وسیع انتظام کریں اور اخبارات کی مناسب رہنمائی کریں۔

۴۔ کراچی میں اس شورش کے نمایاں لیڈروں کی گرفتاری کے بعد آج ایک سرکاری اعلان جاری کیا جارہا ہے یہ ضروری ہے کہ احراریوں کو شورش کے ان حامیوں سے جو نسبتاً کم جوشیلے ہیں علیحدہ اور منقطع کر دیا جائے اور فی الحال حملے کو احراریوں ہی پر مرتکز کیا جائے۔ سرکاری اعلان میں احراریوں کے متعلق جو طریق اختیار کیا گیا ہے اس کو تقویت دینے کے لیے احراریوں کی گزشتہ بدافعالیوں اور موجودہ افتراق انگیز سرگرمیوں کی پرزور اشاعت کی جائے''۔

مرکزی حکومت کے سرکاری اعلان میں یہ صراحت کی گئی کہ احمدیوں کے خلاف شورش کو احراریوں نے منظم کیا ہے۔ اور ان کے ماضی سے ظاہر ہے کہ وہ تقسیم سے پیشتر کانگرس اور ان دوسری جماعتوں کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے جو قائداعظم کی اس جدوجہد کے خلاف صف آرا ہو رہی تھیں جو مرحوم نے مسلمانوں کی آزادی کے لیے جاری کر رکھی تھیں۔ اس جماعت نے اب تک

پاکستان کے قیام کو دل سے گوارانہیں کیا۔ان لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان اختلافات پیدا کریں۔اور پاکستان کے استحکام کے متعلق عوام کے اعتماد کوٹھیس پہنچائیں اس شورش کا یہ مقصد بالکل واضح ہے کہ مذہب کا لبادہ اوڑھ کر فرقہ وار اختلاف کی آگ کو بھڑکایا جائے اور مسلمانوں کے اتحاد کو تباہ کر دیا جائے۔اب اس شورش کے علمبرداروں نے فیصلہ کیا ہے کہ ''ڈائریکٹ ایکشن'' کیا جائے اوراس کے ساتھ ہی بڑے پیمانے پر فسادات برپا کرنے کا منصوبہ بھی تیار کرلیا ہے تاکہ اس کے طریقے سے حکومت ان کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے پر مجبور ہو جائے۔کوئی قابل ذکر حکومت ملت کے کسی طبقے کے ''ڈائرکٹ ایکشن'' سے مرعوب نہیں ہوسکتی حکومت نے عزم مصمم کرلیا ہے کہ اپنے تمام ذرائع ووسائل سے کام لیکر قانون وانتظام کو برقرار رکھے گی۔اگرامن عامہ میں خلل ڈالا گیا تو قانون اپنا کام کریگا اور اس کو توڑنے والے اس کے نتائج کو بھگتیں گے۔اس سرکاری اعلان میں جمہور کے تمام طبقوں سے اپیل کی گئی کہ خلاف قانون سرگرمیوں کو ہرگز روانہ رکھیں اور کوئی ایسا فعل نہ ہونے دیں جس سے پاکستان کی سلامتی یا استواری کو کسی اعتبار سے بھی نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔

اس سرکاری اعلان کی نقول چیف سیکرٹری نے ۲۸ فروری ۱۹۵۳ء کو تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں اور ڈویژنل افسروں کے نام ارسال کیں اور ان کو اطلاع دی حکومت نے جماعت احرار کے سرغنوں اور بعض دوسرے اشخاص کو جو اس شورش میں سرگرم حصہ لے رہے تھے گرفتار کرنے کا حکم صادر کیا ہے ''آزاد'' اور ''الفضل'' جو علی الترتیب احراریوں اور احمدیوں کے جماعتی آرگن ہیں ۔ممنوع الاشاعت قرار دیے گئے ہیں۔اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو چاہیے کہ اپنے اپنے اضلاع کی صورتحال پر چوکنے ہو کر نگاہ رکھیں ۔اس منسلکہ چٹھی میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو یہ ہدایت بھی کی گئی تھی کہ مرکزی حکومت کے سرکاری اعلان کی بنیادوں پر حکومت کا نقطہ نگاہ جمہور پر واضح کریں۔اوراس حقیقت پر خاص زور دیں کہ یہ شورش احراریوں نے صرف اپنے اغراض و مقاصد کے لیے برپا کی ہے اور حکومت کے اقدامات کا رخ زیادہ انہی کی طرف ہے۔اس چٹھی میں حکام اضلاع پر حکومت کا یہ منشا بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ کوئی مزید گرفتاریاں نہ کی جائیں تاوقتیکہ مقامی حالات کے ماتحت ایسا اقدام

قطعی طور پر ضروری نہ ہو جائے اور ظاہر ہے کہ اب اتنا وقت نہیں ہے کہ ایسے اقدامات کے لیے پہلے صوبائی حکومت سے مشورہ کیا جائے۔ چونکہ اس امر کا اندیشہ تھا کہ شورش پسند لاہور یا کراچی کو رضا کاروں کے دستے بغرض گرفتاری بھیجنا شروع کر دیں گے۔ لہٰذا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو مندرجہ ذیل فوری تدابیر اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی:۔

''(الف) آپ کو چاہیے کہ رائے عامہ پر اثر ڈالنے اور عام خیالات کو صحیح راستے پر لگانے کی غرض سے اپنے ضلع کے سنجیدہ عناصر کی امداد حاصل کریں۔ ان کو اچھی طرح سمجھا دینا چاہیے کہ حکومت شہریوں کے جائز مذہبی یا غیر مذہبی حقوق میں کسی اعتبار سے بھی مداخلت یا ممانعت کی خواہاں نہیں لیکن جو لوگ امن عامہ میں خلل ڈالنے یا حکومت کو پریشان کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان کو حکومت ہرگز پنپنے کا موقع نہ دے گی۔

(ب) آپ کو چاہیے کہ اپنے ضلع میں احمدی جماعت کے مقتدر ارکان کو بھی تنبیہ کر دیں کہ وہ ایسی تحریر یا تقریر سے قطعی طور پر اجتناب کریں جس سے صورتحال کے بدتر ہونے یا دوسرے فرقوں کے اشخاص کے بھڑک اٹھنے کا احتمال ہو۔ ان سے خاص طور پر یہ بھی کہہ دیا جائے کہ حکومت کے موجودہ اقدامات پر اظہار مسرت سے بھی محترز رہیں۔ کیونکہ ایسے اظہار سے حکومت کے خلاف جانب داری کا غلط احساس پیدا ہوسکتا ہے۔

(ج) پولیس سپرنٹنڈنٹوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ روزانہ صورتحال کی رپورٹ ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس سی آئی ڈی کو ارسال کریں۔ اگر اس سلسلے میں کوئی اہم اور غیر معمولی نوعیت کا واقعہ آپ کے علم میں آئے تو ان رپورٹوں کے علاوہ آپ فی الفور پولیس کو لاسلکی یا ٹیلیفون کے ذریعے سے اس کی اطلاع ہوم سیکرٹری کو دیں۔

(د) جب تک صورتحال کافی حد تک پرسکون نہ ہو جائے۔ آپ کو چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو اپنے صدر مقام ہی پر مقیم رہیں''۔

یکم مارچ ۱۹۵۳ء کو ہوم سیکرٹری نے (سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس لاہور کے سوا) تمام پولیس سپرنٹنڈنٹوں کو (ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور کے سوا) تمام ڈپٹی کمشنروں کو اور (لاہور) کے سوا) باقی

رینجوں کے ڈپٹی انسپکٹر جنرلوں کو حسب ذیل چٹھی بمراد اطلاع ارسال کی:۔

''احرار کی شورش اب یہ شکل اختیار کر رہی ہے کہ بیرونی اضلاع سے رضا کاروں کو 'ڈائریکٹ ایکشن' کے لیے بھیجا جا رہا ہے۔حکومت کا منشا یہ ہے کہ اس شورش کو بیرونی اضلاع سے لاہور کی طرف پھیلنے کا موقع نہ دیا جائے۔اور اس کو ابتدائی سرچشمے ہی پر دباؤ دینے کے لیے مقامی اقدام کیا جائے۔لہٰذا آپ مضبوط اقدام کریں تاکہ رضا کار لاہور نہ آنے پائیں۔اس امر کو حکومت آپ کے اختیار تمیزی پر چھوڑتی ہے کہ اپنے صوابدید کے مطابق ضروری تدابیر اختیار کریں جن میں زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری احکام امتناعی صادر کرنا بھی شامل ہے کثیر تعداد میں رضا کاروں کی اکٹھی گرفتاریوں سے حتی الوسع پرہیز کیا جائے۔سابقہ ہدایات کے مطابق آپ کو چاہیے کہ حکومت کے اقدام کی حمایت کی رائے عامہ پر اثر ڈالنے کے لیے اپنے ضلع کے صحیح الدماغ عناصر کی تائید حاصل کریں''۔

اس چٹھی کی نقول ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سینئیر سپرنٹنڈنٹ پولیس لاہور کو بغرض ''تعمیل حسب بیان'' اور ڈی آئی جی لاہور کو ''بغرض اطلاع'' ارسال کی گئیں۔

اسی دن ڈی آئی جی ،سی آئی ڈی ،نے ایک لاسلکی پیغام نمبر 563-82/BDSB تمام پولیس سپرنٹنڈنٹوں اور رینج ڈپٹی انسپکٹر جنرل کو بھیجا جس میں دوسرے امور کے علاوہ یہ بھی ہدایت کی گئی تھی:۔

''رضا کار کو کراچی کی طرف اور ممکن ہو تو لاہور کی طرف بھی روانہ ہونے کی اجازت نہ دی جائے''۔

۲ مارچ ۱۹۵۳ء کو ملک حبیب اللہ اے ڈی آئی جی۔سی آئی ڈی نے رضا کاروں کے متعلق ذیل کا حکم نامہ صادر کیا:

''انسپکٹر جنرل پولیس کی ہدایت کے مطابق میں نے گوجرانوالہ،راولپنڈی،سرگودھا،لائل پور،منٹگمری اور ملتان کے پولیس سپرنٹنڈنٹوں کو ٹیلیفون پر اطلاع دی ہے کہ رضا کاروں کو کراچی جانے سے روکنے کے لیے افہام و تفہیم سے کام لیا جائے۔لیکن اگر سمجھانا بجھانا بیکار

ثابت ہوا تو ان کو گرفتار کرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تجویز یہ ہے کہ بیرونی اضلاع سے رضا کاروں کے جو دستے لاہور کو آرہے ہیں ان کو لاہور سے خاصے دور فاصلے پر جہاں ممکن ہو روکا جائے اور وہیں ان کے متعلق ضروری کارروائی کر لی جائے۔اگر یہ طرز عمل کامیاب ہو گیا تو شہر لاہور میں جلسے اور جلوسوں کا دباؤ کافی حد تک کم ہو جائے گا۔گزشتہ دو دن سے راولپنڈی، گجرات، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، سرگودھا، لائل پور، منٹگمری کے اضلاع سے کثیر تعداد رضا کار لاہور میں آرہے ہیں۔اسی قسم کے انتظامات رضا کاروں کو الگ تھلگ کرنے کی غرض سے لاہور ریلوے سٹیشن پر روک لینا شاید ممکن نہ ہو''۔

۴۔مارچ ۱۹۵۳ء کو ہوم سیکرٹری نے لاسلکی پیغام نمبر 2563-82BDSB مورخہ یکم مارچ ۱۹۵۳ء کے تسلسل میں جو ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے تمام پولیس سپرنٹنڈنٹوں اور رینج ڈپٹی انسپکٹر جنرل کو بھیجا تھا۔مندرجہ ذیل ہدایات رضا کاروں کے متعلق تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں۔پولیس سپرنٹنڈنٹوں اور رینج ڈپٹی انسپکٹر جنرل کو ارسال کیں:۔

''سب سے پہلے تو رضا کاروں کے دستوں کو کراچی یا لاہور جانے سے باز رکھنے کے لیے نصیحت و ترغیب سے کام لیا جائے۔لیکن اگر سمجھانے بجھانے کا کوئی نتیجہ نہ نکلے تو پھر مناسب انسدادی کارروائی عمل میں لائی جائے''۔

حصہ سوم

فسادات

(۲۷ فروری سے فسادات کے خاتمے تک)

فسادات کا حال

مجلس عمل کے ممبر ۲۷ فروری کو کراچی میں گرفتار کر لیے گئے۔تحریک کے جو لیڈر کراچی میں تھے۔ان کی طرف سے ٹیلفون پر لاہور میں ہدایات موصول ہو چکی تھیں۔ چنانچہ اس وقت تک رضا کاروں کے چند دستے لاہور سے کراچی کو روانہ ہو چکے تھے۔ جو دستہ ۲۷ فروری کو غازی علم الدین کی سرگردگی میں روانہ ہوا تھا اس کو پنجاب پولیس نے لودھراں ریلوے سٹیشن پر روک کر ٹرین سے اتار لیا۔ باقی دو دستے جن میں سے ایک ۲۵ کو زیر سرکردگی معراج الدین سالار اور دوسرا ۲۶ کو زیر سرکردگی صاحبزادہ فیض الحسن روانہ ہوا تھا کراچی پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔اور وہاں گرفتار کر لیے گئے۔ ۲۶۔۲۷ فروری کی درمیانی رات کو کراچی میں جس اقدام کا فیصلہ ہوا تھا اس پر حکومت پنجاب نے عمل کیا۔اور وہ اشخاص جن کی فہرست انسپکٹر جنرل پولیس نے کراچی سے واپسی پر تیار کی تھی ،گرفتار کر لیے گئے ۔ان گرفتاریوں سے صوبے بھر میں اور بالخصوص لاہور میں اور سیالکوٹ گوجرانوالہ راولپنڈی لائل پور اور منٹگمری کے شہروں میں برہمی اور لاقانونی کی ایک لہر دوڑ گئی اور لاہور میں بدنظمی اور ابتری کا سیلاب اس قدر قابو سے باہر ہو گیا کہ ۶ مارچ کو فوج شہر میں داخل ہو گئی اور مارشل لا کا اعلان کر دیا گیا۔

لاہور

۲۷ فروری ۱۹۵۳ء کراچی کے فیصلے کی تعمیل میں مولانا اختر علی خاں کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا گیا۔ لیکن جب پولیس افسر نے جو اس وارنٹ کی تعمیل پر مامور تھا، یہ وارنٹ مولانا کو دکھایا تو انہوں نے کہا اگر مجھے گرفتار نہ کیا جائے تو میں لکھ دینے کو تیار ہوں کہ اس شورش سے قطع تعلق کر لوں گا۔ پولیس افسر انہیں سول لائنز کے تھانے میں لے گیا وہاں مولانا نے یہ معافی نامہ لکھ کر دے دیا:۔

''میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ تحریک نے جو شکل اختیار کر لی ہے وہ پاکستان کی سالمیت کے لیے نقصان رساں ہے اور میرا خیال ہے کہ اگر تحریک اس طریقے سے جاری رہی تو پاکستان کے دشمن اس سے ناواجب فائدہ اٹھائیں گے اور ہر پاکستانی ایسی تحریک کو ناپسند کرے گا جس سے پاکستان کی سالمیت تباہ ہو جائے۔ اس تحریک کا موجودہ رجحان ملک میں افتراق اور ابتری پید کرنے کا موجب ہو گا۔ اگر خدانخواستہ فسادات بڑھ گئے اور حکومت قوت استعمال کرنے پر مجبور ہو گئی تو یہ امر فریقین کے لیے سخت ذلت کا باعث ہو گا میری رائے میں مسلمان کے خون کا ایک قطرہ پوری کائنات سے بھی زیادہ بیش بہا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس معاملے میں مزید غور کرنا چاہیے تاکہ صورتحال کو درست کیا جاسکے۔ میرا کوئی تعلق موجودہ ''ڈائریکٹ ایکشن'' سے نہیں ہے۔ میں نے نہ کبھی تشدد کی حمایت کی ہے نہ میں گورنر جنرل وزیر اعظم اور دوسرے اکابر پاکستان کو ملامت و دشنام کا نشانہ بنانے ان کے جنازوں کے جلوس نکالنے نہ ان کی کوٹھیوں پر پکٹنگ کرنے کا حامی رہا ہوں۔ اس قسم کے افعال کا ارتکاب تو درکنار، میری رائے میں ایسے افعال کا تصور بھی کسی صحیح الخیال پاکستانی کے لیے زیبا نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے ملک کے داخلی نظم و نسق کو مستحکم کرنے اور غیر ممالک کی نظروں میں حکومت کی ساکھ اور عزت کو بلند کرنے کے لیے ایسے افعال کے ارتکاب سے اجتناب کریں۔ جن کا نتیجہ یہ ہو کہ ہم دنیا کی نگاہوں میں اضحوکہ بن جائیں''۔

اس تحریر کی رو سے مولانا کے نزدیک مسلمانوں کے خون کا ایک قطرہ پوری کائنات سے زیادہ قیمتی تھا۔ ''ڈائریکٹ ایکشن'' کے ساتھ مولانا کا کوئی تعلق نہ تھا۔ تحریک نے جو صورت اختیار کر لی تھی وہ پاکستان کے استحکام کے لیے خطرناک تھی۔ مولانا ہر قسم کے تشدد اور بدنظمی کے خلاف تھے۔ وہ ایسی باتوں کو روا رکھنے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ وزیر اعظم یا دوسرے رہنماؤں کے جنازے نکالے جائیں یا ان کی کوٹھیوں پر پکٹنگ کی جائے۔ اور وہ ہر شے کے مخالف تھے جس سے پاکستان اور اس کے باشندے اضحوکۂ روزگار بن جائیں۔ اس ذلت آمیز معافی نامے کی بنا پر مولانا اختر علی خاں گرفتار نہ کیے گئے۔ نہ ان کے اخبار ''زمیندار'' کے خلاف کوئی کارروائی کی گئی تا آنکہ ۲۸ فروری کو اس نے پھر مکروہ رویہ اختیار کیا۔

۲۸۔ فروری ۱۹۵۳ء: جونہی ۲۷ فروری کو کراچی میں اور ۲۷۔۲۸ فروری کی شب کو لاہور میں لیڈروں کی گرفتاریاں عمل میں آئیں، لاہور میں دکانیں بند ہو گئیں اور بعض اشخاص کی ٹولیاں غیر رضامند دکانداروں کو دکانیں بند کرنے پر مجبور کرنے کے لیے بازاروں میں چکر کاٹنے لگیں۔ تیسرے پہر باغ بیرون دہلی دروازہ میں ایک جلسہ عام منعقد ہوا۔ جہاں گرفتاری کے لیے تیار ہونے والے بعض رضا کاروں کو ہار پہنائے گئے۔ اور ان کا ایک جلوس نکالا گیا جو سول سیکرٹریٹ کی طرف روانہ ہوا لیکن راستے میں ہجوم نے اپنا راستہ بدل لیا اور گورنمنٹ ہاؤس پہنچنے کے لیے مال روڈ پر چل دیا۔ ہجوم کی تعداد پانچ اور چھ ہزار کے درمیان تھی اور اس کا رجحان بظاہر تشدد کی طرف نہ تھا شرکائے جلوس صرف حکومت کے خلاف پولیس کے خلاف اور احمدیوں کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ چیرنگ کراس کے قریب جلوس کو روکا گیا اور اس کو منتشر ہونے کی ہدایت دی گئی۔ اس وقت وہاں کمشنر، انسپکٹر جنرل پولیس، ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سینئیر سپرنٹنڈنٹ پولیس پہنچ چکے تھے۔ ہار پہنے ہوئے رضا کاروں نے باہر نکل کر اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔ لیکن ان سے کہا گیا کہ عام جلسوں اور جلوسوں پر چونکہ کوئی پابندی نہیں اور انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ اس لیے وہ گرفتار نہیں کیے جا سکتے۔ تاہم رضا کاروں نے گرفتاری پر اصرار کیا۔ اس پر

ٹریفک کے لیے سڑک صاف کرنے کی غرض سے زیر دفعہ ۱۵۱/۱۰۷ ضابطہ فوجداری چونتیس اشخاص گرفتار کر لیے گئے۔ ان کو ٹرک میں بٹھایا گیا اور شہر سے کچھ فاصلے پر لیجا کر چھوڑ دیا گیا۔ اس کے بعد ہجوم منتشر ہو کر مختلف اطراف کو روانہ ہو گیا۔ اس سے کچھ دیر بعد کمشنر، ہوم سیکرٹری، انسپکٹر جنرل پولیس، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سینیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس سول لائینز کے تھانے میں جمع ہوئے اور انہوں نے صورتحال پر گفتگو کرنے کے بعد عام جلسوں اور جلوسوں کو ممنوع قرار دینے کا فیصلہ کیا۔

یکم مارچ: یہ جلوس اور گرفتاریوں کا دن تھا

مولانا اختر علی خاں کے معافی مانگ لینے کی خبر پورے شہر میں پھیل گئی۔ عوام غضبناک ہو گئے اور انہوں نے میکلوڈ روڈ پر مولانا کے مکان کو گھیر لیا۔ پولیس کا ایک دستہ وہاں پہنچ گیا اور جب مولانا کے بیٹے نے ہجوم کو یقین دلایا کہ مولانا اپنے گاؤں کرم آباد (ضلع گوجرانوالہ) میں ہیں تو ہجوم منتشر ہو گیا۔ تقریباً اسی وقت مولانا احمد علی نے دہلی دروازے کے باہر ایک بڑا جلوس مرتب کیا۔ یہاں ہجوم تشدد پر آمادہ معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ اس نے خشت باری کر کے پولیس کی ایک گاڑی کو نقصان پہنچایا مولانا احمد علی زیر دفعہ ۳۔ پبلک سیفٹی ایکٹ گرفتار کر لیے گئے۔ اور تینتیس اشخاص کی گرفتاری زیر دفعہ ۱۵۱/۱۰۷ ضابطہ فوجداری عمل میں آئی۔ ایک اور جلوس ہائی کورٹ کی عمارت کے نزدیک نمودار ہوا جو گورنمنٹ ہاؤس کی طرف جانا چاہتا تھا۔ یہ جلوس روک دیا گیا اور ایڈیشنل سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ۱۲۹ اشخاص کو گرفتار کر لیا۔ اسی افسر نے مال روڈ پر ایک جلوس کا سامنا کیا اور ۲۳ مزید افراد کو گرفتار کر لیا۔ تیسرے پہر ایک بڑا جلوس دہلی دروازے سے گورنمنٹ ہاؤس کی طرف روانہ ہوا جس کو چیرنگ کراس کے قریب روکا گیا۔ اس وقت کمشنر، ہوم سیکرٹری، انسپکٹر جنرل پولیس اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ موجود تھے۔ بہت سے لوگوں نے آگے بڑھ کر اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔ وہ بھی ٹرکوں پر سوار کرائے گئے اور یوم گزشتہ کی طرح لاہور سے کچھ فاصلے پر لے جا کر اتار دیے گئے۔ اس کے بعد ہجوم تشدد کے کوئی آثار ظاہر کیے بغیر منتشر ہو گیا۔

۲۔ مارچ: معلوم ہوتا ہے کہ جب بعض لوگوں نے سنا کہ مولانا اختر علی خاں نے معافی

مانگ لی ہے اور اب کرم آباد جا کر اپنے گھر میں گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔تو بعض مقامی آدمی ان کے پاس وہاں گئے اور انہیں بزدلی کا طعنہ دیا۔مولانا نے الزام کی صحت سے انکار کیا اور یکم مارچ کی شام کو یا ۲ مارچ کی صبح کو لاہور پہنچ گئے ۔انہوں نے وزیر خاں کی مسجد میں جا کر لوگوں پر اپنا موقف واضح کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ میں اس تحریک کا اسی طرح وفادار ہوں جیسے پہلے تھا۔انہوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ میں تیسرے پہر اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کروں گا۔چنانچہ شام کے وقت دس ہزار کا ایک جلوس مسجد سے نکلا یہ ہجوم نہایت تند اور سرکش تھا۔یہ جلوس چیرنگ کراس پر روکا گیا۔جہاں کمشنر، ہوم سیکرٹری، انسپکٹر جنرل پولیس، ڈی آئی جی پولیس اور سینئیر سپرنٹنڈنٹ پولیس موجود تھے ۔یہ مجمع خلاف قانون قرار دیا گیا۔مولانا اور بعض دوسرے اشخاص گرفتار کر لیے گئے اور ایک ایسی جگہ جمع کیے گئے جس کے گرد پولیس نے حلقہ باندھ لیا تھا۔دفعتہً کوئی ایک ہزار اشخاص کے ہجوم نے اینٹوں، ڈبوں، بوتلوں اور دوسری چیزوں سے پولیس کے حلقے پر حملہ کیا۔اس حملے میں گیارہ پولیس افسر جن میں دو سپرنٹنڈنٹ پولیس یعنی مسٹر ذوالقرنین خاں اور مسٹر ٹیلر بھی تھے مجروح ہو گئے اور ہجوم پر لاٹھی چارج کرنا پڑا۔مولانا جیل پہنچا دیے گئے اور اکتالیس اشخاص بلوے کی بنا پر گرفتار کر لیے گئے۔جو اشخاص اسے سے پہلے مولانا اختر علی خاں کے ساتھ گرفتار کر لیے گئے تھے ان کو حسب معمول لاہور سے دور لے جا کر چھوڑ دیا گیا۔اس پر ہجوم منتشر ہو گیا۔جب سب لوگ چلے گئے تو کمشنر، ہوم سیکرٹری، انسپکٹر جنرل پولیس، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، سینئیر سپرنٹنڈنٹ پولیس اور سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی انسپکٹر جنرل پولیس نے سول لائنیز کے تھانے میں اپنی کانفرنس منعقد کی۔چونکہ صورتحال نہایت تیزی سے بدتر ہو رہی تھی اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ جنرل آفیسر کمانڈنگ دہم ڈویژن کو اطلاع دی جائے اور استدعا کی جائے کہ وہ فوج لے کر آئیں اور سول حکام کی امداد کے لیے موجود رہیں ۔جنرل آفیسر کمانڈنگ خود تو نہ آئے لیکن انہوں نے اپنے جی ایس او آئی (لفٹیننٹ کرنل شیر خاں)اور دوسرے افسروں کو بھیجا جنھوں نے یہ سمجھایا کہ اگر فوجی امداد کی ضرورت ہے تو اس کے لیے صوبائی حکومت کی طرف سے مطالبہ ضروری ہے۔اس پر کچھ بحث کی گئی۔سول کے حکام کا دعویٰ تھا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ حکومت کو کسی قسم کی اطلاع دیے بغیر یہ اختیار رکھتے ہیں کہ فوج

سے امداد طلب کریں۔لیکن فوجی افسر اس موقف پر ڈٹے ہوئے تھے کہ اس معاملے میں چونکہ فوج کے مصارف کا سوال بھی شامل ہے کہ فوجی امداد کا مطالبہ رسماً صوبائی حکومت کی طرف سے آنا چاہئے۔۔ بحث کے دوران بھی انسپکٹر جنرل پولیس نے کہا کہ میں حکومت پنجاب کی جانب سے تحریری مطالبہ پیش کیے دیتا ہوں۔لہٰذا ایک چٹھی کا مسودہ تیار کیا گیا جو ہوم سیکرٹری نے فوجی افسروں کے حوالے کر دیا چٹھی میں یہ لکھا تھا کہ چونکہ لاہور میں سخت فساد کے پھوٹ پڑنے کا اندیشہ ہے اور یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ شاید سول حکام اس صورتحال کا میاب مقابلہ نہ کر سکیں لہٰذا حکومت پنجاب نے ہوم سیکرٹری کو ہدایت کی ہے کہ وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اس بدنظمی کے سدباب اور سرکوبی میں مدد دینے کے لیے فوجی امداد طلب کریں۔اس تحریری مطالبہ میں یہ امور درج نہ کیے گئے کہ فوج کی کتنی تعداد مطلوب ہے، کتنی مدت تک اس کی ضرورت ہوگی اور اس کی ڈیوٹیاں کس طریق پر لگائی جائیں گی اور کہا گیا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مناسب وقت کے اندر ان امور سے جی او سی صاحب کو مطلع کر دیں گے۔اس کانفرنس میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ زیر دفعہ ۱۴۴۔ضابطہ فوجداری کا ایک حکم صادر کر کے لاہور کارپوریشن کے مخصوص حصوں میں جلوس کا نکالنا ممنوع قرار دیا جائے۔اسی شام کو چیف منسٹر کے مکان پر کابینہ کا ایک اجلاس ہوا۔جس میں چیف سیکرٹری اور وہ سب افسر بھی شامل ہوئے جو سول لائنیز کے تھانے میں اجلاس کر چکے تھے۔سول لائنیز کے تھانے میں جو فیصلے کیے گئے تھے۔ان کو کابینہ نے منظور کر لیا اور آدھی رات سے کچھ بعد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے دفعہ ۱۴۴۔ضابطہ فوجداری کا حکم صادر کیا کہ لاہور شہر کی کارپوریشن کی حدود کے اندر پانچ یا پانچ سے زیادہ آدمیوں کا اجتماع ممنوع ہے اور وہ رقبہ اس سے مستثنٰی رکھا گیا ہے۔جس کے گرد سرکلر روڈ واقع ہے۔

۳ مارچ: اس دن نسبتاً خاموشی رہی۔کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا۔فوج جناح گارڈن میں پہنچ گئی اور اس نے صبح کو سول لائنیز اور کارپوریشن کے رقبہ شہر میں گشت لگانا شروع کیا۔اندرون فصیل کا شہر مستثنٰی رکھا گیا۔بارڈر پولیس بھی حرکت میں آ گئی تھی۔بعض غیر اہم جلوس اندرون فصیل اور بعض ایسے رقبوں پر بھی نکالے گئے جو حکم زیر دفعہ ۱۴۴ میں آتے تھے۔انارکلی میں اکتیس آدمی دفعہ ۱۴۴ کے

احکام کوتوڑنے کی وجہ سے گرفتار کیے گئے۔اور ایک پرشور وسرکش جلوس جو نیلا گنبد سے مال روڈ کی طرف آرہا تھا۔ٹولنٹن مارکیٹ کے قریب لاٹھی چارج سے منتشر کیا گیا جس کا حکم مسٹر ایم اے کے چودھری اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے دیا تھا۔دواور ہجوم بھی روکے گئے اور ان کو انسپکٹر جنرل پولیس نے خود ایک پولیس کے دستے سے لاٹھی چارج کراکر منتشر کر دیا۔اس دن صرف ایک ہی سنگین واقعہ ہوا کوئی ایک سو آدمیوں کا ہجوم میکلوڈ روڈ سے منٹگمری کے راستے سے چیرنگ کراس کی طرف بڑھ رہا تھا اس ہجوم نے پولیس کی ایک پارٹی پر پتھر برسائے۔جوزیر سرکردگی آغا سلطان احمد انسپکٹر نولکھا مامور تھی۔پولیس نے ہجوم پر تین راؤنڈ چلائے جن سے کوئی جانی نقصان نہ ہوا۔

شام کو یہ دیکھا گیا کہ فوج نے گشت کرنا بند کر دیا ہے۔

۴ مارچ: اس دن کابینہ کا ایک اجلاس ہوا جس میں چیف سیکرٹری،ہوم سیکرٹری،انسپکٹر جنرل پولیس نے ایک تقریر کی رپورٹ پڑھ کر سنائی جو شب گزشتہ مولانا عبدالستار خاں نیازی نے مسجد وزیر خاں میں کی تھی۔یہ تقریر سخت اشتعال انگیز تھی اور مقرر کی گرفتاری کے لیے ہوم سیکرٹری نے زیر دفعہ ۳ پبلک سیفٹی ایکٹ ایک حکم صادر کیا تھا۔لیکن اس کی تعمیل نہ ہو سکی تھی کیونکہ جس مسجد میں نیازی نے اپنے آپ کو مسند نشین کر رکھا تھا۔وہ شورش پسندوں کا ایک مضبوط گڑھ بن چکی تھی جس میں داخلہ محال تھا۔

فوج نے بظاہر ہیڈ کوارٹر کے احکام کے ماتحت گشت لگانا بند کر دیا تھا بلکہ ایک یا دو کمپنیاں جناح گارڈن سے واپس چھاؤنی بھی چلی گئی تھیں۔بہت سے جلوس نکالے گئے اور منتشر ہو گئے۔ان میں سے ایک جلوس نے احمدیہ بلڈنگز کا محاصرہ کر لیا جس کو اسسٹنٹ سب انسپکٹر محمد اکرم نے ہلکے لاٹھی چارج سے منتشر کر دیا۔اب ٹرینوں سے اور لاریوں سے رضا کاروں کے بے شمار دستے لاہور میں داخل ہو رہے تھے۔سرگودھا کے رضا کاروں کے ایک دستے کو سب انسپکٹر محمد حامد نے نولکھا تھانہ کے قریب منتشر کیا۔برانڈرتھ روڈ پر ایک سو دس رضا کاروں کے ایک اور دستے نے سید حسنات احمد سٹی مجسٹریٹ،ملک خاں بہادر سپرنٹنڈنٹ پولیس اور سید فردوس شاہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کا سامنا

کیا۔ رضا کاروں نے منتشر ہونے سے انکار کیا۔ اور چوک دال گراں پہنچے۔ جہاں ان پر اشک آور گیس چھوڑی گئی۔ وہ پھر منتشر نہ ہوئے۔ اور زمین پر بیٹھ گئے۔ جب لاٹھی چارج بھی غیر موثر ثابت ہوا تو پولیس والوں نے ان کو ایک ایک کر کے اٹھایا۔ ٹرکوں میں ڈالا اور لے گئے۔ اس واقع کے متعلق غلط افواہیں فوراً پھیلنے لگیں۔ ظاہر کیا گیا۔ کہ پولیس نے رضا کاروں کو منتشر کرتے ہوئے قرآن مجید کی توہین کی، اس کو ٹھوکریں لگائیں، اس کے اوراق پھاڑے اور ایک چھوٹے سے لڑکے کو ہلاک کر دیا۔ دہلی دروازے کے باہر جلسہ ہوا جس میں ایک لڑکا پیش کیا گیا جو اپنے ہاتھ میں قرآن مجید کے چند پھٹے ہوئے اوراق لیے ہوئے تھا۔ اس نے بیان کیا کہ میں کلام الٰہی کی توہین کا عینی گواہ ہوں۔ ایک مولوی (غالباً مولوی محمد یوسف) نے یہ اوراق ہاتھ میں لے کر حاضرین کو دکھائے اور ایک نہایت پر تشدد تقریر کی جس سے غصے میں بھرا ہوا مجمع اور بھی زیادہ غضبناک ہو گیا۔ واقعہ کی یہ بناوٹی کہانی ہر جگہ جوش میں بھرے ہوئے لوگوں کا موضوع گفتگو بن گئی۔ اور چند ہی گھنٹوں کے اندر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی جس سے پولیس کے خلاف غیض و نفرت کے جذبات برانگیختہ ہو گئے۔

ہم نے دال گراں کے واقعہ کا مذکورہ حال تحریری بیانات اور افسروں کی شہادت سے اخذ کیا ہے۔ لیکن اس کے متعلق احراریوں اور مجلس عمل والوں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ قطعاً مختلف ہے ان کا قول یہ ہے کہ اس واقعہ کے دوران میں ایک پولیس افسر نے قرآن کو ٹھوکر ماری اور ایک چھوٹے سے لڑکے کو زدوکوب کر کے مار ڈالا۔ اس قول کی تائید میں محمد نذیر گواہ نمبر ۳۲۔ محمد حنیف گواہ نمبر ۳۳ شیخ محمد رفیق گواہ نمبر ۳۴ اور سراج دین گواہ نمبر ۳۷ نے بیان دیے ہیں۔ عدالت نے سید حسنات احمد سٹی مجسٹریٹ اور ملک خاں بہادر خاں سپرنٹنڈنٹ پولیس (پنجاب کنسٹیبلری) کی شہادت بھی قلمبند کی ہے جو موقع پر موجود تھے۔ غیر سرکاری گواہوں کا بیان ہے کہ رضا کاروں کا ایک دستہ چوک دال گراں کی طرف سے ریلوے سٹیشن کی طرف آ رہا تھا کہ پولیس نے اس کو روکا۔ رضا کاروں سے منتشر ہونے کے لیے کہا گیا لیکن وہ بیٹھ گئے اور جب انہیں پاس کھڑے ہوئے ٹرکوں کی طرف لے جانے کی کوشش کی گئی تو وہ زمین پر لیٹ گئے۔ اور انہیں گھسیٹ کر لے جانا پڑا۔ جو لوگ اسطرح گھسیٹے گئے

ان میں ایک بوڑھا آدمی بھی تھا جس کے پاس ایک حمائل تھی۔ جب وہ گھسیٹا جا رہا تھا تو حمائل گر پڑی اور ایک پست قامت پولیس افسر نے جس کے گلے میں گلہڑ تھا اس کو ٹھوکر ماری اس معاملے کے متعلق گواہوں میں اختلاف ہے کہ آیا وہ حمائل ٹھوکر کھا کر نالی میں گر گئی یا وہیں زمین پر پڑی رہی۔ اور آیا وہ جزدان میں ملفوف تھی یا بغیر جزدان کے تھی جو شخص یہ جزدان پہنے ہوئے تھا وہ طلب نہیں کیا گیا نہ اس شخص کا کوئی اتا پتہ دیا گیا اور نہ اس لڑکے کے متعلق کوئی تفصیلات بتائیں گئیں ہیں جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کو مار مار کر ہلاک کر دیا گیا ہے۔ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ کوئی مسلمان پولیس آفیسر خواہ وہ کتنا ہی لامذہب کیوں نہ ہو۔ کتاب اللہ کو ٹھوکر مار سکتا ہے اور اس شدید ترین کافرانہ حرکت کا مجرم بن سکتا ہے۔ ہمارے سامنے بحث میں اس امر کو تسلیم کیا گیا ہے لیکن یہ بھی کہا گیا ہے کہ ممکن ہے کتاب اللہ نادانستگی کی حالت میں پامال کر دی گئی ہو۔ سید حسنات احمد اور ملک خاں بہادر خاں دونوں نے اس الزام کی صحت سے انکار کیا ہے۔ اور چونکہ اس بارے میں غیر سرکاری شہادت مایوس کن حد تک ناکافی اور قلیل ہے اس لیے ہم قبول نہیں کر سکتے کہ کسی نے قرآن مجید کو ٹھوکر ماری تھی یا کسی لڑکے کو مار مار کر ہلاک کر دیا تھا۔

شورش پسندوں نے حکام کے خلاف نفرت پھیلانے کے لیے جو دوسری چالیں اختیار کیں وہ حسب ذیل تھیں:۔

(۱) اس مضمون کے اشتہار شائع کیے گئے کہ جھنگ اور سرگودھا میں ایک ہزار سے زیادہ اشخاص گولیاں مار مار کر ہلاک کر دیے گئے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اس دن ان مقامات پر ایک گولی بھی نہیں چلائی گئی۔

۲۔ یہ افواہ پھیلائی گئی کہ احمدی موٹر کاروں میں سوار ہو کر اندھا دھند لوگوں پر گولیاں چلا رہے ہیں۔

۳۔ مسجد وزیر خاں سے یہ اعلان کیا گیا کہ سرکاری ملازموں نے دفتروں میں یہ ہڑتال کر دی ہے اور تحریک میں شامل ہو گئے ہیں۔

۴۔ یہ خبریں پھیلائی گئیں کہ ضلع کی پولیس نے گولی چلانے سے انکار کر دیا ہے اور اب

صرف بارڈر پولیس اور کانسٹیبلری پولیس گولیاں چلا رہی ہے۔

یہ بیان کہ بعض احمدی فوجی وردیاں پہنے ایک جیپ میں سوار ہو کر لوگوں کو اندھا دھند گولیاں کا نشانہ بنا رہے تھے۔ ہمارے سامنے موضوع ثبوت بنایا گیا اور اس کی تائید میں متعدد گواہ پیش کیے گئے۔ اگرچہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک پر اسرار گاڑی میں احمدی سوار تھے یا وہ گاڑی کسی احمدی کی ملکیت تھی۔

ساڑھے چار بجے شام دہلی دروازے کے باہر ایک جلسہ عام منعقد ہوا جس کے حاضرین کی تعداد پانچ ہزار کے قریب تھی اس جلسے میں یہ بیان کیا گیا کہ چوک دال گراں میں پولیس نے ایک لڑکے کو گولی مار دی ہے اور قرآن مجید کو پامال کیا ہے۔ جلسے کے بعد ایک جلوس مرتب کیا گیا جو مسجد وزیر خاں کی طرف روانہ ہوا۔ منظور الحق اور محمد صادق اسسٹنٹ سب انسپکٹروں نے مسجد کے قریب اس ہجوم کو روکا۔ سید فردوس شاہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو فون پر اطلاع ملی کہ لوگ ان اسسٹنٹ سب انسپکٹروں کو اٹھا کر مسجد لے گئے ہیں اور یہ دونوں ہلاک کر دیے گئے ہیں یا عنقریب کیے جانے والے ہیں۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ایک مسلّح ریزرو دستہ زیر سرکردگی سب انسپکٹر مظفر خاں (تھانہ کوتوالی) ساتھ لیا اور مسجد کی طرف چل دیے، مسجد کے عین باہر ان کا سامنا ایک غضبناک ہجوم سے ہوا جب ڈی ایس پی نے پوچھا کہ دو پولیس افسر کہاں ہیں تو ان کو بلوائیوں نے گھیر لیا اور ان پر چھروں اور لاٹھیوں سے حملہ کر کے وہیں ہلاک کر دیا۔ سید فردوس شاہ کے جسم پر باون زخموں کے نشان تھے۔ ان کا اپان ریوالور اور ان کے دو ساتھی پولیس مینوں کی بندوقیں چھین لی گئیں۔ اور سب انسپکٹر مظفر خاں زخمی ہو گیا۔ ڈی ایس پی کی نعش کو کسی نے کوتوالی پہنچا دیا۔ جہاں ہوم سیکرٹری، انسپکٹر جنرل پولیس، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سینئیر سپرنٹنڈنٹ پولیس موجود تھے۔ کرنل عالم آفیسر کمانڈنگ فرسٹ بلوچ رجمنٹ بھی بعض دوسرے افسروں کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ اور بعد میں جنرل آفیسر کمانڈنگ بھی ان سے آن ملے جس وقت یہ افسر صورتحال پر غور کر رہے تھے تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بتایا کہ ڈی ایس پی کے قتل کی خبر سن کر میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ شہر فوج کے حوالے کر دوں۔ اس کے بعد انہوں نے فوجی افسروں پر اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ انسپکٹر جنرل پولیس نے اس اقدام کو پسند نہ

کیا اور کہا کہ اس مرحلے پر شہر کو فوج کے حوالے کرنے کی ضرورت نہیں ۔اگر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ انتظام کو سچ مچ فوج کے حوالے کر دیتے تو ہم ان کے اس فعل کو معقول اور دانشمندانہ خیال کرتے ۔ لیکن یہ صاحب خود ہی اس امر کی نیکنامی لینے پر آمادہ نہیں ہیں ۔ چنانچہ ہمارے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا کہ میں نے تو فوج کے حوالے کرنے کا کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔

جو افسر اس وقت موجود تھے انہوں نے کرفیو نافذ کرنے کا فیصلہ کیا ۔اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں نے اس کے متعلق حکم نافذ کر دیا ۔ پولیس نے شہر میں گشت کی ۔اس کا سابقہ کئی مجمعوں سے پڑا جن کو اس نے گولی چلا کر منتشر کر دیا ۔اس طرح ایک ہجوم جو کرفیو کے حکام کی خلاف ورزی کر رہا تھا بھاٹی دروازے کے قریب ملا اور چند گولیاں چلانے سے منتشر ہو گیا ۔نولکھا بازار میں بھی ایک مجمع کرفیو توڑنے کے لیے اپنے گھروں سے نکل آیا تھا ۔اس پر بھی گولی چلائی گئی احراری رضا کاروں کا ایک ہجوم جو دفتر احرار کے قریب سرکلر روڈ پر جمع ہو گیا تھا کوتوالی کی طرف پیش قدمی کرنے لگا ۔اس کو ضروری تنبیہ کی گئی ۔اور پھر اس پر گولی چلائی گئی ۔جس سے ایک شخص ہلاک اور ایک مجروح ہوا ۔ایک اور ہجوم کو چودھری محمد حسین سپرنٹنڈنٹ پولیس نے میکلوڈ روڈ پر رائفل سے فائر سے منتشر کیا ۔جس سے کچھ جانی نقصانات ہوئے ۔نسبت روڈ پر انسپکٹر آغا سلطان احمد نے چار راؤنڈ چلائے ۔سب انسپکٹر نے گوالمنڈی میں دو دفعہ گولی چلائی خود انسپکٹر جنرل نے ایک مجمع پر گولی چلوائی جو کوتوالی کی طرف بڑھ رہا تھا اس پر کچھ جانی نقصانات ہوئے ۔اسسٹنٹ سب انسپکٹر پولیس چوکی موچی دروازے نے ان بلوائیوں پر گولی چلائی جو پولیس چوکی پر خشت باری کر رہے تھے ۔غرض پورا شہر شور و غوغا کا ایک ہنگامہ زار بنا ہوا تھا ۔رات بھر (دور دور تک مہیب و ہولناک شور کی آوازیں سنائی دیتی رہیں ۔آدھی رات سے کچھ بعد چیف منسٹر کی کوٹھی پر ایک اجلاس ہوا جس میں ہوم سیکرٹری، انسپکٹر جنرل پولیس، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں سینئیر سپرنٹنڈنٹ پولیس جنرل آفیسر کمانڈنگ اور بعض دوسرے فوجی افسر شریک تھے یہ اجلاس تین بجے شب تک جاری رہا انسپکٹر جنرل پولیس نے جنرل آفیسر کمانڈنگ کو بتایا کہ کون کون سے واقعات ہو چکے ہیں ۔اور کن کن حوادث کا اندازہ ہے تا کہ اس امر کا فیصلہ کیا جا سکے کہ فوج سے کیونکر موثر کام لیا جا سکتا ہے۔

۵۔ مارچ: جو واقعات سید فردوس شاہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے قتل کے بعد رونما ہوئے اور ہولناک شور کی آوازیں ۴ مارچ کی رات کو سنیں گئیں۔ آئندہ صبح کے منحوس حوادث کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں اگرچہ ہر شخص اندازہ لگا رہا تھا کہ اب کیا ہوگا لیکن جو کچھ ہوا وہ کسی کے تصور میں بھی نہ آیا تھا۔ اول یہ امر کہ حکم زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری جس کے رو سے لوگوں کا اجتماع ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ اس کا اطلاق اندرون فصیل کے شہر پر نہ ہوتا تھا۔ دوم یہ امر کہ کوئی ذمہ دار افسر مسجد وزیر خاں تک نہیں جا سکتا تھا جہاں سپرنٹنڈنٹ پولیس قتل کر دیا گیا تھا۔ ان دونوں امور سے گویا اس حقیقت کا اعتراف کر لیا گیا تھا کہ شہر ان حکام کی رسائی سے باہر ہو چکا ہے جو امن و نظم کے قیام کے ذمہ دار تھے۔

۵۔ مارچ کی صبح کو نو بجے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے معززین شہر کا اجلاس طلب کیا تا کہ ان کو یہ ترغیب دی جائے کہ وہ عوام کو پرامن رہنے کی تلقین کریں اور ان پر اپنے ذاتی اثر سے دباؤ ڈالیں لیکن کسی نے اس راہ عمل پر گامزن ہونے کی حامی نہ بھری اور صرف چند عورتیں مسجد وزیر خاں میں جانے کے لیے آمادہ ہوئیں جتنا دن چڑھتا گیا۔ حادثے پر حادثہ رونما ہوتا گیا۔ پولیس اور احمدیوں پر حملے کیے گئے اور حکومت یا احمدیوں کی اموال و جائیداد کو آگ لگانے اور لوٹنے کا ہنگامہ جاری رہا۔ زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری جو حکم صادر کیا گیا تھا کہ پانچ یا پانچ سے زیادہ اشخاص ایک جگہ جمع نہ ہوں۔ وہ شہر بھر میں توڑ دیا گیا تھا ہجوم ہر جگہ جمع ہو رہے تھے لوگ ان لوگوں کو گالیاں اور دھمکیاں دے رہے تھے جو گاڑیوں میں سوار نظر آتے تھے بعض حالات میں ان لوگوں کو گھسیٹ کر سواریوں سے اتار دیا گیا۔ باغبانپورہ کا ایک احمدی مدرس منظور احمد چھرے کی ضرب سے ہلاک کر دیا گیا اور اسکے بعد قتل لوٹ اور آتش زنی کے مزید واقعات ہوئے۔ حکومت کی بعض اومنی بسیں بالکل جلا کر خاکستر کر دی گئیں اور دو ڈاک خانے پہلے لوٹے گئے اور پھر جلا دیے گئے۔ پولیس کی ایک گاڑی کو آگ لگا دی گئی اور چھ اور گاڑیاں توڑ پھوڑ دی گئیں۔ بہت سے پرائیویٹ کاروباری مرکز بھی لوٹ لیے گئے۔ پولیس کا ایک دستہ چند نعشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے میو ہسپتال لے جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک ہجوم آن

پہنچا جس نے ان نعشوں کو چھیننے کی کوشش کی تا کہ عوام کے سامنے مظاہرہ کیا جا سکے۔اس کشمکش میں دو کانسٹیبل مجروح ہوئے۔کئی مقامات پر پولیس پر خشت باری کی گئی اور دو جگہ اس پر گولی بھی چلائی گئی۔ایک ہیڈ کانسٹیبل گولی سے زخمی ہوا۔لوہاری دروازے کے باہر فوج کے ایک گشتی دستے پر بھی اینٹیں پھینکی گئیں۔چنانچہ اس دستے کو بھی گولی چلانی پڑی،پولیس کو دن بھر میں کئی مقامات پر گولی چلانی پڑی۔سیکرٹریٹ اور دوسرے کئی دفتروں کے کلرکوں نے کام چھوڑ دیا اور باہر نکل آئے۔اسلامیہ کالج کے طالب علم بھی کلاسیں چھوڑ کر دیال سنگھ کالج کو روانہ ہو گئے اور اس کالج کے طالب علموں کو اپنے میں شامل ہونے پر آمادہ کر لیا۔انہوں نے خشت باری کر کے دروازوں اور کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالے اور پرنسپل کی موٹر کار کو بھی توڑ پھوڑ دیا۔دیال سنگھ کالج سے وہ یونیورسٹی ہال پہنچے اور وہاں سے گورنمنٹ کالج جا پہنچے۔ان کو بزور منتشر کرنے کی کوئی کوشش نہ کی گئی کیونکہ پولیس طلبا سے تصادم پیدا کرنے پر آمادہ معلوم نہ ہوتی تھی۔

سائیکلوسٹائل سے چھاپے ہوئے اشتہار دیواروں پر چسپاں کیے گئے۔جن میں پولیس کے آدمیوں سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہتھیار ڈال دیں کیونکہ حکومت کے خلاف جدوجہد ''جہاد'' ہے۔جس میں کسی مسلمان کو دوسرے مسلمان پر گولی نہ چلانی چاہیے۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے کرفیو لگا کر حکم دیا کہ ۵ اور ۶ مارچ کی درمیانی شب کو ساڑھے تین بجے شام سے چھ بجے تک صبح تک اور چھ سے گیارہ مارچ ۶ بجے شام سے چھ بجے صبح تک کوئی شخص کسی سڑک،بازار،گلی،چھوٹی گلی،شارع عام پر یا کسی پبلک مقام پر باہر نہ نکلے۔اس حکم کا اطلاق پورے شہر پر ہوتا تھا صرف سول لائنز کا ایک حصہ مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔اس رقبے کے اندر کسی پبلک مقام پر پانچ یا پانچ سے زیادہ اشخاص کا اجتماع اور دن اور رات کے کسی حصے میں بھی اسلحہ اٹھا کر چلنا بھی دو مہینے کے لیے ممنوع قرار دیا گیا تھا۔

صبح کو گورنر نے کابینہ کا ایک اجلاس منعقد کیا جس میں چیف سیکرٹری،ہوم سیکرٹری،جنرل آفیسر کمانڈنگ دہم ڈویژن بعض سٹاف افسر،ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سینئیر سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی طلب کیے گئے۔اس جلسے میں جو وزراء و احکام شریک ہوئے۔ان سے گورنر نے کہا کہ قوت کا

استعمال نہایت مضبوطی سے کرو۔ کیونکہ میرا بمبئی کا تجربہ یہی ہے کہ اگر فسادات کے اولین مرحلوں پر بلوائی کثیر تعداد میں ہلاک کر دیے جائیں تو بلوہ وہیں ختم ہو جاتا ہے۔ اس اجلاس میں طویل بحث و مباحثہ کے بعد مندرجہ ذی فیصلے کیے گئے۔

(۱) چونکہ لاہور کی صورتحال بدتر ہو چکی ہے۔ اور شہر بھر میں ہنگامہ برپا ہے۔ اس لیے اولاً پولیس کو چاہیے کہ فسادات کو فرو کرنے کے لیے زیادہ جتنی قوت کا استعمال ضروری ہو اس سے کام لے، شدید اقدام کرے، پولیس کے گشتی دستوں کی امداد کے لیے فوجی دستے بھی مامور رہیں گے۔ جو اپنے کمانڈروں کے ماتحت ہونگے۔ افسر وہاں موجود ہوں۔ ان کو چاہیے کہ اس حصے کی صورتحال کا انتظام اپنے ساتھ کے فوجی کمانڈر کے حوالے کر دے۔

۲۔ اگر پولیس کسی خاص حصہ شہر کی حالت پر قابو پانے سے عاجز ہو تو جو سینئر پولیس افسر وہاں موجود ہو اس کو چاہیے کہ اس حصے کی صورتحال کا انتظام اپنے ساتھ کے فوجی کمانڈر کے حوالے کر دے۔

۳۔ اگر مندرجہ بالا تدابیر قانون وانتظام کی بحالی میں ناکام رہیں اور پولیس فوج کی اس جزوی امداد سے بھی عام صورتحال پر قابو نہ پاسکے تو فوج سے کہا جائے گا کہ شہر کا چارج لے لے۔

۴۔ پولیس کے حوصلوں کو بلند رکھنے کے لیے ہر تدابیر عمل میں لائی جائیں۔ پولیس کے آدمیوں کو بتا دیا جائے کہ جو لوگ بہادری کا ثبوت دیں گے اور اپنے فرائض کو امتیاز اور دیانتداری سے انجام دیں گے ان کو مناسب انعامات دیے جائیں گے۔ ان کو یہ بھی بتا دیا جائے کہ اگر ادائے فرائض کے دوران میں کوئی جانی نقصان ہو گیا تو وارث کو کافی معاوضہ عطا کیا جائے گا۔ سید فردوس شاہ مرحوم کے وارثوں حکومت کسی قالونی کے ضلع میں دو مربع اراضی عطا کرے گی۔

۵۔ جہاں تک ممکن ہو طالب علموں کو بلوائیوں سے الگ رکھنے کی کوشش کی جائے۔

۶۔ ہز ایکسیلینسی گورنر آج تمام سیاسی جماعتوں کے نمائندہ معزز شہریوں سے خطاب کریں

گے کہ وہ شہر میں عقل و ہوش کو بحال کرنے میں اپنے اثر کو استعمال کریں۔

چیف سیکرٹری سے کہا گیا کہ وہ بیان کردہ مسودہ تیار کریں جو معزز شہریوں کے دستخطوں سے جاری کیا جائے جو آج سہ پہر کے وقت مدعو کیے گئے ہیں۔لیکن چونکہ چیف سیکرٹری صاحب سیکرٹریٹ بلا لیے گئے تھے جہاں کلرکوں نے ہڑتال کر رکھی تھی۔اس لیے اس بیان کا مسودہ ہوم سیکرٹری نے تیار کیا۔ہوم سیکرٹری کے لکھے ہوئے مسودے کے متعلق گورنر نے یہ رائے دی کہ اس میں مطالبات کی اس قدر زیادہ مذمت کی گئی ہے کہ نمائندگان عوام سے اس کی منظوری کی توقع نہیں کی جاسکتی۔سیکرٹریٹ سے واپسی پر چیف سیکرٹری نے بھی مسودہ تیار کرنے کی کوشش کی لیکن بالآخر یہ خیال ترک کر دیا گیا۔

سہ پہر کے جلسے میں گورنر اور چیف منسٹر کے ایما پر انسپکٹر جنرل پولیس نے صورتحال کی مفصل کیفیت بیان کی۔ان کے بعد دو اور مقررین یعنی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مسٹر احمد سعید کرمانی ایم ایل اے نے تقریریں کیں۔مولانا نے صورتحال کو حکومت اور عوام کے درمیان خانہ جنگی سے تعبیر کیا اور بتایا کہ جب تک حکومت عوام کے مطالبات کے متعلق غور کرنے پر آمادگی ظاہر نہ کریگی۔میں کسی اپیل میں شریک نہیں ہوسکتا۔مسٹر کرمانی نے کہا کہ اس تحریک کی قیادت اب زیادہ تر بازاری غنڈوں اور دوسرے غیر ذمہ دار اشخاص کے ہاتھ میں ہے اور تعلیم یافتہ لوگ اس کے ساتھ نہیں ہیں۔جب مسٹر کرمانی تقریر کر چکے تو چیف سیکرٹری،ہوم سیکرٹری اور انسپکٹر جنرل پولیس نے باہر جانے کی اجازت طلب کی تاہم یہ اجلاس جاری رہا۔اور مولانا مودودی ایک اپیل کا مسودہ تیار کرنے میں مصروف ہوگئے۔لیکن وہ مسودہ گورنر اور چیف منسٹر نے قبول نہ کیا۔

گورنمنٹ ہاؤس میں شام کو ایک اور اجلاس ہوا۔جس میں وزراء،جنرل آفیسر کمانڈنگ بریگیڈیر حق نواز، بریگیڈیر ایف آر کلو، چیف سیکرٹری،ہوم سیکرٹری،انسپکٹر جنرل پولیس،ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس اور ملک حبیب اللہ سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی شامل تھے۔صورتحال پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ لاقانونی کا آخری واقعہ ڈھائی بجے بعد دوپہر ہوا تھا۔جس میں پولیس کے ایک دستے پر حملہ کیا گیا تھا۔اور پولیس کی ایک گاڑی جلادی گئی تھی۔اس لیے جہاں تک ممکن تھا اب

گولی چلانے سے پرہیز کیا جائے۔ گورنر نے کہا کہ کرفیو کی خلاف ورزی کے معمولی واقعات پر توجہ نہ کی جائے اور حکام میں سے ایک نے یا خود گورنر نے بھی تجویز کی کہ گولی چلانا بند کر دیا جائے۔ فائرنگ کو نرم کر دینے کا فیصلہ ان پولیس افسروں کے لیے بیحد پریشان کن ثابت ہوا جو صورتحال پر قابو پانے میں مصروف تھے۔ صبح کے احکام تو یہ تھے کہ پولیس کو مضبوط تدابیر اختیار کرنی چاہیں۔ چنانچہ مسٹر ایس این عالم اور ملک حبیب اللہ خاں کی کمان میں پولیس کے گشتی دستے انہی ہدایات کے ساتھ بھیج دیے گئے تھے جب شام کے احکام کوتوالی کے مرکز میں پہنچے اور وہاں ان کے افسروں کو پہنچائے گئے جو عملی اقدامات میں مصروف تھے تو بالکل ششدر و مبہوت رہ گئے۔ اور ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ اب کیا کریں پولیس کی بکھری ہوئی ٹولیاں بالکل پریشانی کی حالت میں تھیں۔ رات کے وقت صرف ایک موقع پر گولی چلائی گئی جب ریلوے ملازمین کے ایک ہجوم نے ہڑتال کر دی تھی اور ایک سگنل اور ایک ٹرین کو تباہ کرنے میں مصروف تھا۔

۵ مارچ کے دو ایسے واقعات ہیں جو ہمارے سامنے بحث و مناقشہ کا موضوع بنے رہے۔ اس میں پہلا واقعہ تو یہ تھا کہ دوپہر کے وقت گوال منڈی میں گولی چلائی گئی جس میں (بیان کیا جاتا ہے کہ) بہت سے اشخاص ہلاک ہوئے۔ جن میں عبدالعزیز۔ مودی۔ نظام دین۔ اور محمد حبیب بھی شامل تھے۔ احرار اور مجلس عمل کا بیان ہے کہ ان لوگوں کو ملک خان بہادر خان سپرنٹنڈنٹ پولیس پنجاب کنسٹیلری اور اے ایس آئی عبدالکریم نے ہلاک کیا۔ جو ان دنوں تھانہ گوال منڈی میں تعینات تھا۔ کہا جاتا ہے کہ عبدالعزیز اور مودی کو عبدالکریم نے اور نظام دین اور محمد حبیب کو ملک خان بہادر خان نے رائفل کی گولیوں سے ہلاک کیا۔ اس بیان کو ثابت کرنے کے لیے جو گواہ طلب کیے گئے۔ وہ یہ ہیں:۔

ہدایت اللہ ۴۵ حسین بخش ۴۶ غلام احمد نمبر ۴۸ چراغ دین ۴۹ عبدالرؤف نمبر ۵۰ ماسٹر عبدالمجید نمبر ۵۱، حکیم محمد جمیل نمبر ۵۳ مہر دین ۵۴ سراج دین ۵۶ غلام حسین ۵۷ تاج دین ۵۸ علاؤالدین ۵۹ سردار محمد نمبر ۵۵ محمد حنیف ۵۶ نمبر اور مقبول احمد نمبر ۶۱۔ اس واقعہ کی علیحدہ تفتیش مسٹر عطا محمد خاں نون ڈی آئی جی، مسٹر عبدالحئی مجسٹریٹ اور ایک فوجی افسر نے بھی کی۔ اس تفتیش میں بھی

ان دونوں افسروں میں سے کسی کے خلاف کسی چیز کا ثبوت فراہم نہیں ہوسکا۔حالانکہ ہمارے سامنے شہادت میں ان دونوں پر بیگناہوں کے خون کا ناحق الزام لگایا تھا۔

اس فائرنگ کا سراغ اس سے پیشتر کے ایک واقعہ میں معلوم ہوتا تھا جس کی رپورٹ ابتدائی نمبرے تھانہ گوال منڈی میں لکھوائی گئی تھی۔اس رپورٹ میں یہ لکھا تھا۔اطلاع موصول ہوئی ہے کہ کئی سو آدمی گوال منڈی میں اے ایس آئی عبدالکریم کے گھر کو آگ لگا رہے ہیں۔جس نے اس دن میو ہسپتال کے قریب گولی چلائی تھی۔یہ اطلاع موصول ہوتے ہی اے ایس آئی فیض احمد، اے ایس آئی سلطان احمد اور ہیڈ کانسٹیبل عبدالقادر سمیت پولیس کا ایک دستہ اس مقام پر پہنچے۔انہوں نے ہجوم کو منتشر کرنے کی کوشش کی۔لیکن ان پر ایک مکان کی چھت پر سے گولی چلائی گئی۔جو ہیڈ کانسٹیبل عبدالقادر کو لگی ایک کانسٹیبل کو چھری سے پیٹا گیا۔

متنازعہ واقعہ غالبًا اس سے کچھ دیر بعد رونما ہوا۔اور یہ بالکل ممکن ہے کہ پولیس نے عبدالقادر ہیڈ کانسٹیبل اور ایک پیادہ کانسٹیبل کے زخمی ہو جانے کی وجہ سے انتقامًا گولی چلائی ہو۔اے ایس آئی عبدالکریم قطعی طور پر منکر ہے کہ وہ اس فائرنگ کے وقت موجود تھا۔اس کا بیان ہے کہ اس دن اس نے اپنے ریوالور سے صرف تین راؤنڈ چلائے۔ایک گندے انجن کے پاس، دوسرا چوک امیر علی کے پاس اور تیسرا اپنے گھر کے قریب۔لیکن ان فائروں سے کوئی ہلاک نہیں ہوا۔تاہم وہ تسلیم کرتا ہے کہ اس دن ملک خان بہادر خان سپرنٹنڈنٹ پولیس پنجاب کانسٹیبلری کے حکم سے گوال منڈی میں کوئی دوسری فائرنگ ہوئی تھی جس کا واقعہ متنازعہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ہم اس واقعہ کے متعلق اپنی کوئی رائے ظاہر کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔کیونکہ ہماری شرائط تحقیقات کا دائرہ اس کا مقتضی ہے کہ ہم صرف اختیار کردہ تدابیر کے کافی یا ناکافی ہونے کے متعلق رپورٹ کریں۔حد سے زیادہ فائرنگ ہمارے دائرہ تحقیقات سے باہر ہے۔بجز اس حالت کے کہ ایسی فائرنگ فسادات میں اضافہ کرنے کا باعث ہوئی ہو۔

۵۔مارچ کے واقعات کے متعلق دوسرا متنازعہ فیہ امر کابینہ کا وہ اجلاس تھا جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ساڑھے چھ بجے شام گورنمنٹ ہاؤس میں منعقد ہوا تھا جس کی صدارت گورنر نے

کی تھی اور جس میں میجر جنرل محمد اعظم خان، جی او سی بریگیڈیئر حق نواز، بریگیڈیئر کلو، چیف سیکرٹری، ہوم سیکرٹری، انسپکٹر جنرل پولیس اور ملک حبیب اللہ اے ڈی آئی جی سی آئی ڈی شامل تھے۔اس اجلاس کے فیصلوں میں ایک مبینہ فیصلہ یہ تھا کہ فائرنگ کو نرم کر دیا جائے۔گورنر اور جی او سی دونوں اس امر سے انکار کرتے ہیں کہ کوئی ایسا اجلاس تھا۔لیکن چیف سیکرٹری، ہوم سیکرٹری انسپکٹر جنرل پولیس اور ملک حبیب اللہ قطعی طور کہتے ہیں کہ ایسا اجلاس منعقد ہوا تھا۔اس اجلاس کی کاروائی ملک حبیب اللہ نے کاغذ کے ایک پرزے پر نوٹ کی تھی۔(Ex.D.E23) وہ پرزہ انہوں نے جلسے کے کچھ دیر بعد ہوم سیکرٹری کے حوالے کر دیا تھا اور ہوم سیکرٹری نے اس کو اپنے تحریری بیان کے ساتھ عدالت میں پیش کیا تھا۔اس تحریر کے اندراس کے صحیح ہونے کی شہادت موجود ہے کیونکہ یہ بہت عجلت میں لکھی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور اس کے بعض فقرے واضح طور پر نامکمل ہیں۔اس میں اجلاس کا وقت ساڑھے چھ بجے شام لکھا ہے حاضر اشخاص کے نام لکھے ہوئے ہیں۔اور اجلاس کے پانچ فیصلے بھی درج ہیں، جن میں ایک یہ تھا: ''ہزایکسیلینسی نے کہا کہ کرفیو کی معمولی اصطلاحی خلاف ورزیوں پر کوئی کاروائی نہ کی جائے'' اس تحریر میں نہ فائرنگ میں کمی کرنے'' کے الفاظ درج ہیں نہ ''let up'' کا لفظ لکھا ہے۔یہ بالکل ممکن ہے کہ نہ مسٹر چندریگر اور نہ میجر جنرل محمد اعظم خاں کو واضح طور پر وہ باتیں یاد رہی ہوں جو اس وقت کی پریشانی اور گڑبڑ میں ہوئی تھیں۔یہ بھی ہوسکتا کہ حکام نے جس کو رسمی اجلاس بتایا ہے وہ محض ایک بحث ومشورہ کی مجلس ہو جس میں حاضرین نے بعض ایسے خیالات ظاہر کیے ہوں جن پر عمومی حیثیت سے اتفاق ہو گیا ہو۔اور ملک حبیب اللہ خاں کو ایک رسمی اجلاس کے فیصلہ جات قرار دے رہے ہوں۔یہ نکتہ کچھ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ مسٹر چندریگر خود تسلیم کرتے ہیں کہ اس دن گفت وشنید کے دوران میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ کرفیو کی اصطلاحی خلاف ورزی کی حالت میں کوئی کاروائی نہ کی جائے۔لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے کہ صبح کے فیصلوں میں کچھ تبدیلیاں تجویز کی گئیں اور قبول بھی کر لی گئیں۔اور ان تبدیلیوں کو پولیس نے خدا جانے کیوں اس امر کی ہدایت سمجھ لیا کہ وہ صبح کے فیصلوں کے مطابق فساد کو دبانے کے لیے قوت کا استعمال جس حد تک کر رہے ہیں اس حد تک نہ کریں۔یہ واقعہ ہے کہ اس اجلاس کے بعد پولیس نے اک موریا پل کے سوا

اور کسی مقام پر کوئی گولی نہیں چلائی۔اس سے قطعی طور پر ظاہر ہے کہ پولیس کے فائرنگ کے نرم کر دینے کی ہدایت ضرور دی گئی ہوگی۔

۶۔ مارچ: ۶ مارچ کو جمعہ کا دن تھا اور صبح سویرے ہی تمام اطراف سے جلوس مسجد وزیر خاں میں دھڑا دھڑ پہنچ رہے تھے۔حکومت کے دفاتر نے کام بند کر دیا۔لوکو اور کیرج کی ورکشاپیں بند ہوگئیں اور مزدور پوری تعداد میں تحریک سے اظہار ہمدردی کے طور پر باہر نکل آئے۔غیظ میں بھرے ہوئے ہجوم نے کوتوالی کا محاصرہ کرلیا۔لوگ اس عمارت پر پتھر پھینک رہے تھے اور مطالبہ کرر ہے تھے کہ جن سینئیر پولیس افسروں نے گولی چلائی ہے وہ ان کے حوالے کر دیے جائیں۔چونکہ تازہ ترین احکام یہ تھے کہ گولی چلانے سے حتیٰ الامکان احتراز کیا جائے۔اس لیے ہجوم کو دور رکھنے کی غرض سے اشک آور گیس کے بم کوتوالی کے چھت سے پھینکے گئے۔لیکن جونہی اشک آور گیس ہوا میں تحلیل ہوگئی ہجوم دوبارہ کوتوالی پر یورش کرنے لگا جس وقت انسپکٹر جنرل پولیس کوتوالی کی طرف آرہے تھے۔ایک ہجوم جو جو کاروں تانگوں اور سائیکلوں پر سوار اشخاص کو روک رہا تھا۔ان کی موٹر کو بھی ریلوے سٹیشن کے قریب روکا انہوں نے نولکھا تھانہ کے قریب ایک ٹینک دیکھا جس کے گرد کوئی محافظ حلقہ نہ تھا۔لیکن کچھ فوجی سپاہی موجود تھے۔اور لوگ اس ٹینک کے گرد گھوم رہے تھے۔سرکلر روڈ کے ایک زیریں پل کے پاس ان کو ایک اور ہجوم نے روکا جس کی قیادت ایک ڈاڑھی والا آدمی کرر ہا تھا۔لیکن وہ کسی نہ کسی طرح آگے نکل گئے۔انہوں نے ایک اور ہجوم کو دیکھا جو ایک گھوڑا گاڑی کا تعاقب لاٹھیوں سے کر رہا تھا۔آخر اس نے گاڑی کو جالیا اور گھوڑے کو کھول دیا۔کوتوالی کے قریب پہنچ کر انہوں نے سنا کہ ہجوم یہ نعرے لگا رہا تھا شاہی پولیس زندہ باد، پاکستانی فوجی زندہ باد، پولیس کانسٹیبلری اور بارڈر پولیس مردہ باد۔کوتوالی میں آئی جی نے سینئیر سپرنٹنڈنٹ پولیس مرزا نعیم الدین سے ملاقات کی اور دونوں نے واقعات کے متعلق تبادلہ خیالات کیا۔مرزا نعیم الدین نے اس گفتگو کے دوران میں کیا کہا۔اس کے متعلق میاں انور علی انسپکٹر جنرل پولیس اور مرزا نعیم الدین سینئیر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے بیانوں میں ایک شدید اختلاف ہے۔اس نکتہ پر میاں انور علی کی شہادت درج ذیل ہے:۔

''انہوں نے (مرزا نعیم الدین نے) کہا کہ لوگوں کا کسی نہ کسی وجہ سے یہ خیال ہے کہ حکومت غلطی پر ہے اور نہ صرف غیر ہمدرد ہے بلکہ عملاً مخالف ہے۔ان حالات میں قوت کا

استعمال عام احساسات کو تیز وتند کر رہا ہے اور تلخ کلامی میں اضافے کا باعث ہو رہا ہے۔انہوں نے کہا اب تک حکومت نے مطالبات کے متعلق اپنا رویہ معیّن نہیں کیا۔نہ اس امر کے آثار نظر آتے ہیں کہ حکومت ان پر غور کرنے کے لیے تیار ہے۔مرزا نعیم الدین کے نزدیک اس وجہ سے صورت حال زیادہ دشوار ہو رہی ہے۔وہ اس امر کے خواہاں تھے کہ اپنا خیال چیف منسٹر کی خدمت میں پیش کریں اور کہیں کہ محض سختی کرنے سے صورت حال پر قابو پانے کی کوئی صورت نہیں۔وہ چاہتے تھے حکومت پنجاب لوگوں کو اس بات کا یقین دلائے کہ وہ اتنی غیر ہمدرد اور سنگدل نہیں جتنا اس کو ظاہر کیا جا رہا ہے۔اور وہ مطالبات کا فیصلہ کرانے کے لیے اپنی پوری کوشش صرف کر رہی ہے۔ان کے نزدیک اس قسم کی اپیل حکومت کے خلاف تلخی اور عناد کے جذبات فروہ ہو جائیں گے جو بحالت موجودہ واضح طور پر تیز ہو رہے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔(گورنمنٹ ہاؤس پہنچنے کے بعد) میں نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو چیف منسٹر کی خدمت میں پیش کر دیا۔اور انہوں نے وہاں بھی وہی باتیں دہرائیں جو مجھ سے کی تھیں۔‘‘

لیکن مرزا نعیم الدین نے آئی جی سے اپنی گفت وشنید کے متعلق جو بیان دیا ہے وہ درج ذیل ہے:۔

’’میں کوئی سات بجے کوتوالی پہنچا اور کوئی آدھ گھنٹے کے بعد انسپکٹر جنرل پولیس بھی وہاں پہنچ گئے۔میں نے صورتحال کے متعلق انسپکٹر جنرل پولیس سے بات کی اور ان کو بتایا کہ صورتحال نہایت خطرناک ہے اور حکومت کی کمزور پالیسی اب پولیس کے حوصلوں کو بھی پست کر رہی ہے حالانکہ حکومت کی پالیسی کا یہی پرزہ (یعنی پولیس) اب اس کی حمایت میں کھڑا ہے۔میں نے ان پر زور دیا کہ وہ ہزایکسیلینسی اور عزت مآب چیف منسٹر صاحب پر اس امر کی صراحت کر دیں۔میں نے ان کو بتایا کہ اگر حکومت اپنی پالیسی میں ترمیم نہ کرے گی۔تو میں استعفیٰ دے دوں گا انسپکٹر جنرل نے مجھ سے اتفاق کیا۔اور ہم دونوں گورنمنٹ ہاؤس کو گئے‘‘۔

ان دونوں بیانوں کا مقابلہ کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں مسٹر انور علی کے بیان کے

مطابق مرزا نعیم الدین قوت کے استعمال کے خلاف تھے اور چاہتے تھے حکومت مطالبات کے متعلق اپنے رویے کی وضاحت کرے۔ اور وہ اعلان کرے کہ وہ غیر ہمدرد اور سنگدل نہیں اور حتیٰ الوسع کوشش کر رہی ہے کہ مطالبات کے متعلق کوئی فیصلہ کرے۔ وہاں مرزا نعیم الدین کا بیان یہ ہے کہ میرے نزدیک حکومت کمزور پالیسی پر عمل کر رہی ہے جس سے پولیس کا حوصلہ پست ہو رہا ہے اور اگر پالیسی تبدیل نہ کی گئی تو میں مستعفی ہو جاؤں گا۔ علاوہ بریں مرزا نعیم الدین نے اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا کہ گورنمنٹ ہاؤس میں چیف منسٹر کے سامنے طلب کیے گئے اور انہوں نے چیف منسٹر سے کیا کہا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر انور علی کے قول کے مطابق مرزا نعیم الدین نے کوئی ایسی بات ضرور کی تھی۔ اگرچہ مرزا نعیم الدین اس سے انکار کرتے ہیں لیکن مسٹر چندریگر اور مسٹر دولتانہ کی شہادتوں سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

اب سلسلہ حکایت پھر شروع ہوتا ہے۔ انسپکٹر جنرل پولیس نے اور سینئیر سپرنٹنڈنٹ پولیس کوتوالی سے چیف منسٹر کی کوٹھی پر پہنچے۔ جہاں انہیں معلوم ہوا کہ وہ گورنمنٹ ہاؤس چلے گئے ہیں۔ راستے میں انہوں نے دیکھا کہ تمام دوکانیں بند ہیں اور آدمیوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں شرارت کی نیت سے ادھر ادھر گھوم رہی ہیں۔ چیف منسٹر کی کوٹھی سے یہ دونوں گورنمنٹ ہاؤس گئے۔ گورنمنٹ ہاؤس پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ چیف منسٹر اور دوسرے تمام وزرا وہاں موجود تھے۔ ان کے علاوہ کارپوریشن کے ممبر جن میں بعض خواتین مثلاً بیگم تصدق حسین اور بیگم جی اے خان بھی تھیں۔ کارپوریشن کے ممبر اور نواب مظفر علی خاں قزلباش بھی حاضر تھے۔ عطاءاللہ جہانیاں بھی بعض طالب علم ورکروں کے ساتھ وہاں موجود تھے۔

چیف سیکرٹری اور ہوم سیکرٹری صبح سیکرٹریٹ پہنچ گئے تو انہوں نے دیکھا کہ سیکرٹریٹ کے ملازم احاطے میں جمع ہیں اور فائرنگ کو روکنے اور مطالبات کو تسلیم کرنے کا مطالبہ بلند آہنگی سے کر رہے ہیں۔ مسٹر عالم ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس بھی وہاں پہنچ گئے تھے، ان تینوں نے کلرکوں سے بات چیت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ان میں سے کسی نے ایک نہ سنی۔ وہ ہر دلیل کے جواب میں یہ کہتے رہے کہ ہمارا مطالبہ پورا کیا جائے۔ یعنی فائرنگ بند کی جائے اور مطالبات پورے کیے جائیں اور یہ

مطالبہ ٹیلیفون پر گورنر اور چیف منسٹر کو پہنچا دیا جائے۔ جب چیف سیکرٹری نے یہ وعدہ کیا کہ وہ ان کے کیس کی پوری نمائندگی حکومت سے کر دیں گے۔ اور ہوم سیکرٹری نے یہ دھمکی دی اگر انہیں باہر نکلنے کی اجازت نہ دی گئی تو فوج اور پولیس آ کر کاروائی کرے گی جب جا کر سیکرٹریوں کی موٹر کاروں کو چلنے کا موقعہ دیا گیا جن کو کلرکوں نے گھیر رکھا تھا۔ جب سیکرٹری گورنمنٹ ہاؤس میں پہنچے تو انہوں نے اس کو شور و شعب کا ہنگامہ زار پایا۔ جو کچھ وہاں ہو رہا تھا اسکی کیفیت ہوم سیکرٹری نے مندرجہ ذیل کے الفاظ میں کی ہے:۔

''کثیر تعداد میں لوگ جن میں لاہور کے کونسلر بھی شامل تھے، وہاں موجود تھے اور جو شائستگی کی فضا گورنمنٹ ہاؤس میں ہوا کرتی ہے وہ بالکل مفقود تھی۔ ہز ایکسیلنسی گورنر، چیف منسٹر اور ارکان کابینہ ہز ایکسلینسی کے دفتر میں جمع تھے۔ میں نے اندر جا کر مختصراً ان کو بتایا کہ سیکرٹریٹ میں کیا واقعات پیش آئے تھے۔ شہر میں جو مختلف واقعات رونما ہو رہے تھے ان کی اطلاعات موصول ہونے لگیں۔ گورنر کی کوٹھی کی بجلی کاٹ دی گئی تھی اور کسی نے ٹیلیفون پر مسٹر ایس ایس جعفری سی ایس پی کا یہ پیغام موصول کیا کہ انارکلی میں بعض دوکانیں جل رہی ہیں۔ یہ اطلاع بھی ملی کہ ٹیلیگراف آفس اور ٹیلیگراف ایکس چینج کے ملازموں نے ہڑتال کر دی ہے انسپکٹر جنرل پولیس اور سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس نے جو کوتوالی سے آئے تھے یہ بتایا کہ کوتوالی کم و بیش محاصرے میں ہے اور صورتحال نہایت تشویش انگیز ہے۔ انسپکٹر جنرل پولیس نے مجھے سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کی رائے بتائی کہ شہر کا انتظام صرف قوت کے استعمال سے بحال نہ کیا جا سکے گا۔ اس لیے عوام کی تسکین کے لیے بھی کچھ کرنا چاہیے اور حکومت کو ایک بیان شائع کرنا چاہیے۔ انسپکٹر جنرل پولیس نے یہ بھی کہا کہ اس رائے کو گورنر صاحب اور چیف منسٹر صاحب کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں۔ کچھ دیر بعد ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس لاہور رینج بھی گورنمنٹ ہاؤس پہنچ گئے''۔

شہر کی صورتحال نہایت سرعت کے ساتھ نازک نقطے پر پہنچ رہی تھی۔ ریلوے کے ملازمین نے انجن شیڈ میں داخل ہو کر اس پر قبضہ کر لیا اور کسی انجن کو باہر نکلنے کا موقعہ نہیں دیتے تھے۔

لاہور اور مغلپورہ کے درمیان ریلوے کی پٹڑی توڑ دی گئی تھی اور شاہدرہ سے آنے والی ایک ٹرین راستے میں روک لی گئی تھی۔ وائی ایم سی اے کی عمارت کے قریب آٹو میٹک ٹریفک سگنل کو ہجوم نے جلا دیا تھا اور اب کمرشل بلڈنگ کو لوٹنے والا تھا۔ کچھ مزید سرکاری بسیں جلا دی گئیں تھیں۔ چیف انجینیئر الیکٹرک سٹی کو کارکنوں نے ایک رسمی نوٹس دے دیا تھا کہ اگر گورنمنٹ ہاؤس اور جی او آر اسٹیٹ میں رہنے والے وزیروں اور افسروں نے رضامندی کے ساتھ بجلی نہ کاٹ دی تو شہر بھر میں اندھیرا ہو جائے گا۔ ایک شخص چیف انجنیئر سے یہ اطلاع لے کر آیا اور اس نے مطالبہ کیا کہ اس نوٹس کا فوری جواب دیا جائے۔ عین اس وقت گورنمنٹ ہاؤس کی بجلی کاٹ دی گئی اور فون بیکار ہو گیا۔

جب ہوم سیکرٹری گورنر کے سیکرٹری کے کمرے میں گئے تو انہوں نے دیکھا کہ گورنر، چیف منسٹر اور بعض وزرا کراچی ٹیلیفون کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ہوم سیکرٹری نے اس کمرے کے حاضرین سے بات چیت کی اور ان کو بتایا کہ صورتحال پر اسی صورت قابو پایا جا سکتا ہے کہ مندرجہ ذیل کاروائی کی جائے۔

(۱) مجلس احرار پاکستان اور جماعت اسلامی خلاف قانون انجمنیں قرار دی جائیں۔

(۲) ایسے علما اور مولویوں کی جو عقل کی بات سن سکیں اور قانون وانتظام کی بحالی میں حکومت کی امداد کرنے پر آمادہ ہوں۔ ترغیب دی جائے کہ باہر نکلیں اور ختم نبوت کے نام سے جو لاقانونی پھیل رہی ہے اس کی علی اعلان مذمت کریں۔

(۳) مرکزی کابینہ سے استدعا کی جائے کہ وہ اپنے وزیر کو فی الفور لاہور بھیجیں۔

(۴) شہر مکمل طور پر فوج کے حوالے کر دیا جائے۔

ہوم سیکرٹری نے مشورہ دیا کہ مرکز سے فی الفور گفتگو کی جائے کیونکہ اندیشہ ہے کہ ٹیلیفون کسی بھی وقت بیکار ہو جائے۔ انہوں نے ملٹری ٹرنک لائن پر کراچی سے ٹیلیفون کا رابطہ قائم کرایا لیکن تھوڑی دیر بعد وہ دفعتہً منقطع ہو گیا۔ ہوم سیکرٹری اور انسپکٹر جنرل پولیس بھی جو کمرے آئے تھے۔ اس وقت باہر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد گورنر نے ہوم سیکرٹری کو طلب کر لیا اور ان کو انگریزی میں کچھ نکات بتا کر کہا کہ ان کے مطابق اردو میں ایک بیان کا مسودہ تیار کریں۔ ہوم سیکرٹری نے جواب دیا کہ میں اردو

میں مسودات لکھنے کی مہارت نہیں رکھتا۔ اس لیے یہ کام مسٹر ذوالقرنین خان سپرنٹنڈنٹ پولیس کے سپرد کیا جائے۔ چنانچہ چیف منسٹر کی ہدایت کا مفاد ہوم سیکرٹری نے گورنر اور چیف منسٹر کے سامنے مسٹر ذوالقرنین کو سمجھا دیا۔ چیف منسٹر نے کہا یہ مسودہ فوراً لکھ کر پیش کیا جائے۔ کیونکہ وہ کراچی سے ٹیلیفون پر بات چیت کرنے والے ہیں۔ مسٹر ذوالقرنین نے بیان کا جو ابتدائی مسودہ تیار کیا۔ وہ یہ تھا:۔

''وزیراعلیٰ پنجاب اپنی اور اپنی وزارت کی جانب سے یہ اعلان کرتے ہیں کہ ان کی حکومت تحفظ ختم نبوت کے لیڈران سے فوری گفت وشنید کے لیے تیار ہے۔ اور عوام سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ملک میں امن وامان قائم کرنے میں ان ہاتھ بٹائیں۔ وہ عوام کو اطمینان کو دلاتے ہیں کہ پولیس اور فوج کی کوئی متشدانہ کاروائی بالخصوص فائرنگ نہیں کرے گی تاوقتیکہ ان کو کسی کے جان و مال کی حفاظت کے لیے ایسا کرنے نہ پڑے۔ صوبائی حکومت مرکزی حکومت سے گفت وشنید کر رہی ہے اور میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ بحثیت صدر صوبہ مسلم لیگ، پاکستان کے صدر کے سامنے پنجاب کے عوام کی طرف سے یہ مطالبات فوری توجہ کے لیے پیش کر رہے ہیں''۔

جب چیف منسٹر نے اس بیان کو پڑھا تو انھوں نے کہا کہ یہ بالکل غیر موثر ثابت ہوگا چنانچہ انھوں نے ذیل کے الفاظ بڑھا دینے کا حکم دیا:

''پنجاب کی عوام کی طرف سے'' کے بعد ''اپنی تائید کے ساتھ'' اور آخر میں ''کیونکہ یہ قوم کے متفقہ مطالبات ہیں'' کے الفاظ بڑھا دیے جائیں۔

یہ بیان سائیکلوسٹائل کیا جا رہا تھا کہ چیف منسٹر نے اس میں ذیل کے الفاظ کا اضافہ کرنے کی خواہش کی:۔

''صوبائی حکومت کا ایک وزیر طیارے کے ذریعے ان مطالبات اور ہماری تائید کے ساتھ آج ہی کراچی بھیجا جا رہا ہے۔ ہماری پرزور سفارش ہے کہ چودھری ظفر اللہ خاں کو وزارت سے مستعفی ہونے پر مجبور کیا جائے''۔

گورنر اور چیف منسٹر دونوں کی خواہش یہ تھی کہ بیان نماز جمعہ سے پہلے ہوائی جہاز سے

مسجدوں سے گرایا جائے۔ گورنر نے چیف منسٹر اور کابینہ کی موجودگی میں ہوم سیکرٹری کو حکم دیا کہ یہ بیان ٹیلیفون پر خلفیہ شجاع الدین کو سنا دیں۔ جو اسی دن یا ایک دن قبل کے ایک مطبوعہ اشتہار کی رو سے مجلس عمل کے چوتھے ڈکٹیٹر مقرر کیے گئے تھے۔ ہوم سیکرٹری نے حکم کی تعمیل میں یہ بیان خلیفہ شجاع الدین کو پڑھ کر سنا دیا اور گورنر کی خواہش کے مطابق اس کی نقلیں بھی صاحب کی کوٹھی پر بھجوا دیں۔ گورنر صاحب خلیفہ صاحب کو مطمئن کرنے کے لیے بہت فکر مند معلوم ہوتے تھے کیونکہ انہوں نے کئی دفعہ دریافت کیا کہ آیا خلیفہ صاحب کو بیان کی کاپیاں ارسال کر دی گئیں ہیں یا نہیں۔ گورنر نے انسپکٹر جنرل پولیس کو ہدایت کی کہ اس بیان کو لاؤڈ سپیکر والی گاڑیوں سے شہر بھر میں نشر کیا جائے۔ گورنر اور چیف منسٹر کے حکم کے مطابق اس بیان کا ترجمہ فی الفور اضلاع میں پہنچا دیا گیا۔

اس دن کے واقعات کو دیکھ کر ''سینٹ بارتھولومیو ڈے'' یاد آتا تھا حتیٰ کہ ڈیڑھ بجے بعد دوپہر مارشل لا کا اعلان کر دیا گیا۔ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ایک دن قبل احمدی مدرس قتل کر دیا گیا تھا۔

۶۔ مارچ کو ایک احمدی محمد شفیع برماوالا مغلپورہ میں ہلاک کر دیا گیا اور کالج کے احمدی طالب علم کو بھاٹی دروازے کے اندر لوگوں نے چھرے مار مار کر قتل کر دیا۔ ایک اور احمدی (یا مفروضہ احمدی) مرزا کریم بیگ کو فلیمنگ روڈ پر چھرا مار دیا گیا اور اس کی نعش ایک چتا میں پھینک دی گئی جو فرنیچر کو آگ لگا کر تیار کی گئی تھی۔ احمدیوں کی جو جائدادیں اور دکانیں اس دن لوٹی یا جلائی گئیں، وہ یہ تھیں:۔

پاک ریز، شفا میڈیکل، اور سوکو، موسیٰ اینڈ سنز کی دوکان، راجپوت سائیکل ورکس، ملک محمد طفیل اور ملک برکت علی چوب عمارتی کے احاطے اور گودام میں، مین روڈ پر ملک عبدالرحمٰن کا مکان اور مزنگ روڈ اور ٹمپل روڈ پر پانچ احمدیوں کے مکان جن میں شیخ نور احمد کا مکان بھی شامل تھا۔ تیسرے پہر ایک ممتاز ایڈووکیٹ مسٹر بشیر احمد، امیر جماعت احمدیہ لاہور کا مکان گھیر لیا۔ ہجوم اس مکان میں داخل ہونے ہی والا تھا کہ مسٹر بشیر احمد نے اپنے دفاع میں چند گولیاں چلائیں۔ ایک خاص فوجی عدالت نے ان کے اس فعل پر مقدمہ چلایا لیکن وہ بری کر دیے گئے۔ ۶ اور ۷ مارچ کی رات کو عبدالحکیم مالک پائنیر الیکٹرک اینڈ بیٹری سٹیشن کے مکان پر چھاپہ مارا گیا اور ان کی بوڑھی والدہ قتل کر دی گئی۔

مسٹر دولتانہ کی رہنمائی اور بیرون جات کی لیگوں کی پیروی

جب ۶ مارچ کو چیف منسٹر کا بیان شائع ہو گیا تو اس کے بعد صوبے کے بہت سے مسلم لیگیوں نے مطالبات کی تائید میں قراردادیں منظور کیں۔ اسی طرح ۶ مارچ کو میاں چنوں مسلم لیگ نے ایک قرارداد منظور کی کہ اس مطلب کا ایک قانون منظور ہونا چاہیے کہ کوئی شخص اپنے لیے نبی کا لفظ استعمال نہ کرے گا اور اگر کرے گا تو اس جرم کا مرتکب ہوگا۔ ۷ مارچ ۱۹۵۳ء کو سٹی مسلم لیگ وزیر آباد نے دو قراردادیں منظور کیں۔ جن میں سے ایک قرارداد میں ہر کونسلر کا فرض قرار دیا گیا کہ وہ مقامی مجلس عمل کی مالی امداد کرے گا اور بوقت ضرورت تحریک ختم نبوت کی حمایت میں اپنی جان تک دینے سے دریغ نہیں کرے گا۔ قرارداد میں یہ اعلان بھی کیا گیا کہ سٹی مسلم لیگ من حیث الجماعت مجلس عمل کے پروگرام اور اس کی سرگرمیوں میں مداخلت نہ کرے گی۔ دوسری قراردوں میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ بذریعہ تار وزیر اعظم پاکستان اور وزیر اعلیٰ پنجاب کو اطلاع دی جائے کہ مجلس عمل کے مطالبات تین دن کے اندر تسلیم کیے جائیں۔ ورنہ سٹی مسلم لیگ کے ممبر متحدہ طور پر مستعفی ہو جائیں گے اور اپنے اپنے حلقہ انتخاب کے ایم ایل اے حضرات سے درخواست کریں گے کہ چودھری ظفر اللہ خاں کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد کے حق میں حمایت حاصل کرنے کی تحریک شروع کر دیں۔ اسی قرارداد میں یہ بھی ظاہر کیا گیا کہ حکومت نے مسلمانوں کے مذہبی مطالبات کو دبانے کے لیے جو جابرانہ تدبیر اختیار کی ہیں وہ سخت قابل مذمت ہیں۔ اسی دن سٹی مسلم لیگ جلال پور جٹاں نے ایک قرارداد منظور کی جس میں تحریک ختم نبوت کی اور وزیر اعلیٰ کے بیان ۶ مارچ کی غیر مشروط حمایت کی گئی اور کہا گیا کہ اس بیان کے مطابق وہ جو بھی قدم اٹھائیں گے۔ لیگ اس کی تائید کرے گی۔ قرارداد میں یہ بھی کیا گیا کہ لیگ کے ممبر اپنی ہائی کمان سے احکام کے منتظر ہیں اور حصول مقصد کے لیے عملی اقدام اٹھانے پر آمادہ ہیں۔ دوسری قرارداد میں حکومت سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ مجلس عمل کے مطالبات کو حتی الامکان جلد سے جلد منظور کرے۔ ۸ مارچ کو مسلم لیگ گکھڑ نے تین قراردادیں منظور کیں۔ ایک کا

یہ مطلب تھا کہ لیگ کے وقار کو قائم رکھنے کے لیے اس کے ممبروں کا فرض ہے کہ عوام کا ساتھ دیں اور ختم نبوت کی تحریک میں حصہ لیں۔ دوسری قرارداد میں لیگ میں اپنے صدر میر محمد بشیر کا شکریہ ادا کیا تھا جنہوں نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا تھا۔ اور تمام کونسلروں سے بھی اس مطلب کی اپیل تھی اور تیسری قرارداد میں حاکم علی ٹھیکیدار کو صدر مقرر کیا گیا۔ اور تمام کونسلروں سے کہا گیا کہ وہ میر محمد بشیر کی گرفتاری کے بعد رضا کاروں کے مہیا کرنے کے لیے ضروری انتظامات کریں۔ سٹی مسلم لیگ کاموں کے نے ۱۰ مارچ ۱۹۵۳ء کو احمدیوں کو اقلیت قرار دینے اور چودھری ظفر اللہ خاں کو برطرف کرنے کے مطالبات کی حمایت کی۔

مسٹر دولتانہ نے ۶ مارچ کا بیان واپس لے لیا

۱۰۔ مارچ ۱۹۵۳ کو مسٹر دولتانہ نے حسب ذیل اعلان کیا:۔

''اس مہینے کی چھ تاریخ کو میں نے اپنی اور اپنی وزارت کی طرف سے اہل پنجاب سے اپیل کی تھی۔ کہ قانون وانتظام کے قیام میں امداد دیں۔

میں نے ان کو یقین دلایا تھا کہ میری حکومت تحریک ختم نبوت کے لیڈروں سے فی الفور گفت وشنید کرنے پر آمادہ ہے۔ اور میرے وزرا مطالبات کو مرکزی حکومت کے سامنے پیش کر کے سفارش کرینگے کہ ان کو تسلیم کر لیا جائے۔

یہ اپیل اس وقت کی گئی تھی جب لاہور میں قانون کے دشمن لوٹ مار، آتش زنی اور ضروری سروسوں کو تلپٹ کرنے میں مصروف تھے۔ پاکستان کے مخالف تفرقہ پرداز گروہ پاکستان کی سلامتی اور استواری کو نقصان پہنچانے کی غرض سے تحریک تحفظ ختم نبوت سے فائدہ اٹھا کر نظم حکومت کو درہم برہم کرنے اور مسلمانوں میں افتراق پیدا کرنے کے لیے بدنظمی کی آگ بھڑکا رہے تھے۔

میری اپیل کا مقصد یہ تھا کہ صوبے کے باشندے قانون وانتظام کے قیام کے لیے کوششیں

کریں۔تا کہ دشمنان پاکستان اس قابل نہ رہیں کہ پاکستان کی سلامتی کو نقصان پہنچانے کی غرض سے ایک مذہبی تحریک کے پردے میں اندرونی تفرقوں کو مشتعل کر کے لاقانونی پھیلا دیں۔لیکن بدقسمتی یہ نتیجہ ہوا کہ میری اپیل کے باوجود لاقانونی جاری رہی اور لاہور میں صورتحال پر قابو پانے کے لیے مارشل لا نافذ کرنا پڑا۔

موجودہ حالات میں تحریک تحفظ ختم نبوت کے لیڈروں سے گفت وشنید کرنے اور مطالبات پر غور کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ہر حکومت کا پہلا فرض یہ ہے کہ قانون کی اطاعت اور شہریوں کے جان ومال کی حفاظت کا پختہ بندوبست کرے۔

صوبائی حکومت اور مرکزی حکومت دونوں کا عزم یہ ہے کہ لاقانونی جہاں بھی سر اٹھائے گی اسے دبا دیا جائے گا اور صوبے میں قانون وانتظام کو بحال رکھا جائے گا۔حکومت موجودہ خطرے کو جو ملک کی سلامتی اور سالمیت کو درپیش ہے ہر ممکن ذریعے سے کام لے کر دبائے گی۔

میں اس صوبے کے لوگوں سے اپیل کرتا ہوں کہ جہاں کہیں قانون وانتظام کو خطرہ درپیش ہو وہاں اس کی بحالی کے لیے حکومت سے تعاون کریں اور ایسا انتظام کریں کہ دشمنان پاکستان ملک کی سلامتی اور سالمیت کو نقصان پہنچائے بغیر مسئلہ ختم نبوت کو استعمال نہ کر سکیں''۔

مجلس عاملہ پنجاب مسلم لیگ نے اس بیان کی تائید کی اور اپنے اس اجلاس منعقدہ ۱۱ مارچ ۱۹۵۳ء میں یہ اعلان کیا کہ مجلس عاملہ اس اپیل کی دلی حمایت کرتی ہے جو باشندگان پنجاب سے کی گئی ہے۔اور مزید برآں پنجاب کے ہر مسلم لیگی کو ہدایت کرتی ہے کہ اس بیان کی ہدایت پر وفاداری سے عمل کریں۔

سیالکوٹ

سیالکوٹ کے واقعات کی کیفیت کے متعلق سرکاری بیان ان تحریری بیانات میں درج ہے۔

جو مسٹر آئی یو خان کمشنر، مسٹر ایس این عالم ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس، مسٹر غلام سرور خان ڈپٹی کمشنر اور سید عبدالرؤف سپرنٹنڈنٹ پولیس نے داخل کیے اور جو شہادت لیفٹیننٹ خوشی محمد نے دی جب مسٹر غلام سرور ڈپٹی کمشنر جن کے خلاف عوام کو بعض شکایات تھیں، تبدیل کر دیے گئے تو ہم نے اپنے چند اجلاس سیالکوٹ میں منعقد کر کے کافی غیر سرکاری شہادت قلمبند کی۔

جب سے مسٹر مظہر علی اظہر ۱۹۳۱ء کی تحریک کشمیر میں احراری رضا کاروں کا ایک دستہ لے کر جموں میں داخل ہوئے تھے۔ سیالکوٹ اسی زمانے سے احراریوں کا ایک ہدایتی مرکز چلا آتا ہے۔ یہ ایک اہم احمدی مرکز بھی رہا ہے جس کی اہمیت قادیان سے دوسرے درجے پر تھی۔ احراری احمدی نزاع کے سلسلے میں یہاں پہلا اہم واقعہ یہ ہوا کہ غلام محمد شاہ نے احمدیوں کے خلاف ایک تیز وتند تقریر کی جس کی پاداش میں وہ زیر دفعہ ۲۹۵۔ الف تعزیرات ہند ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ کو سزایاب ہوا۔ یہ نزاع کسی نہ کسی شکل میں ۱۹۴۹ء تک جاری رہا۔ لیکن ان برسوں کے دوران کوئی بڑا واقعہ رونما نہ ہوا۔ ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو احراریوں نے ایک تبلیغ کانفرنس اس مقصد سے منعقد کی کہ باؤنڈری کمیشن میں احمدیوں کے رویے کے خلاف نکتہ چینی کریں۔ اس کے جواب میں احمدیوں نے اپنی پوزیشن واضح کرنے کے لیے ۱۵ جنوری ۱۹۵۰ء کو اپنا ایک جلسہ منعقد کیا۔ عین اسی وقت جب یہ جلسہ ہو رہا تھا، احراریوں نے ہنگامہ برپا کیا۔ اور ایک لڑکے کے چھرا مار دیا گیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری ایک حکم صادر کیا جس کی رو سے ایک ہفتہ کے لیے جلسے ممنوع قرار دیے گئے۔ نومبر ۱۹۵۱ء میں احمدی اپنا عام سالانہ اجلاس منعقد کرنا چاہتے تھے لیکن جو جذبات اس وقت پھیل رہے تھے ان کے پیش نظر حکام ضلع نے ان کو سمجھا بجھا کر یہ اجلاس ملتوی کرا دیا۔ پھر یہ اجلاس نومبر ۱۹۵۲ء میں احمدیوں نے اپنے جلسہ گاہ میں منعقد کیا لیکن احراریوں نے حاضرین پر خشت باری کی۔

فروری ۱۹۵۲ء تک احراری احمدیوں کے خلاف رائے عامہ کو منظم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب احمدیوں کے خلاف شورش نے تحفظ ختم نبوت کی شکل اختیار کی۔ اور ۲۱ جولائی ۱۹۵۲ء کو اس شہر میں ایک آل مسلم پارٹیز کنونشن منعقد کی گئی۔ اس کنونشن کے بعد تحریک تحفظ ختم نبوت زیادہ

مقبول ہوگئی اور تمام فرقوں کے مذہبی مبلغ اس میں شامل ہو گئے۔تحریک روز بروز زیادہ قوی ہوتی جارہی تھی۔مساجد کے اندر جمعہ کے ہر خطبے میں احمدیوں کے متعلق دشنام و بدگوئی کا سلسلہ جاری ہو گیااور تین مطالبات زور وشور سے پیش کیے جانے لگے۔۲۰ جولائی ۱۹۵۲ء کو پسرور کے مقام پر ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کنونشن میں چیف منسٹر نے ایک تقریر کی جس میں انہوں نے اعلان کیا کہ وہ ’’تحریک ختم نبوت کی پوری حمایت کرتے ہیں بشرطیکہ قانون و انتظام کو کوئی خطرہ درپیش نہ ہو‘‘۔اکتوبر ۱۹۵۲ء میں عرس گلوشاہ کے موقع پر مولوی بشیر احمد خطیب جامع مسجد پسرور، کرامت علی شاہ اور منظور احمد نے احمدیوں کے خلاف اشتعال انگیز تقریریں کی۔ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ان لوگوں کے خلاف زیر دفعہ ۲۱۔پنجاب پبلک سیفٹی کمیشن ایکٹ کاروائی کی سفارش کی۔لیکن حکومت نے ان سے اتفاق نہ کیا۔نومبر ۱۹۵۲ء میں ایک اور آل مسلم پارٹیز کانفرنس منعقد کی گئی جس میں تین مطالبات بیشتر زور وشور سے دہرائے گئے۔صوبائی حکومت اب احراری احمدی نزاع کی وسعت اور شدت کا احساس کرچکی تھی۔چنانچہ اس نے اس معاملہ کے متعلق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے نام عام ہدایات کا ایک سلسلہ جاری کردیا۔ان ہدایات کا مفاد یہ تھا کہ قابل اقدام تقریروں کے خلاف صرف مقدمات دائر کیے جائیں مسجدوں میں گرفتاریاں نہ کی جائیں نہ مساجد کے اجتماعات کو منتشر کیا جائے۔ایک اور ہدایت یہ تھی کہ کاروائی صرف احراریوں اور احمدیوں تک محدود رکھی جائے۔لہٰذا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ احراری مولویوں نے ہر مسجد کے ممبر سے احمدیوں کے خلاف پراپیگنڈا جاری رکھنے میں اپنے آپ کو بالکل آزاد محسوس کیا۔

مجلس عمل پنجاب کی ہدایت کے مطابق اس ضلع میں ایک مجلس عمل مرتب کی گئی۔اس مجلس عمل نے رضا کاروں کی بھرتی اور سرمائے کی فراہمی کا کام شروع کردیا۔صاحبزادہ فیض الحسن ضلع میں جلسوں کا ایک سلسلہ جاری کرکے شدید پروپیگنڈا کرنے میں مصروف رہے۔۲۰ فروری ۱۹۵۳ء کو جناح پارک میں ہزارہا آدمی نماز جمعہ کے لیے جمع ہوئے۔جن سے مولوی محمد علی کاندھلوی، پروفیسر خالد محمود، مولوی محمد یعقوب اور مولوی فضل حق نے خطاب کیا۔احمدی عقائد کے خلاف رسالے اور کتابچے فروخت کیے گئے اور آٹھ آنے تک ٹکٹ بیچ کر ہزاروں روپے جمع کیے گئے۔

کراچی میں ۲۷ فروری ۱۹۵۳ء کو جو فیصلے کیے گئے تھے، ان کے مطابق ہوم سیکرٹری نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ایک لاسلکی پیغام بھیجا جس میں قاضی منظور احمد اور ولی محمد جرنیل کو گرفتار کرنے کی ہدایت کی۔ یکم مارچ ۱۹۵۳ء کو شہر نے کامل ہڑتال کی اور دس ہزار اشخاص کا ایک ہجوم ریلوے اسٹیشن پر رضا کاروں کے اس پہلے دستے کو الوداع کہنے کے لیے جمع ہوا جو زیر سرکردگی مولوی محمد یوسف ''ڈائریکٹ ایکشن'' میں اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔ اس ہجوم نے بازاروں میں گشت لگایا۔ احمدیوں کے خلاف نعرے لگائے اور حکومت بالخصوص وزیر اعظم پاکستان کو گالیاں دیں۔ یہ ہجوم اس قدر سرکش تھا کہ اس نے ٹرین کی روانگی میں تاخیر کرا دی اور ٹرین کے بعض ڈبوں کی کھڑکیاں توڑ ڈالیں۔ بعض آدمی رضا کاروں کے ساتھ ٹرین میں سوار ہو گئے۔ اور نارووال پہنچ کر اتر گئے۔ واپس آتے ہوئے انہوں نے ٹرین کو روکا۔ سٹیشن کے دو کانداروں کو لوٹا۔ اور ریل کی پٹڑی کے آس پاس گنے کی فصلوں کو برباد کیا۔

۲ر مارچ ۱۹۵۳ء کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس ڈی او چٹھی نمبری - 2514 29-BDSB مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۵۳ء کو موصول ہوئی جس میں حکومت کا یہ فیصلہ بتایا گیا تھا کہ اس شورش کو سختی سے دبایا جائے۔ انہوں نے پولیس اور مجسٹریٹوں کا اجلاس طلب کیا۔ اور فیصلہ کیا کہ:۔

(ا) ۲۔۳ مارچ ۱۹۵۳ء کی درمیانی رات کو شورش کے سرغنہ زیر دفعہ ۳ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ گرفتار کر لیے جائیں (اس کے لیے ہوم سیکرٹری کی منظوری ٹیلیفون پر حاصل کر لی گئی)۔

۲۔ جو لوگ اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کریں، ان کو حراست میں لے لیا جائے اور پھر کسی دور دست مقام پر لے جا کر چھوڑ دیا جائے۔

۳۔ فوج سے استدعا کی جائے کہ بوقت ضرورت امداد کے لیے موجود رہے۔

۲ر مارچ ۱۹۵۳ء کی شام کو رام تلائی میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا۔ جس میں مولوی سلطان محمود، پروفیسر خالد محمود، مولوی حبیب احمد اور مولوی محمد یعقوب نے تقریریں کیں۔ ان تقریروں کا لہجہ واضح طور پر حکومت کے خلاف تھا اور پروفیسر خالد محمود نے خواجہ ناظم الدین کو آگاہ کیا کہ ان کا انجام بھی مسٹر لیاقت علی خاں کا سا ہوگا۔ اعلان کیا گیا کہ کل رضا کاروں کے دو دستے کراچی روانہ کیے

جائیں گے۔

مولوی محمد حسین، مولوی محمد علی کاندھلوی، محمد صادق ولد بھولا، مولوی حبیب احمد، عبدالغفور بٹ اور بشیر احمد ولد چراغ دین ۲۔۳ مارچ کی درمیانی رات گرفتار کر لیے گئے۔ ۳ مارچ کی صبح کو فوج اور پولیس کے دستوں کی گشت کے باوجود چھوٹے چھوٹے ہجوم بازاروں میں نمودار ہوئے۔ یہ ہجوم سرکشی پر مائل تھے۔ لیکن ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم سے بعض کو فوج نے اور بعض کو پولیس نے منتشر کر دیا۔ جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کوئی سوا دس بجے قبل دوپہر الشہابیہ پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ اس عمارت کے اندر اور ارد گرد کے مکانوں کی چھتوں پر ایک بہت بڑا ہجوم جمع ہے اور حکومت کے خلاف نعرے لگا رہا ہے۔ جب ان سے منتشر ہونے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے شہابیہ کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اس پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اس مجمع کو خلاف قانون قرار دیا اور مسٹر خلیل الرحمٰن اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور خواجہ اقبال احمد مجسٹریٹ کو حکم دیا کہ اس مجمع کو منتشر کر دیں۔ جب مسٹر خلیل الرحمٰن خان اس عمارت میں داخل ہوئے تو انہیں معلوم ہوا کہ ان کا ریوالور کسی نے ان کی پیٹی سے نکال لیا ہے تاہم وہ اور خواجہ اقبال احمد چار اشخاص کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے جو ہار پہنے ہوئے تھے۔ اور ان میں سے ایک مولوی محمد یعقوب تھا جو ۲۔۳ مارچ کی رات گرفتار نہ ہو سکا تھا۔ گرفتاریوں کے بعد ہجوم دارالشہابیہ اور ملحقہ عمارتوں کی چھتوں پر چڑھ گیا۔ اور منڈیروں پر سے اینٹیں پھینکنے لگا۔ جن کی وجہ سے پولیس نے ان گاڑیوں کے پیچھے پناہ لی جو دارالشہابیہ کے سامنے سڑک پر کھڑی تھیں۔ خشت باری کی وجہ سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے پولیس کو گولی چلانے کا حکم دیا لیکن اس کے باوجود ہجوم منڈیروں پر سے اینٹیں پھینکتا رہا۔ اس مرحلے پر ایک اور ہجوم دفعتہً دارالشہابیہ کے عقب میں سڑک پر نمودار ہوا اور اس نے بھی پولیس پر خشت باری شروع کر دی۔ ان کو منتشر ہونے کے لیے کہا گیا لیکن چونکہ انہوں نے خشت باری جاری رکھی اس لیے پولیس کو گولی چلانے کا حکم دیا گیا۔ اس پر ہجوم پیچھے ہٹ گیا ایک آدمی ہلاک پایا گیا۔ اس موقع پر کل اکیس گولیاں چلائی گئیں پولیس نے نعش کو اٹھا لیا لیکن ہجوم پولیس پر غالب آیا۔ اس نے نعش بھی چھین لی اور مولوی محمد یعقوب کو بھی حراست سے چھڑا لیا۔ چونکہ صورتحال بالکل ہی قابو سے باہر ہو گئی

تھی اس لیے اس کو فوج کے حوالے کر دیا گیا جس کی کمان لیفٹیننٹ کرنل خوشی محمد (ہشتم پنجاب رجمنٹ) کررہے تھے۔ ہجوم نے سول کے افسروں کو گھیر لیا جو ایک بند گلی میں بھاگے جہاں سے وہ اس گلی کے ایک مکان کی چھت پر پہنچ گئے کچھ دیر بعد وہاں غلام حسن اے ایس آئی کو لایا گیا جن کے پیٹ میں چھرا مارا گیا تھا اور جن کا ریوالور چھین لیا گیا تھا۔ اس اثنا میں ہجوم نے پولیس کی دو گاڑیاں اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی جیپ کو آگ لگا دی۔ میونسپل فائر بریگیڈ طلب کر لیا گیا۔ لیکن وہ بھی جلا دیا گیا۔ اس مرحلے پر یہ اطلاع ملی کہ ہجوم ضلع کچہری کی عمارتوں، پولیس کے دفتر اور بعض دوسری سرکاری عمارتوں کو آگ لگانے کے در پے ہے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کسی نہ کسی طرح باہر نکلے اور انہوں نے پولیس لائن سے ایک گارد ساتھ لی تاکہ سرکاری عمارتوں اور سٹیٹ بینک کی عمارتوں کو بچائیں۔

جس وقت دارالشہابیہ کا واقعہ ہو رہا تھا۔ سٹی انسپکٹر اور سٹی مجسٹریٹ کو رنگپورہ کے چوک سنت سنگھ میں ایک اور ہجوم کا سامنا کرنا پڑا جو دارالشہابیہ کو طرف آ رہا تھا۔ اس ہجوم کو روکا گیا لیکن وہ تشدد پر اتر آیا اور اس نے سٹی مجسٹریٹ، سٹی انسپکٹر، اے ایس آئی ثناء اللہ اور ایک ہیڈ کانسٹیبل کو زخمی کر دیا۔ لیکن فوج ان کی مدد کو پہنچ گئی اور انہیں مزید نقصان سے بچایا۔

دوپہر تک ہجوم بے انتہا بڑھ گیا اور ٹریفک ڈیوٹی کے پولیس کانسٹیبلوں پر حملے کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے ایک جلوس کی شکل اختیار کر لی اور ایک شخص کی نعش کو ساتھ لے کر جو دارالشہابیہ میں مارا گیا تھا گشت کرنے لگا۔ یہ ہجوم سٹی مسلم لیگ کے دفتر پہنچا اور اس کی لائبریری لوٹ لی۔ خواجہ محمد صفدر ایم ایل اے صدر سٹی مسلم لیگ کو ان کے دفتر سے نکالا گیا، ان کا منہ کالا کیا گیا اور ان کو بازاروں میں پھرایا گیا۔ آخر کرنل خوشی محمد نے ان کو چھڑایا۔ اس کے بعد ہجوم جناح پارک میں پہنچا۔ جہاں کوئی پچاس ہزار اشخاص نے مولوی محمد یعقوب کی امامت میں متوفی آدمی کے جنازے کی نماز ادا کی۔ اس موقع پر مولوی نے حسب توفیق ایک پرزور تقریر کی۔

کمشنر کو ٹیلیفون پر صورتحال کے متعلق اطلاع دی گئی۔ چنانچہ وہ اسی دن شام کو پہنچ گئے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ۳ تاریخ کے ایک بجے بعد دوپہر سے لے کر ۴ تاریخ کے ایک بجے بعد دوپہر

تک چوبیس گھنٹے کا کرفیو نافذ کر دیا تھا۔لیکن چونکہ پولیس اور فوج کی نفری کم تھی۔اس لیے یہ کرفیو عمل میں نہ لایا جا سکا اور کمشنر نے اس کے اوقات تبدیل کر کے دس بجے شب سے ساڑھے چار بجے صبح تک کر دیے۔اسی شام کو غیر احمدی عبدالحئی قریشی کو جس نے ہجوم کو تشدد سے منع کیا تھا، زدوکوب کیا گیا اور اس کا گھر لوٹ لیا گیا۔

۴ مارچ کو زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری ایک حکم نافذ کیا گیا جس کی رو سے عام جلسے اور جلوس ممنوع قرار دیے گئے۔اس دن ڈائریکٹ ایکشن کمیٹی نے اپنا مرکز دارالشہابیہ سے مسجد مولوی نور حسین میں منتقل کر دیا گیا جو تحصیل اور تھانہ صدر کے قریب واقع ہے۔ایک بڑا ہجوم اس مسجد کی طرف جا رہا تھا۔اس کو راستے میں روک لیا گیا۔کمشنر کی ہدایت کے مطابق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ہجوم کو منتشر ہونے کا حکم دیا۔لیکن وہ افسروں پر پل پڑا۔پولیس کو اس ہجوم پر لاٹھی چارج کا حکم دیا گیا جس کے جواب میں آس پاس کے مکانوں سے اینٹیں برسائی گئیں۔مسٹر خلیل الرحمٰن اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے سر پر شدید زخم آیا اور پولیس کی ایک گاڑی توڑ پھوڑ دی گئی۔لہٰذا صورت حال کا انتظام فوج کے حوالے کر دیا گیا۔جس نے گولی چلا کر قابو پالیا۔تھوڑی دیر بعد ایک ہجوم پھر مسجد کے سامنے کھڑا ہو گیا۔فوج کے افسروں نے ان سے بات چیت کی اور ان سے منتشر ہو جانے کی استدعا کی لیکن کچھ اثر نہ ہوا تو بازار میں ایک طرف سے دوسری طرف تک ایک فیتہ کھینچ دیا گیا اور ہجوم کو تنبیہ دی گئی کہ اس فیتے کی حد سے آگے نہ بڑھیں لیکن کسی نے فیتہ توڑ دیا۔اور فوج کا جھنڈا جلا دیا۔بعض لوگ تلواریں اور چھرے گھماتے ہوئے ناچنے لگے اور اس روک سے آگے بڑھنے لگے۔ اس پر فوج نے بریگیڈیر اے کے اکبر کے حکم سے گولی چلائی جس سے چار آدمی ہلاک اور دس مجروح ہوئے۔اس ہنگامے میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا جو لیفٹیننٹ کرنل خوشی محمد خاں کی زبان سے سنئے:۔

> ایک آدمی چھرے گھماتا اور ناچتا ہوا باہر نکلا اور گولی کھانے کے لیے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔لیکن میں نے اس کو بتایا جب تک وہ فیتے کے دوسری طرف رہے گا اس کو گولی نہیں ماری جائے گی لیکن جونہی اس نے فیتہ عبور کیا اسکو گولی ماردی جائے گی۔جب گولی چلنی شروع ہوئی تو وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا وہ کہیں ہجوم میں غائب ہو گیا تھا۔پہلی فائرنگ کے بعد

ایک مولوی نے سامنے آ کر فوج اور پولیس کو گالیاں دیں۔ اور ان کو کافر کہا۔ میں نے بگلر سے کہا بگلر بجائے۔ چنانچہ جونہی اس مولوی نے بگل کی آواز سنی وہ ہجوم پر سے پھلانگتا ہوا پیچھے کی طرف بھاگ گیا''۔

تیسرے پہر ایک ہجوم نے ایک اے ایس آئی اور کانسٹیبل پر یورش کی۔ اے ایس آئی کا ریوالور اور کانسٹیبل کی بندوق چھین لی اور ان کی وردیاں جلا دیں۔ ایک اور پیادہ کانسٹیبل کسی کیس کی مملوکات لیے جا رہا تھا اس پر حملہ کیا گیا اور مملوکات چھین لی گئیں۔ دو احمدیوں کے چھرا گھونپ دیا گیا اور تین دوسرے احمدیوں کے مکانات ہجوم نے لوٹ لیے۔

جب مسٹر این این عالم ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس شام کو پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے معاملات فوج کے حوالے کر رکھے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ حوالگی حق بجانب نہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے کمشنر سے مشورہ کر کے صورتحال کو دوبارہ فوج سے واپس لے لینے کا فیصلہ کر لیا انہوں نے پولیس سے جو ۳ اور ۴ مارچ کے واقعات سے پست حوصلہ ہو چکی تھی، خطاب کیا اور شہر کی گشت کے انتظامات کیے۔ فوج نے اپنا بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سٹی کوتوالی میں منتقل کر لیا۔

۵ مارچ کو فوج نے شہر بھر میں ''فلیگ مارچ کیا'' اور وسیع پیمانے پر گشت لگایا بعض جلوس منتشر کیے گئے اور کچھ رضا کار گرفتار کیے گئے۔

۶ مارچ کو مسٹر دولتانہ کی اپیل ریڈیو پر نشر کی گئی اور لاسلکی پیغام کے ذریعے سے بھی پہنچائی گئی۔ اس سے یہ خیال پھیل گیا کہ حکومت نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ چنانچہ حکام ضلع کی پوزیشن نا قابل رشک ہو گئی۔ جو جلسے اور جلوس ممنوع کیے گئے وہ جاری ہو گئے اور روزانہ بے شمار افراد گرفتار ہونے لگے۔ ۷ تاریخ کو ۹۸، ۸ تاریخ کو ۱۲۱ اور ۹ تاریخ کو ۱۴۹ افراد گرفتار کیے گئے۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ عوام پر چیف منسٹر کی اپیل کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

۷ مارچ کو پروفیسر خالد محمود اور فضل حق نے تقریریں کیں۔ جن میں پولیس اور فوج سے مطالبہ کیا کہ ہتھیار ڈال دیں اور دوسرے سرکاری ملازموں کو تلقین کی کہ ہڑتال کر دیں اور تحریک میں شامل ہو جائیں۔

۱۰۔ مارچ تک صورتحال یہی رہی یہاں تک چیف سیکرٹری کی طرف سے ایک لاسلکی پیغام پہنچا کہ حکام ضلع ہر قسم کی لاقانونی کو سختی سے کچل دیں۔ اس سے لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ اب حکام ضلع کسی قسم کی لاقانونی کو روانہ رکھیں گے۔ لہٰذا دفعہ ۱۴۴ کے احکام کی تعمیل ہونے لگی۔ پروفیسر خالد محمود، فضل حق، مولوی سلطان احمد اور دیگر اشخاص مسجدوں میں منتقل ہو چکے تھے۔ جہاں سے وہ لاؤڈ سپیکر اور خفیہ پیغامات کے ذریعے احکام و ہدایت جاری کر کے تحریک کی رہنمائی کر رہے تھے۔ ان کو مسجدوں کے اندر گرفتار کرنا مناسب نہ سمجھا گیا۔ البتہ ان کے خلاف زیر دفعہ ۸۷، ۸۸ ضابطہ فوجداری کارروائی کی گئی۔ اس سے بہت اچھا اثر ہوا۔ اور ۱۲ مارچ کو ان لوگوں نے مسجدوں سے نکل کر اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔ ان کی گرفتاری کے بعد شورش عملاً ختم ہوگئی اور ۱۶ مارچ کو شہر کے حالات بالکل معمول پر آ گئے۔

مذکورہ بالا ماجرا افسروں کے تحریری بیانات اور شہادتوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ غیر سرکاری گواہوں کی جو شہادت سیالکوٹ میں قلمبند کی گئی۔ اس سے اس ماجرا کے کسی حصے کی تردید نہیں ہوئی شہادت میں جس بات پر زور دیا گیا وہ یہ تھی کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ایسے آدمیوں کو پیٹا یا پٹوایا جو گرفتار ہونے کے بعد جیل میں بند کیے جا چکے تھے۔ انہوں نے خود ایک پولیس کانسٹیبل سے کہہ کر اپنی جیپ کو آگ لگوائی اور خود ہی اس جلوس کی حوصلہ افزائی کی جو یکم مارچ کو ریلوے سٹیشن پر گیا تھا۔ پہلے الزام سے ہمارا کوئی تعلق نہیں گو اس کی تائید میں کافی شہادت موجود ہے۔ دوسرا الزام عام عقل و ہوش کی توہین ہے۔ اور تیسرے الزام کی صحت سے خود مولوی محمد علی کاندھلوی نے انکار کیا ہے۔ ہماری یہ سوچی سمجھی ہوئی رائے ہے کہ ایک سے زیادہ دفعہ صورتحال کو فوج کے حوالے کر کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے دانشمندی اور جرات کا ثبوت دیا اور قانون اور اس کی پشت پناہ قوت کو عام تضحیک و استہزا سے بچا لیا۔ اس کے بعد جو خونریزی ہوئی اس کی ذمہ داری اگر اشخاص متعلقہ پر عائد نہیں ہوتی تو اس کا بار پولیس اور ملٹری پر بھی نہیں بلکہ یہ ذمہ داری کسی اور پر عائد ہوتی ہے۔

گوجرانوالہ

گوجرانوالہ احراریوں کا ایک اہم مرکز ہے اول اس لیے کہ گوجرانوالہ سیالکوٹ کے قریب ہے دوم اس لیے کہ یہ ایک مقبول عام احراری مقرر صاحبزادہ فیض الحسن کا وطن ہے۔

احراریوں نے ۱۹۴۹ء میں یہاں ایک تبلیغ کانفرنس منعقد کی لیکن چونکہ اس وقت تک پاکستان کی نئی مملکت کے متعلق احراریوں کی نیک نیتی پر سخت شبہات موجود تھے۔اس لیے یہ کانفرنس کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوئی ۱۹۵۱ء میں انہوں نے ''دفاع کانفرنس'' کے پردے میں ایک اور کانفرنس منعقد کی۔ یہ اجتماع بہت کامیاب ہوا کیونکہ اس کے انتظامات سٹی مسلم لیگ کے صدر نے کیے تھے۔ اس کانفرنس میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے تقریر کی اور اپنا یہ عقیدہ ظاہر کیا کہ احمدیوں کو قتل کرنا اور ان کی جائیدادوں کو جلا دینا کارِثواب ہے۔اسی سال میں ایک کانفرنس بھی ہوئی جس میں احمدیوں کو کافر قرار دیا گیا اور ان کے مجلسی اور اقتصادی مقاطعہ کی حمایت کی گئی۔

۲۰ جون ۱۹۵۲ء ''یوم مطالبات تھا'' احراریوں نے دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کر کے مسجد شیرانوالہ باغ کے اندر ایک جلسہ عام منعقد کیا۔اس جلسے میں صاحبزادہ فیض الحسن، شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج دین نے تقریریں کیں جو سب کے سب گرفتار کر لیے گئے۔لیکن بعد میں چیف منسٹر کے حکم سے رہا کر دیے گئے۔ جولائی ۱۹۵۲ء میں ایک اور کانفرنس ہوئی جس میں صاحبزادہ فیض الحسن نے یہ اعلان کیا کہ کسی احمدی کو قتل کرنا رضائے الٰہی کا موجب ہے۔ جب کانفرنس ختم ہوئی تو مولانا اختر علی خاں کے اعزاز میں ایک دعوت چائے دی گئی۔جس میں ڈپٹی کمشنر اور مسلم لیگ کے لیڈر بھی شامل ہوئے۔بعد میں احمدیوں نے ڈپٹی کمشنر سے شکایت کی کہ اس کانفرنس میں ایک مقرر نے حاضرین کو امام جماعت احمدیہ کے قتل پر اکسایا تھا۔احمدیوں کے خلاف جذبات کی برانگیختگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وزیر آباد میونسپل کمیٹی نے دو احمدی مدرسوں اور چار احمدی استانیوں کو ملازمت سے برطرف کر دیا۔ صاحبزادہ فیض الحسن، مولوی عبد الواحد خطیب مسجد شیرانوالہ باغ اور مولوی محمد اسماعیل نے

احمدیوں کے خلاف شورش میں نمایاں حصہ لیا اور دوسری مذہبی اور سیاسی جماعتوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش بھی کی۔ ۲۔۳ نومبر ۱۹۵۲ء کو گوجرانوالہ میں مجلس عمل کے زیر اہتمام ایک جلسہ عام منعقد ہوا جس میں جماعت اسلامی کے ایک نمائندہ میاں طفیل محمد نے شرکت کی۔ مجلس نے احمدیوں کے مجلسی اور اقتصادی مقاطعہ کی حمایت کی چنانچہ اس کے بعد اشیائے خوردونوش کی دو کانوں پر اس مطلب کے بورڈ لگائے گئے کہ یہاں احمدیوں کو علیحدہ برتنوں میں کھانا دیا جا سکتا ہے۔ ایک شخص عبدالغفعار اثر، بی اے جو اس سے قبل بازاری عورتوں کے خلاف تحریک میں کامیاب ہوا تھا۔ اس تحریک میں بھی شامل ہو گیا تا کہ اس کا اپنا دائرہ اثر وسیع ہو جائے۔ روزنامہ ''زمیندار'' کے مالک مولانا اختر علی خاں نے تین عام جلسوں میں تقریریں کیں جن میں انہوں نے تحریک کے لیے دو ہزار روپیہ جمع کیا۔ ایک اور جلسے میں جوان کے گاؤں کرم آباد میں ہوا تھا انہوں نے اس تحریک کے لیے ایک کروڑ روپیہ چندہ جمع کرنے کی اپیل کی۔ جب کراچی میں وزیر اعظم کو الٹی میٹم دیا جا چکا تو ڈائریکٹ ایکشن کی وسیع تیاریاں شروع ہو گئیں اور مولویوں نے ضلع کے مختلف شہروں میں اپنا پروپیگنڈا بہت تیز کر دیا۔ کامریڈ عبدالکریم اور مولوی عبدالغفعو ہزاروی وزیر آباد میں، مولوی ابو الحسن محمد یحیٰی اور مولوی فضل احمد حافظ آباد میں، لطیف احمد چشتی اور حافظ عبدالشکور کامونکے میں اور مولوی عبدالوحد اور مولوی محمد اسماعیل گوجرانوالہ میں مصروف ہو گئے۔ رضا کاروں کی بھرتی جاری ہو گئی۔ حافظ آباد کے لیے پانچ سو رضا کاروں کا کوٹہ مقرر کیا گیا تھا جو مجلس عمل کی ترتیب سے ایک ہفتے کے اندر اندر پورا ر ہو گیا۔ پورے ضلع کی بھرتی کا کوٹہ ساڑھے چار ہزار تھا اور جن لوگوں نے رضا کاروں کے حلف نامے پر دستخط کیے ان میں مسٹر منظور حسن سیکرٹری مسلم لیگ بھی شامل تھے۔

شورش اس وقت شروع ہوئی جب صوبائی حکومت کے احکام کے ماتحت مولوی محمد اسماعیل خطیب مسجد اہلحدیث گرفتار کر لیے گئے۔ یہ روز کا معمول ہو گیا کہ لاہور جانے سے پہلے رضا کاروں کے جلوس نکالے جاتے اور جلسے منعقد کیے جاتے۔ مجلس عمل ختم کر دی گئی اور حکیم عبدالرحمٰن نائب صدر مجلس احرار گوجرانوالہ تحریک کے ڈکٹیٹر مقرر کیے گئے۔

۲ / مارچ کو چیف سیکرٹری کی طرف سے ایک ڈی او چٹھی نمبری 2514-29BDSB

مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۵۳ء ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو موصول ہوئی جس میں مزید گرفتاریوں سے منع کیا گیا تھا لیکن یکم مارچ ۱۹۵۳ء کو اے ڈی آئی جی، سی آئی ڈی کی طرف سے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو یہ ہدایات پہنچیں کہ رضا کاروں کے دستوں کو لاہور اور کراچی کی طرف روانہ ہونے سے روکا جائے جس کا مطلب یہ تھا کہ انہیں گوجرانوالہ میں گرفتار کرلیا جائے۔ دونوں ایک دوسرے کے متضاد تھیں اور چونکہ مجسٹریٹوں اور پولیس نفری کی کمی اور جیل میں جگہ کی قلت کے باعث حکام ضلع گرفتاریوں کے حق میں نہ تھے اور ایک آدھ دن اور صورتحال کو دیکھنا چاہتے تھے۔ لہٰذا لاہور کے حکام اعلیٰ پولیس سے استفسار کیا گیا کہ ان حالات میں کیا کیا جائے۔ اس کا جواب یہ ملا کہ اس سے قبل رضا کاروں کی گرفتاری کے متعلق جو حکم دیا جا چکا ہے اس کی تعمیل کی جائے اور اگر جیل میں کافی جگہ نہ ہو تو گرفتار شدہ اشخاص کو دور دست دیہات میں جمع کر دیا جائے۔

۲؍ مارچ کو دس بجے ڈپٹی کمشنر کے کمرہ عدالت میں سرکاری اور غیر سرکاری آدمیوں کا ایک اجلاس ہوا۔ سٹی مسلم لیگ کے عہدیداروں نے اس اجلاس میں موقع پا کر لیگ کے اندر اپنے مخالفین کی مذمت کی اور حکام ضلع کے ساتھ سرگرم تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔ اس مرحلے پر لاہور جانے والی ٹرینوں کو ان ہجوموں نے روکنا شروع کر دیا جو لاہور جانے والے رضا کاروں کی مشایعت کے لیے ریلوے سٹیشن پر جمع ہو جاتے تھے۔ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، پولیس کا ایک دستہ ساتھ لے کر ریلوے سٹیشن پر گئے اور انہوں نے پچاس رضا کاروں کے ایک دستے کو ٹرین سے اتار کر گرفتار کرلیا اس پر ہجوم میں جوش پھیل گیا اور اس نے دو دفعہ ٹرین کو روکا جب ایڈیشنل مجسٹریٹ نے ٹرین کو روانہ کر دینے کی دوسری کوشش کی تو ان پر حملہ کیا گیا جس سے وہ اور چار پولیس مین زخمی ہو گئے جن میں سے ایک سب انسپکٹر بھی تھا۔ اسی دن شام کو پانچ ہزار کے ایک جوش میں بھرے ہوئے ہجوم نے ریلوے سٹیشن سے کچھ فاصلے پر سندھ ایکسپریس کو روک لیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس چھ پیادہ کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر اس مقام پر پہنچے لیکن ان پر اینٹوں اور پتھروں کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ چونکہ اس وقت اندھیرا ہو چکا تھا اور اگر ہجوم منتشر نہ ہوتا تو تشدد پر اتر آتا اور ٹرین کے مسافروں کی پریشانی کا باعث ہوتا۔ اس لیے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے تین پیادہ کانسٹیبلوں کو حکم دیا کہ بارہ راؤنڈ ہوا میں چلائیں۔

اس سے ہجوم منتشر ہو گیا اور کسی قسم کا جانی نقصان نہ ہوا۔اس کے بعد معززین شہر کا ایک اجلاس ریلوے سٹیشن پر طلب کیا گیا۔اگرچہ ان میں سے ہر ایک اس غنڈے پن پر مذمت کر رہا تھا لیکن کسی قسم کی عملی امداد کرنے پر آمادہ نہ تھا کہ مبادا وہ کافر یا مرزائی قرار دیا جائے۔

چونکہ مجلس عمل کے عہدہ داروں نے مجلس عمل کی حمایت کا عہد کر رکھا تھا۔اس لیے مجلس عمل کے ڈکٹیٹر نے مسٹر منظور حسن ایم ایل اے سیکرٹری سٹی مسلم لیگ سے مطالبہ کیا کہ وہ ایک دستے کی قیادت کر کے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کریں لیگ کے صدر شیخ آفتاب احمد نے تجویز کی کہ شیخ منظور حسن کی فرضی اور بناوٹی گرفتاری کا انتظام کیا جائے تا کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ تحریک کو لیگ کی حمایت حاصل ہے۔اس پر اتفاق ہو گیا۔شیخ منظور حسن گرفتار کیے گئے اور انہیں پولیس کی ایک جیپ میں بٹھا کر ضلع کے ایک دور دست گوشے پر اتار دیا گیا اور کہا گیا کہ وہ چند روز تک گوجرانوالہ واپس نہ آئیں۔لیکن لوگ اس چال کو سمجھ گئے اور دوسرے دن کوئی دو سو آدمی شیخ آفتاب احمد کے مکان پر پہنچے اور ان سے کہنے لگے کہ ایک جلوس میں شامل ہوں۔وہ زبردستی مکان سے باہر نکالے گئے اور ان کو ایک جلوس کے ساتھ چلنے پر مجبور کیا گیا جو مسجد شیرانوالہ باغ کو جا رہا تھا۔اس وقت تک مسٹر منظور حسن گوجرانوالہ واپس آ چکے تھے اور مسجد شیرانوالہ باغ میں پہنچ کر شورش پسندوں میں شامل ہو چکے تھے انہوں نے احمدیوں اور حکومت کے خلاف کئی تقریریں کیں۔اور سات مسلم لیگ کونسلروں کو ساتھ لے کر ایک جلوس کی قیادت کی یہ سب لوگ گرفتار کر لیے گئے۔

چیف منسٹر کا بیان مورخہ ۶ مارچ لاہور کی ہدایت کے مطابق شہر بھر میں نشر کر دیا گیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو اطلاع ملی کہ ۷ مارچ کو احمدیوں کے جان و مال پر حملوں کا خطرہ ہے۔اس صورتحال پر فوج سے گفتگو کی گئی۔فوج نے تجویز کی کہ دفعہ ۱۴۴ کے ماتحت عام جلسے اور جلوس ممنوع قرار دیے جائیں لیکن سپرنٹنڈنٹ پولیس اور ڈپٹی کمشنر نے اس تجویز کو قبول نہ کیا اور اس کی بجائے فیصلہ کیا کہ فوج اور پولیس مل کر شہر میں گشت کریں۔اس کے بعد شہر میں لاقانونی کے کسی واقعہ کی اطلاع نہیں آئی سوائے اس کے ایک احمدی کی دوکان لوٹنے کی کوشش کی گئی۔

۷ مارچ کو موضع نند پورہ میں شورش پسندوں کے ایک پر غیظ ہجوم نے ایک شخص محمد حسین کو یہ

سمجھ کر قتل کر دیا کہ وہ احمدی ہے تفتیش سے یہ معلوم ہوا کہ متوفی کے ایک دشمن نے اس کو قتل کرانے کے لیے چال چلی تھی۔

۸۔مارچ کو مقامی ایم ایل اے مسجد شیرانوالہ باغ میں طلب کیے گئے اور ان سے درخواست کی گئی کہ لاہور جا کر ہدایات لائیں۔ یہ ایم ایل اے چیف منسٹر سے ملے لیکن کوئی قطعی ہدایات نہ لائے گوجرانوالہ میں فوج کی ایک کمپنی ۵ مارچ کو دو بٹالین ۶ مارچ کو اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب کنسٹیبلری کے دو ریزرو دستوں کے ساتھ ۸ مارچ کو پہنچ گئے۔

جب فوج آئی تو ان نعروں سے اس کا خیر مقدم کیا گیا ''پاکستانی فوج نے سیالکوٹ گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ زندہ باد پاکستانی فوج زندہ باد'' شورش پسند ہر جگہ یہ اعلان کر رہے تھے کہ وہ کفر کے خلاف جہاد میں مصروف ہیں اور کئی مقامات پر ایسے پوسٹر لگائے گئے جن میں پولیس اور فوج سے اپیل کی گئی تھی کہ گولی نہ چلائیں بلکہ جہاد میں شامل ہو جائیں۔

ضلع میں کوئی ایک درجن احمدیوں کو مجبور کر دیا گیا کہ اپنے عقیدے سے توبہ کر لیں۔

اس ضلع میں مسلم لیگ اس تحریک سے عملی رابطہ رکھتی تھی۔ گوجرانوالہ کی سٹی مسلم لیگ نے تحریک ختم نبوت کی حمایت میں قرارداد منظور کی اور اس کے سیکرٹری مسٹر منظور حسن نے اسی مطلب کی ایک قرارداد صوبہ مسلم لیگ کونسل کے اجلاس لاہور میں پیش کرنے کے لیے ارسال کی۔ انہوں نے اس قسم کی ایک قرارداد آل پاکستان مسلم لیگ کے اجلاس ڈھاکہ میں پیش کرنے کی بھی کوشش کی۔

احمدیوں کا ایک وفد ۲۰ مارچ کو سپرنٹنڈنٹ پولیس سے ملا لیکن انہوں نے کہا کہ میں آپ لوگوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ اس سے پہلے دن میں نے چیف منسٹر سے ہدایات طلب کی تھیں اور انہوں نے ہدایات دینے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ انھوں نے مرکز سے اس معاملے کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا۔

کمک پہنچنے کے بعد غنڈوں کی گرفتاریاں اور ناجائز اسلحہ کے لیے تلاشیاں شروع ہوگئیں مولوی عبدالواحد جو تحریک کی پشت پر تھے اور حکیم عبدالرحمن ڈکٹیٹر علی الترتیب ۱۱ اور ۱۲ مارچ کو گرفتار کر لیے گئے۔ اس کے بعد چند اور مولوی آگے آئے اور وہ بھی گرفتار کر لیے گئے۔ بالآخر یہ فیصلہ کیا گیا

کہ فوج کی امداد سے مسجد شیرانوالہ باغ پر چھاپہ مارا جائے۔ چھاپہ مارا گیا مسجد شورش پسندوں سے پاک کر دی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ رقم شیخ آفتاب احمد، مرزا شریف بیگ، محمد دین، ایم اے عزیز انصاری اور گوجرانوالہ مسلم لیگ کے بعض کونسلروں نے فراہم کی تھی۔

صفدر علی اور نصیر دین عرف نصیریا غنڈوں کے دو مشہور لیڈر تھے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ان کی گرفتاری کا حکم صادر کیا۔ اولذکر کسی نہ کسی طرح ضلع سے باہر نکل گیا اور بعدازاں جھنگ میں گرفتار کیا گیا۔ نصیریا بھی کچھ مدت تک گرفتاری سے بچتا بچاتا رہا لیکن آخر اسے سراغ لگا کر گرفتار کر لیا گیا۔

ضلع میں شورش کے دوسرے مرکز حسب ذیل تھے:۔

(۱) کامونکے: یہاں احمدیوں اور حکومت کے خلاف مظاہرے اور جلوس مرتب کرنے والے لطیف احمد چشتی اور حافظ عبدالشکور تھے۔ جو سرمایہ ضبط کیا گیا اس کی مقدار دس ہزار سات سو بہتر روپے تھی۔

(۲) وزیر آباد: یہاں تحریک کی تنظیم کرنے والے مولوی عبدالغفور ہزاروی اور کامریڈ عبدالکریم تھے۔ یہاں ریل کی پٹڑی پر لکڑی کا ایک لٹھ رکھ کر ایک ٹرین روکی گئی۔ جو سرمایہ یہاں ضبط کیا گیا اس کی مقدار دو ہزار پانچ سو آٹھ روپے تھی۔

(۳) حافظ آباد: یہاں ابوالحسن محمد یحییٰ اور مولوی فضل الٰہی نے عوام کے جذبات کو بھڑکایا۔

(۴) گکھڑ: یہاں ٹرینیں روکی گئیں۔ میر محمد بشیر صدر گکھڑ مسلم لیگ نے مع چند کونسلروں کو اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔

(۵) نوشہرہ ورکاں: ایک پرانا کانگرسی ڈاکٹر محمد اشرف یہاں گڑبڑ کا ذمہ دار تھا۔

(۶) سوہدرہ: یہاں مولوی عبدالمجید اہل حدیث نے عام جلسوں کا اہتمام کیا۔

راولپنڈی

یہاں بھی فسادات کے آغاز سے پیشتر واقعات کی رفتار بالکل صوبے کے دوسرے قصبوں کی ہی مانند تھی۔احراریوں نے احمدیوں اوران کے مذہب کی مذمت سے کام کا آغاز کیا۔اس کے جواب میں احمدیوں نے احراریوں کے ماضی کو اجاگر کرنا شروع کیا تاکہ پاکستان کے متعلق ان کی نیت کی نسبت جو شبہات تھے وہ قوی ہو جائیں۔آل پارٹیز مسلم کنونشن کے بعد احراری دوسرے مذہبی فرقوں مبلغوں اور پیروں کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا مساجد احمدیوں کے خلاف پروپیگنڈا کا مرکز بن گئیں اور جمعہ کے خطبات تو احمدی عقائد کی مذمت ومخالفت کے لیے ہی وقف کر دیے گئے۔نومبر ۱۹۵۲ء میں سید عطاءاللہ شاہ بخاری اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے جو احراریوں کے بڑے بڑے لیڈروں میں سے ہیں۔لیاقت باغ کے ایک جلسہ عام میں تقریریں کیں۔اس کے بعد رضا کاروں کی بھرتی اور سرمائے کی فراہمی کی مہم شدت سے شروع کر دی گئی۔

جب کراچی میں تحریک کے لیڈر گرفتار کر لیے گئے۔اور مولوی غلام اللہ خاں کو بھی ۲۷ فروری کو حکومت پنجاب نے گرفتار کر لیا۔تو دھڑا دھڑ جلوس اور جلسے منعقد ہونے لگے۔ایک جلسہ عام جو لیاقت باغ میں پیر صاحب گولڑہ شریف کے زیر صدارت منعقد ہوا۔وہ سب سے بڑا جلسہ تھا جس کی نظیر ماضی میں نہ مل سکتی تھی۔جب ۶ مارچ کو سیالکوٹ اور لاہور کے واقعات کے متعلق مبالغہ آمیز افواہیں پھیلیں اور یہ اطلاع موصول ہوئی کہ حکومت پنجاب نے مطالبات منظور کر لیے ہیں۔اور کراچی کو اس کی منظوری کی اطلاع دے دی ہے تو صورتحال بے حد نازک ہو گئی۔فوری نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے خیال کیا کہ حکومت نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔چنانچہ جلوس زیادہ جارحانہ ہو گئے۔ان کی تعداد بھی بڑھ گئی اور ان کو لاٹھی چارج سے منتشر کرنا پڑا۔

۶ مارچ کو لیاقت باغ میں ایک اور جلسہ منعقد ہوا۔ایک ہجوم نے جلسے کے بعد منتشر ہو کر مری روڈ کا رخ کیا اور احمدیوں کی ایک مسجد کو اور ایک چھوٹی موٹر کار کو آگ لگا دی۔اسی شام کچھ دیر بعد

لوٹ مار اور آتش زنی کے مزید واقعات بھی رونما ہوئے ۔احمدیہ کمرشل کالج ،نور آرٹ پریس اور پاک ریسٹوران شہر کے مختلف حصوں میں واقع تھے ۔لیکن لوگ زبردستی ان میں گھس گئے اور انہوں نے مختلف اشیا کو لوٹنے جلانے اور تباہ کرنے کی کوشش کی ۔ایک غیر احمدی نوجوان نور آرٹ پریس میں ملازم تھا اس کو احمدی سمجھ کر چھرا مارا گیا اور وہ اسی زخم کی وجہ سے ہلاک ہو گیا۔ جب صورتحال سخت خطرناک ہوگئی تو ۷ مارچ کو فوج طلب کر لی گئی ۔اس دن تھانہ گولڑہ اور تھانہ سنگ جانی کے علاقوں میں ٹیلیفون کے تار کاٹ دیے گئے ۔شہر کے موزوں اور اہم مقامات پر فوج متعین کر دی گئی۔

۸ مارچ کو گورنمنٹ کالج راولپنڈی کے ایک کمیونسٹ طالب علم مسعود ملک اور مولوی عبدالقدوس پونچھی کی سرکردگی میں ایک غضبناک ہجوم پولیس کوتوالی کے سامنے جمع ہو گیا اور خشت باری کرنے لگا۔سٹی مجسٹریٹ نے پولیس کو گولی چلانے کا حکم دے دیا۔جس سے ایک بلوائی ہلاک ہو گیا اور چھ مجروح ہوئے ۔اس کے بعد دفعہ ۱۴۴ کے ماتحت حکم صادر کیا گیا۔جس کی رو سے جلسے اور جلوس ممنوع قرار دیے گئے ۔اور رات کے وقت کرفیو عائد کر دیا گیا۔۲۳۹ اشخاص کو کرفیو توڑنے کی پاداش میں سزائیں دی گئیں۔اس کے بعد شورش کی تنظیم کرنے والوں نے جامع مسجد میں پناہ لی جہاں سے وہ رضا کاروں کو گرفتار کرنے کے لیے بھیجتے رہے۔ایک ہزر تینتیس رضا کار گرفتار کیے گئے اور ان کے خلاف زیر دفعہ ۱۸۸ تعزیرات پاکستان مقدمات دائر کیے گئے ۔یہ سب سزایاب ہوئے سوائے ان چونسٹھ اشخاص کے جنہوں نے معافی مانگ لی رہا کر دیے گئے ۔

شورش کی نوعیت کی وجہ سے پولیس اور فوج کے ادنیٰ ملازمین کے حوصلے اور وفاداری پر اثر پڑنے لگا۔ مسلم لیگ کے اکثر لیڈر اور مقامی ایم ایل اے کہیں روپوش ہو گئے اور انہوں نے عوام کا سامنا کرنے سے انکار کر دیا۔حقیقت میں وہ دورخی پالیسی پر عمل کر رہے تھے بظاہر حکام کے حامی تھے لیکن اندرونی طور پر شورش کی تائید و اعانت کر رہے تھے ۔پورے ضلع میں ایک مولوی بھی ایسا نہ تھا جو شورش کی حمایت نہ کر رہا ہو۔ جو مولوی گرفتار کیے گئے ان میں عارف اللہ شاہ ،محمد مسکین ،محمد اسماعیل زاہدی اور عبدالحنان شامل تھے ۔اور یہ تمام آل پارٹیز مسلم کنونشن کے ممبر تھے ۔

نواحی اضلاع سے بھی کثیر تعداد لوگ شورش میں حصہ لینے کے لیے آ گئے اطلاع موصول

ہوئی کہ ضلع ہزارہ سے دو ہزار پٹھان راولپنڈی کی طرف آ رہے ہیں۔لیکن سپرنٹنڈنٹ پولیس نے پیر صاحب گولڑہ شریف کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ ان لوگوں کو واپس چلے جانے کی ہدایت دے دیں۔اس طرح ایک کہن سال مگر مقبول عام مولوی محمد اسحاق مانسہروی بھی تحریک کی قیادت کے لیے نکل آئے۔لیکن حکام ضلع ان کو سمجھانے بجھانے میں کامیاب ہو گئے۔ بلکہ ان سے ایک تحریری اپیل جاری کرائی کہ لوگ لاقانونی اور بدنظمی پیدا کرنے سے پرہیز کریں۔

اس ضلع میں شورش مارچ کے تیسرے ہفتے میں ختم ہوگئی۔

لائل پور

یہ ضلع احراریوں کا اہم مرکز ہے۔ان میں سے اکثر جالندھر، گورداسپور، ہوشیار پور، لدھیانہ اور امرتسر کے اضلاع سے آئے ہیں اور یہی اضلاع بہت سے آبادکاروں کے اصلی وطن ہیں۔ جنوری ۱۹۵۳ء تک اس ضلع میں احراری احمدی نزاع کی کیفیت دوسرے اضلاع ہی کی مانند تھی۔یکم دسمبر ۱۹۵۳ء کو یوم میلادالنبی کے موقع پر احراریوں نے ایسے جھنڈے بلند کیے جن پر یہ مطالبات لکھے تھے کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دیا جائے اور چودھری ظفراللہ خاں کو کابینہ سے برطرف کر دیا جائے۔ اس کے بعد یہ باقاعدہ معمول ہو گیا کہ قبل نماز اور بعد نماز کی تقریروں میں یہی مطالبات دہرائے جانے لگے۔تقریریں نہ صرف احمدیوں کے بلکہ حکومت کے بھی خلاف تھیں۔جڑانوالہ ایک جلسہ عام میں مولوی فیروز الدین اور حافظ عبدالقدیر، مولوی عنایت اللہ مجاہد، مولوی میر داد اور مولوی عبدالرحیم نے تقریریں کیں۔جن میں مطالبات دہرائے اسی قسم کے جلسے لائل پور سمندری، ٹوبہ ٹیک سنگھ، تاندلیانوالہ اور گوجرہ میں منعقد ہوئے۔اس دوران میں رضا کار برابر طور پر بھرتی کیے جاتے رہے جو قرآن پر حلف اٹھاتے اور اپنے خون سے ڈائریکٹ ایکشن کے عہد نامے پر دستخط کرتے تھے۔ تحریک کے لیے چندہ آسانی سے جمع ہو رہا تھا۔رضا کاروں کی تعداد نو ہزار تک اور فراہم شدہ سرمائے کی مقدار تیس ہزار روپے تک پہنچ گئی تھی۔

اس تحریک کو بہت سے مسلم لیگیوں کی حمایت بھی حاصل تھی ۔حقیقت میں لیگ کے بہت سے کونسلر جماعت احرار سے تعلق رکھتے تھے اور اس تحریک کی حمایت میں اثر ڈال رہے تھے۔

لائل پور کے غلام نبی جانباز تاندلیانوالہ کے قاضی محمد حسین اور لائل پور کے مولوی عبید اللہ، ۲۷ فروری کو صوبائی حکومت کے ہدایات کے ماتحت گرفتار کر لیے گئے ۔یکم مارچ کو جامع مسجد سے ایک جلوس پندرہ رضا کاروں کے اس دستے کی مشایعت کے لیے ریلوے سٹیشن کو روانہ ہوا جو مولوی محمد یوسف خطیب جامع مسجد کی سرکردگی میں کراچی جارہا تھا۔کوئی گرفتاری نہ کی گئی کیونکہ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو لاہور سے ٹیلیفون پر اطلاعات موصول ہوئیں تھیں کہ کراچی کو جانے والے رضا کاروں کو گرفتار نہ کیا جائے ۔دوسرے دن صاحبزادہ افتخار الحق نے ریلوے سٹیشن لائل پور کے سامنے ایک نہایت اشتعال انگیز تقریر کی ۔وہ ایک سو رضا کاروں کو ساتھ لے کر لاہور روانہ ہو رہے تھے اور تقریباً چھ ہزار کا ایک ہجوم ان کو ایک جلوس کے ساتھ ریلوے سٹیشن پر لے گیا تھا۔وہ سالا روالہ ریلوے سٹیشن پر اتار لیے گئے تھے اور گرفتار کر لیے گئے ۔۳ مارچ کو زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری ایک حکم صادر کر کے عام جلسے اور جلوس ممنوع قرار دیے گئے ۔لیکن اس کے باوجود سیالکوٹ میں گولی چلنے کی خبر یہاں پہنچی تو چار پانچ ہزار انسانوں کا ایک جلوس جامع مسجد سے ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی کو روانہ ہوا۔ابھی وہ اپنی منزل مقصود کو نہیں پہنچا تھا کہ ۱۳ آدمی گرفتار کر لیے گئے اور جلوس منتشر کر دیا گیا۔زراعتی کالج بند ہو گیا اور دیہات سے رضا کار دھڑا دھڑ شہر میں آنے لگے ۔شام کے وقت ڈپٹی کمشنر نے معززین شہر کا ایک اجلاس طلب کیا جس میں ضلع مسلم لیگ اور سٹی مسلم لیگ کے صدر بھی شامل ہوئے ۔ان حضرات کا رویہ ہرگز تعاون کی طرف مائل نہ تھا بلکہ آخر الذکر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ میرا رویہ صدر صوبائی مسلم لیگ سے ملاقات کرنے کے بعد معین ہوا ہے جنہیں کچھ مدت پہلے میں لاہور میں مل کر آیا ہوں۔

۴ مارچ کو شہر میں مکمل ہڑتال رہی ۔جامع مسجد میں سات ہزار آدمیوں کا اجتماع ہوا جس میں بہت سے مولویوں نے تقریریں کر کے سیالکوٹ میں گولی چلانے کی مذمت کی ۔جلسے کے بعد تین الگ الگ جلوس روانہ ہوئے ۔جو بالآخر باہم مخلوط ہو گئے ۔اور ان کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی۔اس کے بعد وہ ڈپٹی کمشنر پر گئے ۔وہاں انہوں نے اپنے مطالبات دہرائے اور اپنے آپ کو گرفتاری کے

لیے پیش کیا۔ لیکن ڈپٹی کمشنر نے دانائی سے کام لے کر اس جلوس کا رخ بدل دیا بلکہ جیل تک خود اس کی رہنمائی کی۔ جہاں پہنچ کر جلوس کے لیڈر اور ۱۲۴ دوسرے اشخاص گرفتار کر لیے گئے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی جلوس کے ساتھ تھے جب ڈپٹی کمشنر نے ہوم سیکرٹری سے فوج مہیا کرنے کی درخواست کی تو ۴ اور ۵ کی درمیانی رات ۹/۸ پنجاب رجمنٹ کی بٹالین یہاں پہنچ گئی۔

۵ مارچ کو پچاس رضا کار گرفتار کر لیے گئے اور بیس میل دور لے جا کر چھوڑ دیے گئے ان کے علاوہ ایک جلوس کے ۵۵ شرکا زیر دفعہ ۱۸۸۔ تعزیرات پاکستان گرفتار کر لیے گئے۔ جب لاہور فائرنگ کی خبر ۶ مارچ کو لائل پور میں پہنچی تو بطور احتجاج کئی جلوس نکل آئے اور کوئی ۱۲۵ اشخاص گرفتار کیے گئے۔ چک جھمرہ سے آنے والے رضا کاروں نے چناب ایکسپریس کو ریلوے سٹیشن لائل پور کے قریب روک لیا۔ یہ خبر بھی موصول ہوئی کہ لاہور میں مارشل لا کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ شام کو چیف منسٹر کا یہ اعلان پہنچا کہ حکومت پنجاب نے شورش پسندوں کے مطالبات کو تسلیم کر لیا ہے۔ انکو حکومت پنجاب کی رائے کے ساتھ مرکز بھیج دیا ہے اور صوبے کا ایک وزیر ان مطالبات کو کابینہ کے سامنے بوجہ احسن پیش کرنے کی غرض سے کراچی جا رہا ہے۔ شورش پسندوں نے اس اعلان سے یہ سمجھ لیا کہ حکومت نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی مہم تیز کر دی اور اس کے بعد بعض مسلم لیگی ایم ایل اے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کرنے لگے۔

۷ مارچ غنڈے پن اور لاقانونی کا دن تھا۔ تین مختلف جلوس نکالے گئے اور ایک سو سات اشخاص گرفتار کر لیے گئے۔ جن میں شیخ بشیر احمد صدر سٹی مسلم لیگ بھی شامل تھے جنہوں نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا تھا۔ دس ہزار کے ایک ہجوم نے ضلع کی کچہریوں پر حملہ کر دیا۔ کھڑکیاں توڑ ڈالیں۔ مجسٹریٹوں کو عدالتیں بند کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اور پھر ڈپٹی کمشنر کے گھر میں گھس گئے۔ لائل پور کاٹن ملز کی خوردہ فروشی کی دوکان لوٹ لی گئی ریل کی پٹڑی توڑ دی گئی۔ اور تین ٹرینیں ریلوے سٹیشن کے قریب روک دی گئیں۔ ریلوے سٹیشن پر دوکانوں اور مسافروں کو لوٹا گیا۔ ٹرین میں بعض عورتیں بے آبرو ہو گئیں۔ اور ایک کیبن میں بری طرح زخمی ہو گئیں۔ ہجوم کو منتشر ہونے کے لیے کہا گیا اور جب اس نے تعمیل سے انکار کیا تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے پولیس کو گولی چلانے کا حکم دے دیا۔

سینتالیس راؤنڈ چلائے گئے۔ چار آدمی ہلاک ہوئے اور چار زخمی ہوئے۔ اس کے بعد کرفیو نافذ کر دیا گیا۔

اس دن بعض مسلم لیگی ایم ایل اے سمندری میں ایک جلوس لے کر نکلے۔

۸ مارچ کو دیروزہ ہلاک شدہ اشخاص کی نماز جنازہ ادا کرنے کے لیے بیس ہزار کا ہجوم جمع ہوا نماز کے بعد جلوس مرتب کیا گیا جس نے بازاروں میں گشت لگایا۔ ایک اور جلوس زراعتی کالج سے نکالا گیا۔ دن بھر کرفیو کی خلاف ورزی ہوتی رہی اور کوئی ایک سو دس آدمی گرفتار کیے گئے۔ جب ڈپٹی کمشنر اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس نے سنا کہ ایک ہجوم چنیوٹ بازار کی طرف جا رہا ہے تو وہ دونوں فوج کے ایک گشتی دستے کو ساتھ لے کر وہاں پہنچے۔ ہجوم کا رویہ جارحانہ تھا، ہجوم کو مجمع خلاف قانون قرار دیا گیا اور منتشر ہونے کا حکم دیا گیا۔ لیکن اس حکم کی تعمیل نہ کی گئی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے فوج کو گولی چلانے کا حکم دیا تین آدمی مارے گئے اور ایک زخمی ہوا۔ کچھ احراری رضا کار گوجرانوالہ سے ایک ٹرک میں آئے جس میں مائیکروفون لگا ہوا تھا یہاں سے وہ گرفتاری سے بچ کر نکل گئے اور جھنگ کو چل دیے۔ چنانچہ وہ وہاں گرفتار کیے گئے۔ یہ اپنے ساتھ تین ریوالور، کافی گولیاں بارود اور تیس ہزار روپیہ نقد لیے جا رہے تھے۔

اسی دن شام کے وقت ہجوم نے شہر کے اندرونی ٹرانسمشن سسٹم کے تار کاٹ ڈالے۔

۹ مارچ کو ایک پورے دن کا کرفیو عائد کیا گیا۔ لیکن اس کے بعد زراعتی کالج کے طلبا نے ایک لمبا جلوس نکال لیا۔ رضا کار برابر دیہات سے شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ ان میں ایک سو بیس جامع مسجد میں ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ وہ سب گرفتار کر لیے گئے۔ شام کے وقت ڈپٹی کمشنر نے معززین شہر کا ایک اجلاس طلب کیا جس میں ضلع مسلم لیگ کے صدر نے محض مجلس عمل کے نمائندے کا پارٹ ادا کیا۔

۱۰ مارچ کو چیف منسٹر کی دوسری اپیل آ گئی جس میں شورش پسندوں کے خلاف مضبوط کاروائی کی ہدایت دی گئی تھی۔ اس کا اثر اچھا ہوا۔ اس لیے حکام ضلع کو اس سے واضح ہدایت حاصل ہوئی۔ چنانچہ تحریک ٹھنڈی پڑنے لگی۔ ۱۷ مارچ کو جامع مسجد سے رضا کاروں کا ایک جلوس نکلا۔ ۱۹ مارچ کو

متولی کی مدد سے مسجد خالی کرالی گئی۔اور ۲۰ مارچ کو ضلع کی حالت پھر اپنے معمول پر آ گئی۔اس تمام دوران میں کسی احمدی کے جان و مال کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔نہ شہر میں اور نہ صنعتی رقبے میں کسی جائداد کی توڑ پھوڑ کی گئی۔پرائیوٹ طور پر گولی چلانے کے صرف دو واقعات ہوئے دونوں میں احمدیوں نے غلط فہمی کے ماتحت گولی چلادی تھی اور دونوں موقعوں پر بعض بچے زخمی ہوئے۔ضلع کے جن دوسرے قصبوں پر شورش کا اثر ہوا۔وہ یہ تھے: چک جھمرہ، جڑانوالہ،ڈجکوٹ، سمندری، تاندلیانوالہ، گوجرہ،ٹوبہ ٹیک سنگھ اور کمالیہ۔لیکن ان مقامات پر قوت کے استعمال کی ہرگز ضرورت نہیں پڑی اور احمدیوں کی جان و مال کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا۔شورش پسندوں سے جو سرمایہ چھینا گیا۔اس کی مقدار چار ہزار دوسوتیئس روپے دو آنے تین پائی تھی۔

منٹگمری

منٹگمری بھی احراریوں کا اہم مرکز ہے۔کیونکہ (۱) بہت سے احراری یہاں آباد ہو گئے ہیں۔(۲) احمدیوں کے خلاف تحریک کے ذمہ داروں اور احراریوں کے خلاف بہت سے مقدمات اسی ضلع میں دائر ہوئے (۳) احراری یہاں ایک ادارہ چلا رہے ہیں جس کا نام جامع رشیدیہ ہے اور یہ ادارہ احراریوں کی مذہبی سیاسی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز ہے۔اس ضلع کے پانچ بڑے بڑے احراری یہ ہیں۔مفتی ضیاالحسن (احراری لیڈر مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا بھتیجا) جو منٹگمری میں آباد ہوگیا ہے۔مولوی حبیب اللہ،مولوی لطف اللہ اور مولوی عبداللہ تینوں بھائی جو منٹگمری میں جامع رشیدیہ کے بانی ہیں اور مولوی بشیر احمد رضوانی جو اوکاڑے میں آباد ہوگیا ہے۔یہاں جو واقعات فسادات سے پہلے یا ان کے دوران رونما ہوئے۔ان کی کہانی اس جامع تحریری بیان میں درج ہے جو مسٹر حق نواز سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مرتب کیا ہے۔واقعات ویسے ہی ہیں جیسے دوسرے مقامات پر پیش آئے۔احراریوں اور احمدیوں کی ایک دوسرے کے خلاف تقریریں، جب آل پارٹیز مسلم کنونشن نے جولائی ۱۹۵۲ء میں مرتب کر لیے۔اس کے مسجدوں سے احمدیوں کے خلاف پرزور

پروپیگنڈا، سرمائے کی فراہمی اور ڈائریکٹ ایکشن کے لیے رضا کاروں کی بھرتی اور ۲۷ فروری کی گرفتاریوں کے بعد عام جلسے اور جلوس اور زیر دفعہ ۱۰۷ ضابطہ فوجداری یا زیر دفعہ ۳ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ گرفتاریاں۔ جماعت اسلامی کے مقامی ارکان اور دوسرے مولوی تحریک میں شامل ہو گئے اور مسجدیں رضا کاروں کا ہیڈ کوارٹر بنا دی گئیں۔ مختلف جماعتوں کے اشخاص نے جن میں مجلس احرار، جماعت اسلامی اور مسلم لیگ والے بھی شامل ہیں، مظاہروں میں سرگرم حصہ لیا۔ ان اشخاص کے نام سپرنٹنڈنٹ پولیس کے تحریری بیان کے ساتھ بطور ضمیمہ ا مندرج ہیں۔ بھرتی ہونے والے رضا کاروں کی تعداد منٹگمری میں دو ہزار، اوکاڑہ میں ڈیڑھ ہزار، عارف والا میں سات سو اور چیچہ وطنی میں دو سو تھی۔

مولوی لطف اللہ اور حبیب اللہ کی گرفتاری کے احکام صوبائی حکومت کی طرف سے ۲۷ فروری کو موصول ہوئے۔ آخر الذکر اس وقت بھی ہائیکورٹ کے ماتحت توہین عدالت کے جرم میں سزائے قید کاٹ رہا تھا۔ حکام ضلع مزید گرفتاریاں بھی کرنا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے مفتی ضیاالحسن اور مولوی عبداللہ اول اور مولوی عبداللہ ثانی کو گرفتار کرنے کی اجازت حکومت سے حاصل کر لی تھی۔

۲ مارچ کو اے ڈی آئی جی کی طرف سے یہ ہدایت موصول ہوئی کہ کراچی جانے والے رضا کاروں کو گرفتار نہ کیا جائے۔

چیف منسٹر کی اپیل مورخہ ۶ مارچ کا اثر یہاں بھی وہی ہوا جو دوسرے مقامات پر ہوا تھا یعنی شورش کو مزید تقویت پہنچ گئی۔ اس ضلع میں کسی قدر اہمیت کے واقعات صرف وہ تھے جو اوکاڑہ میں پیش آئے۔

۶ مارچ کو تین ہزار کا ایک ہجوم ریلوے سٹیشن پر پہنچا اور اس نے ڈاؤن پاکستان میل کو تین گھنٹے تک روکے رکھا۔ ہجوم نے ڈبوں کی کھڑکیاں توڑ ڈالیں۔ ٹرین کو روکنے والی ویکیوم کی زنجیریں توڑ ڈالیں اور مسافر عورتوں کو بے آبرو کیا۔ ۸ مارچ کو اوکاڑہ کے قریب ٹیلیگراف کے تار کاٹ دیے گئے۔ ۳ اپریل کو جامع مسجد میں چند آتش ریز تقریروں کے بعد عورتوں کا جلوس نکلا جو کچھ کتبے اور جھنڈے اٹھائے ہوئیں تھیں۔ پولیس نے کتبے چھیننے کی کوشش کی جس پر پانچ سو آدمیوں کا

ایک پرغیظ ہجوم پولیس پر پل پڑا۔ پولیس اس ہجوم کو پیچھے ہٹا رہی تھی کہ ستر سال کا ایک بوڑھا آدمی زخمی ہوا اور پھر ہسپتال میں فوت ہو گیا۔

۸ مارچ کا ایک اور واقعہ بھی ہے اگرچہ اس کا ذکر کسی سرکاری بیان میں نہیں لیکن ہمارے نزدیک اس کے باور نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ حافظ محمد بخش سیکرٹری جماعت احمدیہ چک نمبر ۲ (نزد اوکاڑہ) اور ان کے کنبے کے اشخاص کو جن میں ایک بی اے اور دوسرا بی اے ایل ایل بی ہے، مجبور کیا گیا کہ اپنے عقیدے سے توبہ کر لیں اور تحریک احمدیہ کے بانی کو گالیاں دیں۔ پھر چار پانچ ہزار کا ایک ہجوم ان کو جامع ملیہ اوکاڑہ میں لایا۔ جہاں وہ مولوی ضیا الدین اور مولوی معین الدین کے سامنے پیش کیے گئے اور ان سے کہا گیا کہ ان مولویوں کے سامنے اپنے عقائد سے منحرف ہونے کا اعلان کریں۔

سرغنوں کو آسانی سے گرفتار کرنے کے لیے ۱۴ مارچ کو اوکاڑہ میں چوبیس گھنٹے کا کرفیو نافذ کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۷ مارچ کو منٹگمری میں ڈھائی بجے دوپہر سے ۶ بجے صبح تک کرفیو عائد رکھا گیا۔ اس کے بعد ۱۳ مارچ کو منٹگمری اور اوکاڑہ میں ۱۷ دن کے لیے عام جلسے اور جلوس ممنوع قرار دیے گئے۔

اوکاڑہ میں ۱۳ اپریل کا واقعہ پیش آنے کے بعد ضلع کے حالات پھر اپنے معمول پر آ گئے۔

حصہ چہارم

وہ کوائف جن کا نتیجہ مارشل لاء کے اعلان کی صورت میں نکلا

یہ اس کیس کا کم وبیش تاریخ وار بیان ہے جس میں ہم نے متعلقہ واقعات وحقائق بیان کرنے کے علاوہ نکات پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے جو بعض فریقوں کے درمیان ما بہ النزاع تھے۔ اب ہم اپنے اخذ کردہ نتائج کو یکجا پیش کرینگے اور اپنے دائرہ تحقیقات کی شروط کی تکمیل کریں گے۔ہم زیر دفعہ ۴ پنجاب ایکٹ ۲، ۱۹۵۴ء اس کام پر مامور کیے گئے تھے کہ مندرجہ ذیل دوائر تحقیقات کے مطابق فسادات کے متعلقہ کوائف اور اس کی ذمہ داری کے تعین کی غرض سے تحقیقات کریں:۔

(الف) فسادات کی ذمہ داری

(ب) وہ کوائف جو ۶ مارچ ۱۹۵۳ء کو لاہور میں مارشل لا کے اعلان کا موجب ہوئے۔

(ج) صوبائی سول حکام نے فسادات کی روک تھام اور اس کے بعد ان کے تدارک کے لیے جو تدابیر اختیار کیں وہ کافی تھیں یا ناکافی۔

فقرہ (ب) میں کوائف کے متعلق جو ہدایت ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم محض ان واقعات کے بیان پر اکتفا کر لیں جو فسادات سے پہلے یا ان کے دوران میں رونما ہوئے ہوں۔ ہم اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ فسادات سے اور لاہور میں مارشل لا کے اعلان سے پہلے اور ان کے دوران میں جو واقعات وحوادث پیش آئے، ان کے درمیان سببی تعلق کا پتہ چلانا ہمارا کام ہے۔ ایکٹ ہم سے یہ مطالبہ بھی کرتا ہے کہ ہم اس امر کا پتہ چلائیں کہ فسادات کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ لہٰذا تحقیقات کی نوعیت کا تقاضا یہ ہے کہ فسادات کی ذمہ داری کے متعلق ان کوائف کی نسبت جو

مارشل لا کے اعلان کا باعث ہوئے اور ان تدبیروں کے متعلق جو فسادات کی روک تھام اور ان کے تدارک کے لیے اختیار کی گئیں، بحث ونظر، حوالہ جات اور اظہار رائے کے عملیات باہم گڈمڈ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ ان موضوعات کو الگ الگ رکھیں۔ اور حتی الوسع اعادے سے بچیں لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ یہ موضوعات آپس میں ایک دوسرے سے بے حد مربوط اور مخلوط ہیں۔ اگرچہ ذمہ داری کا ذکر فقرہ (الف) اور کوائف (ب) میں ہوا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک زیادہ آسان اور منطقیانہ بات یہی ہے کہ ہم پہلے آخر الذکر شق کو لیں۔

یہ امر تمام جماعتوں کے نزدیک مسلم ہے کہ ٦ مارچ کو جو کوائف موجود تھے۔ ان میں حالات کو فوج کے حوالے اور سول اقتدار کو فوج کے ماتحت کر دینا بالکل ناگزیر ہو چکا تھا۔ سول کے حکام جو عام حالات میں قانون وانتظام کے قیام کے ذمہ دار ہوتے ہیں کاملاً بے بس ہو چکے تھے اور ان میں ٦ مارچ کو پیدا ہونے والی صورت حالات کا مقابلہ کرنے کی کوئی خواہش اور اہلیت باقی نہ رہی تھی۔ نظم حکومت کی مشینری بالکل بگڑ چکی تھی اور کوئی شخص مجرموں کو گرفتار کر کے یا ارتکاب جرم کو روک کر قانون کو نافذ العمل کرنے کی ذمہ داری لینے پر آمادہ یا خواہاں نہ تھا۔ انسانوں کے بڑے بڑے مجمعوں نے جو معمولی حالات میں معقول اور سنجیدہ شہریوں پر مشتمل تھے۔ ایسے سرکش اور جنوں زدہ ہجوموں کی شکل اختیار کر لی تھی جن کا واحد جذبہ یہ تھا کہ قانون کی نافرمانی کریں اور حکومت وقت کو جھکنے پر مجبور کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی معاشرے کے ادنیٰ اور ذلیل عناصر موجود بدنظمی اور ابتری سے فائدہ اٹھا کر جنگل کے درندوں کی طرح لوگوں کو قتل کر رہے تھے۔ ان کی املاک کو لوٹ رہے تھے اور قیمتی جائداد کو نذر آتش کر رہے تھے۔ محض اس لیے کہ یہ ایک دلچسپ تماشا تھا یا کسی خیالی دشمن سے بدلہ لیا جا رہا تھا پوری مشینری جو معاشرے کو زندہ رکھتی ہے، پرزہ پرزہ ہو چکی تھی اور مجنوں انسانوں کو دوبارہ ہوش میں لانے اور بے بس شہریوں کی حفاظت کرنے کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ سخت سے سخت تدابیر اختیار کی جائیں۔ گویا مارشل لا کے نفاذ کے براہ راست ذمہ دار فسادات تھے لیکن خود فسادات کیونکر وجود میں آئے؟ آیا کوئی فوری اور غیر متوقع واقعہ ان کا باعث ہوا تھا یا بعض افراد یا گروہ مدت سے دانستہ ان کے منصوبے تیار کر رہے تھے۔ یہاں پھر یہ امر مسلم ہے کہ فسادات ان

احتجاجوں اور مظاہروں کا نتیجہ تھے جو پنجاب کے مختلف قصبوں میں اس وقت شروع ہوئے جب کراچی میں ۲۷ فروری کی صبح کو اور پنجاب کے بعض قصبوں میں ۲۷ فروری کی شب کو یا اس کے بعد مجلس عمل کے بعض ممبر گرفتار کر لیے گئے۔ یہ گرفتاریاں اس لیے عمل لائی گئیں کہ ڈائریکٹ ایکشن کی وہ دھمکی جس کا نوٹس یہ لوگ یا ایک ماہ قبل وزیر اعظم پاکستان کو دے چکے تھے، اب عمل میں آنے والی تھی۔ اور ۲۷ فروری کی صبح سے گورنر جنرل اور وزیر اعظم کی کوٹھیوں پر رضا کاروں کے دستے بھیجے جانے والے تھے۔ ہم کو یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ اگر اجازت دی جاتی تو یہ دستے پورے نظم وضبط کے ساتھ اپنی منزل مقصود پر پہنچ جاتے اور مطالبات کے متعلق حکومت کی بے پروائی کے خلاف عوام کی ناراضی کا کوئی اظہار نہ کیا جاتا اور یہ پانچ پانچ آدمیوں کے دستے محض ایک قسم کی ستیا گرہ پیش کرنے والے تھے۔ لیکن جس شخص کو یہ تجربہ ہے کہ ایسے موقع پر کیا ہوا کرتا ہے۔ وہ اس قسم کی توقع کو محض خوش خیالی اور کھوکھلی دلیل سمجھ کر رد کر دے گا۔ اگر کراچی یا دوسرے مقامات پر کوئی گرفتاری نہ کی جاتی تو وہاں کیسے واقعات رونما ہوتے اور شورش کیا صورت اختیار کرتی، یہ محض قیاس وتخیل کا معاملہ نہیں بلکہ ایسے موقعوں پر نفسیات اجتماع اور انتظامی مشکلات کے تجربے کی روشنی میں ہر ذہین شخص صحیح حکم لگا سکتا ہے اور مستقبل کے واقعات کا اندازہ کر سکتا ہے۔ لہٰذا اگر ۲۷ فروری کی صبح کو گرفتاریاں نہ بھی کی جاتیں تو فسادات ضرور رونما ہوتے۔ صرف اتنا فرق ہوتا کہ تھوڑی دیر بعد کراچی میں اور پنجاب کے اہم قصبوں میں گرفتاریاں اشد ضروری ہو جاتیں۔ جہاں رضا کاروں کے جیش کی ترتیب، ڈائرکٹ ایکشن کی کمیٹیوں کے قیام اور ڈکٹیٹروں کے تقرر کے متعلق طویل تیاریاں کی جا چکی تھیں۔ جب ہم ذمہ داری کے مسئلے پر بحث کرینگے۔ اس وقت بتائیں گے کہ جن جماعتوں نے ڈائریکٹ ایکشن کا تصور قائم کیا اس کی بنیاد رکھی اور اس کا منصوبہ تیار کیا انہیں اس قسم کے اقدام کے قدرتی نتائج کا اندازہ تھا اور مجلس عمل کا ہر ممبر اگر وہ احمق نہیں تھا تو بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ جو راہ عمل مجلس نے اختیار کی ہے۔ اس میں شہریوں کے جان و مال اور حکومت کی مشینری کے وجود کے لیے شدید خطرات مضمر ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ وزیر اعظم کو جو نوٹس دیا گیا اس میں صاف لکھا تھا کہ اگر وہ مطالبات کو قبول کرنے آمادہ نہیں ہیں تو اپنے عہدے سے استعفا دے دیں اور ڈائریکٹ ایکشن کی دھمکی صرف

اس صورت میں دی گئی کہ وہ اپنی ضد پر قائم رہیں اور مطالبات کو منظور نہ کریں اور اس دھمکی میں اس امر کا صاف اعتراف شامل ہے کہ اگر وزیر اعظم مستعفی نہ ہوں گے تو ان کی جگہ کوئی دوسرا آدمی رئیس حکومت مقرر کیا جائے گا جو مطالبات کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہو۔ اس بحث کے رو سے بعد میں رونما ہونے والے فسادات کا براہ راست باعث مطالبات ہی کو قرار دیا جائے گا۔

مطالبات تین تھے پہلے مطالبہ میں حکومت سے کہا گیا تھا کہ احمدیوں کے قادیانی فرقے کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ دوسرے مطالبے کا منشا یہ تھا کہ چودھری ظفر اللہ خان کو وزیر خارجہ کے عہدے سے برطرف کیا جائے۔ اور تیسرا یہ تھا کہ دوسرے احمدی جو مملکت کے کلیدی عہدوں پر فائز ہیں۔ موقوف کر دیے جائیں ہمارے سامنے سب جماعتوں نے تسلیم کیا ہے کہ ان تینوں مطالبات کی نوعیت سیاسی نہیں بلکہ قطعی طور پر مذہبی ہے اس کلیے کا استثنا صرف حافظ کفایت حسین (شیعہ عالم) ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ صرف ایک مطالبہ جس میں احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی خواہش کی گئی ہے، مذہبی نوعیت رکھتا ہے۔ باقی دو مطالبات کی نوعیت سیاسی ہے۔ ان مطالبات کی لازمی دینی نوعیت سے نہ جماعت اسلامی نے اور نہ اس کے امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے انکار کیا ہے۔ گو مولانا نے ان کے لیے چند مزید وجوہ بھی پیش کی ہیں۔ تمام دوسرے علما نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ تینوں کے تینوں مذہبی مطالبات ہیں اور ان میں ایک بھی سیاسی نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کوئی شخص جو ڈائریکٹ ایکشن میں شامل تھا، ان مطالبات کی سیاسی نوعیت کو تسلیم ہی نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا کرتا تو براہ راست فسادات کا ذمہ دار ٹھہرتا۔ ہر متعلقہ شخص نے ان مطالبات کی مذہبی نوعیت پر غالباً اس لیے زور دیا کہ اس پر کہیں ایک دنیاوی مقصد کی خاطر فسادات برپا کرنے کی ذمہ داری عائد نہ ہو جائے۔ کیس کے اس حصے پر بعض اہم گروہ مثلاً احرار اور جماعت اسلامی اور بعض علماء جو ایک زمانے میں احرار یا کانگرس سے وابستہ تھے اور تقسیم سے پہلے علی الاعلان قومیت پرستی اور غیر مذہبی مملکت کے حامی اور تقسیم اور مسلم لیگ کے مخالف تھے واضح طور پر پریشان اور بدحواس ہوئے اور اپنی سابقہ تقریروں کے پیش نظر انہیں اپنی عدم مطابقت اور تضاد کا احساس ہوا کیونکہ اگر مطالبات کی نوعیت مذہبی تھی اور مذہب ایک حقیقت قائمہ و ثابتہ ہے تو یہ سمجھنا بے انتہا مشکل ہو جاتا ہے کہ جو

نظریہ مذہب پر مبنی ہو وہ ایک وقت سے دوسرے وقت اور ایک مقام سے دوسرے مقام پر تبدیل کیونکر ہوسکتا ہے۔ انہیں اس موقف کے عواقب کا پورا شعور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عوام کے سامنے اس پوزیشن پر قائم رہے کہ یہ مطالبات ان کے مذہبی عقائد پر مبنی ہیں۔

ہم مطالبات کے متعلق ایک اور نکتہ اس موقع پر بیان کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ یہ مطالبات صرف ان اشخاص کے نہیں بتائے جاتے جو آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کراچی اور آل مسلم پارٹیز کنونشن لاہور کی قراردادیں منظور کرنے میں شریک تھے۔ بلکہ ان کو اسلام کے تمام فرقوں کے متفقہ مطالبات سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ہمارے سامنے یہ دعویٰ کسی نے نہیں کیا کہ ہر مذہبی گروہ یا انجمن نے جن میں سے بعض کے اپنے آئین و دستور موجود ہیں، الگ الگ اس موضوع پر بحث کی ہے اور اس کے متعلق اپنے آئین کے ماتحت قراردادیں منظور کی ہیں۔ جو کچھ ہوا، وہ یہ ہے کہ ہر مذہبی گروہ کا کوئی رکن یا بعض ارکان (خواہ وہ عہدہ دار ہوں یا نہ ہوں) کنونشن میں اس گروہ کی نمائندگی کے لیے چن لیے گئے اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مطالبات تمام مذہبی گروہوں کے متفقہ مطالبات ہیں تو یہ دعویٰ صرف اس حد تک صحیح ہے کہ ملک کے نہایت اہم مذہبی گروہوں میں کسی رکن یا چند ارکان نے مطالبات کے متعلق استحسان ظاہر کیا ہے لہٰذا صرف ان معنوں میں ان مطالبات کو تمام مسلم فرقوں کے مطالبات ہیں تو یہ دعویٰ صرف اس حد تک صحیح ہے کہ ملک کے نہایت اہم مذہبی گروہوں میں کسی رکن یا چند ارکان نے مطالبات کے متعلق استحسان ظاہر کیا ہے۔ لہٰذا صرف ان معنوں میں ان مطالبات کو تمام مسلم فرقوں کے مطالبات کہا جاسکتا ہے۔

جب یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ مطالبات متفقہ ہیں اور ان کی نوعیت مذہبی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ مطالبات متفقہ ہیں اور ان کی نوعیت مذہبی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ مطالبات تمام اسلامی فرقوں کے نزدیک بعض دینی مسلمات و عقائد کی بنا پر واضح طور پر ثابت ہیں جن علما سے ہم نے اس موضوع پر سوالات کیے قریب قریب ان سب نے بیان کیا کہ یہ مطالبات اس قرارداد مقاصد کا جو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ۱۲ اپریل مارچ ۱۹۴۹ء کو منظور کی تھی اور دین و سیاست کے اس مجموعے کا قدرتی نتیجہ ہیں جس کو اسلام کہتے ہیں، بہت زور شور سے بیان کیا گیا ہے

کہ پاکستان کا مطالبہ اور قیام محض اس غرض سے عمل میں آیا تھا کہ نئی مملکت کا آئندہ سیاسی نظام قرآن اور سنت پر مبنی ہوگا اور جب پاکستان کا مطالبہ حقیقتاً پورا ہو گیا اور قرارداد مقاصد نے اس مطالبہ کی بنیاد کو واضح طور پر تسلیم کر لیا تو علما اور پاکستانی شہریوں کے دلوں میں یہ عقیدہ راسخ ہو گیا کہ ہر مطالبہ جو مذہبی دلائل کی رو سے صحیح ثابت کر دیا جائے اس کو مملکت کے ارباب اختیار صرف قبول ہی نہ کرینگے بلکہ اس کا پر جوش خیر مقدم کرینگے کیونکہ وہ خود کئی سال سے پاکستان میں ایک ایسی اسلامی مملکت قائم کرنے کے لیے چیخ پکار کرتے رہے ہیں جس میں اسلامی نمونے کے سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی ادارات قائم کیے جا سکیں۔ یہ بھی بتایا گیا کہ بعض لیڈروں نے علی الاعلان اس نصیب العین کے حصول کو اپنی زندگی کا واحد مقصد قرار دیا ہے۔ لہٰذا ان مطالبات کو تسلیم کرانے کے لیے علما کو دینیاتی مسائل دلائل سے صرف یہ ثابت کر دینے کی ضرورت ہے کہ احمدی ایک علیحدہ قوم اور خارج از اسلام ہیں اور اس ملک کے امور عامہ میں حصہ لینے کا کوئی حق نہیں رکھتے جس کا نظم و نسق قطعی طور پر احکام اسلام کے مطابق چلایا جائے گا۔ مطالبات کی حقیقی نوعیت کا اندازہ لگانے کے لیے اس موقع پر یہ بیان کرنا ضروری ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام دین و سیاست کا مجموعہ ہے تو اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ اسلام ایک ثقافتی مجموعہ ہے جو سیاسی ساخت اور قانونی و معاشرتی روایات پر حاوی ہے اور جو اسلامی عقائد و عبادات اخلاقیات اور جو اسلامی عقائد و عبادات اخلاقیات اور ادارت عائلی سے الگ ممتاز ہے۔ اسلام کا یہ تصور جزوی طور پر یورپی اصطلاحات سے مستعار لیا گیا ہے۔ لیکن اس کی بنا ''دارالاسلام'' کے نظریے پر بھی ہے۔ یعنی وہ ملک جو زندگی کے متعلق ایک مخصوص اور علیحدہ زاویہ نگاہ رکھتا ہو اور اپنے تمام ادارات کی بنیاد اور اپنی تمام سرگرمیوں کی اساس، ان مقاصد کے حصول پر رکھتا ہو جنکی ہدایت الہام الٰہی سے ملی ہے۔ ہم اس موضوع پر دوبارہ توجہ کرینگے لیکن موجودہ مرحلے پر یہ سمجھ لینا بے حد اہم ہے کہ ان مطالبات کو اسلامی مملکت کے نظریہ پر مبنی ہونے کے معنی کیا ہیں۔ اس مقصد کے لیے نہ صرف یہ سمجھنا ضروری ہے کہ مسلمانوں اور احمدیوں کے عقائد میں کیا کیا فرق ہے بلکہ دین و سیاست کے اس متحدہ نظام کا جس کو اسلام کہتے ہیں۔ اور اسلامی مملکت کے اس نظریے کا جس کا لازمی نتیجہ ان مطالبات کو بتایا جاتا ہے صحیح اور واضح تصور کیا ہے۔

مسلمانوں اور احمدیوں کے درمیان عقائدی اختلافات

اس سے پیشتر رپورٹ کے حصہ اول میں ہم احمدی تحریک کے آغاز کا مختصر حال بیان کر چکے ہیں اور اس تحریک کے پیرووں کے مخصوص عقائد و مسلمات کا ذکر بھی کیا جا چکا ہے اب ہم ان عقائد پر زیادہ جامعیت کے ساتھ نظر ڈالیں گے تاکہ مسلمانوں اور احمدیوں کے دینی اختلافات کو بہتر طور سے سمجھ سکیں۔

ختم نبوت

پہلا اختلاف احمدی جماعت کے بانی مرزا غلام احمد کے مقام سے تعلق رکھتا ہے۔ مرزا غلام احمد کا دعویٰ ہے کہ وہ نبی ہیں اور مسلمانوں کے نزدیک وہ اس دعوے کی وجہ سے بالکل خارج از اسلام ہو گئے ہیں۔ ایک متفق علیہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نوع بشر کی ہدایت کے لیے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے ہیں مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ یہ انبیا کا سلسلہ جن میں سے بعض کا ذکر قرآن مجید اور بائیبل میں خاص طور سے آیا ہے پیغمبر اسلام صلعم پر ختم ہو جاتا ہے۔ عقیدہ ختم نبوت ان معنوں میں کہ نبوت رسول پاک کے وصال پر ختم ہو گئی۔ اور اس کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات سے ماخوذ بتایا جاتا ہے۔

ما کان محمد ابآ احد من رجالکم ولکن رسول اللہ و خاتم النبین و کان اللہ بکل شی علیما (سورہ ۳۳۔ آیت نمبر ۴۰)

ترجمہ۔ محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے ختم پر ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

واذا اخذ اللہ میثاق النبین لمآ اتیتکم من کتاب وحکمة ثم جاء کم رسول مصدق لما معکم لتومنن بہ ولتنصرنا ط قال ء اقررتم واخذ تم علٰے ذلکم

اصری ط قالوآ اقررنا ط قالا فاشھدو وانا معکم من الشھدین.

(سورہ۳۔آیت۸۱:)

ترجمہ۔اور جب اللہ نے عہد لیا انبیا سے کہ جو کچھ میں تم کو کتاب اور علم دوں اور پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے جو مصداق ہو اس کا جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور اس رسول پر اعتقاد بھی لانا اور اس کی طرفداری بھی کرنا۔فرمایا کہ آیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا عہد قبول کیا۔وہ بولے ہم نے اقرار کیا فرمایا کہ تو گواہ رہنا اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔

الیوم یبئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشو ھم واخشون ط الیوم اکملت لکم دینکم و اتمت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا.

(سورہ۵۔آیت۴)

ترجمہ۔آج کے دن کافرلوگ تمہارے دین سے ناامید ہو گئے سو ان سے مت ڈرنا اور مجھ سے ڈرتے رہنا آج کے دن تمہارے لیے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر انعام ختم کر دیا اور اسلام کو تمہارا دین بننے کے لیے پسند کر لیا۔

اس کے علاوہ متعدد احادیث سے اور آیات مندرجہ کی مستند تفاسیر سے جو متقدمین کے زمانے سے چلی آتی ہیں، یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارے نبی کریم کے بعد کوئی نیا نبی مبعوث نہ ہوگا۔عربی فارسی اور اردو کے بعض مشہور شعرا کے اشعار اور اس موضوع پر بعض رسالوں اور کتابچوں کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ جماعت احمدیہ کے فاضل وکیل مسٹر عبدالرحمان خادم نے اس کے برعکس سورہ۴ آیت ۶۹،سورہ ۵۷ آیت ۱۹،سورہ ۷ آیت ۳۵ اور سورہ ۲۳ آیت ۵۱ کے حوالے دیے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

ومن یطع اللہ والرسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبین والصدیقین و الشھداء والصلحین و حسن اولئک رفیقا (سورہ۴ آیت ۶۹)

ترجمہ۔اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مان لے گا تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے ساتھ ہونگے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے۔یعنی انبیا صدیقین،شہدا اور صلحا اور یہ حضرات بہت

اچھے رفیق ہیں۔

والذین آمنو باللہ ورسلہ اولئک ھم الصدیقون والشھدآء عند ربھم لھم اجرھم ونورھم والذین کفروا وکذبوا بایاتنا اولئک اصحاب الجحیم

(سورہ ۵۷ آیت ۱۹)

ترجمہ۔اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ایسے ہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں ان کے لیے ان کا اجر اور ان کا نور ہوگا اور جو لوگ کافر ہوئے اور ہماری آیتوں وجھٹلایا یہی لوگ جہنمی ہیں۔

یا یھا الرسل کلو من الطیبت واعملو صالحا انی بما تعملون علیم

(سورہ ۲۳ آیت ۵۱)

ترجمہ:۔اے پیغمبرو! نفیس چیزیں کھاؤ اور نیک کام کرو میں تم سب کے کئے ہوئے کاموں کو خوب جانتا ہوں۔

استدلال کا ایک خاص طریقہ ہے جس کی تصریح کرنا ہمارے لیے ضروری نہیں کیونکہ ہمارا فرض یہ نہیں ہے کہ کسی خاص تاویل کی صحت کے مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار کریں استدلال کے اس طریقے کے ماتحت قرآن مجید کی ان آیات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ مستقبل میں یعنی ہمارے رسول پاک کے بعد ایسے اشخاص پیدا ہونگے جن پر نبی یا رسول کی اصطلاح کا اطلاق ہو سکے گا۔اس دلیل کو تقویت پہنچانے کے لیے بعض احادیث بھی نقل کی گئی ہیں اور بعض ایسے مفسرین اور دوسرے حضرات کی تصانیف کے حوالے بھی دیے گئے ہیں جن کی روحانی برتری عام طور مسلم ہے اگرچہ اس امر سے انکار نہیں کیا جاتا کہ مرزا غلام احمد نے نبی کا لفظ اپنے لیے استعمال کیا ہے لیکن یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ انہوں نے یہ لفظ ایک خاص معنی میں استعمال کیا ہے اور وہ اصطلاحی مفہوم کے اعتبار سے نبی نہ تھے۔یعنی وہ اللہ کی طرف سے کوئی ایسا پیغام نہ لائے تھے جس سے سابقہ پیغام کی تنسیخ ترمیم یا ایزادی لازم آتی ہو اور ان کا دعویٰ تشریعی نبوت کا نہیں۔ بلکہ ظلی یا بروزی نبوت کا ہے۔ فریق ثانی کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ ظل اور بروز کا تصور (جسے حلول یا ہندی میں اوتار کہنا

چاہیے) عقائد اسلامی کے منافی ہے اور ہر شخص جو وحی نبوت کا مورد ہونے کا دعویٰ کرتا ہے وہ ایک نئی امت کی بنیاد رکھتا ہے۔ لہٰذا ملت اسلام کے دائرے سے خارج ہو جاتا ہے۔ مرزا غلام احمد، موجودہ امام جماعت احمدیہ اور اس جماعت کے ممتاز مصنفین کی تحریروں کا حوالہ دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مرزا غلام احمد نے ایسی وحی اور ایسے الہام کے مورد ہونے کا دعویٰ کیا جس سے اب تک اللہ تعالیٰ مخصوص طور پر صرف انبیا ہی کو نوازتا رہا ہے۔ لہٰذا یہ مسئلہ صرف اس ایک سوال پر محدود ہو جاتا ہے کہ آیا مرزا غلام احمد نے کبھی ایسی وحی کے مورد ہونے کا دعویٰ کیا ہے جو ''وحی نبوت'' کہلا سکتی ہو۔ زمانہ ماضی میں جب کبھی کوئی نبی آیا اس نے اپنی قوم کو یہ حکم دیا (ہمارے نبی کریم نے پوری نوع بشر کو مخاطب فرمایا تھا) کہ میرے دعوے پر غور کرو اور مجھ پر ایمان لاؤ اگر تم میری نبوت کے متعلق شک وشبے اور بے یقینی میں مبتلا ہو گئے تو عاقبت میں سزا کے مستوجب ہو گے۔ لہٰذا لوگ محسوس کرتے ہیں کہ یا اس دعوے کو ماننا ہو گا یا اس سے انکار کرنا ہو گا۔ پھر جو لوگ اس دعوے کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ ان کی ایک علیحدہ مذہبی جماعت بن جاتی ہے جس کو اصلی قوم اچھوت سمجھنے لگتی ہے اور نئی جماعت ان لوگوں کو جو نئے نبی کی تصدیق نہیں کرتے اپنے سے منقطع سمجھتی ہے۔ اگرچہ مرزا غلام احمد نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور لوگوں کو تلقین کی کہ وہ اس ہاتھ پر بیعت کر لیں لیکن یہ سوال بدستور قائم رہا کہ آیا انہوں اپنی وحی کو ''وحی نبوت'' کا مرتبہ دیا ہے جس پر ایمان نہ لانا آخرت میں عذاب وعتاب الہٰی کا موجب ہو گا۔ احمدیوں نے اور ان کے موجودہ امام نے بڑے غور وخوض کے بعد ہمارے سامنے یہی موقف اختیار کیا ہے کہ مرزا صاحب نے اپنی وحی ''وحی نبوت'' کے برابر قرار نہیں دیا۔ لیکن فریقین ثانی کا پرزور دعویٰ ہے کہ انہوں نے یقیناً قرار دیا ہے۔ احمدی لٹریچر میں جس میں خود مرزا غلام احمد اور موجودہ امام جماعت احمدیہ کی تحریریں بھی شامل ہیں، ایسے قرائن موجود ہیں جن سے فریق ثانی کے دعوے کی تائید ہوتی ہے لیکن ہمارے سامنے جو موقف اختیار کیا گیا ہے وہ واضح طور پر یہ ہے کہ مرزا غلام احمد اپنے آپ کو محض اس لیے نبی کہتے تھے کہ ان کو ایک الہام میں اللہ تعالیٰ نے نبی کر کے مخاطب کیا تھا وہ کوئی نیا قانون یا ضابطہ نہیں لائے انہوں نے اصلی اور پرانی شریعت میں نہ کوئی تنسیخ کی ہے نہ اضافہ کیا ہے اور مرزا صاحب کی وحی پر ایمان نہ لانے سے کوئی شخص

خارج از اسلام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ اس معاملے میں رائے دینا ہمارا کام نہیں کہ احمدی دائرہ اسلام سے خارج ہیں یا نہیں۔ ہم نے اس نقطہ کا ذکر محض اس لیے کیا ہے کہ احمدیوں اور غیر احمدیوں کے درمیان جو اختلافات بتائے جاتے ہیں، ان کی تصریح کر دیں۔ اب یہ قرار دینا غیر احمدیوں کا کام ہے کہ احمدیوں کو مسلمان سمجھا جائے یا نہ سمجھا جائے۔

مسیحّیات

فریقین کے درمیان دوسرا اہم اختلاف یسوع مسیح کے صلیب دیے جانے اور یوم قیام سے پہلے ان کے ظہور ثانی کے متعلق ہے۔ مسیح کے مصلوب ہونے اور دوبارہ ظہور کرنے کے متعلق کم از کم چار مختلف عقیدے موجود ہیں۔

(۱) ایک عقیدہ جس پر اکثر مسلمان فرقے متفق ہیں۔ یہ ہے کہ مسیح صلیب پر فوت نہیں ہوئے بلکہ چوتھے آسمان پر زندہ موجود ہیں۔ روز قیامت سے پہلے زمین پر اتریں گے اور ان کا ظہور قیامت کی نشانیوں میں سے ہوگا۔

(۲) ایک عقیدہ احمدیوں کا ہے کہ مسیح صلیب پر وفات پانے سے بچ گئے۔ شاگردوں نے ان کا علاج معالجہ کیا جب ان کے زخم اچھے ہو گئے تو وہ کشمیر چلے گئے جہاں طبعی موت مر گئے۔ روز قیامت سے پہلے جس شخص کے ظہور کا وعدہ کیا گیا ہے۔ وہ اپنے خصائل میں مسیح کا مثل ہوگا اور وہ شخص مرزا غلام احمد ہے۔

(۳) ایک عقیدہ یہ ہے کہ مسیح صلیب پر فوت ہو گئے تھے۔ لیکن روز قیامت سے پیشتر اپنی قبر میں جی اٹھیں گے اور

(۴) ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ مسیح صلیب پر فوت ہو گئے تھے اور اب نہ وہ خود ظاہر ہونگے نہ ان کا کوئی مثل آئیگا قرآن مجید کی جن آیات میں اس قصے کا ذکر ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

ولما ضرب ابن مریم مثلاًاذا قومک منه یصد ون O وقالواء الهتنا خیر ام

ھو ماضربوہ لک الا جدلا بل ھم قوم خصمون O ان ھو الا عبد انعمنا علیہ وجعلنا ہ مثلا لبنی اسرائیل O ولو نشآ ء لجعلنا منکم ملائکۃ فی الارض یخلفون O وانہ لعلم للساعۃ فلا تمترن بھاو اتبعون ھذا صراط مستقیم (سورہ۴۳۔آیات ۵۷تا۶۱)

ترجمہ۔اور جب ابن مریم کے متعلق ایک عجیب مضمون بیان کیا گیا تو یکا یک آپ کی قوم کے لوگ چلانے لگے (تحقیر سے) کہنے لگے ہمارے معبود بہتر ہیں یا عیسیٰ یہ جو کچھ ان لوگوں نے بیان کیا محض جھگڑے کے لیے اور یہ لوگ جھگڑالو ہیں۔عیسیٰ تو محض ایک ایسے بندے ہیں جن پر ہم نے فضل کیا اور ان کو بنی اسرائیل کے لیے ایک نمونہ بنایا۔اگر ہم چاہتے تو ہم تم سے فرشتوں کو پیدا کر دیتے کہ وہ زمین پر رہا کرتے۔وہ قیامت کے یقین کا ذریعہ ہیں پست تم لوگ اس میں شک نہ کرو اور میری اتباع کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔

سورہ۵۔آیت ۱۱۷:

ما قلت لھم الا ما امرتنی بہٓ ان اعبدوا اللہ ربی و ربکم و کنت علیھم شھیدا ما دمت فیھم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم و انت علی کل شی شھید.

ترجمہ۔میں نے ان سے کچھ نہیں کہا سوائے اس کے جو آپ نے مجھ سے کہنے کو کہا تھا کہ تم اللہ کی بندگی اختیار کرو جو میرا اور تمہارا رب ہے میں ان پر مطلع رہا جب تک ان میں رہا پھر جب آپ نے مجھے وفات دی تو آپ ان پر مطلع رہے اور آپ ہر چیز کی پوری خبر رکھتے ہیں۔

سورہ۳۔آیت ۵۵، ۱۴۴:

اذ قال اللہ یعسیی انی متوفیک ورا فعک الی و مطھرک من الذین کفروا وجاعل الذین اتبعوک فوق الذین کفروآ الی یوم القیمۃ ثم الی مرجعکم فاحکم بینکم فیما کنتم فیہ تختلفون (۵۵)

ترجمہ۔اور جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے عیسیٰ بیشک میں تجھ کو وفات دینے والا ہوں اور تجھے اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور تجھ کو ان لوگوں سے پاک کرنے والا ہوں جو منکر ہیں اور جو لوگ تمہارا کہنا ماننے والے ہیں۔ان کو غالب رکھنے والا ہوں ان لوگوں پر جو منکر ہیں روز قیامت تک پھر سب کی واپسی میری طرف ہوگی۔سو میں تمہارے درمیان ان امور میں فیصلہ کروں گا۔جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔

وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افائن مات او قتل انقلبتم على اعقابكم ومن ينقلب على عقبيه فلن يضر الله شياً وسيجزى الله الشاكرين. (۱۴۴)

ترجمہ۔محمد صرف رسول ہی تو ہیں آپ سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔سو اگر آپ کا انتقال ہو جائے یا آپ شہید ہو جائیں تو کیا تم لوگ الٹے پھر جاؤ گے اور جو شخص پیٹھ دکھا جائے گا۔وہ خدا کا کوئی نقصان نہ کرے گا اور خدا حق شناس لوگوں کو جلد ہی جزا دے گا۔

سورہ۴۔آیت ۱۵۷ تا ۱۵۸:

(۱۵۷)وقولهم انا قتلنا المسيح عيسى ابن مريم رسول الله وما قتلوه وما صلبوه ولكن شبه لهم وان الذين اختلفوا فيه لفى شك منه ط ما لهم به من علم الا اتباع الظن وما قتلوه يقينا o بل رفعه الله اليه وكان الله عزيزاً حكيماo

ترجمہ۔اور ان کا قول ہے کہ ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو جو خدا کے رسول ہیں قتل کر دیا۔حالانکہ نہ انہوں نے ان کو قتل کیا۔نہ سولی پر چڑھایا۔بلکہ ان کو اشتباہ ہو گیا اور جو لوگ ان کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں وہ غلط خیال میں ہیں ان کے پاس سوائے ظنی باتوں کے کوئی دلیل نہیں انہوں نے یقیناً قتل نہیں۔بلکہ خدا نے ان کو اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ بڑا زبردست حکمت والا ہے۔

غیر احمدی مسلمان ان آیات کی تفسیر کر کے یہ ثابت کرتے ہیں کہ مسیح صلیب پر فوت نہیں ہوئے تھے بلکہ معجزانہ طور پر نظر کا ایک دھوکا واقع ہو گیا تھا۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے مسیح کو اپنی طرف اٹھا لیا تھا۔ وہ اب تک چوتھے آسمان پر موجود ہیں اور روز قیامت سے پہلے وہاں سے نازل ہوں گے ۔اس عقیدے کی تائید میں بے شمار حدیثیں پیش کی جاتی ہیں ۔لیکن احمدی انہی آیات کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ مسیح صلیب پر نہیں بلکہ عام حالات میں طبعی موت مرے تھے۔ان کے خصائل رکھنے والا ایک اور آدمی موعود تھا۔ چنانچہ وہ مرزا غلام احمد کی شخصیت میں ظہور کر چکا ہے۔ وہ نامور علما و ائمہ کی کئی تحریرات اپنے اس عقیدے کی تائید پیش کرتے ہیں کہ روز قیامت سے پیشتر جو مسیح موعود ظاہر ہونے والا تھا خود مسیح نہیں بلکہ مثیل مسیح ہوگا۔ مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش نے مجلس عمل کی جانب سے یہ دعویٰ کیا کہ ان آیات اور بعض دوسری آیات قرآنی کی احمدی تفسیر ''تاویل وتحریف'' ہے جو کفر وارتداد کی مترادف ہے اور جو شخص اس قسم کی غلط تاویل کا مرتکب ہو۔ وہ حلال الدم والمال ہو جاتا ہے (یعنی اس کے جان و مال کی حفاظت نہیں کی جاتی) اس بحث میں ایک متنازعہ فیہ معاملہ یہ ہے کہ سورہ ۴۳ کی آیت ۵۷ میں لفظ ''مثلاً'' کے کیا معنی ہیں ۔اور آیات محولہ بالا میں جو لفظ ''وفی'' آیا ہے اس کے مشتقات کیا کیا ہیں۔ اور سورہ ۴۳ کی آیت ۶۱ میں لفظ ''انہ'' کی ضمیر کس طرف راجع ہوتی ہے لیکن یہ ہمارا کام نہیں کہ اس بحث کے مالہ و ماعلیہ کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کریں۔

جہاد

فریقین کے درمیان تیسرا اختلاف عقیدہ جہاد کے حدود کے متعلق ہے جن کا ذکر سورہ ۲۲ کی آیات ۳۹، ۴۰ سورہ ۲ کی آیات ۱۹۰ تا ۱۹۴ سورہ ۶۰ کی آیت ۸، سورہ ۴ کی آیات ۷۴، ۷۵ سورہ ۹ کی آیت ۵ اور سورہ ۲۵ کی آیت ۵۲ میں پایا جاتا ہے آیات درج ذیل ہیں۔

سورہ ۲۲ آیات ۳۹۔۴۰

اذن للذین یقتلون بانھم ظلموا وان اللہ علی نصر ھم لقدیر۔ ن الذین

اخرجو من دیارھم بغیر حق الا ان یقولو ا ربنا اللہ ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع و صلوٰت و مساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا ط ولینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیز۔

ترجمہ۔ان لوگوں کولڑنے کی اجازت دی گئی ہے جن سے لڑائی کی گئی کیونکہ ان پرظلم کیا گیا اوراللہ یقیناً ان کو غالب کرنیکی پوری قدرت رکھتا ہے۔جولوگ اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے محض اتنی بات پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارارب اللہ ہے اگراللہ تعالیٰ ایک دوسرے کے ہاتھوں لوگوں کا زورنہ گھٹاتارہتا تو نصاریٰ کے خلوت خانے عبادت خانے یہود کے صومعے اوروہ مسجدیں جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے سب منہدم ہو گئے ہوتے۔ بے شک اللہ اس کی مدد کریگا بے شک اللہ قوت اور غلبے والا ہے۔

سورہ۲ آیات ۱۹۰ سے ۱۹۴ تک

وقاتلو ا فی سبیل اللہ الذین یقا تلونکم ولا تعتد وا ان اللہ لا یحب المعتدین ο واقتلو ھم حیث ثقفتو ھم واخرجو ھم من حیث اخرجوکم والفتنۃ اشد من القتل ولا تقاتلو ھم عند المسجد الحرام حتیٰ یقاتلو کم فیہ فان قاتلوکم فاقتلوھم کذلک جزآء الکافرین ο فان انتھو ا فان اللہ غفور رحیم ο وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الذین للہ فان انتھو فلا عدوان الا علی لظالمین ο الشھر الحرام با الشھر الحرام و الحرمت قصاص فمن اعتدی علیکم فاعتد و ا علیہ بمثل ما اعتدی علیکم واتقو اللہ واعلموا ان اللہ مع المتقین ο

ترجمہ۔اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جوتم سے لڑنے لگیں اور حد سے تجاوز نہ کرو۔واقعی اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔اوران کوقتل کرو جہاں ان کو پاؤاوران کونکال باہرکرو جہاں سے انہوں نے تم کونکال باہرکیا ہےاورشرارت قتل سے بھی بڑھ کر ہےاوران کے ساتھ مسجد حرام کے قریب قتال نہ کرو جب تک وہ لوگ خودتم سے وہاں نہ لڑ پڑیں۔اگر

وہ خود ہی لڑنے لگیں تو تم بھی ان کو قتل کرو ایسے کافروں کی یہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ لوگ باز آجائیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور ان کے ساتھ اس حد تک لڑو کہ فتنہ وشرارت باقی نہ رہے اور دین اللہ ہی کا ہو جائے اور اگر وہ لوگ باز آجائیں تو بے انصافی کرنے والوں کے سوا سختی کسی پر بھی نہیں ہوتی۔ حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینے کے عوض میں اور یہ حرمتیں تو عوض معاوضہ کی چیزیں ہیں پس جو تم پر زیادتی کرے اس پر تم بھی زیادتی کرو۔ جیسی زیادتی اس نے کی ہے۔ اللہ سے ڈرتے رہو کیونکہ اللہ تعالیٰ ڈرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

سورہ ٦٠ آیت ٨:

لاینهكم الله عن الذين لم يقاتلو كم فى الدين ولم يخر جو كم من ديار كم ان تبرو هم و تقسطوا اليهم ان الله يحب المقسطين.

ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ انصاف اور احسان کا برتاؤ کرنے سے نہیں روکتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔

سورہ ۴۔ آیت ۷۴، ۷۵

فليقاتل فى سبيل الله الذين يشرون الحيوة الدنيا بالا خرة ومن يقاتل فى سبيل الله فيقتل او يغلب فسوف نو تيه اجرا عظيما ٥ وما لكم لا تقاتلون فى سبيل الله والمستضعفين من الرجال والنسا والولدان الذين يقولون ربنا ا خر جنا من هذه القرية الظالم اهلها واجعل لنا من لدنك وليا واجعل لنا من لدنك نصيرا ٥

اس شخص کو چاہیے کہ اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑے جو آخرت کے بدلے دنیوی زندگی کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ جو شخص اللہ کی راہ میں لڑے پھر جان سے مارا جائے تو ہم اسے اجر عظیم دیں گے۔ اور تم کو کیا ہوا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان کمزوروں کی خاطر جہاد نہیں کرتے جن میں کچھ مرد ہیں کچھ عورتیں ہیں کچھ بچے ہیں اور جو دعا کر رہے ہیں کہ اے

ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نکال جس کے رہنے والے سخت ظالم ہیں۔اے خدا ہمارے لیے غیب سے کوئی دوست بھیج اور کوئی حامی بھیج۔

سورہ ۹۔آیت ۵:

فاذا انسلخ الا شھر الحرم فاقتلوا المشر کین حیث وجد تموھم وخذ و ھم واحصرو ھم واقعدوا لھم کل مرصد فان تابو و اقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ فخلوا سبیلھم ط ان اللہ غفور رحیم.

ترجمہ۔پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو جہاں پاؤ مارو۔پکڑو۔باندھو اور ان کی گھات میں بیٹھو پھر اگر توبہ کرلیں۔نماز پڑھیں۔زکوۃ دیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔اور اللہ بیشک بہت بخشش کرنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔

سورۃ ۲۵ آیت ۵۲

فلا تطع الکفرین وجاھدھم بہ جھا دا کبیرا.

ترجمہ۔پس کافروں کی خوشی کا کام نہ کرو اور قرآن سے ان کا زور وشور سے مقابلہ کرو۔

جہاں تک عقیدہ جہاد کا تعلق ہے۔احمدیوں کا خیال یہ ہے کہ جس جہاد کو ’’جہاد بالسیف‘‘ کہتے ہیں وہ صرف اپنے اپنے دفاع میں جائز ہے اور مرزا غلام احمد نے اس مسئلہ پر اپنا خیال پیش کرتے ہوئے محض ایک عقیدہ مرتب کرلیا ہے جو قرآن مجید ہی کی متعدد آیات پر مبنی اور براہ راست اسی سے ماخوذ ہے اور مرزا صاحب قرآن مجید کے کسی قاعدے یا کسی ہدایت کو منسوخ وموقوف کرنے کے مدعی نہیں ہیں۔دوسری جماعتوں کا جواب یہ ہے کہ اس معاملے کے متعلق مرزا صاحب نے جن کے الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے۔ان سے صاف ظاہر ہے کہ وہ کسی قرآنی عقیدے کو پیش نہیں کر رہے ہیں بلکہ قرآن کے موجودہ قانون کو منسوخ کررہے ہیں اس سلسلے میں مندرجہ ذیل فقروں کو بطور ثبوت پیش کیا جارہا ہے۔

’’میں ایک حکم لے کر آپ لوگوں کے پاس آیا ہوں وہ یہ ہے کہ اب سے تلوار کے جہاد کا

خاتمہ ہے''

''اب جہاد دین کے لیے حرام ہے''

''مسیح کے آنے کا یہ نشان ہے کہ وہ دین کی لڑائیاں کم کردے گا''

''میں نے جہاد کی ممانعت کے بارے میں نہایت مؤثر تقریریں کیں''

''میں نے جہاد کے خلاف صدہا کتابیں تحریر کر کے عرب اور مصر اور بلاد شام اور افغانستان میں گورنمنٹ کی تائید میں شائع کی''۔

''مسیح موعود کے وقت جہاد کا حکم قطعاً منسوخ کردیا گیا''۔

''اب زمین کے فساد بند ہو گئے''

''اب جو دین کے لیے تلوار اٹھاتا ہے اور غازی نام رکھ کر کافروں کو قتل کرتا ہے وہ خداوند اور اس کے رسول کا نافرمان ہے''۔

''میرے فرقے میں جس کا خدا نے مجھے امام اور رہبر مقرر فرمایا ہے تلوار کا جہاد بالکل نہیں یہ فرقہ اس بات کو قطعاً حرام جانتا ہے کہ دین کے لیے لڑائیاں کی جائیں''۔

''اسلام میں جو جہاد کا مسئلہ ہے میری نگاہ میں اس سے بدتر اسلام کو بدنام کرنے والا اور کوئی مسئلہ نہیں''۔

''مجھے مسیح اور مہدی مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار کرنا ہے''۔

یہ فقرے مرزا صاحب ان کے جانشینوں اور پیروں کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ ان فقروں پر اور اس دعویٰ پر کہ ''میری وحی میں امر بھی ہے اور نہی بھی'' (اربعین نمبر ۴ صفحہ ۷) انحصار کر کے یہ پرزور طریق پر کہا گیا ہے کہ ان میں جو اعلانات کیے گئے ہیں۔ ان سے قرآن مجید کے موجودہ قانون کی ترمیم یا تنسیخ لازم آتی ہے۔ احمدیوں کی طرف سے اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ الفاظ وتصریحات استعمال کی گئی ہیں۔ ان میں تنسیخ کا مفہوم نہیں بلکہ قرآن مجید کے ایک عقیدے کی تعبیر وتوجیہہ ہے جو صدیوں سے غلط فہمی کا شکار بنا رہا ہے اور بہرکیف ان الفاظ کی تعبیر دوسرے لوگ کچھ بھی کریں، احمدیوں نے اس کا مطلب ہمیشہ یہی سمجھا ہے کہ ان میں کوئی نیا عقیدہ رائج نہیں کیا گیا بلکہ

اسی اصلی اور ابتدائی عقیدے کا اعادہ ہے جو قرآن مجید میں موجود ہے اور مرزا غلام احمد نے صرف پرانے عقیدے کی پاکیزگی کو میل کچیل سے پاک کر دیا ہے۔ جماعت احمدیہ نے اس سلسلے میں ''یضع الحرب'' کی حدیث بھی پیش کی ہے اور کہا ہے کہ مرزا صاحب نے اپنی تحریرات میں کسی قانون کو منسوخ نہیں کیا بلکہ اس حدیث کے مطابق صرف قتال کو معطل کر دیا ہے یہ نکتہ بے حد اہم ہے کیونکہ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ مرزا صاحب کا مقصد ان خیالات کے اظہار سے یہ ہے کہ قرآن مجید کے اصلی عقیدے کو منسوخ کر کے یا جزوی طور پر ترمیم کر کے ایک نیا عقیدہ قائم کریں اور ان کے پیرو یہی سمجھیں کہ انہوں نے یہ نیا عقیدہ قائم کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مرزا صاحب کا دعویٰ نبوت ''تشریعی نبی'' کی حیثیت سے ہے اور اس اعتبار سے یہ دعویٰ ''آیہ خاتم النبین'' کی اس تفسیر کے بھی منافی ہوگا جو خود احمدی کرتے ہیں۔ اور اگر اس عقیدے کی تاویل وحی یا الہام پر مبنی ہے اس سے اور بھی زیادہ یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ غیر احمدی جماعتیں اس دلیل کو اور بھی آگے بڑھا کر یہ کہتی ہیں کہ اگر ان تحریروں میں ظاہر کردہ خیال محض اصلی اور ابتدائی عقیدے کے اثبات و تائید ہی پر مشتمل ہے، جب بھی مرزا صاحبؑ کی حیثیت تشریعی نبی کی ٹھہرتی ہے کیونکہ اگر اثبات کرنے والا حق تاویل کے بجائے حق اعلان و اثبات کا دعویٰ کرے تو اصولاً اثباتی تشریع بھی بجائے خود اصلی عقیدے کی تشریع کے برابر ہے۔

احمدی ان تحریروں کی صحیح اہمیت واضح کرنے کی کوشش میں قرآن مجید کی ان متعلقہ آیات کو پیش کرتے ہیں جو ہم نے اوپر نقل کی ہیں اور اس عام رائے کی صحت پر اعتراض کرتے ہیں کہ ''آیت السیف'' نے (نویں سورت کی پانچویں آیت جو مدنی ہے) ان مکی آیات کو منسوخ کر دیا ہے جن میں حفظ و دفاع کی غرض سے یا ان مومنین کو ظلم سے نجات دلانے کے لیے جنگ و قتال کا ذکر کیا گیا ہے جو عرب کے اس حصے میں آباد تھے جو کفار کے زیر اثر تھا۔ کہا گیا ہے یہ امر احمدیوں کے بنیادی عقیدوں میں شامل ہے کہ قرآن مجید کی کوئی آیت کسی بھی مکی آیات کی وجہ سے منسوخ نہیں کی گئی اور ان کا دعویٰ ہے کہ ''آیت بالسیف'' کسی اعتبار سے بھی مکی آیات کے منافی یا غیر مطابق نہیں ہے وہ ناسخ و منسوخ کے پورے نظریے کی تردید کرتے ہیں اور انہوں نے مندرجہ ذیل دو آیتوں کی (جن کا تعلق اس

نظریے سے ہے) دوسری وجوہ کی بنا پر صراحت و وضاحت کی کوشش کی ہے:۔

سورہ۲۔آیت۱۰۶

ما ننسخ من آیة او ننسها نات بخیر منها او مثلها الم تعلم ان الله علی کل شی قدیر.

ترجمہ۔ہم کسی آیت کا حکم موقوف کر دیتے ہیں یا اس کو بھلا دیتے ہیں تو ہم اس سے بہتر یا ویسی ہی آیت بھیج دیتے ہیں کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

سورہ۱۶۔آیت۱۰۱

و اذا بدلنا آیة مکان آیة و الله اعلم بما ینزل قالو انما انت مفتر.

ترجمہ۔اور جب ہم کسی آیت کو دوسری آیت کے بجائے بدلتے ہیں تو گو اللہ تعالیٰ جو حکم بھیجتا ہے اسے خوب جانتا ہے لیکن یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم جھوٹے اور جعلساز ہو۔

ہم نے اس بحث کے نکتے کی تصریح کر دی ہے اب ہم اس موضوع کو یہیں چھوڑتے ہیں لیکن بعد میں دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوں گے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ قرآن مجید کی سیدھی سادی آیات کو اکثر کس طرح غلط سمجھا گیا ہے اور ان کو بعض نہایت چونکا دینے والی عمومی تاویلات کا آلہ بنایا گیا ہے جو تفسیر یا تاویل کے کسی مسلمہ قاعدے کے رو سے حق بجانب نہ تھیں۔

جس بحث کا سلسلہ اوپر بیان کیا گیا ہے اس کے بیج پچاس سال سے زیادہ عرصے پر بکھرے ہوئے ہیں۔عقیدہ ختم نبوت، عیسیٰ ابن مریم کا روز قیامت سے پہلے بجسد عنصری دوبارہ ظہور اور مسئلہ جہاد ان تینوں مسائل کے متعلق اختلافات ایسے تھے کہ علماء کی طرف سے احتجاج اور مرزا صاحب کے خلاف کفر کے فتوؤں کا اجرا بالکل طبعی تھا۔لہٰذا ۱۸۸۲ء میں جونہی مرزا صاحب نے مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ کیا۔ان کے خلاف کفر کے فتوے دیئے جانے لگے اس تحریک میں جہاں بعض ذی علم اور ذی اثر حضرات مثلاً مولانا محمد علی، خواجہ کمال الدین، ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ اور ڈاکٹر محمد حسین کشاں کشاں شامل ہو گئے وہاں دوسرے لوگ غضبناک بھی ہوئے جو اس تحریک کو اصلاً سیاسی تحریک اور مسلمان ممالک و اقوام کے لیے باعث خطرہ سمجھتے تھے۔ڈاکٹر محمد اقبال نے اس کی شدید مذمت کی

اور پروفیسر الیاس برنی نے اس کو استہزا کا نشانہ بنایا۔ بے شمار دیگر حضرات نے اس کے خلاف لکھا اور اب تک مسلسل لکھ رہے ہیں۔ احمدی نشر و اشاعت کی وقعت کو خوب جانتے ہیں چنانچہ ان کی پروپیگنڈا کی مشینری بھی آغاز سے اب تک برابر سرگرم کار رہی۔ اس طرح دونوں طرف سے بے اندازہ لٹریچر فراہم ہو گیا۔

دیگر شکایات والزامات

اسلام کے تمام مذہبی مباحث میں ملحد، مرتد، کافر، زندیق، مشرک، منافق، فاسق، فاجر، مفتری، ملعون، کذاب، شیطان، ابلیس، مردود، شقی کے الفاظ نہایت عام ہیں۔ چنانچہ اس مباحثے کے متعلقہ لٹریچر میں یہ تمام الفاظ استعمال کیے جانے لگے۔ اس کے بعد فریقین نے ایسے الفاظ بھی استعمال کیے جو چنداں اصطلاحی نہ تھے مثلاً ولد الزنا، ولد الحرام خنزیر، طوائفیں، رنڈیاں، کتیاں، شرابی، زانی، بدکار، فریبی، غنڈا، خونی، بے حیا اور بے شمار دیگر الفاظ جن کا ذکر بے حد شرمناک ہے۔ تقسیم کے بعد سے اس نزاع نے محض دشنام طرازی کی ایک مسلسل مہم کی صورت اختیار کر لی ہے جس میں شخصی چال چلن پر نہایت فحش اور بازاری حملے کیے گئے ہیں۔ احرار اس معاملے میں اپنے مخالفین سے ہمیشہ بازی لے گئے ہیں۔

اس قسم کے اختلاف انگریزوں کے لیے نہایت مفید تھے کیونکہ ان کا منشا یہی تھا کہ ان کے محکوم لوگ مذہبی اختلافات میں الجھے رہیں۔ اور جب تک اس قسم کے نزاعات سے قانون و انتظام میں خلل اندازی کا کوئی خطرہ پیدا نہ ہوتا وہ ان کو غنیمت سمجھتے اگر لوگ محض اس جھگڑے میں مصروف رہتے کہ دوسروں کو جنت میں جانے کا حق ہے یا وہ ابدی جہنم کی آگ میں جلنے کے مستحق ہیں اور وہ نہ ایک دوسرے کا سر پھوڑتے نہ اپنے لیے دنیاوی فوائد کا مطالبہ کرتے تو انگریز ان نزاعات کو کامل بے پروائی بلکہ شاید اطمینان سے دیکھتا رہتا لیکن جونہی یہ نزاعات ایک دوسرے کا سر پھوڑنے میں منتج ہوتے وہ فسادیوں کی سرکوبی میں نہایت شدید اور بیدرد بن جاتا۔ مرزا صاحب انگریزی راج کی اس

برکت کی بے حد قدر کرتے تھے جو نہ صرف ان نزاعات کی اجازت دیتا تھا بلکہ ان کی ہمت افزائی کرتا تھا اور غیر احمدیوں کو تحریک احمدیہ کے بانی اور اس کے لیڈروں کے خلاف جو بڑی بڑی شکایات تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ انگریزوں کے ذلیل خوشامدی ہیں۔

''جہاد'' کے متعلق مرزا صاحب کی تصنیف سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ کتاب ان واقعات کے پیش نظر لکھی تھی جو سرحد پر رونما ہو رہے تھے اور جن میں متعدد انگریز افسر قتل کر دیئے گئے تھے ہر انگریز افسر کو جو ہندوستان میں آتا تھا ہدایت کی جاتی تھی کہ 'غازی' کی طرف سے ہوشیار رہے یعنی اس مذہبی دیوانے افغان یا قبائلی سے جو کسی کافر کو قتل کرنا کار ثواب سمجھتا تھا۔ یہ فعل اس کے لیے مالی نفع کا موجب بھی ہوتا تھا اور خدا کے ہاں بھی اس کا اجر مسلم تھا۔ اگر اس قسم کے حملے مذہبی تعصب کا نتیجہ تھے تو ان کا ارتکاب یقیناً اسلام کے عقیدہ جہاد کے منافی تھا اور مرزا صاحب نے اس عقیدے کی جو تردید کی وہ مستحسن تھی لیکن جب انھوں نے عقیدہ جہاد کی تاویل میں ''مہربانی انگریزی حکومت'' اور اس کی مذہبی رواداری کی تعریف نہایت خوشامدانہ لہجے میں کرنی شروع کی تو اس تاویل پر چند در چند شبہات پیدا ہونے لگے۔ پھر جب مرزا صاحب نے ممالک اسلامی کی عدم رواداری اور انگریزوں کو فراخ دلانہ مذہبی پالیسی کا مقابلہ و موازنہ توہین آمیز انداز میں کیا تو مسلمانوں کا غیظ و غضب اور بھی زیادہ مشتعل ہو گیا۔ احمدی جانتے تھے کہ ان کے عقائد دوسرے مسلم ممالک میں اشاعت ارتداد پر محمول کیے جائیں گے اور ان کا یہ خیال اس وقت اور بھی پختہ ہو گیا ہو گا جب افغانستان میں عبدالطیف (احمدی) کو سنگسار کیا گیا۔ جب پہلی جنگ عظیم میں (جس میں ترکوں کو شکست ہوگئی تھی) بغداد پر ۱۹۱۸ء میں انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور قادیان میں اس ''فتح'' پر جشن مسرت منایا گیا تو مسلمانوں میں شدید برہمی پیدا ہوئی اور احمدی انگریزوں کے پٹھو سمجھے جانے لگے۔

جب تقسیم ملک سے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کا دھندلا سا امکان افق پر نظر آنے لگا تو احمدی آنے والے واقعات کے متعلق متفکر ہونے لگے۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء کے آغاز تک ان کی بعض تحریروں سے یہ منکشف ہوتا ہے کہ انہیں پہلے انگریزوں کا جانشین بننے کی توقع تھی لیکن جب پاکستان کا دھندلا سا خواب مستقبل کی ایک حقیقت کا روپ اختیار کرنے لگا تو ان کو یہ امر کسی قدر دشوار

معلوم ہوا کہ ایک نئی مملکت کے تصور کو مستقل طور پر گوارا کر لیں انہوں نے اس وقت اپنے آپ کو عجیب گومگو کی حالت میں پایا ہوگا کیونکہ نہ تو وہ بھارت کی غیر مذہبی ہندو مملکت کو اپنے لیے چن سکتے تھے نہ پاکستان کو پسند کر سکتے تھے جس میں فرقہ بازی کے روا رکھے جانے کی کوئی توقع نہ تھی۔ ان کی بعض تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تقسیم کے مخالف تھے کہتے تھے کہ اگر ملک تقسیم بھی ہو گیا تو وہ اسے دوبارہ متحد کرنے کی کوشش کریں گے اس کی وجہ واضح طور پر یہ تھی کہ احمدیت کے مرکز قادیان کا مستقبل بالکل غیر یقینی نظر آ رہا تھا جس کے متعلق مرزا صاحب بہت سی پیشگوئیاں کر چکے تھے۔

مشروط تقسیم کے ماتحت قادیان پاکستان میں شامل کیا گیا تھا لیکن ضلع گورداسپور میں (جہاں قادیان واقع ہے) مسلمان صرف ایک فیصد کی اکثریت میں تھے اور اس ضلع کی مسلمان آبادی زیادہ تر تین شہروں میں جمع تھی جن میں ایک قادیان تھا۔ لہٰذا قادیان کے آخری شمول کے متعلق اندیشے محسوس کیے جانے لگے اور چونکہ احمدی اس کو ہندوستان میں شامل کرنے کا مطالبہ کر سکتے تھے۔ لہٰذا ان کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ باقی نہ رہا تھا کہ اس کو پاکستان میں شامل کرانے کے لیے جدوجہد کریں۔ احمدیوں کے خلاف معاندانہ اور بے بنیاد الزامات لگائے گئے ہیں کہ باؤنڈری کمیشن کے فیصلے میں ضلع گورداسپور اس لیے ہندوستان میں شامل کر دیا گیا کہ احمدیوں نے ایک خاص رویہ اختیار کیا اور چودھری ظفر اللہ خان نے جنھیں قائداعظم نے اس کمیشن کے سامنے مسلم لیگ کا کیس پیش کرنے پر مامور کیا تھا خاص قسم کے دلائل پیش کیے لیکن عدالت ہذا کا صدر جو اس کمیشن کا ممبر تھا اس بہادرانہ جدوجہد پر تشکر امتنان کا اظہار کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے جو چودھری ظفر اللہ خان نے گورداسپور کے معاملے میں کی تھی۔ یہ حقیقت باؤنڈری کمیشن کے حکام کا غذات میں ظاہر و باہر ہے اور جس شخص کو اس مسئلے سے دلچسپی ہو وہ شوق سے اس ریکارڈ کا معائنہ کر سکتا ہے چودھری ظفر اللہ خان نے مسلمانوں کے لیے نہایت بے غرضانہ خدمات انجام دیں۔ ان کے باوجود بعض جماعتوں نے عدالتی تحقیقات میں ان کا ذکر جس انداز میں کیا ہے وہ شرمناک ناشکرے پن کا ثبوت ہے۔

احمدیوں کے خلاف دوسری شکایت جو ہمارے سامنے تفصیل سے پیش کی گئی ہے یہ ہے کہ مرزا غلام احمد نے دوسرے انبیا کے مقابلے میں جن میں ہمارے رسول پاک صلعم بھی شامل ہیں اپنا

ذکر مبالغہ آمیز انداز سے کیا ہے اور احمدی اپنے بعض اشخاص کے متعلق امیر المومنین ام المومنین سیدۃ النسا، رضی اللہ عنہ، صحابہ کرام جیسی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں جو نبی کریم کے اہل بیت یا ان کے حلقہ احباب سے مخصوص طور منسوب ہونے کی وجہ سے خاص تقدس و احترام کی سرمایہ دار بن چکی ہیں۔ مسٹر عبدالرحمان خادم نے جنھوں نے کتب قدیمہ کی تلاش و تجسس میں بڑی محنت کی ہے اس کا جواب یہ دیا کہ ان القاب میں سے اکثر بعض اولیا کے خاندانوں میں بھی استعمال کیے جا چکے ہیں جن میں احراری لیڈر صاحبزادہ فیض الحسن کا خاندان بھی شامل ہے اور دوسرے فرقوں کے لیڈروں اور پیروں کے لیے بھی یہ القاب استعمال کیے گئے ہیں۔ جن میں ایک اور احراری لیڈر چودھری افضل حق بھی ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا ہمارا کام نہیں کہ آیا القاب کا استعمال جائز تھا یا ناجائز لیکن اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمانوں کے جذبات ان القاب کے استعمال سے ضرور متاثر ہوتے ہیں جو خاص اور محدود شخصیتوں کے لیے استعمال ہونے کی وجہ سے مقدس قرار پا چکے ہیں اور ان کے ساتھ تاریخ اسلام کی بعض بلند شخصیتوں کی یاد وابستہ ہے۔ احمدی لٹریچر میں رسول پاک کے خاندان کی بعض خواتین کے متعلق جو حوالے پائے جاتے ہیں ان کے متعلق بھی ہمارا یہی خیال ہے گو اس شکایت کی ایک نظیر ''قلائد الجواہر'' میں بھی پائی جاتی ہے اور وہ شاید زیادہ متبذل ہے اس میں شک نہیں کہ رسول پاک صلعم اور کسی دوسرے زندہ یا مردہ شخص کے درمیان مقابلہ و موازنہ ہر مومن کے لیے دل آزاری کا موجب ہے۔ احمدی افسروں اور عہدہ داروں کے متعلق صدر مقام کو اس اطلاع کا موصول ہونا بھی ثابت ہو چکا ہے کہ انہوں نے بعض لوگوں کو احمدی فرقے میں داخل کیا لیکن مرکزی حکومت کے سرکاری اعلان مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۵۲ء کے امام جماعت احمدیہ نے ایک ہدایت نامہ جاری کر کے ان تبلیغی سرگرمیوں کو روک دیا تھا۔

یہاں اس مضمون کا ذکر ضروری ہے جو ''الفضل'' مورخہ ۱۵ جولائی ۱۹۵۲ء میں ''خونی ملا کے آخری دن'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس کی طرف جماعت اسلامی مجلس عمل اور مجلس احرار نے خاص طور پر توجہ دلائی ہے اور اس کو اس دعوے کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ احمدی لٹریچر اشتعال انگیز ہے اس مضمون سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ پروردگار عالم پاکستان کی نئی مملکت کو اس غرض سے وجود

میں لایا ہے کہ مُلا کو ختم کر دے اس تحریر میں مُلا کو نہایت سخت الفاظ میں برا بھلا کہا گیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ زمانہ ماضی کی بہت سی مسلمان مملکتوں کے زوال کی ذمہ داری مُلا پر عائد ہوتی ہے اس مضمون میں تین احمدیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو افغانستان میں مار ڈالے گئے تھے یعنی امیر عبدالرحمٰن خان کے زمانے میں ایک شخص عبدالرحمٰن خان۔ امیر حبیب اللہ خان کے عہد حکومت میں صاحبزادہ عبدالطیف (جو سنگسار کیا گیا تھا) اور امیر امان اللہ خان کے عہد میں نعمت اللہ اور اس کے ساتھ ہی بتایا گیا ہے کہ ان تینوں امیروں کا کیا حشر ہوا اور بیان کیا گیا ہے کہ مُلا زدہ افغانستان کے مقابلے میں مملکت پاکستان وجود میں آئی ہے جو زیادہ روادار ہے۔

قائداعظم کی اس پالیسی کا حوالہ دے کر کہ تمام مسلمانوں کو مل کر متحدہ محاذ پیش کرنا چاہیے۔ کہا گیا ہے کہ اس سے عطا اللہ شاہ بخاری، مُلاّ بدایونی، ملا احتشام الحق، مُلا مودودی اور مُلا محمد شفیع جیسے ملاؤں کا انجام ظاہر ہے۔ یہ مضمون قطعی طور پر اشتعال انگیز ہے اس میں مولانا احتشام الحق اور مولانا محمد شفیع جیسے علما کا ذکر تحقیر آمیز پیرائے میں کیا گیا ہے۔ جو دستور ساز اسمبلی کے ملحقہ تعلیمات اسلامی بورڈ کے ممبر ہیں۔ اور اسی طرح مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تضحیک کی گئی ہے جن کا دینیات میں تبحر سب کے نزدیک مسلم ہے۔ اس مضمون سے نہ صرف ان علما کی جو اس میں مذکور ہیں بلکہ یقیناً علما کے پورے گروہ کی دل آزاری ہوئی ہوگی۔ لیکن اس مضمون کے متعلق ایک بات قابل ذکر ہے کہ یہ اس وقت لکھا گیا ہے جب آل مسلم پارٹیز کنونشن (کراچی) اور آل مسلم پارٹیز کنونشن (لاہور) اپنی مجلس عمل مرتب کر چکی تھیں۔ ان میں پانچ مذکورہ بالا علما شامل تھے اور احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دلانے کی مہم کا آغاز کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا یہ مضمون جذبہء انتقام کے ماتحت لکھا گیا تھا۔ بہر کیف اس سے ظاہر ہے کہ کس طرح ایک جماعت کے حملے کا جواب دوسری جماعت کی طرف سے دیا جارہا تھا اور صورت حال بد سے بدتر ہوتی چلی جارہی تھی۔

احمدی ایک متحدہ منظّم جماعت ہیں۔ ان کا صدر مقام ایک خالص احمدی قصبے میں واقع ہے۔ جہاں ایک مرکزی تنظیم قائم ہے جس کے مختلف شعبے ہیں مثلاً شعبہ امور خارجہ، شعبہ امور داخلہ، شعبہ امور عامہ اور شعبہ نشر و اشاعت یعنی وہ شعبے جو ایک باقاعدہ سیکرٹریٹ کی تنظیم میں ہوتے ہیں وہ

سب یہاں موجود ہیں۔ ان کے پاس رضا کاروں کا ایک جیش بھی جس کو ''خدام دین'' کہتے ہیں ''فرقان بٹالین'' اسی جیش سے مرکب ہے اور یہ خالص احمدی بٹالین ہے جو کشمیر میں خدمت انجام دے چکی ہے۔ احمدی دوسرے مسلمانوں کے ساتھ یا ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے اور اپنی لڑکیاں انکو نکاح میں نہیں دیتے۔ یہ تمام حقائق شہادت سے ثابت ہو چکے ہیں۔ اور انہی کی بنا پر غیر احمدی جماعتیں اپنے اس مطالبہ کو حق بجانب قرار دیتی ہیں کہ احمدیوں کو ایک علیحدہ قوم قرار دیا جائے۔ احمدی اس تنظیمی بندوبست کو اس بنا پر جائز ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہر جماعت کو جس کے سامنے ایک قطعی مقصد حکمت عملی اور لائحہ عمل موجود ہو، اس کا حق حاصل ہے کہ اپنے معاملات کو اپنے طریقے پر منظم کرے تا کہ بہترین نتائج پیدا ہوں۔ اس الزام کے جواب میں کہ وہ اپنی لڑکیاں غیر احمدیوں کو نہیں دیتے۔ احمدیوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ غیر احمدی کے ساتھ احمدی لڑکی کا نکاح ہمارے نزدیک کالعدم یا ناجائز نہیں ہے۔ لیکن لڑکی کے مفاد کے پیش نظر اس کے والدین کو یہی مشورہ دیا جاتا ہے کہ اس کے لیے اپنی جماعت ہی میں شوہر تلاش کریں۔ اس سلسلے میں دوسرے فرقوں اور جماعتوں کی مثالیں دی گئی ہیں جو اسی طریق پر عمل کرتی ہیں۔

مسلمانوں کے پیچھے نماز نہ پڑھنے کے الزام کا جواب بھی یہی دیا جاتا ہے کہ دوسرے فرقے بھی اس امتیاز پر عامل ہیں یہ مثال نمایاں طور سے پیش کی گئی ہے کہ چودھری ظفر اللہ خان قائداعظم کے جنازہ میں شامل نہ ہوئے۔ لیکن چودھری ظفر اللہ خان کا جواب یہ ہے کہ نماز جنازہ کے امام مولانا شبیر احمد عثمانی احمدیوں کو کافر، مرتد اور واجب القتل قرار دے چکے تھے۔ اس لیے میں اس جنازہ میں شریک ہونے کا فیصلہ نہ کر سکا۔ جس کی امامت مولانا کر رہے تھے۔ نمازہ جنازہ کے متعلق احمدیوں نے ہمارے سامنے بالآخر یہ موقف اختیار کیا کہ مرزا غلام احمد کا ایک فتویٰ حال ہی میں دستیاب ہوا ہے جس میں انہوں نے احمدیوں کو اجازت دی ہے کہ وہ ان مسلمانوں کی نمازہ جنازہ میں شریک ہو سکتے ہیں جو مرزا صاحب کے مکذب اور مکفر نہ ہوں۔ لیکن اس کے بعد بھی معاملہ وہیں کا وہیں رہتا ہے کیونکہ اس فتوی کا ضروری مفہوم یہی ہے کہ اس مرحوم کی نمازہ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی جو مرزا صاحب کو نہ مانتا ہو لہٰذا اس اعتبار سے یہ فتوی موجودہ طرز عمل ہی کی تائید و تصدیق کرتا ہے۔

اس مسئلے پر کہ آیا احمدی دوسرے مسلمانوں کو ایسا کافر سمجھتے ہیں جو دائرہ اسلام سے خارج ہے۔احمدیوں نے ہمارے سامنے یہ موقف ظاہر کیا ہے کہ ایسے لوگ کافر نہیں ہیں اور لفظ ''کفر'' جو احمدی لٹریچر میں ایسے اشخاص کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔اس سے کفرِ خفی یا انکار مقصود ہے یہ ہرگز کبھی مقصود نہیں ہوا کہ ایسے اشخاص دائرہ اسلام سے خارج ہیں لیکن ہم نے اس موضوع پر احمدیوں کے بے شمار سابقہ اعلانات دیکھے ہیں اور ہمارے نزدیک ان کی کوئی تعبیر اس کے سوا ممکن نہیں کہ مرزا غلام احمد کے نہ ماننے والے دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔اب یہ کہا جا رہا ہے کہ مسلمان جو رسول پاک صلعم کے بعد کسی مامور من اللہ کے دعوے کو قبول نہیں کرتے چونکہ وہ اللہ اور رسول کے منکر نہیں ہیں لہٰذا ''امت'' میں شامل ہیں یہ قول کسی اعتبار سے بھی اس سابقہ اعلان سے غیر مطابق نہیں کہ دوسرے مسلمان کافر ہیں دراصل ان الفاظ سے اس سابقہ عقیدے کی بالواسطہ تصدیق ہوتی ہے کہ ایسے اشخاص صرف ان معنوں میں مسلمان ہیں کہ وہ رسول کی امت سے تعلق رکھتے ہیں اور اس حیثیت سے مسلم معاشرے کے ممبر کہلانے کے حقدار ہیں۔یہ موقف اس قول سے بالکل مختلف ہے کہ وہ مسلمان ہیں اور کافر نہیں ہیں۔

آخری شکایت احمدیوں کے خلاف یہ ہے کہ وہ احمدیہ عقائد کی تبلیغ کے لیے جارحانہ پروپیگنڈا کرتے ہیں۔اس شکایت کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ چودھری ظفر اللہ خان نے ۱۸ مئی ۱۹۵۲ء کو جہانگیر پارک کراچی میں تقریر کی۔احمدی افسر عام جلسوں کی کھلم کھلا صدارت کرتے اور تحریک کی حمایت میں تقریر کرتے ہیں اور جن لوگوں کا ان سے سرکاری طور پر سابقہ پڑتا ہے ان کو احمدی بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔اس امر پر شدید اعتراض کیا گیا ہے کہ سرکاری افسر اور اہلکار مقامی انجمنوں کے عہدہ دار بن جاتے ہیں۔اس سلسلے میں مرزا بشیر الدین محمود احمد کی کوئٹہ والی تقریر پیش کی گئی ہے جو ''الفضل'' مورخہ ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئی تھی اور جس میں انہوں نے اپنی جماعت سے اپیل کی تھی کہ بلوچستان میں اپنے پروپیگنڈا کو تیز کر دیں تاکہ یہ صوبہ آئندہ سرگرمیوں کا مرکز بن جائے۔اس کے علاوہ ان کا وہ خطبہ پیش کیا گیا جو ۱۹۵۱ء کے کرسمس میں انہوں نے صدر انجمن احمدیہ ربوہ کے سالانہ اجلاس میں دیا تھا اور جو ''الفضل'' مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۵۲ء میں شائع کیا گیا تھا۔اس

خطبہ میں انہوں نے اپنے پیرووں سے پر جوش اپیل کی تھی کہ اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو تیز تر کر دیں تا کہ جولوگ اب تک منکر ہو رہے ہیں وہ ۱۹۵۲ء کے آخر تک احمدیت کی آغوش میں آجائیں ۔ایک اور خطبے کا ذکر بھی کیا گیا ہے جو ''الفضل'' مورخہ ۱۱ جنوری ۱۹۵۲ء میں شائع کیا گیا تھا اور جس میں احمدیوں کو ترغیب دی گئی تھی کہ صرف ایک محکمے یعنی فوج ہی میں جمع نہ ہو جائیں بلکہ تمام دوسرے محکموں میں بھی پھیل جائیں ۔اس کے علاوہ بہت سی رپورٹوں کا حوالہ بھی دیا گیا ہے جو احمدی سرکاری افسروں اور اہلکاروں نے اپنی تبلیغ کے نتائج کے متعلق صدر مقام کو بھیجیں۔

احمدیوں کا پروپیگنڈا صرف پاکستان تک محدود نہیں اور ''الفضل'' کی بعض شائع کردہ رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے ملکوں میں جو احمدی مقرر ہیں ان کی تبلیغ پر بھی بعض اوقات مار پیٹ اور بدنظمی رونما ہوگئی اسی قسم کا ایک واقعہ اوکاڑہ میں بھی پیش آیا تھا۔ وہاں ایک احمدی ڈپٹی کمشنر کے عہد میں بعض احمدی مبلغین غیر احمدیوں کے دیہات میں گئے اور وہاں ان سے بدسلوکی کی گئی نتیجہ یہ ہوا کہ اس بدسلوکی کے سلسلے میں گرفتاریاں ہوئیں پھر ان گرفتاریوں کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس میں بعض مقررین نے تقریریں کیں اور ان تقریروں کو سن کر ایک نوجوان نے ایک احمدی مدرس کو قتل کر دیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اس شدید اور جارحانہ پروپیگنڈا سے مسلمانوں کے جذبات مذہبی کو صدمہ پہنچا اور اسی وجہ سے یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے بحث کے دوران میں احمدی لیڈروں کی بعض دوسری تحریرات کا ذکر بھی کیا گیا ہے جن میں مسلمانوں کو لفظ ''دشمن'' سے موسوم کیا گیا تھا یا ان کے لیے صرف ''مسلمان'' کا لفظ استعمال کیا گیا تھا تا کہ احمدیوں سے ممیّز کیا جا سکے۔

مطالبات کی پشت پر نظریہ

مسلمانوں اور احمدیوں کے عقائدی اختلافات اور احمدیوں کی سرگرمیوں کے متعلق اس بیان کی ترتیب کے بعد ہم ان وجوہ کے سمجھنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ جن کی بنا پر تین مطالبات پیش کیے گئے۔ ہم اس سے پیشتر لکھ چکے ہیں کہ قریب قریب تمام علماء اس امر پر متفق ہیں کہ تین مطالبات میں سے ہر مطالبہ اسلام کے اس تصور پر مبنی ہے جو ان کے نزدیک صحیح ہے۔ مولانا داؤد غزنوی، ماسٹر تاج الدین انصاری، سید مظفر علی شمسی اور بعض دوسرے اشخاص نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ یہ مطالبات اس قرارداد مقاصد کا قدرتی نتیجہ تھے جو ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں طویل اور پر جوش بحث کے بعد منظور ہوئی تھی۔ تحقیقات کے دوران میں شروع سے آخر تک ہر شخص کے نزدیک یہ بات مسلم تھی کہ یہ مطالبات اسی نظریے کی پیداوار ہیں جس کے بل پر پاکستان میں ایک اسلامی مملکت کے قیام کا دعویٰ اور بعض حلقوں کی طرف سے وعدہ کیا گیا تھا۔ مطالبات کی معقولیت یا عدم معقولیت کا اندازہ کرنے کے لیے اس نکتے کو واضح طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ اسلامی مملکت میں (یا اسلام میں کیونکہ دونوں ایک ہی چیز ہیں) مسلم رعایا اور غیر مسلم رعایا کے حقوق کے درمیان بنیادی فرق و امتیاز ہے اور ایک فرق کا ذکر تو ابھی کیا جا سکتا ہے کہ غیر مسلموں کو نظم و نسق حکومت کے اونچے دائروں میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ لہٰذا اگر احمدی مسلمان نہیں بلکہ کافر ہیں تو وہ مملکت کے کسی بڑے عہدے پر فائز نہیں ہو سکتے۔ اس لیے یہ لازم آتا ہے کہ دو مطالبوں کے مطابق چودھری ظفر اللہ خان اور دوسرے احمدیوں کو جو مملکت کے کلیدی عہدوں پر قابض ہیں موقوف کر دیا جائے اور تیسرے مطالبہ میں احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مقصد بھی یہی ہے کہ آئندہ کسی احمدی کو مملکت میں کوئی ایسا مقام حاصل نہ ہو سکے چونکہ یہ مسئلہ جس کو مطالبات نے بلاواسطہ پیدا کیا ہے، بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور پاکستان کے مستقبل کے لیے انتہائی درجے کا اہم ہے اس لیے ہم نے علما کی امداد سے ''مملکت اسلامی'' کے تصور اور اس کے متعلقات پر گہری نظر ڈالی ہے۔ اور اب ہم اسی کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔

مملکت اسلامی

ہمارے سامنے یہ بار بار کہا گیا ہے کہ پاکستان کے مطالبے میں ''مملکت اسلامی'' کا مطالبہ قطعاً شامل تھا۔ پاکستان کے لیے جدوجہد کرنیوالے اہم لیڈروں کی بعض تقریروں سے بلا شبہ یہی مطلب اخذ کیا جا سکتا ہے۔ یہ لیڈر جب مملکت اسلامی کا یا کسی ایسی مملکت کا نام لیتے تھے جس پر قوانین اسلامی کی حکومت ہوگی تو شاید ان کے ذہن میں کسی ایسے قانونی نظام کا تصور ہوگا جو اسلامی عقائد، اسلامی قانون شخصی، اسلامی اخلاقیات اور اسلامی ادارت پر مبنی ہو یا ان سے مخلوط ہو۔ جس شخص نے بھی پاکستان میں ایک مذہبی مملکت کے قیام پر سنجیدگی سے غور کیا ہے اسے ان عظیم مشکلات کا ضرور احساس ہوا ہے جو کسی ایسی سکیم میں لازماً پیش آئیں گی یہاں تک کہ ڈاکٹر محمد اقبال نے بھی جو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک متحدہ مملکت کا تصور قائم کرنے والے اولین مفکر سمجھے جاتے ہیں۔ اپنے خطبہ صدارت (مسلم لیگ ۱۹۳۰ء) میں فرمایا۔

''ہندوؤں کو کسی قسم کا اندیشہ نہ ہونا چاہیے کہ خود اختیار مسلم مملکتوں کی تخلیق کا مطلب یہ ہوگا کہ ایسی مملکتوں میں کوئی مذہبی قسم کی حکومت قائم ہوگی یہ اصول کہ ہر گروہ کو اپنے خطوط پر آزادانہ ترقی کرنے کا حق ہونا چاہیے ہرگز کسی تنگ نظرانہ فرقہ پرستی کی پیداوار نہیں ہو سکتا''۔

جب ہم ذمہ داری کے مسئلے پر توجہ کرینگے تو ہم یہ ضرور بتائیں گے کہ جو جماعتیں آج تینوں مطالبات کو مذہبی وجوہ کی بنا پر نافذ کرنے کے لیے تقاضا کر رہی ہیں۔ ان میں سے اکثر خود اسلامی مملکت کے تصور کی مخالف ہیں۔ حتیٰ کہ جماعت اسلامی کے امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا خیال بھی یہی ہے کہ اگر کبھی نئی مسلم مملکت وجود میں آ گئی تو اس میں حکومت کی ہیت صرف (غیر مذہبی) ہی ہو سکتی ہے تقسیم سے پہلے قائداعظم نے پاکستان کی جو پہلی تصویر دنیا کے سامنے پیش کی وہ اس انٹرویو میں ظاہر ہوئی تھی جو انہوں نے رائٹر کے نامہ نگار مسٹر ڈون کیمبل کو دیا تھا۔ قائداعظم نے فرمایا کہ نئی مملکت ایک عصری جمہوری مملکت (ماڈرن ڈیموکریٹک سٹیٹ) ہوگی جس میں حاکمیت کے حامل

جمہور ہوں گے اور اس نئی قوم کے تمام افراد کے حقوق شہریت بلا امتیاز مذہب ونسل وعقیدہ مساوی ہوں گے۔ جب پاکستان رسمی طور سے نقشہ عالم پر نمودار ہو گیا تو قائداعظم نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں ایک یادگار تقریر کی جس میں نئی مملکت کے بیانی اصولوں کی تصریح کرتے ہوئے فرمایا۔

''اس کے باوجود اس تقسیم میں ان اقلیتوں کے مسئلے سے دامن بچانا ناممکن ہے جو ایک ڈومینن یا دوسری میں رہ جائیں گی۔ یہ بات بالکل ناگزیر تھی اس کے سوا کوئی دوسرا حل نہیں اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کہ ہم باشندوں کی خصوصاً عوام اور غربا کی فلاح و بہبود پر اپنی تمام کوششیں مرتکز کر دیں۔ اگر تم باہم تعاون سے کامیاب کرو گے ماضی کو بھول جاؤ گے اور مخالفتوں کو ترک کر دو گے تو تم لازماً کامیاب ہو جاؤ گے۔ اگر تم اپنے ماضی کو بدل دو گے۔ اور اس سپرٹ میں متحد ہو کر کام کرو گے کہ تم میں سے ہر ایک خواہ وہ کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو خواہ ماضی میں اس کے تعلقات تمہارے ساتھ کیسے ہی رہے ہوں خواہ اس کا رنگ اس کی ذات اور اس کا عقیدہ کچھ بھی ہو اول، دوم اور آخر اس مملکت کا شہری ہے جس کے حقوق و فرائض بالکل مساوی ہیں تو تمہارے عروج و ترقی کی کوئی انتہا نہ ہو گی۔

میں اس معاملے پر انتہائی زور دینا چاہتا ہوں ہمیں اس سپرٹ میں کام شروع کر دینا چاہیے کچھ مدت میں اکثریت اور اقلیت اور ہندو قوم اور مسلم قوم کی یہ تمام بدنمائیاں غائب ہو جائیں گی کیونکہ آخر مسلمان ہونے کی حیثیت میں بھی تمہارے ہاں پٹھان، پنجابی، شیعہ، سنی وغیرہ موجود ہیں اور ہندوؤں میں بھی برہمن، ویشنو، کھتری اور بنگالی، مدارسی وغیرہ ہیں۔ اگر مجھ سے پوچھو تو میں یہ کہوں گا کہ یہ چیز ہندوستان کی آزادی وخودمختاری کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ رہی ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہم مدتوں پہلے آزاد ہو چکے ہوتے۔ دنیا کی کوئی طاقت کسی قوم کو خصوصاً چالیس کروڑ نفوس کی قوم کو اپنا محکوم نہیں رکھ سکتی۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو کوئی تم کو مفتوح نہ کر سکتا اور اگر کر بھی لیتا تو زیادہ مدت تک تم پر اپنا تسلط قائم نہ رکھ سکتا (چیرز) لہٰذا اس سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہیے تم آزاد ہو اس

مملکت پاکستان میں تم اپنے مندروں میں آزادانہ جا سکتے ہو اور مساجد اور دوسری عبادت گاہوں میں بھی جانے میں بھی آزاد ہو۔ تمہارا مذہب، تمہاری ذات تمہارا عقیدہ کچھ بھی ہو کاروبار مملکت کا اس سے کوئی تعلق نہیں (ہیئر ہیئر) تم جانتے ہو تاریخ شاہد ہے کہ کچھ مدت پیشتر انگلستان کے حالات آج کل کے ہندوستان کے حالات سے بدتر تھے، رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ایک دوسرے کو آزار پہنچانے میں مصروف تھے۔ آج بھی بعض ایسی مملکتیں موجود ہیں جن میں ایک خاص طبقے کے خلاف امتیازات اور قیود عائد کی جا رہی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم ایسے ایام میں اپنی مملکت کا آغاز نہیں کر رہے ہیں۔ ہمارا آغاز ایسے ایام میں ہو رہا ہے جب ایک قوم اور دوسری قوم ایک ذات اور مسلک اور دوسری ذات اور مسلک کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہیں رہا۔ ہم اس بنیادی اصول کی بنا پر آغاز کار کر رہے ہیں کہ ہم تم شہری ہیں اور ایک مملکت کے مساوی شہری ہیں (پرزور اظہار مسرت) انگلستان کے لوگوں کو بھی ایک زمانے میں صورتحال کا حقائق کا سامنا کرنا پڑا تھا اور ان ذمہ داریوں اور گرانباریوں سے بھگتنا پڑا تھا جو ان کی حکومت نے ان پر عائد کی تھیں اور وہ اس آگ میں قدم بقدم گزر چکے ہیں آج تم بجا طور سے کہہ سکتے ہو کہ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کا کوئی وجود باقی نہیں۔

آج صرف یہ حقیقت موجود ہے کہ ہر شخص برطانیہ عظمٰی کا شہری ہے ہر شہری کی حیثیت مساوی ہے اور تمام شہری ایک قوم کے افراد ہیں۔

میرے نزدیک اب ہمیں اسی نصب العین کو پیش نظر رکھنا چاہیے پھر تم دیکھو گے کہ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد نہ ہندو ہندو رہیں گے نہ مسلمان مسلمان رہیں گے مذہبی معنوں میں نہیں کیونکہ وہ تو ہر فرد کا ذاتی عقیدہ ہے بلکہ سیاسی معنوں میں سب ایک مملکت کے شہری ہوں گے۔

قائداعظم پاکستان کے بانی تھے اور جس موقع پر انہوں یہ تقریر کی تھی وہ تاریخ پاکستان کا پہلا سنگ میل تھا۔ اس تقریر کے مخاطب اپنی مملکت کے مسلم وغیر مسلم باشندے بھی تھے اور اہل عالم بھی

اوراس کا مقصد یہ تھا کہ جس نصب العین کے حصول کی خاطرنئی مملکت اپنی تمام طاقتوں کو وقف کرنے والی تھی اسی کو حتی الامکان نہایت واضح طور پر معین کر دیا جائے۔اس تقریر میں بار بار ماضی کی تلخیوں کا ذکر کر کے یہ اپیل کی گئی ہے کہ ماضی کو بدل دو اور جنگ و پیکار کو دفن کر دو۔قائداعظم کے نزدیک اس مملکت کے آئندہ شہری کو بلا امتیاز رنگ ونسل اور بلا لحاظ مذہب وملت برابر کے حقوق ورعایات حاصل ہوں گے اوراس پر برابر کے فرائض عائد ہونگے۔اس تقریر میں لفظ ''قوم'' کو بار بار دہرایا گیا ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ مذہب کو کاروبار مملکت سے کوئی تعلق نہیں اور صرف فرد کے ذاتی ایقان و ایمان کا معاملہ ہے۔

ہم نے علما سے سوال کیا کہ آیا مملکت کا یہ تصوران کے نزدیک قابل قبول ہے ان میں سے ہر ایک نے بلا تامل اس کا جواب نفی میں دیا اوران میں احراری اوروہ سابق کانگرسی بھی شامل تھے جو تقسیم سے پہلے اس تصور کو قریب قریب جزو ایمان سمجھتے تھے۔اگر مولانا امین احسن اصلاحی کی شہادت جماعت اسلامی کے نقطہ نگاہ کی صحیح مظہر ہے تو جومملکت اس نصب العین پر مبنی ہو وہ ''ابلیس'' کی مخلوق ہے ان کے اس خیال کی تصدیق جماعت کے بانی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی بے شمار تحریروں سے بھی ہوتی ہے،علما میں سے کوئی بھی ایسی مملکت کو برداشت نہیں کرسکتا جس کی بنیاد قومیت پرستی اوراس کے متعلقات پر ہو۔ان کے نزدیک مملکت کی فعالیت کو متعین کرنے کی اہلیت صرف ''ملت'' اوراس کے متعلقات میں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ قائداعظم نے ایک عصری قومی مملکت کا جو تصور پیش کیا تھا وہ ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو قرارداد مقاصد منظور ہو جانے کے بعد متروک ہو گیا لیکن یہ بھی کھلم کھلا تسلیم کیا جاتا ہے کہ یہ قرارداد اگرچہ الفاظ وفقروں کے اعتبار سے بہت بلند بانگ معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں محض دھوکا ہے اور اس میں نہ صرف مملکت اسلامی کا ہیولیٰ تک شامل نہیں بلکہ اس کی دفعات خصوصاً جو بنیادی حقوق سے متعلق ہیں واضح طور پر مملکت اسلامی کے اصولوں کے منافی ہیں۔

مملکت اسلامی کی بنیاد

اب سوال یہ ہے کہ آخر وہ ''مملکت اسلامی'' کیا چیز ہے جس کے متعلق باتیں تو سب کرتے ہیں اور سوچتا کوئی بھی نہیں پیشتر اس کے کہ ہم اس سوال کا جواب دریافت کرنے کی کوشش کریں ہمیں خود مملکت کے دائرہ و وظائف کا ایک واضح تصور قائم کرنا چاہیے۔

جب علما سے یہ کہا گیا کہ تاریخ اسلام میں سے کسی اسلامی مملکت کی نظیر پیش کریں تو ان کے خیالات و آراء میں باہم اختلاف تھا مثلاً اگر چہ حافظ کفایت حسین (شیعہ عالم) نے صرف اس نظام حکومت کو اپنا نصب العین قرار دیا جو رسول پاک صلعم کے زمانے میں قائم رکھا تھا لیکن مولانا داؤد غزنوی نے اپنے پیش کردہ نظائر میں جمہوریہ اسلامی کا زمانہ عمر بن عبدالعزیز کا عہد خلافت اور صلاح الدین ایوبی دمشقی، سلطان محمود غزنوی، محمد تغلق، اورنگزیب اور موجودہ حکومت عربیہ سعودیہ کی مثالیں بھی شامل کردیں تاہم اکثر علما نے جمہوریہء اسلامی کے نظام حکومت کو پیش کیا جس کی مدت ۶۳۲ء سے ۶۶۱ء تک یعنی تیس سال سے بھی کم تھی اور بعض نے عمر بن عبدالعزیز کے نہایت مختصر عہد کو بھی اس میں شامل کر دیا۔ مولانا عبدالحامد بدایونی نے کہا کہ ایک مثالی مملکت کی تفصیلات علما خود بھی تجویز کریں گے۔ ماسٹر تاج الدین انصاری کے دماغ میں مملکت اسلامی کے متعلق جوژولیدہ تصور تھا وہ ان کی شہادت کے مندرجہ ذیل حصے سے معلوم کیا جاسکتا ہے:۔

سوال۔ کیا آپ تحریک خلافت میں شامل تھے؟

جواب۔ جی ہاں۔

سوال۔ تحریک خلافت ہندوستان میں کب ختم ہوئی تھی؟

جواب۔ ۱۹۲۳ء میں جب ترکوں نے اپنے ملک کو سیکولر سٹیٹ (غیر مذہبی مملکت) قرار دیدیا

سوال۔ اگر آپ سے کہا جائے کہ جب ترکوں نے خلافت کو موقوف کر دیا اس کے بعد

بھی تحریک خلافت طویل مدت تک قائم رہی تو کیا یہ صحیح ہوگا؟

جواب۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ترکوں کی طرف سے خلافت کے موقوف ہوتے ہی تحریک خلافت ختم ہوگئی تھی۔

سوال۔ آپ کے متعلق اطلاع یہ کہ آپ ۱۹۲۸ء تک تحریک خلافت کے ممبر رہے اور تقریریں بھی کرتے رہے کیا یہ صحیح ہے؟

جواب۔ یہ صحیح نہیں ہوسکتا۔

سوال۔ کیا کانگرس کو خلافت سے دلچسپی تھی؟

جواب۔ جی ہاں۔

سوال۔ کیا خلافت آپ کے نزدیک دینی عقیدے پر مبنی تھی یا محض ایک سیاسی تحریک تھی؟

جواب۔ یہ ایک خالص دینی تحریک تھی۔

سوال۔ کیا مسٹر گاندھی تحریک خلافت کے حامی تھے؟

جواب۔ جی ہاں۔

سوال۔ تحریک خلافت کا مدعا کیا تھا؟

جواب۔ انگریز ترکی میں خلافت کے ادارے کو نقصان پہنچا رہا تھا اور مسلمان انگریز کے اس رویے سے رنجیدہ تھے۔

سوال۔ کیا اس تحریک کا مدعا یہ نہ تھا کہ مسلمانوں میں خلافت کا احیا کیا جائے؟

جواب۔ جی نہیں۔

سوال۔ کیا خلافت آپ کے نزدیک مسلم نظام حکومت کا ضروری جزو ہے؟

جواب۔ جی ہاں۔

سوال۔ لہٰذا کیا آپ پاکستان میں خلافت کے قیام کے حامی ہیں۔

جواب۔ جی ہاں۔

سوال۔ کیا مسلمانوں کے ایک سے زیادہ خلیفے بھی ہو سکتے ہیں؟

جواب۔ جی نہیں۔

سوال۔ کیا پاکستان کا خلیفہ تمام مسلمانوں عالم کا خلیفہ ہو گا؟

جواب۔ ہونا تو چاہیے مگر ہو نہیں ہو سکتا۔

سیاسی فکر کا ارتقاء گزشتہ تین ہزار سال کی مدت پر پھیلا ہوا ہے۔ اور اس فکر کو اس کے ابتدائی مرحلوں میں مذہب سے الگ نہیں کیا جا سکتا اس دوران میں دو سوال ہمیشہ غور و فکر کا موضوع رہے ہیں:۔

(۱) مملکت کے معینہ وظائف کیا ہیں؟

(۲) مملکت کا حاکم کون ہو گا؟

اگر مملکت کی سرگرمیوں کا دائرہ فرد کی مادی یا روحانی یا دونوں قسم کی بہبود پر حاوی ہے تو پہلے سوال سے براہ راست دوسرا بڑا سوال پیدا ہوتا ہے کہ حیات انسانی کا مقصد اور انسان کی انتہائی تقدیر کیا ہے۔ اس مسئلے پر مختلف اوقات میں نہیں بلکہ ایک ہی زمانے میں مختلف و متضاد خیالات مروج رہے ہیں۔ استوائی جنوبی افریقہ کے باشتیوں کا اب تک یہ عقیدہ ہے کہ ان کے دیوتا ''کومبا'' نے ان کو جنگل میں شکار کھیلنے اور ناچنے گانے کے لیے بھیجا ہے۔ اپیکورس کے پیروؤں کا یہ قول بھی زیادہ تر یہی مفہوم رکھتا ہے کہ حیات انسانی کا مقصد کھانا پینا اور خوش رہنا ہے۔ کیونکہ موت ان تمام خوشیوں سے محروم کر دیتی ہے۔ افادیت پرستوں نے اپنے ادارات کو اس مفروضے پر مبنی قرار دیا ہے کہ اس زندگی کے بعد جو کچھ بھی ہو اس کا خیال نہ کرو اور انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے ذہنی اور جسمانی لذتیں حاصل کی جائیں۔ رواقیین کا ایمان ہے کہ تمام جسمانی خواہشات کو روکنا اور کم کرنا چاہیے اور دیو جانس کلبی نے زندگی بسر کرنے کے لیے ایک ٹب ہی کو کافی قرار دیا تھا۔ جرمن فلسفیوں کا خیال ہے کہ فرد محض مملکت کے لیے زندہ رہتا ہے لہٰذا مقصد حیات یہ ہے کہ مملکت جن مقاصد کے حصول کا فیصلہ کرے ان میں اس کی خدمت کی جائے۔ قدیم ہندو فلسفی گھونسے کی منطق اور اس کے طبعی نتائج یعنی قانون انتخاب طبعی اور تنازع للبقا پر ایمان رکھتے تھے۔ مملکت کا سامی نظریہ خواہ وہ یہودی ہو،

عیسائی ہو یا اسلامی، ہمیشہ اس امر کا مدعی رہا کہ حیات انسانی کا مقصد آئندہ زندگی کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا ہے۔لہٰذا عبادات الٰہی اور اعمال حسنہ ہی زندگی کے تنہا مقصد ہیں۔۔فلاسفہ یونان جن کی ابتدا اسقراط سے ہوتی ہے مقصد زندگی اس امر کو سمجھتے تھے کہ فلسفیانہ غور وفکر میں مصروف رہیں تا کہ ان عظیم صداقتوں کا انکشاف کر سکیں جو فطرت میں پوشیدہ ہیں اور دوسرے لوگوں کا کام ہے کہ ان فلسفیوں کے خورد ونوش کا انتظام کریں جو اس کام میں مصروف ہیں۔اسلام اس عقیدے پر زور دیتا ہے کہ اانسان کو جو زندگی بخشی گئی ہے وہ صرف اس دنیا کی زندگی نہیں بلکہ ابدی زندگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب موجودہ زندگی ختم ہو جاتی ہے اور اگلے جہان میں انسان کا درجہ اور مرتبہ اس کے ان عقائد واعمال پر منحصر ہے جن پر وہ اس دنیا میں عامل رہا ہے چونکہ موجودہ زندگی بجائے خود مقصود نہیں بلکہ حصول مقصود کا محض ایک ذریعہ ہے اس لیے نہ صرف فرد بلکہ مملکت کو بھی اس سیکولر نظریئے کے خلاف رہنا چاہیے جو تمام سیاسی اور اقتصادی ادارات کو اس امر پر مبنی قرار دیتا ہے کہ آئندہ زندگی پر اس کے اثرات کی کچھ پروانہ کی جائے اور فرد اور مملکت کو ایسے انسانی کردار کے لیے کوشاں رہنا چاہیے جس سے آدمی کو آئندہ زندگی میں بہتر مقام حاصل ہو سکے۔

اس نظریے کے مطابق اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو اس مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے لہٰذا یہ سوال فوراً پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کیا ہے اور مومن یا مسلم کس کو کہتے ہیں ہم نے علما سے یہ سوال کیا اور انہوں نے اس کے جو جوابات دیے ان کا ہم عنقریب تذکرہ کرینگے لیکن ہم یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ ہمیں یہ دیکھ کر بے انتہا افسوس ہوا کہ علما جن کا پہلا فرض اس موضوع پر پختہ آرا کو قائم کرنا تھا مایوس کن حد تک باہم غیر متفق تھے۔ان فاضل علماء نے اپنے خیالات کس انداز ے سے ظاہر کیے اس کو چھوڑ دیجیے اور ہماری بات سنیے ہمارے نزدیک اسلام ایک ایسا نظام ہے جو (ہر منظم مذہب کی مانند) مندرجہ ذیل پانچ موضوعات پر حاوی ہے:۔

(۱) مسلمات یعنی بنیادی عقائد

(۲) عبادات یعنی وہ مذہبی رسوم وعوائد جو انسان کے بجالانے چاہئیں۔

(۳) اخلاقیات یعنی کردار اخلاقی کے ضوابط

(۴) ادارات۔ معاشرتی۔ اقتصادی اور سیاسی

(۵) خالص قانونی یعنی شریعت

ان تمام موضوعات کے متعلق قواعد وضوابط کی لازمی بنیاد الہام پر ہے نہ کہ عقل پر۔ گو یہ دونوں باہم مطابق بھی ہو سکتے ہیں لیکن یہ مطابقت اتفاقی ہوگی کیونکہ عقل انسانی ناقص ہو سکتی ہے اور عقل کا حقیقی قطعی تقاضا صرف اللہ کے علم میں ہے جو انسانوں کی رشد وہدایت کے لیے اپنے برگزیدہ پیغمبروں کی وساطت سے عالم انسانی کو اپنا پیغام بھیجتا ہے۔ اس لیے انسانوں کو چاہیے کہ عقائد کو تسلیم کریں۔ عبادات کی پابندی اختیار کریں۔ تعلیمات اخلاقی پر عمل کریں۔ قانون کی اطاعت کریں اور ان ادارات کو قائم کریں جو اللہ نے الہام فرمائے ہیں خواہ ان کی عقلی مصلحت ظاہر نہ ہو بلکہ خواہ وہ عقل انسانی کے خلاف ہی ہوں کیونکہ ذات باری تعالیٰ منزہ عن الخطا ہے۔ اس لیے الہام الٰہی کے ذریعے سے جو کچھ بھی معلوم ہو اس کو ایک قطعی صداقت کی حیثیت سے قبول کرنا ہوگا۔ خواہ اس کا موضوع روحانی اور ماورائے طبعی ہو یا تاریخ، قانون اور عبادات سے تعلق رکھتا ہے یا کسی ایسے موضوع سے متعلق ہو جس کو فکر انسانی تحقیق علمی سے وابستہ سمجھتا ہو۔ مثلاً انسان کی پیدائش ارتقا، علم کائنات یا علم ہیئت، عقل کا معیار قطعی معیار نہیں ہے اور اس حقیقت سے انکار گویا اللہ تعالیٰ کی عقل کل اور اس کے عزائم کا انکار ہے اور یہ کفر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے وقتاً فوقتاً اپنے برگزیدہ بندوں کی معرفت جن میں ہمارے رسول پاکؐ آخری تھے اپنا الہام بھیجا ہے یہ الہام قرآن مجید میں موجود ہے اور مندرجہ بالا پانچ موضوعات پر حاوی ہے۔ لہٰذا اسلام کو ماننے والے شخص کا صحیح کام یہ ہے کہ وہ اس الہام الٰہی کو سمجھے۔ اس پر ایمان لائے اور اس پر عمل کرے۔

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغامات بھیجنے کے لیے واسطہ بناتا ہے وہ رسول یا نبی کہلاتے ہیں۔ چونکہ نبی کا ہر قول وفعل اللہ کے اشارے کے ماتحت ہوتا ہے اور ہمارے رسول پاکؐ کا ہر قول و فعل یقیناً اللہ کی طرف سے تھا لہٰذا وہ رسمی الہام ہی کی مانند خطا سے پاک ہوتا ہے کیونکہ انبیا معصوم ہیں۔ اور ایسے قول یا فعل کی اہلیت ہی نہیں رکھتے جو منشائے الٰہی کے خلاف ہو یہ افعال و

اقوال ''سنت'' کہلاتے ہیں اور سنت قرآن ہی کی طرح غلطی اور خطا سے پاک ہے اس سنت کی تفصیل حدیث میں درج ہے اور حدیث کی متعدد کتابیں ہیں جو مسلمان علما نے کئی نسلوں تک طویل محنت شاقہ اور گہری تحقیق کے بعد مرتب کی ہیں۔

''حدیث'' رسول پاک صلعم اور ان کے صحابہ کرام کے اقوال وافعال کے تذکرے سے مراد ہے اولین دور میں صحابہ یعنی وہ لوگ جنہوں نے رسول پاک کی صحبت میں زندگی بسر کی علم سنت کے بہترین اور مستند ماخذ تھے۔ بعد کے لوگوں کو تابعین کے اقوال پر اکتفا کرنا پڑا۔ یہ لوگ رسول پاکؐ کے بعد پہلی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ جنہوں نے صحابہ سے علم حاصل کیا تھا پھر اس کے بعد کی نسل کے بیانات پر حصر کرنا پڑا جو ''تبع تابعین'' کہلاتے ہیں یہ لوگ رسول پاکؐ کے بعد دوسری نسل سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے تابعین سے کسب علم کیا تھا ''مرفوع'' وہ حدیث ہے جو رسول پاک کے متعلق کسی اور بیان پر مشتمل ہو ''موقوف'' اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں صحابہ کے اقوال وافعال کا ذکر ہو اور ''مقطوع'' وہ حدیث ہے جو رسول پاکؐ کے بعد کی پہلی نسل سے قبل پر حاوی نہ ہو۔ بلکہ صرف تابعین کے اقوال وافعال پر مشتمل ہو بعض احادیث میں خود اللہ تعالیٰ کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ ایسی حدیث کو حدیث قدسی یا حدیث الٰہی کہتے تاکہ عام ''حدیث نبوی'' سے ممیز ہو سکے۔

جو احادیث رسول اللہ سے منسوب کی جاتی ہیں۔ ان کا بہت بڑا حصہ ''احکام'' ''فرائض دینی'' ''حلال وحرام'' پاکیزگی عبادات'' ''خوراک کے متعلق ضوابط اور دیوانی وفوجداری قوانین پر مشتمل ہے اس کے علاوہ ان میں عقائد، سزا جزا، حشر ونشر، جہنم اور جنت، ملائکہ، تخلیق عالم، الہام اور انبیائے سابقہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ بہت سی احادیث میں رسول پاک صلعم کے مفید و بابرکت اقوال اور اخلاقی تعلیمات مندرجہ ہیں۔

احادیث کی اہمیت آغاز ہی میں محسوس کر لی گئی تھی اور نہ صرف ان کو ازبر یاد کیا جاتا تھا بلکہ وہ بعض حالات میں معرض تحریر میں بھی لائی گئی تھیں۔ تدوین حدیث کا کام تیسری صدی ہجری میں شروع ہوا۔ اور صحاح ستہ اسی صدی میں مرتب کی گئیں۔ جن کے مصنفین یہ حضرت تھے:۔

(۱)البخاری (وفات ۲۵۶ ہجری مطابق ۸۷۰ء)

(۲)مسلم (وفات ۲۶۱ ہجری مطابق ۸۷۵ء)

(۳)ابوداؤد (وفات ۲۷۵ ہجری مطابق ۸۸۸ء)

(۴)الترمذی (وفات ۲۷۹ ہجری مطابق ۹۱۵ء)

(۵)النسائی (وفات ۳۰۳ ہجری مطابق ۹۱۵ء)

(۶)ابن ماجہ (وفات ۲۷۳ ہجری مطابق ۸۸۶ء)

زمانہ حاضر کے قوانین شہادت کی رو سے (جن میں ہمارا قانون شہادت بھی شامل ہے) احادیث سنت کی قابل قبول شہادت نہیں ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک متعدد راویوں کے سلسلے سے ہم تک پہنچی ہے لیکن قانونی سند کے اعتبار سے قابل قبول ہیں۔ احادیث کے ان مجموعوں کی وقعت اس بات سے نہیں (جیسا کہ غلطی سے اکثر بیان کیا جاتا ہے) کہ ان کے مولف نے سب سے پہلے رائج حدیثوں کے متعلق صحیح یا موضوع ہونے کا فیصلہ کیا بلکہ ان کی اصلی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ایسے تمام اقوال کو یکجا جمع کر دیا جو اس زمانے کے سلفی حلقوں میں صحیح سمجھے جاتے تھے۔

شیعہ حدیث کو اپنے نقطہ نگاہ سے پرکھتے ہیں اور صرف ایسی حدیثوں کو معتبر سمجھتے ہیں۔ جن کی روایت حضرت علی اور ان کے رفقا سے منسوب ہے۔ لہٰذا اس موضوع پر ان کی اپنی کتابیں موجود ہیں۔ جن میں سے وہ مندرجہ ذیل پانچ کتابوں کو بالخصوص بہت معتبر خیال کرتے ہیں:۔

(۱) الکافی از محمد بن یعقوب الکلینی (وفات ۳۲۸ ہجری مطابق ۹۳۹ء)

(۲) من لا یستحضرہ الفقیہ از محمد بن علی بن بابویہ القمی (وفات ۳۸۱ھ مطابق ۹۹۱ء)

(۳) تہذیب الحکام

(۴) الاستبصار فی مختلف فیہ الاحبار (کتاب سابق کا خلاصہ) از محمد الطوسی (وفات ۴۵۹ھ مطابق ۱۰۶۷ء)

(۵) نہج البلاغہ (حضرت علی کے مبینہ اقوال) از علی بن طاہر الشریف المرتضیٰ (وفات ۴۳۶ ہجری مطابق ۱۰۴۴ء) (از برادرش رضی الدین البغدادی)

جب دوسری اور تیسری صدیوں میں عبادات و رسوم عقائد و مسلمات اور اہم ترین سیاسی و اجتماعی ادارات نے قطعی شکل اختیار کر لی تو بہت سے راویان حدیث کے استناد اور ان کی روایتوں کے اعتبار کے بارے میں ایک رائے عامہ پیدا ہوگئی۔ عقیدے کے اصول اساسی اس وقت تک مالک بن انس، الشافعی اور دیگر علما کی تصانیف میں قائم ہو چکے تھے جو مختلف حلقوں میں مستند و معتبر سمجھے جاتے تھے بلکہ وہ زیادہ تر رسول پاک صلعم کی احادیث کی سند پر ہی مبنی تھے۔ جتنا وقت گزرتا گیا کسی نے ان احادیث کی صحت پر شبہ کرنے کی جرات نہ کی اور آج تک صحاح ستہ احادیث کی صحت و صداقت پر تقریباً قطعی یقین برابر چلا آرہا ہے۔

ہم اب تک اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کسی موضوع پر کوئی حکم بھی ہو اگر اس کا استخراج قرآن مجید اور سنت رسول پاکؐ سے کیا گیا ہے تو وہ ہر مسلمان کے لیے واجب التعمیل ہے لیکن چونکہ سنت کی شہادت صرف حدیث ہے۔ اس لیے سنت اور حدیث کے الفاظ ایک دوسرے سے اس قدر مخلوط ہو گئے ہیں کہ دونوں میں تمیز دشوار ہوگئی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں مقصد ''قرآن اور سنت'' ہو وہاں بھی عام طور پر ''قرآن و حدیث'' ہی کا جملہ استعمال کیا جاتا ہے۔

اس مرحلے پر ایک اور اصول سامنے آجاتا ہے جو مساوی طور پر بنیادی ہے وہ اصول یہ ہے کہ اسلام آخری الہامی مذہب ہے جو ہر اعتبار سے مکمل اور جامع ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس دین کے کسی حصے کی تنسیخ یا تخفیف یا اضافے کا امکان اتنا ہی بعید ہے۔ جتنا کسی نئے رسول کا مبعوث ہو جانا غیر ممکن ہے۔ دین مکمل کر دیا گیا ہے **(اکملت لکم دینکم سورہ ۵ آیت ۳)**

اس لیے اب کسی ایسے نئے ضابطے کی ضرورت نہیں رہی جو اصلی ضابطے کی تنسیخ، ترمیم یا تائید کرے اور نہ کسی نئے پیغمبر یا پیغام کی حاجت باقی ہے۔ لہٰذا ان معنوں میں نبوت رسول پاک صلعم پر ختم ہوگئی اور الہام کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔ یہ ''ختم وحی نبوت'' کا عقیدہ ہے۔ اگر اس نظریے کو پوری طرح سمجھ لیا جائے کہ اسلام کے عقائد، اخلاق اور ادارات خطا سے پاک ہونے کے عقیدے پر مبنی ہیں خواہ وہ بے خطائی قرآن میں، سنت میں، اجماع میں یا اجتہاد مطلق میں مضمر ہو تو اس سے جو نتائج بھی مستنبط ہونگے وہ آسانی سے سمجھ میں آجائیں گے۔ چونکہ ہر معاملے میں خواہ وہ

عبادات سے متعلق ہو یا اس کی نوعیت سیاسی یا اجتماعی یا اقتصادی ہو آخری معیار صداقت الہامی الٰہی ہے اور الہام قرآن مجید ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے اور سنت بھی الہام کی مانند بے خطا ہے اور سنت کی صحت کی تنہا شہادت حدیث ہے۔ لہٰذا اسلامی مملکت قائم کرنے کے خواہشمندوں کا پہلا فرض یہ معلوم کرنا ہے کہ جس حکم کا حالات حاضرہ پر اطلاق ہوتا ہے وہ آیا قرآن یا حدیث میں موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لیے موزوں ترین اشخاص وہی ہیں جنہوں نے زندگی بھر قرآن و حدیث کا مطالعہ کیا ہے۔ یعنی سنیوں کے علما اور شیعوں کے مجتہد جو امام غائب (جو امر الٰہی کے ماتحت حاکم ہے) کے نائب ہیں۔ ان علمائے دین کا وظیفہ یہ ہوگا کہ ایسے احکام کا سراغ لگانے میں مصروف رہیں جن کا اطلاق مخصوص صورتوں میں ہو سکے۔ ان کی یہ مصروفیت اسی قسم کی ہوگی جس میں فلاسفہ یونان مشغول رہا کرتے تھے اور دونوں میں فرق صرف یہ ہوگا کہ فلاسفہ یونان کے نزدیک تو تمام صداقتیں فطرت میں مضمر تھیں جو انفرادی کوشش سے بے نقاب کی جا سکتی تھیں۔ لیکن علما و مجتہدین اس حق کا سراغ لگائیں گے جو کتاب اللہ اور حدیث رسول اللہ میں موجود ہے۔ مجلس اصول اساسی میں علما کے بورڈ کی جو سفارش کی گئی تھی وہ گویا اس اصول کا منطقی اعتراف تھا اور اس بورڈ کے خلاف صحیح اعتراض حقیقت میں یہی ہونا چاہیے تھا کہ جس اصول نے اس بورڈ کو جنم دیا تھا۔ اس کے عمل درآمد کے لیے وہ بورڈ نہایت ناکافی اور کمزور آلہ تھا۔

اجماع کے معنی ہیں مجتہدین ملت کا اتفاق رائے۔ مجتہدین وہ لوگ ہیں جو رسول پاک صلعم کے وصال کے بعد اپنے علم کی بنا پر خود حکم لگانے اور فیصلے کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اجماع کے اختیار کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ اللہ تعالیٰ امکان خطا سے حفاظت کرے گا کیونکہ ابن ماجہ میں رسول اللہ صلعم کی ایک حدیث درج ہے کہ ''میری امت گمراہی پر کبھی متفق نہ ہوگی'' اجماع سے متنازعہ فیہ مسائل کے متعلق احکام معین کر دیے جاتے تھے اور جب وہ ایک دفعہ معین ہو جاتے تھے تو دین کا جزو لاینفک بن جاتے تھے اور ان سے انکار کرنا کفر قرار دیا جاتا تھا۔ اجماع کے متعلق یہ نکتہ یاد رکھنا لازمی ہے کہ اس سے مجتہدین کے اتفاق رائے کا اظہار ہوتا ہے۔ عوام کے اتفاق کا معاملہ بالکل خارج از بحث ہے۔ اس طریق سے اجماع نے نہ صرف غیر منفصل معاملات کے متعلق احکام معین کر دیے

ہیں بلکہ بعض اہم ترین عقائد تک کو تبدیل کر دیا ہے۔

اجماع اور اجتہاد میں یہ فرق ہے کہ اجماع اجتماعی اور اجتہاد انفرادی ہوتا ہے۔ اجتہاد کے معنی ہیں کسی مقدمے یا قانون کے کسی حکم کے متعلق رائے قائم کرنے میں انتہائی محنت کرنا۔ اجتہاد قرآن اور سنت پر قیاس کے اطلاق سے کیا جاتا ہے۔ اجتہاد پہلے پہل خطا سے پاک نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ اس کے نتائج ہمیشہ ظنی خیال کیے جاتے تھے یہ صرف اس حالت میں خطا سے پاک سمجھا جاتا تھا جب مختلف افراد کا اجتہاد مل کر اجماع بن جاتا تھا لیکن یہ وسیع اجتہاد بہت جلد ایسے لوگوں کے خاص اجتہاد کی شکل اختیار کر گیا جو رائے قائم کرنے کا خاص حق رکھتے تھے جب بعد کے علما نے چار شرعی مذاہب کی تاسیس کا مطالعہ کیا تو ان مذاہب کے بانیوں کو ''اجتہاد مطلق'' کا درجہ دے دیا۔ لیکن وقتاً فوقتاً ایسے افراد ظہور میں آتے رہے جنہوں نے اجتہاد کے اولین مفہوم کو اختیار کیا اور دعویٰ کیا کہ وہ بھی اصول اولیٰ کے ماتحت اپنی رائے قائم کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک ابن تیمیہ حنبلی تھے (وفات ۷۲۸ء) دوسرے سیوطی تھے (وفات ۹۱۱ء) جنھوں نے اجتہاد کے دعوے کے علاوہ اپنی صدی کے مجدد ہونے کا دعویٰ بھی کیا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ جس طرح ہر صدی میں ایک مجدد آنا چاہیے۔ اسی طرح ہر زمانے میں کم سے کم ایک مجتہد ضرور ہونا چاہیے۔ شیعوں کے اسلام میں آج بھی مجتہدین مطلق موجود ہیں جو امام غائب کے نائب سمجھے جاتے ہیں۔ پس اجتماعی اجتہاد سے اجماع پیدا ہوتا ہے اجماع کی بنیاد یہ کہ اللہ تعالیٰ خطا سے محفوظ رکھتا ہے یعنی اجماع کا فیصلہ خطا سے پاک ہوتا ہے۔

مملکت اسلامی کے لوازم

چونکہ اسلامی شریعت کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ الہام الٰہی اور رسول پاک کے اقوال و افعال خطا سے پاک ہیں۔ لہٰذا قرآن اور سنت کے احکام وقوانین انسان کے وضع کردہ قوانین سے بالاتر ہیں اور ان دونوں کے تصادم کی صورت میں آخر الذکر کو (بلالحاظ اپنی نوعیت کے) اول الذکر کے آگے سر جھکا دینا چاہیے۔ اس طرح اگر کسی مسئلے کے متعلق قرآن یا سنت میں کوئی ایسا حکم موجود ہو

جو ہمارے تصور کے مطابق قانون دستوری یا قانون بین الاقوامی کے دائرے میں آتا ہو تو اس صورت میں اس حکم کو نافذ کرنا چاہیے سوائے اس حالت کے کہ خود وہ حکم انحراف کی اجازت دیتا ہو۔ یعنی شریعت اسلامی میں قانون دستوری اور دوسرے قانون کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہیں بلکہ جتنے قوانین قرآن اور سنت میں پائے جاتے ہیں۔ وہ مملکت کی مسلمان رعایا کے لیے قانون ملکی ہی کا ایک حصہ ہیں۔ اس طرح اگر قرآن یا سنت میں کوئی ایسا حکم ہو جو دوسری مملکتوں کے ساتھ مملکت کے تعلقات یا مملکت کی مسلمان رعایا اور دوسری مملکتوں کے ساتھ مملکت کے تعلقات یا مملکت کی مسلمان رعایا اور دوسری مملکتوں یا ان مملکتوں کی رعایا کے درمیان روابط سے تعلق رکھتا ہو تو اس حکم کا نفاذ بھی اتنا ہی لازمی ہوگا۔ جتنا قرآن یا سنت کے دوسرے احکام کا نفاذ ضروری ہے۔ لہٰذا اگر پاکستان اسلامی مملکت ہے یا اس کو صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بنانے کا ارادہ ہے تو اس کے دستور میں ذیل کی پانچ دفعات ضرور ہونی چاہئیں:۔

(۱) تمام قوانین جو قرآن و سنت میں موجود ہیں مسلمانوں کے لیے قانون ملکی کا ایک حصہ متصور ہونگے اور اسی حیثیت سے نافذ کیے جائیں گے۔

(۲) دستور کی کوئی دفعہ جو قرآن یا سنت کے منافی ہوگی وہ اپنے منافی ہونے کی حد تک کالعدم سمجھی جائے گی سوائے اس حالت کے کہ دستور خود اجماع امت کے ماتحت وضع کیا گیا ہو یعنی مسلمہ مرتبے کے علما اور مجتہدین کے اتفاق رائے سے تیار ہوا ہو۔

(۳) سوائے اس حالت کے کہ پاکستان کے موجودہ قوانین کو مذکورہ بالاقسم کے اجماع امت کی منظوری حاصل ہو جائے۔ موجودہ قانون کی کوئی دفعہ جو قرآن یا سنت کے منافی ہوگی وہ اپنے منافی ہونے کی حد تک کالعدم سمجھی جائے گی۔

(۴) کسی آئندہ قانون کی کوئی دفعہ جو قرآن و سنت کے منافی ہوگی کالعدم سمجھی جائے گی۔

(۵) بین الاقوامی قانون کا کوئی قاعدہ اور کسی ایسے میثاق یا معاہدے کی کوئی دفعہ (جس کے فریقوں میں پاکستان بھی شامل ہوگا) اگر قرآن یا سنت کے خلاف ہوگی تو پاکستان کے کسی مسلمان پر اس کی پابندی واجب نہ ہوگی۔

مملکت اسلامی میں حاکمیت اور جمہوریت

علما نے اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ اگر پاکستان میں اصول اسلامی کے مطابق حکومت قائم کی گئی تو اس کی شکل جمہوری نہیں ہو گی ہم ابھی قرآن وسنت کی حاکمیت کے عقیدے کی وضاحت کر چکے ہیں۔ قرارداد مقاصد میں جب یہ اظہار کر دیا گیا کہ تمام حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے تو گویا اس موقف کو صحیح طور سے تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن جب اس قرارداد کے واضعین نے یہ بیان کیا کہ ایک آزاد و خود مختار مملکت کے لیے دستور تیار کیا جائے گا جس میں اسلام کے سکھائے ہوئے اصول جمہوریت پوری طرح مدنظر رکھے جائیں گے تو انہوں نے خود مختار جمہوریت دونوں لفظوں کا غلط استعمال کیا۔ ہو سکتا ہے کہ جس سیاق وسباق میں انہوں نے یہ لفظ استعمال کیے، اس میں ان لوگوں نے اس کا مطلب غلط نہ سمجھا ہو جو اسلامی اصولوں کے ماہر ہیں۔ لیکن یہ دونوں لفظ مغربی فلسفہ سیاست سے مستعار لیے گئے تھے اور ان معنوں میں دونوں کا استعمال اس قرارداد میں غلط طور سے کیا گیا تھا۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں ملک آزاد و خود مختار ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے باشندے یا اس کا کوئی دوسرا گروہ افراد حق رکھتا ہے کہ اپنے ملک کے نظم امور کو جس طریقے سے چاہے چلائے اور اس میں ضرورت اور پالیسی کے سوا دوسرے مصالح بالکل حائل نہ ہوں لیکن ایک اسلامی مملکت اس مفہوم میں آزاد و خود مختار نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کو قرآن یا سنت کے کسی قانون کو منسوخ یا ترمیم یا ترک کرنے کا اختیار نہیں ہو گا۔ کسی مملکت کے اختیار قانون سازی کو قطعاً محدود کر دینا اس مملکت کے لوگوں کی آزادی وخود مختاری کو محدود کرنا ہے اور اگر اس تحدید کا ماخذ ارادہ عوام کے سوا کوئی اور ہو تو جس حد تک یہ تحدید عائد کی جائے گی اس حد تک مملکت اور اس کے باشندوں کی حاکمیت لازماً کم ہو جائے گی۔ اسلامی مملکت میں حاکمیت اپنے قانونی مفہوم کے اعتبار سے صرف اللہ ہی کی ذات کو حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی طرح جمہوریت کا مطلب ''جمہور کی حکومت'' ہے خواہ یہ حکومت براہ راست ان کے ہاتھ میں ہو جیسے یونان وروما میں تھی یا وہ اپنے منتخب نمائندوں کی وساطت سے حکومت کریں

جیسے زمانہ ءحاضر کی جمہوریتوں میں رواج ہے۔ اگر دستور کے وضع کرنے قوانین کے بنانے اور انتظامی کاروائی کے دائرے میں جمہور کا اختیار بعض نا قابل تبدیل احکام وقواعد کے ماتحت ہوتو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ جو قانون چاہیں منظور کر سکتے ہیں یا انتظامی وظائف کی بجا آوری میں اپنے منشا کے مطابق عمل کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی اسلامی مملکت میں مقنّنہ ایک قسم کا اجماع بھی ہوتو عوام اس میں حصہ لینے سے قطعی طور پر محروم ہونگے کیونکہ فقہ اسلامی میں اجماع امت صرف مسلمہ حیثیت کے علما و مجتہدین تک محدود ہے اور جمہوریت کی طرح یہ حق عوام تک ہرگز نہیں پہنچتا۔

علما کے نزدیک اسلامی مملکت کے دیگر خصائص

سابقہ صفحات میں ہم نے اپنی طاقت بھران اصولوں کی تصریح کی کوشش کی ہے جن پر ایک مذہبی مملکت تعمیر کی جاسکتی ہے اور اس کو اسلامی مملکت کہا جاسکتا ہے اب ہم ایسی مملکت کے بعض خصائص بیان کریں گے اور اس کے متعلق علما کے تصور کا خاص طور پر تذکرہ کریں گے۔

مجلس قانون ساز اور قانون سازی

نظام اسلامی میں قانون سازی کا موجودہ مفہوم بالکل ناپید ہے۔ دین وسیاست کا وہ مجموعی نظام جو دین اسلام کہلاتا ہے ایک مکمل نظام ہے اور اس میں ایسا انتظام موجود ہے کہ جو صورت حالات بھی پیدا ہو اس کے متعلق قانون کا انکشاف واطلاق کر دیا جائے۔ جمہوریہ ءاسلام کے دوران میں زمانہ ءحاضر کے انداز کی کوئی مقنّنہ موجود نہ تھی اور جو صورت حالات یا فوری ضرورت پیش آجاتی تھی۔ اس کے مطابق علما قانون انکشاف اور اطلاق کر سکتے تھے۔ قانون بن چکا تھا اور اس کے بنانے کی حاجت نہ تھی اور قانون کا نفاذ جن لوگوں کے سپرد تھا ان کا کام صرف یہ تھا کہ کسی خاص مقدمے کی اغراض کے لیے قانون کا انکشاف کریں۔ البتہ جب ایک دفعہ اس قانون کا آغاز اور اطلاق ہو جاتا تو وہ دوسروں کے لیے پیروی کی ایک نظیر بن جاتا۔ بعض حلقوں کا یہ قول بالکل غلط ہے

کہ پاکستان جیسے ملک میں جو مختلف قوموں پر مشتمل ہے جس میں مسلم بھی ہیں اور غیر مسلم بھی اور جس میں غیر مسلموں کو نمائندگی بھی دی گئی ہے اور یہ حق بھی عطا کر دیا گیا ہے کہ جو مسئلہ پیش ہو اس پر ووٹ دے سکیں۔ مقنّنہ ہی اجماع یا اجتہادی ہوتا ہے لیکن اس میں ان لوگوں کا کوئی مقام نہیں جو علم قانون کے ماہر نہیں ہیں۔ اس اصول کے ماتحت کفار خواہ وہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے بالکل خارج از بحث ہو جاتے ہیں چونکہ اسلام ایک مکمل مذہب ہے اس میں واضح قوانین بھی ہیں اور اجماع یا اجتہاد سے مستنبط بھی کیے جا سکتے ہیں۔ اور وہ انسانی فعالیت کے پورے دائرے پر حاوی ہیں لہٰذا اس میں اس چیز کا کوئی جواز نہیں جس کو زمانہ حاضر کے مفہوم میں قانون سازی کہتے ہیں۔ اس نکتے پر جب مولانا ابوالحسنات صدر جمعیۃ العمائے پاکستان سے استفسار کیا گیا تو انہوں نے مندرجہ ذیل جوابات دیے۔

سوال۔ کیا قانون کی تعبیر جن افراد یا جماعتوں کے سپرد کی جاتی ہے ان سے علیحدہ وضع قوانین کا ادارہ بھی اسلامی مملکت کا ایک لازمی جزو ہے؟

جواب۔ جی نہیں ہمارا قانون مکمل ہے اور اس میں صرف ایسے اشخاص کی تعبیر اور توجیہ کی ضرورت ہے جو اس کے ماہر ہیں۔ میرے عقیدے کے مطابق کوئی ایسا مسئلہ پیدا نہیں ہو سکتا جس کے متعلق قرآن یا حدیث سے قانون کا استنباط نہ ہو سکے۔

سوال۔ صاحب الحل والعقد کن لوگوں کو کہتے ہیں؟

جواب۔ وہ اپنے وقت کے ممتاز علماء تھے ان لوگوں کو اپنے علم شریعت کی وجہ سے یہ رتبہ حاصل ہوا تھا یہ لوگ کسی اعتبار سے زمانہ حاضر کی جمہوریت کے مشابہ یا مترادف نہ تھے یہی خیال امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاری نے اپنی ایک تقریر میں ظاہر کیا تھا جو ''آزاد'' مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۴۷ء میں درج ہوئی تھی۔ اس تقریر کے دوران میں انہوں نے کہا کہ ہمارا دین کامل و مکمل ہے اور مزید قوانین وضع کرنا کفر کے برابر ہے لیکن ابوالاعلیٰ مودودی کی رائے یہ ہے کہ ایک اسلامی مملکت میں ان معاملات کے متعلق صحیح معنوں میں قانون سازی ممکن ہے جن کے متعلق قرآن وسنت اور سابقہ اجماع میں کوئی ہدایت نہ مل سکے اور مولانا نے اپنے اس نکتے کی وضاحت کے لیے اس مجلس

افراد کا ذکر کیا ہے جس سے رسول پاکؐ اوران کے بعد خلفا امور مملکت کے متعلق تمام معاملات پر مشورہ کیا کرتے تھے۔ یہ مسئلہ کسی قدر مشکل ہے اوراس کی اہمیت بہت زیادہ ہے کیونکہ قانون سازی کے ادارے کواس دعوے کے مطابق بنانا ہوگا جومولانا ابوالحسنات اور بعض دوسرے علمائے دین نے کیا ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ ہے اوراس قدر وسیع ہے کہ ہر قسم کی انسانی فعالیت کے متعلق پیدا ہونے والے مسائل کا حل مہیا کرسکتا ہے اور کسی ایسے خلاف کا قائل نہیں جس کو تازہ قانون سازی سے پر کرنے کی ضرورت ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام مشورے کا حکم دیتا ہے اور نہ صرف رسول پاک صلعم بلکہ پہلے خلفائے اربعہ اوران کے جانشین بھی اپنے وقت کے ممتاز اشخاص سے مشورہ کیا کرتے تھے جن پر ان کے علم شریعت اوران کے تقویٰ کی وجہ سے پورا اعتماد کیا جاسکتا تھا۔ اس تحقیقات کے دوران مجلس شوریٰ کے متعلق کچھ زیادہ معلوم نہ ہوسکا سوائے اس کے جو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے اس تحریری بیان میں موجود ہے جو مولانا نے اس عدالت کی درخواست پر مہیا کیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ایک مجلس افراد موجود تھی اور آیا ان لوگوں کا مشورہ کوئی قانونی حیثیت یا تنقیدی قوت رکھتا تھا اگرچہ ان اشخاص کی نمائندہ نوعیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن ان کا انتخاب یقیناً زمانہ حاضر کے طریقوں کے مطابق نہیں ہوتا تھا۔ ان سے عارضی طور پر مشورہ ضرور کیا جاتا تھا لیکن یہ قطعاً صحیح نہیں کہ وہ موجودہ مجالس قانون ساز کی طرح قوانین وضع کرنے کا اختیار رکھتے تھے۔ ان کے کیے ہوئے فیصلے یقیناً نظائر کا کام دیتے تھے اوران کی نوعیت اجماع کی تھی جو قانون سازی نہیں بلکہ کسی خاص مقدمے پر کسی موجودہ قانون کے اطلاق کا نام ہے جب امور مملکت میں ان سے مشورہ کیا جاتا تھا تو ان کے وظائف یقیناً اس صلاح کی نوعیت رکھتے تھے جو زمانہ حاضر کی کابینہ دیتی ہے لیکن اس قسم کی صلاح قانون نہیں ہوتی بلکہ اس کو صرف فیصلہ کہا جاسکتا ہے۔

زمانہ حاضر کی قانون سازی کو اجماع سے مشابہ بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ جیسا ہم پہلے بیان کرچکے ہیں۔ مجلس قانون ساز قانون وضع کرتی ہے۔ لیکن مجلس شوریٰ کے علما کا کام یہ تھا کہ کسی خاص نقطے پر جس کا ذکر قرآن وسنت میں نہ پایا جاتا ہو۔ فیصلے کا تعین کریں۔ لہٰذا وہ صرف قانون کا انکشاف واطلاق کرتے تھے قانون کو وضع نہ کرسکتے تھے البتہ جو فیصلہ وہ کردیتے تھے نہ صرف اس

خاص مقدمے پر بلکہ بعد کے موقع پر بھی واجب العمل نظیر بن جاتا تھا۔ اگر قانون دستور میں یہ دفعہ شامل ہو کہ اگر اس قانون کی کوئی دفعہ قرآن وسنت کے مخالف ہوگی تو کالعدم سمجھی جائے گی اور عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) میں مقنّنہ کے کسی بنائے ہوئے قانون کے خلاف اس بنا پر اعتراض اٹھایا جائے کہ خود مجلس قانون ساز ہی قرآن وسنت کے خلاف ہے تو تصور کیجیے کہ کس قدر عجیب اور پیچیدہ صورت حالات پیدا ہو جائے گی۔

غیر مسلموں کا موقف

جس وجہ کی بنا پر چودھری ظفر اللہ خان اور مملکت کی کلیدی اسامیوں کے احمدی عہدہ داروں کی برطرفی کا مطالبہ کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ احمدی غیر مسلم ہیں اس لیے ایک اسلامی مملکت کے ذمیوں کی طرح وہ مملکت کے بڑے عہدوں پر تقرر کا حق نہیں رکھتے۔ مطالبات کے اس پہلو سے براہ راست یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم اسلامی دستور نافذ کریں گے تو پاکستان میں غیر مسلموں کی حیثیت ذمیوں کی سی ہوگی اور وہ پاکستان کے پورے شہری نہ ہوں گے کیونکہ ان کو مسلمانوں کے مساوی حقوق حاصل نہیں ہونگے۔ وضع قوانین میں ان کی کوئی آواز نہ ہوگی قانون کے نفاذ میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا اور انہیں سرکاری عہدوں پر فائز ہونے کا کوئی حق نہ ہوگا۔ اس موقف کا پورا اظہار مولانا ابو الحسنات سید محمد احمد قادری، مولانا احمد علی، میاں طفیل محمد اور مولانا عبد الحامد بدایونی کی شہادتوں میں کیا گیا ہے۔ جب اس موضوع پر مولانا ابو الحسنات سے استفسار کیا گیا تو انہوں نے یہ جواب دیا:۔

سوال۔ اگر ہم پاکستان میں اسلامی مملکت قائم کرینگے تو کفار (غیر مسلم) کا موقف کیا ہوگا۔ کیا انہیں سرکاری عہدوں پر فائز ہونے کا حق ہوگا؟

جواب۔ ان کا موقف ذمیوں کا سا ہوگا۔ ان کی وضع قوانین میں کوئی آواز نہ ہوگی۔ قانون کی تنفیذ میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا اور سرکاری عہدوں پر فائز ہونیکا حق نہ ہوگا۔

سوال۔ کیا ایک اسلامی مملکت میں رئیس مملکت اپنے اختیارات کا کوئی جزو کفار کو تفویض کر سکتا ہے؟

جواب۔ جی نہیں۔ مولانا نے استفسار کا یہ جواب دیا۔

سوال۔ اگر ہم پاکستان میں اسلامی مملکت قائم کرینگے تو کفار کا موقف کیا ہوگا کیا انہیں وضع قوانین میں کوئی آواز حاصل ہوگی۔ انہیں قانون کی تنفیذ کا موقع دیا جائیگا۔ اور انہیں سرکاری عہدوں پر فائز ہونے کا حق ہوگا؟

جواب۔ ان کا موقف ذمیوں کا سا ہوگا، وضع قوانین میں ان کی کوئی آواز نہ ہوگی۔ نہ تنفیذ قانون کا حق ہوگا۔ البتہ حکومت ان کو کسی سرکاری عہدے پر فائز ہونے کی اجازت دے سکتی ہے۔

میاں طفیل احمد نے حسب ذیل بیان دیا:۔

سوال۔ اقلیتوں کے حقوق کے متعلق جو مضمون 'سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کو پڑھ کر بتایئے کہ آیا اس میں اسلامی مملکت کے متعلق آپ کے خیالات کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے (اس مضمون میں بیان کیا گیا تھا کہ اقلیتوں کے حقوق مسلمانوں کے برابر ہوں گے)

جواب۔ میں نے یہ مضمون پڑھ لیا ہے اگر پاکستان میں جماعت اسلامی کے نظریے پر مبنی مملکت قائم کی جائے تو میں پاکستان میں عیسائیوں یا دوسرے غیر مسلموں کے ان حقوق کو تسلیم نہیں کرونگا۔

اس نکتے پر مولانا عبدالحامد بدایونی کی ذہنی ژولیدگی مندرجہ ذیل بیان سے ظاہر ہوگی:۔

سوال۔ کیا آپ نے کبھی مذکورہ بالا تقریر کو پڑھا ہے؟ (قائداعظم کی وہ تقریر جو انہوں نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں کی تھی)

جواب۔ جی ہاں میں نے وہ تقریر پڑھی ہے۔

سوال۔ کیا آپ اب تک پاکستان کے اس تصور سے اتفاق کرتے ہیں جو قائداعظم نے دستور ساز اسمبلی کی تقریر میں پیش کیا تھا اور جس میں انہوں نے کہا تھا کہ آج کے بعد صرف ایک

پاکستانی قوم ہوگی جس میں مسلم اور غیر مسلم شامل ہوں گے۔ان سب کو مساوی شہری حقوق حاصل ہوں گے نسل مذہب اور مسلک کا کوئی امتیاز نہ ہوگا۔اور مذہب محض فرد کا نجی معاملہ سمجھا جائے گا؟

جواب۔میں اس اصول کو تسلیم کرتا ہوں کہ تمام قوموں کو خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم مملکت کے نظم ونسق اور قانون سازی میں ان کی آبادکاری کے مطابق نمائندگی حاصل ہونی چاہیے۔سوائے اس کے کہ غیر مسلم شعبہ فوج اور محکمہ عدالت میں نہ لیے جاسکیں گے نہ وزیر مقرر کیے جاسکیں گے اور نہ کسی اعتماد کے عہدے پر فائز ہوسکیں گے۔

سوال۔کیا آپ کا مقصد اس سے یہ ہے کہ غیر مسلموں کا موقف ذمیوں کا سا ہوگا یا اس سے بہتر ہوگا؟

جواب۔جی نہیں۔ذمیوں سے مراد ان ملکوں کی غیر مسلم آبادی سے ہے جن کو کسی اسلامی مملکت نے فتح کیا ہو۔اس لفظ کا اطلاق ان غیر مسلم اقلیتوں پر نہیں ہوسکتا جو کسی اسلامی مملکت میں پہلے سے آیا ہوا ایسی اقلیتیں معاہد کہلاتی ہیں (یعنی وہ لوگ جن سے کوئی معاہدہ کیا گیا ہو)

سوال۔اگر ان سے کوئی معاہدہ نہ ہو تو پھر ان کی حیثیت کیا ہوگی؟

جواب۔ایسی حالت میں ان قوموں کو شہریت کے کوئی حقوق حاصل نہ ہوں گے۔

سوال۔کیا پاکستان میں رہنے والی غیر مسلم اقلیتیں آپ کے نزدیک معاہد کہلا سکتی ہیں؟

جواب۔جی نہیں تاوقتیکہ ان سے کوئی معاہدہ نہ ہو میرے علم میں ایسی قوموں کے ساتھ پاکستان میں اب تک کوئی معاہدہ نہیں ہوا۔

پس اس عالم دین کی شہادت کی رو سے پاکستان کے غیر مسلم نہ تو شہری ہوں گے نہ انہیں ذمیوں یا معاہدوں کی حیثیت حاصل ہوگی۔

جمہوریہ اسلامی کے دوران میں رئیس مملکت یعنی خلیفہ ایک ایسے نظام انتخاب کے ماتحت منتخب کیا جاتا تھا جو زمانہ حاضر کے انتخاب سے قطعاً مختلف تھا۔اور اس کی بنیاد نہ بالغوں کے حق رائے دہی پر اور نہ عمومی نمائندگی کی کسی اور ہیئت پر تھی اس کی جو بیعت کی جاتی تھی جسے حلف اطاعت کہنا چاہیے اسے ایک مقدس معاہدہ کی حیثیت حاصل تھی اور جب وہ اجماع الامت یعنی لوگوں کے اتفاق

آرا سے منتخب ہو جاتا تھا تو جائز حکومت کے تمام شعبوں کا سر چشمہ بن جاتا تھا۔ اس کے بعد اس کو اور صرف اس کو حکومت کرنے کا حق ہوتا تھا وہ اپنے بعض اختیارات اپنے نائبوں کو تفویض کر سکتا تھا اور اپنے گرد ایسے اشخاص کے ایک گروہ کو جمع کر لیتا تھا جو علم و تقویٰ میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے، اس گروہ کو مجلس شوریٰ یا اہل الحل والعقد کہتے تھے۔ اس نظام کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ کفار ان وجوہ کے ماتحت جو واضح تھے اور جن کے بیان کی حاجت نہیں اس مجلس میں دخل حاصل نہیں کر سکتے تھے 'ور خلیفہ اپنے اختیارات کفار کو بالکل تفویض نہ کر سکتا تھا۔ خلیفہ حقیقی رئیس مملکت اور تمام اختیارات کا حامل ہوتا تھا اور زمانہ حاضر کی کسی جمہوری مملکت کے صدر کی طرح ایک بے اختیار فرد نہ تھا جس کا فرض صرف اتنا ہوتا ہے کہ اپنے وزیر اعظم اور کابینہ کے فیصلوں پر دستخط کر دے وہ اور وضع قوانین کا کام ان کے سپرد کرنا تو قانونی اعتبار سے بالکل ہی ناممکن تھا۔

جب صورت حال یہ ہے تو مملکت کو لازماً کوئی ایسا انتظام کرنا ہوگا کہ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان فرق معین ہو سکے اور اس کے نتائج پر عمل درآمد کیا جا سکے۔ لہٰذا یہ مسئلہ بنیادی طور پر اہم ہے کہ فلاں شخص مسلم ہے یا غیر مسلم اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے اکثر ممتاز علماء سے یہ سوال کیا ہے کہ وہ ''مسلم'' کی تعریف کریں۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ اگر مختلف فرقوں کے علماء احمدیوں کو کافر سمجھتے ہیں تو ان کے ذہن میں نہ صرف اس فیصلے کی وجوہ بالکل روشن ہونگی بلکہ وہ ''مسلم'' کی تعریف بھی قطعی طور پر کر سکیں گے کیونکہ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ فلاں شخص یا جماعت دائرہ اسلام سے خارج ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ دعویٰ کرنے والے کے ذہن میں اس امر کا واضح تصور موجود ہو کہ ''مسلم'' کس کو کہتے ہیں۔ تحقیقات کے اس حصے کا نتیجہ بالکل اطمینان بخش نہیں نکلا اور، گر ایسے سادہ معاملے کے متعلق بھی ہمارے علماء کے دماغوں میں اس قدر ژولیدگی موجود ہے تو آسانی سے تصور کیا جا سکتا ہے کہ زیادہ پیچیدہ معاملات کے متعلق ان کے اختلافات کا کیا حال ہوگا۔ ذیل میں ہم ''مسلم'' کی تعریف ہر عالم کے اپنے الفاظ میں درج کرتے ہیں۔ اس تعریف کا مطالبہ کرنے سے پہلے ہر گواہ کو واضح طور پر سمجھا دیا گیا تھا کہ آپ وہ قلیل سے قلیل شرائط بیان کیجیے جن کی تکمیل سے کسی شخص کو مسلم کہلانے کا حق حاصل ہو جاتا ہے اور یہ تعریف اس اصول پر مبنی ہونی چاہئے جس کے

مطابق گرائمر میں کسی اصطلاح کی تعریف کی جاتی ہے نتیجہ ملاحظہ ہو۔

مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری صدر جمعیۃ العلمائے پاکستان

سوال۔ مسلم کی تعریف کیا ہے؟

جواب۔ اول۔ وہ توحید الٰہی پر ایمان رکھتا ہو۔

دوم۔ وہ پیغمبر اسلام کو اور تمام انبیائے سابقین کو خدا کا سچا نبی مانتا ہو۔

سوم۔ اس کا ایمان ہو کہ پیغمبر اسلام صلعم انبیا میں آخری نبی ہیں (خاتم النبین)

چہارم۔ اس کا ایمان ہو کہ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ الہام پیغمبر اسلام صلعم پر نازل کیا

پنجم۔ وہ پیغمبر اسلام صلعم کی ہدایات کے واجب الاطاعت ہونے پر ایمان رکھتا ہو

ششم۔ وہ قیامت پر ایمان رکھتا ہو۔

سوال۔ کیا تارک صلوٰۃ مسلم ہوتا ہے؟

جواب۔ جی ہاں لیکن منکر صلوۃ مسلم نہیں ہو سکتا۔

مولانا احمد علی صدر جمعیت العلمائے اسلام مغربی پاکستان:۔

سوال۔ ازراہ کرم مسلم کی تعریف کیجیے۔

جواب۔ وہ شخص مسلم ہے جو (۱) قرآن پر ایمان رکھتا ہو اور (۲) رسول اللہ صلعم کے ارشادات پر ایمان رکھتا ہو۔ ہر شخص جو ان دو شرطوں کو پورا کرتا ہے مسلم کہلانے کا حقدار ہے۔ اور اس کے لیے اس سے زیادہ عقیدے اور اس سے زیادہ عمل کی ضرورت نہیں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی

سوال۔ ازراہ کرم مسلم کی تعریف کیجیے۔

جواب۔ وہ شخص مسلم ہے جو (۱) توحید پر (۲) تمام انبیا پر (۳) تمام الہامی کتابوں پر (۴) ملائکہ پر (۵) یوم الآخرۃ پر ایمان رکھتا ہو۔

سوال۔ کیا ان باتوں کے محض زبانی اقرار سے کسی شخص کو مسلم کہلانے کا حق حاصل ہو جاتا ہے اور آیا کہ ایک مسلم مملکت میں اس سے وہ سلوک کیا جائے گا جو مسلمان سے کیا جاتا ہے؟

جواب۔ جی ہاں۔

سوال۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں ان تمام باتوں پر ایمان رکھتا ہوں تو کیا کسی شخص کو اس کے عقیدے کے وجود پر اعتراض کرنے کا حق حاصل ہے؟

جواب۔ جو پانچ شرائط میں نے بیان کی ہیں وہ بنیادی ہیں جو شخص ان شرائط میں سے کسی شرط میں کوئی تبدیلی کرے گا وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

غازی سراج الدین منیر:

سوال۔ ازراہ کرم مسلم کی تعریف کیجیے۔

جواب۔ میں ہر اس شخص کو مسلمان سمجھتا ہوں جو کلمہ لا الہ الا اللہ پر ایمان کا اقرار کرتا ہے اور رسول پاک صلعم کے نقش قدم پر چل کر زندگی بسر کرتا ہے۔

مفتی محمد ادریس جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد۔ لاہور:۔

سوال۔ ازراہ کرم مسلم کی تعریف کیجئے؟

جواب: لفظ مسلمان فارسی کا لفظ ہے مسلم کے لیے فارسی میں جو لفظ مسلمان بولا جاتا ہے اس میں اور لفظ 'مومن' میں فرق ہے میرے لیے یہ ناممکن ہے کہ میں لفظ مومن کی مکمل تعریف کروں کیونکہ اس امر کی وضاحت کے لیے بے شمار صفحات درکار ہیں کہ 'مومن' کیا ہے جو شخص اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا اقرار کرتا ہے وہ مسلم ہے، اس کو توحید الٰہی رسالت انبیا اور یوم قیامت پر ایمان رکھنا چاہیے جو شخص اذان یا قربانی پر ایمان نہیں رکھتا وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اس طرح بے شمار دیگر امور بھی ہیں جو ہمارے نبی کریم سے ہم کو تواتر کے ساتھ پہنچے ہیں۔ مسلم ہونے کے لیے ان سب امور پر ایمان لانا ضروری ہے میرے لیے یہ قریب قریب ناممکن ہے کہ ان تمام امور کی مکمل فہرست پیش کروں۔

حافظ کفایت حسین، ادارۂ تحفظ حقوق شیعہ:۔

سوال۔ مسلمان کون ہے؟

جواب۔ جو شخص (۱) توحید (۲) نبوت (۳) قیامت پر ایمان رکھتا ہے وہ مسلمان کہلانے کا

حقدار ہے یہ تین بنیادی عقائد ہیں جن کا اقرار کرنے والا مسلمان کہلا سکتا ہے۔ ان تین بنیادی عقائد کے معاملے میں شیعوں اور سنیوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ان تین عقیدوں پر ایمان رکھنے کے علاوہ بعض اور امور ہیں جن کو ضروریات دین کہتے ہیں، مسلمان کہلانے کا حقدار بننے کے لیے ان کی تکمیل ضروری ہے ان ضروریات کے تعین اور شمار کے لیے مجھے دو دن چاہئیں۔ لیکن مثال کے طور پر میں یہ بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ احترام کلام اللہ، وجوب نماز، وجوب روزہ، وجوب حج مع الشرائط اور دوسرے بے شمار امور ضروریات دین میں شامل ہیں۔

مولانا عبدالحامد بدایونی، صدر جمعیت العلمائے پاکستان۔

سوال۔ آپ کے نزدیک مسلمان کون ہے؟

جواب۔ جو شخص ضروریات دین پر ایمان رکھتا ہے وہ 'مومن' ہے اور ہر مومن مسلمان کہلانے کا حقدار ہے۔

سوال۔ ضروریات دین کونسی ہیں؟

جواب۔ جو شخص پنج ارکان اسلام پر اور ہمارے رسول پاک صلعم پر ایمان رکھتا ہے وہ ضروریات دین کو پورا کرتا ہے۔

سوال۔ آیا ان پنج ارکان اسلام کے علاوہ دوسرے اعمال کا بھی اس امر سے کوئی تعلق ہے کہ کوئی شخص مسلمان ہے یا دائرہ اسلام سے خارج ہے؟

(نوٹ) گواہ کو سمجھا دیا گیا تھا کہ دوسرے اعمال سے وہ ضوابط اخلاقی مراد ہیں جو زمانہ حاضر کے معاشرے میں صحیح سمجھے جاتے ہیں)

جواب۔ یقیناً تعلق ہے۔

سوال۔ پھر آپ ایسے شخص کو مسلمان نہیں کہیں گے جو ارکان خمسہ اور رسالت پیغمبر اسلام پر تو ایمان رکھتا ہے لیکن دوسرے لوگوں کی چیزیں چرا لیتا ہے جو مال اس کے سپرد کیا جائے اس کو غبن کر لیتا ہے۔ اپنے ہمسائے کی بیوی کے متعلق نیت بد رکھتا ہے اور اپنے محسن سے انتہائی ناشکری کا مرتکب ہوتا ہے؟

جواب۔ایسا شخص اگر ان عقیدوں پر ایمان رکھتا ہے جو ابھی بیان کیے گئے ہیں تو ان تمام اعمال کے باوجود وہ مسلمان ہوگا۔

مولانا محمد علی کاندھلوی دارالشہابیہ۔سیالکوٹ:۔

سوال۔ازراہ کرم مسلمان کی تعریف کیجیے؟

جواب۔جو شخص نبی کریم صلعم کے احکام کی تعمیل میں تمام ضروریات دین کو بجالاتا ہے وہ مسلمان ہے۔

سوال۔کیا آپ ضروریات دین کی تعریف کر سکتے ہیں؟

جواب۔ضروریات دین ہر مسلمان کو معلوم ہیں خواہ وہ دینی علم نہ رکھتا ہو۔

سوال۔کیا آپ ضروریات دین کو شمار کر سکتے ہیں؟

جواب۔وہ اتنی شمار میں ہیں کہ ان کا ذکر بے حد دشوار ہے میں ان ضروریات کو شمار نہیں کر سکتا بعض ضروریت دین کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔مثلاً صلوۃ،صوم وغیرہ۔

مولانا امین احسن اصلاحی:۔

سوال۔مسلمان کون ہے؟

جواب۔مسلمانوں کی دو قسمیں ہیں۔ایک سیاسی مسلمان دوسرے حقیقی مسلمان سیاسی مسلمان کہلانے کی غرض سے ایک شخص کے لیے ضروری ہے کہ

(۱) توحید الٰہی پر ایمان رکھتا ہو۔

(۲) ہمارے رسول پاک کو خاتم النبین مانتا ہو یعنی اپنی زندگی کے متعلق تمام معاملات میں ان کو آخری سند تسلیم کرتا ہو۔

(۳) ایمان رکھتا ہو کہ ہر خیر و شر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

(۴) روز قیامت پر ایمان رکھتا ہو۔

(۵) قرآن مجید کو آخری الہام الٰہی یقین کرتا ہو۔

(۶) مکہ معظمہ کا حج کرتا ہو

(۷) زکوۃ ادا کرتا ہو۔

(۸) مسلمانوں کی طرح نماز پڑھتا ہو۔

(۹) اسلامی معاشرے کے ظاہر قواعد کی تعمیل کرتا ہو۔

(۱۰) روزہ رکھتا ہو۔

جو شخص ان تمام شرائط کو پورا کرتا ہو وہ ایک اسلامی مملکت کے پورے شہری کے حقوق کا مستحق ہے۔ اگر وہ ان میں سے کوئی ایسی شرط پوری نہ کرے گا تو وہ سیاسی مسلمان نہ ہوگا (پھر کہا) اگر کوئی شخص ان دس امور پر ایمان کا محض اقرار ہی کرتا ہو۔ گو ان پر عمل کرتا ہو یا نہ کرتا ہو تو یہ اس کے مسلمان ہونے کے لیے کافی ہے۔

حقیقی مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالی اور رسول اللہ کے تمام احکام پر عین اس طرح ایمان رکھتا ہو اور عمل کرتا ہو جس طرح وہ احکام وہدایت اس پر عائد کیے گئے ہیں۔

سوال۔ کیا آپ یہ کہیں گے کہ صرف حقیقی مسلمان ہی مرد صالح ہے؟

جواب۔ جی ہاں۔

سوال۔ اگر ہم آپ کے ارشاد سے یہ سمجھیں کہ آپ کے نزدیک سیاسی مسلمان کہلانے کے لیے صرف عقیدہ کافی ہے اور حقیقی مسلمان بننے کے لیے عقیدے کے علاوہ عمل بھی ضروری ہے تو کیا آپ کے نزدیک ہم نے آپ کا مفہوم صحیح طور پر سمجھا ہے؟

جواب۔ جی نہیں آپ میرا مطلب صحیح طور پر نہیں سمجھے سیاسی مسلمان کے معاملے میں بھی عمل ضروری ہے میرا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان عقائد کے مطابق عمل نہیں کرتا جو ایک سیاسی مسلمان کے لیے ضروری ہیں تو وہ سیاسی مسلمانوں کے دائرے سے خارج ہو جائے گا۔

سوال۔ اگر کوئی سیاسی مسلمان ان باتوں پر ایمان نہ رکھتا ہو جن کو آپ نے ضروری بتایا ہے تو کیا آپ اس شخص کو 'بے دین' کہیں گے؟

جواب۔ جی نہیں میں اس محض 'بے عمل' کہوں گا۔

صدر انجمن احمدیہ ربوہ کی طرف سے جو تحریری بیان پیش کیا گیا۔ اس میں مسلم کی تعریف یہ کی

گئی کہ مسلم وہ شخص ہے جو رسول پاک صلعم کی امت سے تعلق رکھتا ہے اور کلمہ طیبہ پر ایمان کا اقرار کرتا ہے۔

ان متعدد تعریفوں کو جو علماء نے پیش کی ہیں پیش نظر رکھ کر کیا ہماری طرف سے کسی تبصرے کی ضرورت ہے؟ بجز اس کے کہ دین کے کوئی دو عالم بھی اس بنیادی امر پر متفق نہیں ہیں اگر ہم اپنی طرف سے ''مسلم'' کی کوئی تعریف کر دیں جیسے ہر عالم دین نے کی ہے اور وہ تعریف ان تعریفوں سے مختلف ہو جو دوسروں نے پیش کی ہیں تو ہم کو متفقہ طور پر دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جائیگا۔ اور اگر ہم علما میں سے کسی ایک کی تعریف کو اختیار کر لیں تو ہم اس عالم کے نزدیک تو مسلمان رہیں گے لیکن دوسرے تمام علما کی تعریف کے رو سے کافر ہو جائیں گے۔

ارتداد

اسلامی مملکت میں ارتداد کی سزا موت ہے۔ اس پر علما عملاً متفق الرائے ہیں (ملاحظہ ہوں مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صدر جمیعت العلمائے پاکستان پنجاب، مولانا احمد علی صدر جمیعت العلمائے مغربی پاکستان، مولانا ابوالاعلی مودودی بانی وسابق امیر جماعت اسلامی پاکستان، مفتی محمد ادریس جامعہ اشرفیہ لاہور ورکن جمعیۃ العلمائے پاکستان، مولانا داؤد غزنوی صدر جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان، مولانا عبدالحلیم قاسمی جمعیۃ العلمائے اسلام پنجاب اور مسٹر ابراہیم علی کی شہادتیں) اس عقیدے کے مطابق چوہدری ظفر اللہ خان نے اگر اپنے موجودہ مذہبی عقائد ورثے میں حاصل نہیں کیے بلکہ وہ خود اپنی رضامندی سے احمدی ہوئے تھے تو ان کو ہلاک کر دینا چاہیے اور اگر مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری یا مرزا رضا احمد خان بریلوی یا ان بے شمار علماء میں سے کوئی صاحب (جو فتوے (EX.D.E 14) کے خوبصورت درخت کے ہر پتے پر مرقوم دکھائے گئے ہیں) ایسی اسلامی مملکت کے رئیس بن جائیں تو یہی انجام دیو بندیوں اور وہابیوں کا ہوگا۔ جن میں مولانا محمد شفیع دیو بندی ممبر بورڈ تعلیمات اسلامی ملحقہ دستور ساز اسمبلی پاکستان اور مولانا داؤد غزنوی

بھی شامل ہیں۔اور اگر مولانا محمد شفیع دیوبندی رئیس مملکت مقرر ہو جائیں تو وہ ان لوگوں کو جنہوں نے دیوبندیوں کو کافر قرار دیا ہے۔ دائرہ اسلام سے خارج قرار دینگے اور اگر وہ لوگ مرتد کی تعریف میں آئیں گے یعنی انہوں نے اپنے مذہبی عقائد ورثے میں حاصل نہ کیے ہوں گے ۔ بلکہ خود اپنا عقیدہ بدل لیا ہوگا۔تو مفتی صاحب ان کو موت کی سزا دے دیں گے۔

جب دیوبندیوں کا ایک فتویٰ (Ex.D.E 13) جس میں اثنا عشری شیعوں کو کافر و مرتد قرار دیا گیا ہے،عدالت میں پیش ہوا تو کہا گیا کہ اصلی نہیں بلکہ مصنوعی ہے لیکن جب مفتی محمد شفیع نے اس امر کے متعلق دیوبند سے استفسار کیا تو اس درالعلوم کے دفتر سے اس فتوے کی ایک نقل موصول ہو گئی جس پر دارالعلوم کے تمام اساتذہ کے دستخط ثبت تھے۔اور ان میں مفتی محمد شفیع صاحب کے دستخط بھی شامل تھے۔اس فتوے میں لکھا ہے کہ جو لوگ حضرت صدیق اکبرؓ کی صحابیت پر ایمان نہیں رکھتے، جو لوگ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے قاذف ہیں اور جو لوگ قرآن میں تحریف کے مرتکب ہوئے ہیں،وہ کافر ہیں۔مسٹر ابراہیم علی چشتی نے بھی جنہوں نے مطالعہ کیا ہے اور اپنے مضمون سے باخبر ہیں۔ اس رائے کی تائید کی ہے،ان کے نزدیک شیعہ اپنے اس عقیدے کی وجہ سے کافر ہیں کہ حضرت علیؓ نبوت میں ہمارے رسول پاکؐ کے شریک تھے۔مسٹر چشتی نے اس سوال کا جواب دینے سے انکار کیا ہے کہ اگر کوئی سنی اپنا عقیدہ بدل کر شیعوں ہم خیال ہو جائے تو آیا وہ اس ارتداد کا مرتکب ہوگا جس کی سزا موت ہے۔

شیعوں کے نزدیک تمام سنی کافر ہیں اور اہل قرآن یعنی وہ لوگ جو حدیث کو غیر معتبر سمجھتے ہیں اور واجب التعمیل نہیں مانتے متفقہ طور پر کافر ہیں۔اور یہی حال آزاد مفکرین کا ہے۔اس تمام بحث کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ شیعہ،سنی،دیوبندی،اہل حدیث اور بریلوی لوگوں میں سے کوئی بھی مسلم نہیں اور اگر مملکت کی حکومت ایسی جماعت کے ہاتھ میں ہو جو دوسری جماعت کو کافر سمجھتی ہے تو جہاں کوئی شخص ایک عقیدے کو بدل کر دوسرا اختیار کرے گا۔اس کو اسلامی مملکت میں لازماً موت کی سزا دی جائے گی۔اور جب یہ حقیقت مدنظر رکھی جائے کہ ہمارے سامنے مسلم کی تعریف کے معاملے میں کوئی دو عالم بھی متفق الرئے نہیں ہو سکے تو اس عقیدے کے نتائج کا قیاس کرنے کے لیے کسی خاص قوت

متخیلہ کی ضرورت نہیں۔ اگر علماء کی پیش کی ہوئی تعریفوں میں سے ہر تعریف کو معتبر سمجھا جائے پھر انہیں تحلیل وتحویل کے عقائد کے ماتحت لایا جائے اور نمونے کے طور پر الزام کی وہ شکل اختیار کی جائے جو گلیلیو کے خلاف انکویزیشن کے فیصلے میں اختیار کی گئی تھی تو ان وجوہ کی تعداد بے شمار ہو جائے گی جن کی بنا پر کسی شخص کا ارتداد ثابت کیا جا سکے۔

اس رپورٹ کے کسی سابقہ حصے میں ''الشہاب'' کی ضبطی کا حوالہ دیا گیا تھا۔ یہ کتابچہ مولانا شبیر احمد عثمانی کا لکھا ہوتھا جو بعد میں پاکستان کے شیخ الاسلام بن گئے تھے۔ اس کتابچے میں مولانا نے قرآن، سنت، اجماع اور قیاس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اسلام میں ارتداد کی سزا موت ہے۔ اس دینیاتی عقیدے کو پیش کرنے کے بعد مولانا نے اس کتابچے میں بطور بیان واقعہ یہ لکھا تھا کہ حضرت صدیق اکبرؓ اور بعد کے خلفا کے زمانوں میں عرب کے وسیع رقبے بارہا مرتد کے خون سے رنگین ہوئے۔

یہ ہمارا کام نہیں کہ ہم اس عقیدے کی صحت یا عدم صحت کے متعلق اپنی رائے ظاہر کریں لیکن یہ جانتے ہوئے کہ حکومت پنجاب کے پاس اس کتابچے کی ضبطی کی تجویز وزیر داخلہ نے بھیجی تھی۔ ہم اپنے آپ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ آخر حکومت نے ایسا قدم کیوں اٹھایا جس سے ایک ایسے عقیدے کی مذمت لازم آئی جو مولانا کے دعوے کے مطابق قرآن اور سنت سے اخذ کیا گیا تھا۔ ارتداد کے لیے سزائے موت بہت دوررس متعلقات کی حامل ہے اور اس سے اسلام مذہبی جنونیوں کا دین ظاہر ہوتا ہے جس میں حریت فکر مستجب سزا ہے۔ قرآن تو بار بار عقل وفکر پر زور دیتا ہے لیکن ارتداد کے متعلق جو عقیدہ اس کتابچے میں پیش کیا گیا ہے وہ آزادی فکر کی جڑ پر ضرب لگا رہا ہے۔ کیونکہ اس میں یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ جو شخص پیدائشی مسلمان ہو یا خود اسلام قبول کر چکا ہو وہ اگر اس خیال سے مذہب کے موضوع پر فکر کرے کہ جو مذہب اسے پسند آئے۔ اس کو اختیار کر لے وہ سزائے موت کا مستوجب ہوگا۔ اس اعتبار سے اسلام کامل ذہنی فالج کا پیکر بن جاتا ہے اور اگر اس کتابچہ کا یہ بیان صحیح ہے کہ عرب کے وسیع رقبے بارہا انسانی خون سے رنگین ہوئے تھے تو اس سے بھی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ عین اس زمانے بھی جب اسلام عظمت وشوکت کے نقطۂ عروج پر تھا اور پورا عرب

اس کے زیرِ نگیں تھا، اس ملک میں بے شمار ایسے لوگ موجود تھے جو اس مذہب سے منحرف ہو گئے تھے اور انہوں نے اس کے نظام کے ماتحت رہنے پر موت کو ترجیح دی تھی۔ غالبًا اس کتابچے سے وزیر داخلہ کے ذہن پر کچھ اسی قسم کا اثر مرتب ہوا ہوگا جس کے ماتحت انہوں نے حکومت پنجاب کو اس کتابچے کی ضبطی کا مشورہ دیا۔ مزید برآں وزیر موصوف نے جو خود دینی امور میں خاصی مہارت رکھتے ہیں، یہ ضرور سوچا ہوگا کہ اس کتابچے کے مصنف نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ اس نظیر پر مبنی ہے جو عہد نامہ عتیق کے فقرات ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸ میں مذکور ہے اور جس کے متعلق قرآن کی دوسری سورت کی چون ویں (۵۴) آیت میں جزوی سا اشارہ کیا گیا ہے۔ اس نتیجے کا اطلاق اسلام سے ارتداد پر نہیں ہو سکتا اور چونکہ قرآن مجید میں ارتداد پر سزائے موت کی کوئی واضح آیت موجود نہیں، اس لیے، کتابچے کے مصنف کی رائے بالکل غلط ہے۔ بلکہ اس کے برعکس ایک تو سورہ کافرون کی چھ مختصر آیات میں اور دوسری سورت کی آیہ ''لا اکراہ'' کی تہہ میں جو مفہوم ہے اس سے وہ نظریہ بالکل غلط ثابت ہوتا ہے جو ''الشہاب'' میں قائم کیا گیا ہے۔ سورہ کافرون صرف تیس الفاظ پر مشتمل ہے۔ اس کی کوئی آیت چھ الفاظ سے زیادہ کی نہیں اس سورہ میں وہ بنیادی خصوصیت واضح کی گئی ہے جو کردار انسانی میں ابتدائے آفرینش سے موجود ہے اور ''لا اکراہ'' والی آیت میں جس کا متعلقہ حصہ صرف نو الفاظ پر مشتمل ہے ذہن انسانی کی ذمہ داری کا قاعدہ ایسی صحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے بہتر صحت ممکن نہیں۔ یہ دونوں متن جو الہام الٰہی کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتے ہیں انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے اس اصول کی بنیاد و اساس ہیں جس کو معاشرہ انسانی نے صدیوں کی جنگ و پیکار اور نفرت و خونریزی کے بعد اختیار کیا ہے اور قرار دیا ہے کہ یہ انسان کے اہم ترین بنیادی حقوق میں سے ہے لیکن ہمارے علماء و محققین اسلام کو جنگجوئی سے کبھی علیحدہ نہیں کرینگے۔

دوسرے مذاہب کی تبلیغ

ارتداد کی سزا کیا ہونی چاہیے اور آیا غیر مسلموں کو علے الاعلان اپنے مذہب کی تبلیغ کا حق ہے یا نہیں۔ یہ دونوں مسئلے باہم مربوط ہیں۔ جس اصول کے ماتحت ایک مرتد کو سزائے موت دی جاتی ہے اسی کا اطلاق ''کفر'' کی علے الاعلان تبلیغ پر بھی ہونا چاہیے۔ چنانچہ مولانا ابو الحسنات، غازی سراج الدین منیر اور ماسٹر تاج دین انصاری نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ صرف آخر الذکر نے اس معاملے میں اپنی رائے کو علما کی رائے کے ماتحت رکھا ہے کہ ایک اسلامی مملکت میں اسلام کے سوا کسی اور مذہب کو کھلم کھلا تبلیغ کی اجازت نہ ہوگی۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے خیالات بھی اس موضوع پر اسی قسم کے ہیں جو انہوں نے اپنے کتابچے ''اسلام میں مرتد کی سزا'' میں ظاہر کیے ہیں۔ غازی سراج الدین منیر سے جب اس موضوع پر سوال کیا گیا۔ تو ان کا جواب یہ تھا:۔

سوال۔ اگر آپ پاکستان کے رئیس مملکت ہو جائیں۔ احمدیوں سے کیا سلوک کریں گے؟

جواب۔ میں انہیں انسانوں کی حیثیت میں تو برداشت کرلونگا لیکن انہیں اپنے مذہب کی تبلیغ و تلقین کی اجازت نہ دونگا''۔

اگر یہ نظریہ مسلّم قرار دیا جائے کہ ارتداد کی سزا موت ہوگی اور اسلام کے خلاف کسی حملے یا خطرے کو بھی غداری قرار دیا جائے گا اور اس کی سزا بھی وہی ہوگی جو ارتداد کی ہے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ ہر غیر مسلم مذہب کی کھلم کھلا تبلیغ ممنوع قرار پائے گی۔

☆☆

جہاد

اس سے قبل ہم بتا چکے ہیں کہ جن مسائل پر مسلمانوں اور احمدیوں کے درمیان اختلاف ہے ان میں ایک جہاد بھی ہے۔ اس عقیدے سے بے شمار دوسرے متعلقہ امور سامنے آتے ہیں مثلاً غازی شہید، جہاد بالسیف، جہاد فی سبیل اللہ، دارالاسلام، دارالحرب، ہجرت، غنیمت، خمس اور غلامی کے معنی کیا ہیں اور یہ تصورات زمانۂ حاضر کے بین الاقوامی مسائل مثلاً جارحیت، قطع نسل، بین الاقوامی فوجداری کا دائرہ اثر، بین الاقوامی معاہدے اور بین الاقوامی قانون عامہ کے قواعد سے کس حد تک متصادم ہوتے ہیں اور کس حد تک ان میں تطابق ہوسکتا ہے۔

اسلامی مملکت دارالاسلام ہے یعنی وہ ملک جس میں اسلام کے احکام نافذ ہوں اور جس کا حاکم مسلمان ہو۔ دارالاسلام کے باشندے مسلمان بھی ہوتے ہیں اور وہ غیر مسلم بھی جنہوں نے مسلم اقتدار کے سامنے گردن اطاعت جھکا دی ہو۔ اور جن کو مملکت اسلامی نے بعض قیود کے ماتحت اور شہریت کاملہ حاصل ہونے کے امکان کے بغیر ان کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دے دی ہو۔ لیکن ان کا اہل کتاب ہونا ضروری ہے۔ وہ بت پرست ہرگز نہ ہوں۔ مملکت اسلامی نظریاتی اعتبار سے اپنے ہمسایہ غیر مسلم ملک سے دائمی برسر جنگ رہتی ہے۔ کیونکہ ممکن ہے وہ کسی وقت دارالحرب بن جائے۔ اگر ایسا ہو تو اس ملک کے مسلمانوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ اسے چھوڑ کر اپنے برادران دینی کے ملک میں چلے آئیں۔ ہم نے یہ پہلو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے ذیل کے خیالات ظاہر کیے:۔

> سوال۔ جو ملک دارالاسلام کی سرحد پر واقع ہو کیا وہ ایک اسلامی مملکت کے مقابلے میں ہمیشہ دارالحرب کی حیثیت رکھتا ہے؟
>
> جواب۔ جی نہیں، اگر دونوں کے درمیان کوئی مصالحت کا معاہدہ موجود نہ ہو تو اسلامی مملکت بالقوۃ اپنے غیر مسلم ہمسایہ ملک سے برسر جنگ رہے گی کوئی غیر مسلم ملک صرف اس صورت میں دارالحرب کی حیثیت اختیار کرتا ہے جب اسلامی مملکت اس کے خلاف رسمی حیثیت سے

اعلان جنگ کردے۔

غیاث اللغات کی رو سے دارالحرب کافروں کا وہ ملک ہے جس کو اسلام نے مطیع نہ کیا ہو کسی ملک کے دارالحرب بننے کے نتائج مختصراً انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں یوں بیان کیے گئے ہیں:۔

''جب کوئی ملک دارالحرب بن جائے تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس میں سے نکل جائیں اور جو بیوی اس وقت اپنے شوہر کا ساتھ دینے انکار کریگی اس پر خود بخود طلاق واقع ہو جائے گی''۔

پس اگر ہندوستان و پاکستان کے درمیان جنگ ہو جائے اور پاکستان اس وقت اسلامی مملکت ہو تو اسے سرحد پار سے چار کروڑ مسلمانوں کے استقبال کے لیے تیار رہنا چاہیے اور واقعہ یہ ہے کہ مولانا عبدالحامد بدایونی کے نزدیک بحالت موجودہ بھی مسلمانان ہند ہجرت کر سکتے ہیں۔ اس معاملے میں ان کی رائے یہ ہے۔

''سوال: کیا آپ پاکستان میں اپنے نقل مکانی کو مذہبی مفہوم کے اعتبار سے ہجرت کہیں گے؟

جواب: جی ہاں''

اب ہم عنقریب یہ بتائیں گے کہ مرزا غلام احمد نے جہاد کی جو توجیہہ کی ہے وہ ان کے اور ان کی جماعت کے کفر کی وجہ کیوں بتائی جاتی ہے لیکن اس سے قبل ہم یہ بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ مسلمان اب تک جہاد کا کیا مطلب سمجھتے رہے ہیں اور آج کیا سمجھتے ہیں، جہاد کے متعلق مختلف نظریے رائج ہیں مثلاً ایک تو کسی مذہبی جنونی کا خام تصور ہے کہ وہ مذہبی جوش میں سرشار ہو کر تلوار ہاتھ میں لے۔ بلا امتیاز غیر مسلموں کا قتل عام کرتا پھرے۔ اور یقین رکھے کہ اگر وہ اس جنگ میں مارا گیا تو شہید ہوگا اور اگر اس قتل وخون میں کامیاب ہوا تو غازی کا رتبہ حاصل کرے گا۔ ایک انتہا تو یہ ہے اور دوسری طرف یہ تصور بھی موجود ہے کہ مسلمان کی پوری زندگی کفر کا مقابلہ کرنے کے لیے وقف ہے (یہاں کفر خطا وشر کے معنی میں استعمال ہوا ہے) لہٰذا مسلمان کی زندگی میں سب سے بڑی سرگرمی یہ ہے کہ وہ دلیل و برہان کی مدد سے اور جہاں ضروری ہو وہاں قوت سے کام لے کر اسلام کو پھیلائے۔ تآنکہ وہ عالمگیر مذہب بن جائے۔ آخر الذکر (یعنی قوت کے استعمال میں) حالت میں

وہ کسی شخصی غرض سے جنگ نہیں کرتا بلکہ اس جدوجہد کو اپنا فرض سمجھتا ہے جو اللہ نے اس پر عائد کیا ہے اور جس کی بجا آوری کی واحد جزا ذات باری تعالیٰ کی خوشنودی ہے۔ مختصر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں ''جہاد'' کے متعلق مندرجہ ذیل مختصر مقالہ درج ہے:۔

''جہاد: (عربی) جنگ مقدس اسلحہ کے زور سے اسلام کی اشاعت مسلمانوں کا علی العموم مذہبی فریضہ ہے۔ یہ اسلام کا چھٹا رکن بنتے بنتے رہ گیا۔ لیکن خارجیوں کے اولاد و احفاد سے حقیقتاً چھٹا رکن تسلیم کرتے ہیں۔ مسلمان اس موقف پر تدریجی طور پر لیکن سرعت کے ساتھ پہنچ گئے۔ قرآن کی مکی سورتوں میں حملے کے مقابلے میں صبر کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا رویہ ممکن ہی نہ تھا۔ لیکن مدینہ میں حملے کے دفاع کا حق قائم ہو گیا۔ اور رفتہ رفتہ اہل مکہ کے خلاف لڑنا اور ان کو مطیع کرنا فرض عین قرار پا گیا۔ ممکن ہے اس میں کوئی شبہ کی گنجائش ہو کہ آیا (حضرت) محمد (صلعم) خود اس امر کو تسلیم کرتے تھے کہ انہیں اپنے منصب کے اعتبار سے کافروں کی دنیا کے خلاف مستقل طور پر اور بلا وجہ اشتعال جنگ جاری رکھنی چاہیے۔ تا آنکہ وہ اسلام کی مطیع مغلوب ہو جائے۔ احادیث اس امر کے متعلق واضح ہیں۔ لیکن قرآن کی آیات میں ہمیشہ ان کفار کا ذکر آتا ہے جن کو اس لیے مطیع کرنا ضروری ہے کہ وہ خطرناک اور بے ایمان ہیں۔ لیکن حضرت نے آس پاس کی حکومتوں کو جو مکتوب لکھے۔ ان سے ظاہر ہے کہ آپ کے ذہن میں ایسے عالمگیر موقف کا تصور بالکل روشن تھا۔ اور آپ کے انتقال کے بعد یقیناً وہ تصور فی الفور عروج پا گیا اور مسلمان فوجیں عرب کی حدود سے پار پیش قدمی کرنے لگیں۔ لیکن اب جہاد فرض علے الکفایہ ہے جو ان تمام مسلمانوں پر علی العموم عائد ہوتا ہے۔ جو مرد ہوں آزاد ہوں بالغ ہوں جسمانی اور ذہنی اعتبار سے صحیح العقل ہوں اور مسلمان فوج تک پہنچنے کی ضروری استطاعت رکھتے ہوں۔ یہ فرض لازماً ہر فرد پر عائد نہیں ہوتا۔ لیکن جب ایک خاص تعداد اس فرض کو ادا کر دے تو اس کی بجا آوری کافی سمجھی جاتی ہے پس جہاد اس وقت تک جاری رہنا چاہیے جب تک پوری دنیا اسلام کے زیر نگیں نہ ہو جائے۔ جہاد کی نگرانی اور قیادت کسی مسلمان حکمران یا امام کے ہاتھ

میں ہونی ضروری ہے شیعوں کا امام چونکہ غائب ہے اس لیے وہ اس کے ظہور تک فریضہ جہاد ادا نہیں کر سکتے ۔مزید برآں اگر ایسا حکمران سال بھر میں ایک دفعہ کوئی مہم لے کر روانہ ہو جائے ۔ یا ہر سال ایک مہم کی تیاری ہی کر لے ۔ جب بھی فریضہ کی ضروریات پوری ہو جائینگی جن لوگوں کے خلاف جہاد کرنا مقصود ہو۔ان کو سب سے پہلے قبول اسلام کی دعوت دینی چاہیے۔اگر وہ اس سے انکار کریں تو پھر ان سے یہ کہنا چاہیے کہ وہ مسلم حکومت کے آگے سر جھکا دیں، ذمی بن جائیں، جزیہ اور خراج دیں اور اگر یہ بھی نہ مانیں تو جنگ کر لیں ۔پہلی حالت میں ان کی جانیں ان کے خاندان اور ان کا مال بالکل محفوظ رہے گا۔لیکن ان کی حیثیت ادنیٰ ہو گی انہیں شہریت کے اصطلاحی حقوق حاصل نہ ہوں گے۔اور ان سے صرف حفاظت میں لیے ہوئے اشخاص کا سا سلوک کیا جائے گا۔اگر وہ جنگ کریں گے تو وہ اور ان کے افراد خاندان غلام بنا لیے جائیں گے۔ان کے مال پر بطور غنیمت قبضہ کر لیا جائے گا۔جس کا 4/5 حصہ فاتحین کے لشکر کو دیا جائے گا۔اگر وہ اسلام قبول کر لیں اور اس کا موقع انہیں اس وقت بھی حاصل رہے گا جب دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل آ کھڑی ہوں تو وہ ملت مسلمہ میں شامل ہو جائیں گے اور مساوی حقوق و فرائض کے حقدار ہوں گے۔مرتدین کو قتل کر دینا ضروری ہے۔اگر کسی مسلم ملک پر کفار کا حملہ ہو جائے تو امام تمام مسلمانوں کے نام اسلحہ بند ہونے کے لیے اعلان عام جاری کرے گا۔اور خطرہ جتنا وسیع ہوتا چلا جائے گا اسی قدر اس اعلان کی وسعت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ پوری دنیائے اسلام پر حاوی ہو جائیگا جو مسلمان اللہ کے راستے میں (فی سبیل اللہ) لڑتا ہوا مارا جائے وہ شہید ہے اور اس کا جنت میں جانا اور وہاں کی خاص برکات حاصل کرنا یقینی ہے۔اولین نسلوں میں اس قسم کی موت ایک صالح زندگی کا تاج امتیاز سمجھی جاتی تھی۔اب بھی بعض موقعوں پر یہ چیز نہایت جوش انگیز ہوتی ہے۔لیکن جب سے اسلام کا سلسلہ فتوحات ختم ہو گیا ہے شہادت کی عظمت و وقعت بھی نہیں رہی تاہم اب بھی جب مسلموں اور غیر مسلموں کی جنگ ہو تو وہ جہاد ہی کی ترغیبات و انعامات سے مالا مال ہوتی ہے۔اس میں شک نہیں

کہ ہندوستان میں نام نہاد معتزلی اور ترکی میں نوجوان ترک اس کے منکر ہیں۔ اور اساس جہاد کی توضیح کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن مسلمان عوام اب تک ائمہ شریعت کی متفقہ آواز کی پیروی کرتے ہیں۔ اگر عقیدہ جہاد کو خارج کر دیا جائے تو اسلام میں کچھ باقی نہیں رہتا۔"

عام طور پر مسلمہ رائے یہ ہے کہ سورہ توبہ (سورہ ۹) کی پانچویں آیت نے ان مکی آیات کو منسوخ کر دیا جن میں صرف دفاع کے لیے کفار کے خلاف قتال کی اجازت دی گئی تھی۔ اس کے برعکس احمدیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن مجید کی کوئی آیت کسی دوسری آیت کو منسوخ نہیں کرتی اور دونوں قسم کی آیات یعنی مکی آیات اور سورہ توبہ کی متعلقہ آیات کے دائرے مختلف ہیں۔ چنانچہ وہ پہلو بہ پہلو چل سکتی ہیں۔ اس سے ناسخ و منسوخ اور اس کے اثرات نتائج کی مشکل بحث شروع ہو جاتی ہے۔ احمدیوں کی طرف سے یہ استدلال پیش کیا جاتا ہے کہ ناسخ و منسوخ کا عقیدہ اس عقیدے کے منافی ہے کہ قرآن مجید لوح محفوظ میں تمام و کمال موجود ہے۔ اس عقیدے (ناسخ و منسوخ) سے اس امر کا اعتراف لازم آتا ہے کہ منسوخ شدہ آیت کسی خاص موقع کے لیے اتری تھی اور اس موقع پر اپنا مقصد پورا کرنے کے بعد بیکار ہوگئی۔ گویا اللہ تعالیٰ کو بعد میں پیش آنے والے واقعات کا علم نہیں تھا جن سے وہ آیت بیکار ہو جانے والی تھی یا اس کا کوئی ناپسندیدہ نتیجہ نکلنے والا تھا۔ اس عقیدے کا تیسرا نتیجہ یہ بتایا جاتا ہے کہ اس سے اس دعوے کی جڑ کٹ جاتی ہے کہ اسلام کے قوانین ناقابل تغیر اور بے لچک ہیں۔ کیونکہ اگر بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے ایک نیا الہام ضروری ہو جاتا ہے۔ تو الہام کی تکمیل کے بعد حالات میں جو تغیرات ہونگے وہ زیادہ تر الہامات کو بیکار اور متروک بنا دینگے۔ ہم اس مباحثے کے مالہ و ماعلیہ پر اپنی رائے ظاہر نہیں کر سکتے لیکن یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مختصر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالے سے اور بعض دوسری پیش شدہ تحریرات سے جن میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی کتابیں بھی شامل ہیں عقیدہ جہاد کے متعلق جو کچھ معلوم ہوا اس کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ اسلام اسلحہ اور فتوحات کے زور سے پھیلا ہے۔

اب جارحیت اور نسل کشی انسانیت کے خلاف جرائم قرار پا چکے ہیں اور انہی جرائم کی بنا پر نیورمبرگ اور ٹوکیو کی مختلف بین الاقوامی عدالتوں نے جرمنی اور جاپان کے ارباب جنگ کو موت کی

سزائیں دی ہیں۔ایک طرف جارحیت اور نسل کشی کے جرائم ہیں اور دوسری طرف یہ عقیدہ کہ اسلام بزور شمشیر اور بزور فتوحات پھیلا ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دونوں میں فرق کیا ہے۔نسل کشی کے متعلق عنقریب ایک بین الاقوامی میثاق مرتب ہونے والا ہے لیکن اگر جہاد کا وہ نظریہ درست ہے جو ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے تو پاکستان اس میثاق میں ہرگز حصہ نہیں لے سکتا۔مکی سورتوں کی مندرجہ ذیل آیات میں وہ بلندترین اور پاکیزہ اصول پیش کیا گیا ہے جس کا دھندلا سا تصور اب کہیں جا کر بین الاقوامی قانون دانوں کو نظر آنے لگا ہے لیکن ہم برابر یہی تلقین کر رہے ہیں۔کہ جارحیت اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

سورہ۲: آیات۱۹۰و۱۹۳

وقاتلوا فی سبیل الله الذین یقاتلو نکم ولا تعتد وا ان الله لا یحب المعتدین oوقاتلوهم حتیٰ لا تکون فتنة و یکون الدین لله فان انتهوا فلا عد و ان الا علی الظالمینo

ترجمہ۔اور تم لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں کے ساتھ جو تمہارے ساتھ لڑنے لگیں اور حد سے نہ نکلو واقعی اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔اور ان کے ساتھ اس حد تک لڑو کہ فساد باقی نہ رہے اور دین اللہ ہی کا ہو جائے اور اگر وہ لوگ باز آجائیں تو سختی کسی پر نہیں ہو سکتی سوائے بے انصافی کرنے والوں کے۔

سورہ۲۲:۳۹۔۴۰

اذن للذین یقاتلون بانهم ظلموا ط وا ن الله علیٰ نصر هم لقدیر oنِ الذین اخرجوا من دیارهم بغیر حق الآ ان یقولو ربناالله ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع و بیع و صلوت و مساجد یذکر فیها اسم الله کثیرا ط ولینصرن الله من ینصره ط ان الله لقوی عزیزo

ترجمہ۔ان لوگوں کو لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے جن سے لڑائی کی گئی۔کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے۔اور یقیناً اللہ ان کو غالب کر دینے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔جو اپنے گھروں سے

بلا وجہ نکالے گئے محض اتنی بات پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کا ایک کا دوسرے سے زور نہ گھٹا تا رہتا تو صومع خلوت خانے، عبادت خانے اور وہ مسجدیں جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے سب منہدم ہو گئے ہوتے۔ بیشک اللہ اس کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کرے گا۔ بلا شبہ اللہ تعالیٰ قوت والا اور غلبے والا ہے۔

شریعت اسلامی کی ایک اور شاخ ''قانون اسیران جنگ'' ہے۔ اس کا بھی بین الاقوامی قانون سے تصادم یقینی ہے مثلاً اسیران جنگ کے ساتھ سلوک کے بارے میں ہمیں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے ان خیالات کی پابندی کرنی ہوگی جو قرآن وسنت پر مبنی بتائے جاتے ہیں اور وہ یہ ہیں:۔

''سوال:۔ کیا اسلام میں کوئی قانون جنگ بھی موجود ہے؟

جواب۔ جی ہاں۔

سوال: کیا وہ قانون زمانہ حاضر کے بین الاقوامی جنگ سے بنیادی طور پر مختلف ہے؟

جواب۔ یہ دونوں نظام ایک بنیادی فرق پر مبنی ہیں۔

سوال: جو غیر مسلم کسی جہاد میں اسیران جنگ بن کر آئیں ان کے حقوق کیا ہیں؟

جواب۔ اس مسئلے میں اسلامی قانون یہ ہے کہ اگر وہ ملک جس کے یہ قیدی باشندے ہوں ان کا فدیہ (معاوضہ) ادا کردے تو وہ رہا کردیے جائیں۔ قیدیوں کے تبادلہ کی بھی اجازت ہے اگر ان دونوں متبادل صورتوں میں سے کوئی بھی ممکن نہ ہو تو قیدی ہمیشہ کے لیے غلام بنا لیے جائیں۔ اگر ایسا کوئی شخص اپنی کمائی میں سے اپنا فدیہ ادا کرنے کی پیشکش کرے تو اس کو فدیے کے لیے رقم فراہم کرنے کی اجازت دے دی جائے۔

سوال: آیا آپ کا خیال یہ ہے کہ جب تک حکومت ایک اسلامی حکومت کی شکل اختیار نہ کر لے اس وقت تک اس کی طرف سے اعلان کردہ جنگ 'جہاد' نہ سمجھی جائے؟

جواب: جی نہیں اگر مسلمانوں کی قومی حکومت مملکت کے جائز مفادات کے لیے جنگ کا اعلان کرے تو اس کو جہاد کہا جاسکتا ہے۔ جو رائے (Ex.D.D 12) میں مجھ سے منسوب کی گئی ہے۔ وہ میں نے کبھی ظاہر نہیں کی:۔

’رہا یہ مسئلہ کہ اگر حکومت پاکستان اپنی موجودہ شکل وصورت کے ساتھ انڈین یونین کے ساتھ اپنے معاہدات ختم کر کے اعلان جنگ کر بھی دے تو کیا اس کی یہ جنگ جہاد کے حکم میں آجائے گی۔ آپ نے اس بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے۔ وہ بالکل درست ہے۔ جب تک حکومت، اسلامی نظام کو اختیار کر کے اسلامی نہ ہو جائے اس وقت تک اس کی کسی جنگ کو جہاد کہنا ایسا ہی ہے جیسا کسی غیر مسلم کے آزاد کشمیر کی فوج میں بھرتی ہو کر لڑنے کو جہاد اور اس کی موت کو شہادت کا نام دیا جائے۔ مولانا کا جو مدعا ہے۔ وہ یہ ہے کہ معاہدات کی موجودگی میں تو حکومت یا اس کے شہریوں کا اس جنگ میں شریک ہونا شرعًا جائز ہی نہیں۔ اگر حکومت معاہدات ختم کر کے جنگ کا اعلان کر دے تو حکومت کی جنگ تو جہاد پھر بھی نہیں ہو گی۔ تا آنکہ حکومت اسلامی نہ ہو جائے‘‘۔

اس چٹھی میں جو خیال ظاہر کیا گیا ہے۔ وہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا ہے اور اس کی شہادت میاں طفیل محمد نے دی ہے جن کا بیان ہے کہ ’’Ex.D.E 12 اس چٹھی کی عکسی نقل ہے جو میں نے کسی شخص کو لکھی تھی جس کا نام اب مجھے یاد نہیں‘‘۔

اس معاملے کے متعلق مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری کی رائے حسب ذیل ہے۔

’’سوال:۔ کیا اسلام میں کوئی قانون جنگ موجود ہے؟

جواب۔ جی ہاں۔

سوال: کیا وہ قانون بنیادی اصولوں کے اعتبار سے موجودہ بین الاقوامی قانون سے مختلف ہے؟

جواب۔ جی ہاں۔

سوال:۔ اس شخص کے کیا حقوق ہیں جو جنگ میں قید کر لیا جائے؟

جواب۔ وہ اسلام قبول کر سکتا ہے۔ یا ’امان‘ طلب کر سکتا ہے۔ ایسی حالت میں اس سے ’’مستامن‘‘ کا سلوک کیا جائیگا۔ اگر وہ امان طلب نہ کرے گا تو غلام بنا لیا جائے گا‘‘

اسی قسم کی رائے کا اظہار جماعت اسلامی کے میاں طفیل محمد نے کیا ہے ملاحظہ ہو:۔

سوال: کیا اسلام میں جنگ کا کوئی قانون ہے؟

جواب۔جی ہاں۔

سوال:۔اگر وہ قانون بین الاقوامی قانون سے متصادم ہو۔تو آپ کس قانون کی پیروی کریں گے؟

جواب۔اسلامی قانون کی۔

سوال:۔پھر آپ ازراہ کرم یہ بیان کیجیے کہ آپ کا لشکر جن اشخاص کو جنگی قیدیوں کی حیثیت سے گرفتار کرے گا۔ان کی حیثیت کی ہوگی؟

جواب۔میں اس کا فی البدیہ جواب نہیں دے سکتا۔اس کے لیے مجھے مسئلے کا مطالعہ کرنا ہوگا‘‘۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر غنیمت اور خمس کو جہاد کا لازمی جزو سمجھا جائے تو بین الاقوامی معاشرہ اس کو محض لوٹ اور رہزنی قرار دیگا۔

غیر مسلم مملکتوں کے مسلمانوں کا ردعمل

جس نظریہ کی بنا پر پاکستان میں اسلامی مملکت کی بنیاد رکھنے کی خواہش کی جاتی ہے۔اس کے بعض نتائج ان مسلمانوں پر ضرور اثر انداز ہوں گے جو غیر مسلم حکمرانوں کے ماتحت ممالک میں آباد ہیں۔ہم نے امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاری سے سوال کیا کہ آیا ایک مسلمان ایک غیر مسلم مملکت کی وفادار رعایا ہوسکتا ہے۔ان کا جواب ذیل میں درج ہے۔

سوال:۔کیا آپکی رائے میں ایک مسلمان ایک کافر حکومت کے احکام کی تعمیل کا پابند ہو سکتا ہے؟

جواب۔یہ ممکن نہیں کہ کوئی مسلمان کسی غیر مسلم حکومت کا وفادار ہو۔

سوال: کیا چار کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ممکن ہے کہ وہ اپنی مملکت کے وفادار شہری ہوں؟

جواب۔جی نہیں۔

یہ جواب اس نظریے کے بالکل مطابق ہے جو ہمارے سامنے پرزور طریق پر پیش کیا گیا ہے لیکن اگر پاکستان کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے دستور کی بنیاد مذہب پر رکھے تو یہی حق ان ملکوں کو بھی دینا ہوگا جن میں مسلمان کافی بڑی اقلیتوں پر مشتمل ہیں یا جو کسی ایسے ملک میں غالب اکثریت رکھتے ہیں جن میں حاکمیت کسی غیر مسلم قوم کو حاصل ہے۔ لہٰذا ہم نے مختلف علماء سے یہ سوال کیا کہ اگر پاکستان میں غیر مسلموں کے ساتھ شہریت کے معاملات میں مسلموں سے مختلف سلوک کیا جائے تو کیا علماء کو اس امر پر کوئی اعتراض ہوگا۔ کہ دوسرے ملکوں میں مسلمانوں کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ روا رکھا جائے اس سوال کے جوابات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صدر جمعیت العلما پاکستان

سوال: کیا آپ ہندوؤں کا جو ہندوستان میں اکثریت رکھتے ہیں۔ یہ حق تسلیم کرینگے کہ وہ اپنے ہاں ہندو دہرم کے ماتحت مملکت قائم کرلیں؟

جواب۔ جی ہاں۔

سوال: اگر اس نظام حکومت میں منوشاستر کے ماتحت مسلمانوں سے ملیچھوں یا شودروں کا سلوک کیا جائے تو کیا آپکو کوئی اعتراض ہوگا؟

جواب:۔ جی نہیں"

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

سوال۔ اگر ہم پاکستان میں اس شکل کی اسلامی حکومت قائم کرلیں تو کیا آپ ہندوؤں کو اجازت دینگے کہ وہ اپنے دستور کی بنیاد اپنے مذہب پر رکھیں؟

جواب۔ یقیناً مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ حکومت کے اس نظام میں مسلمانوں سے ملیچھوں اور شودروں کا سا سلوک کیا جائے۔ ان پر منو کے قوانین کا اطلاق کیا جائے۔ اور انہیں حکومت میں حصہ اور شہریت کے حقوق قطعاً نہ دیے جائیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت بھی ہندوستان میں صورت حالات یہی ہے"۔

امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاری

سوال۔ ہندوستان میں کتنے کروڑ مسلمان آباد ہیں؟

جواب۔ چار کروڑ

سوال۔ کیا آپ کو اس امر پر اعتراض ہوگا کہ ان پر منو کے قوانین عائد کیے جائیں جن کے ماتحت انہیں کوئی شہری حق حاصل نہ ہوگا۔ اور ان سے ملیچھوں اور شودروں کا سا سلوک کیا جائے گا؟

جواب۔ میں پاکستان میں ہوں اور ان کو مشورہ نہیں دے سکتا''

میاں طفیل محمد (جماعت اسلامی)

سوال۔ دنیا میں مسلمانوں کی آبادی کس قدر ہے؟

جواب۔ پچاس کروڑ۔

سوال:۔ اگر آپ کے قول کے مطابق مسلمانان عالم کی کل آبادی پچاس کروڑ ہے اور پاکستان، سعودی عرب، یمن، انڈونیشیا، مصر، ایران، شام، لبنان، شرق اردن، ترکی اور عراق کے مسلمانوں کی تعداد بیس کروڑ سے زیادہ نہیں تو کیا آپ کے نظریے کا یہ نتیجہ نہ ہوگا کہ تیس کروڑ مسلمانان عالم محض لکڑی کاٹنے اور پانی بھرنے والے بن جائیں گے؟

جواب۔ میرے نظریے کا اثر ان کی حیثیت پر نہ ہونا چاہیے۔

سوال۔ کیا اس حالت میں بھی کہ ان سے مذہبی بنا پر غیر مساوی سلوک کیا جائے اور معمولی حقوق شہریت سے بھی محروم کر دیا جائے؟

جواب۔ جی ہاں۔

اس گواہ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم حکومت اپنے ملک کی سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو اسامیاں پیش بھی کرے تو ان کا فرض ہوگا کہ انکو قبول کرنے سے انکار کر دیں۔

غازی سراج الدین منیر

سوال۔ کیا آپ پاکستان میں اسلامی مملکت کا قیام چاہتے ہیں؟

جواب۔ یقیناً۔

سوال۔ اگر ہمسایہ ملک اپنے سیاسی نظام کو اپنے مذہب پر مبنی قرار دے تو اس پر آپ کا ردعمل کیا ہوگا؟

جواب۔ اگر وہ چاہیں تو ایسا کر سکتے ہیں۔

سوال۔ کیا آپ ان کا یہ حق تسلیم کرتے ہیں کہ وہ تمام مسلمانان ہند کو شودر اور ملیچھ قرار دے دیں۔ اور انہیں کسی قسم کا شہری حق نہ دیں؟

جواب۔ ہم انتہائی کوشش کرینگے کہ ایسی حرکت سے پہلے ہی ان کی سیاسی حاکمیت ختم کر دی جائے ہم ہندوستان کے مقابلے میں بہت طاقتور ہیں، ہم ضرور اتنے مضبوط ہوں گے کہ ہندوستان کو ایسا کرنے سے روک دیں۔

سوال۔ کیا تبلیغ اسلام مسلمانوں کے مذہبی فرائض میں شامل ہے؟

جواب۔ جی ہاں۔

سوال۔ کیا مسلمانان ہند کا بھی یہ فرض ہے کہ علی الاعلان اپنے مذہب کی تبلیغ کریں؟

جواب۔ ان کو اس کا حق حاصل ہونا چاہیے۔

سوال۔ اگر ہندوستانی مملکت مذہبی بنیاد پر قائم کر دی جائے اور وہ اپنے مسلم باشندوں کو تبلیغ مذہب کے حق سے محروم کر دے تو کیا ہوگا؟

جواب۔ اگر ہندوستان کوئی ایسا قانون وضع کرے گا۔ تو چونکہ میں 'تحریک توسیع' پر ایمان رکھتا ہوں۔ اس لیے ہندوستان پر حملہ کر کے اس کو فتح کر لونگا۔

گویا مذہبی وجوہ کی بنا پر امتیازی سلوک کی باہم مساوات کا یہ جواب ہے۔

ماسٹر تاج الدین انصاری

سوال۔ کیا آپ چار کروڑ مسلمانان ہند کے لیے بھی وہی نظریہ پسند کرینگے جو آپ پاکستان کے مسلمانوں کے لیے پیش کر رہے ہیں؟

جواب۔ وہ نظریہ اختیار کرنے کے بعد تو وہ ایک منٹ کے لیے ہندوستان میں نہ رہ سکیں گے۔

سوال۔ کیا مسلمان کا نظریہ ہر مقام پر اور ہر وقت میں بدلتا رہتا ہے؟

جواب۔ جی نہیں۔

سوال۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمانان ہند بھی وہی نظریہ اختیار نہ کریں جو آپ کا ہے؟

جواب۔ اس کا جواب انہی کو دینا چاہیے۔

ہمارے سامنے جس نظریے کی حمایت کی گئی ہے اس کو اگر ہندوستان کے مسلمان اختیار کر لیں تو وہ مملکت کے سرکاری عہدوں سے کاملاً محروم ہو جائیں گے اور صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی ان کا یہی حشر ہوگا جہاں غیر مسلم حکومتیں قائم ہیں۔ مسلمان ہر جگہ دائمی طور پر مشتبہ ہو جائیں گے اور فوج میں بھرتی نہ کیے جائیں گے کیونکہ اس نظریے کے مطابق کسی مسلم ملک اور کسی غیر مسلم ملک کے درمیان جنگ ہونے کی صورت میں غیر مسلم ملک کے مسلم سپاہیوں کے لیے کوئی چارہ نہیں کہ یا تو مسلم ملک کا ساتھ دیں یا اپنے عہدوں سے مستعفی ہو جائیں ہم نے اس مسئلے پر دو عالموں سے سوالات کیے۔ جن کے جوابات درج ذیل ہیں:۔

مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صدر جمعیت العلمائے پاکستان

سوال:۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ ہونے کی صورت میں مسلمانان ہند کا فرض کیا ہوگا؟

جواب۔ ان کا فرض ظاہر ہے کہ انہیں ہمارا ساتھ دینا چاہیے۔ اور ہندوستان کی جانب سے ہمارے خلاف نہ لڑنا چاہیے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

سوال۔ ہندوستان و پاکستان کے درمیان جنگ ہونے کی حالت میں مسلمانانِ ہند کا فرض کیا ہوگا؟

جواب۔ان کا فرض ظاہر ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف نہ لڑیں اور نہ کوئی ایسا فعل کریں جو پاکستان کی سلامتی کے لیے مضر ہو۔

دوسرے اثرات

اسلامی مملکت کے دوسرے اثرات و نتائج یہ ہوں گے کہ ہر قسم کی سنگ تراشی، تاش بازی، تصویر کشی، انسانوں کی عکسی تصاویر، موسیقی، رقص مخلوط اداکاری، سینما، تھیٹر سب کچھ بند کر دینا ہوگا۔ مولانا عبدالحلیم قاسمی نمائندہ جمعیت العلمائے پاکستان کا قول ملاحظہ ہو:۔

سوال: تشبیہ اور تمثیل کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب۔ آپ مجھ سے کوئی معین سوال کیجیے۔

سوال۔ لہولعب کے متعلق آپ کا خیال کیا ہے؟

جواب۔ اس سوال کا جواب بھی وہی ہے جو دے چکا ہوں۔

سوال۔ انسانوں کی تصویر کھینچنے کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب۔ اگر اس قسم کی تصویر کشی ضروری ہو جائے تو اس کے خلاف کچھ اعتراض نہیں۔

سوال۔ عکسی تصویر (فوٹوگرافی) کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب میرا جواب وہی ہے جو تصویر کشی کے متعلق دے چکا ہوں۔

سوال۔ سنگتراشی بحیثیت فن کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب۔ یہ ہمارے مذہب میں ممنوع ہے۔

سوال۔ کیا آپ تاش بازی کو بھی لہولعب میں شمار کرتے ہیں؟

جواب۔ جی ہاں۔ یہ لہو ولعب میں شامل ہے۔

سوال۔ رقص و موسیقی کے متعلق کیا خیال ہے؟

جواب۔ یہ ہمارے دین میں ممنوع ہیں۔

سوال۔ ڈراما اور اداکاری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب۔ اس کا انحصار اس امر پر ہے کہ آپ کا مطلب کس قسم کی اداکاری سے ہے اگر

اس میں بے حیائی اور مرد عورت کا اختلاط لازم ہو تو شرع اسلامی اس کے خلاف ہے۔

سوال۔ اگر مملکت آپ کے نظریات پر مبنی ہو جائے تو کیا آپ کوئی ایسا قانون وضع کرینگے جس کے ماتحت تصویر کشی، انسانوں کی فوٹو گرافی، سنگتراشی، تاش بازی، موسیقی، رقص، اداکاری اور تمام سینما اور تھیئٹر ممنوع قرار پائیں؟

جواب۔ ان تمام مشاغل کی موجودہ صورت کو دیکھ کر تو میرا جواب اثبات میں ہے۔

مولانا عبدالحامد بدایونی اس امر کو معصیت قرار دیتے ہیں کہ اناٹومی کے پروفیسر طلبہ کو تشریح اعضا کی تعلیم دینے کے لیے مسلموں کی نعشوں پر عمل جراحی کریں۔

فوجی سپاہی اور پولیس کے سپاہی کو حق حاصل ہوگا کہ مذہبی وجوہ کی بنا پر اپنے حاکم اعلیٰ کے کسی حکم کی نافرمانی کرے اس پر مولانا ابوالحسنات کا خیال حسب ذیل ہے:۔

''میرا ایمان ہے کہ اگر کسی پولیس مین کو کسی ایسے فعل کا حکم دیا جائے جس کو ہم اپنے مذہب کے خلاف سمجھیں تو پولیس مین کا فرض ہوگا کہ حاکم کے حکم کو نہ مانے۔ اگر پولیس کی جگہ فوج کا لفظ رکھ دیا جائے جب بھی میرا جواب یہی ہوگا۔

سوال۔ کل آپ نے بیان کیا تھا کہ اگر کوئی حاکم اعلیٰ پولیس یا فوج کے کسی سپاہی کو ایسے فعل کا حکم دے جو آپ کے نزدیک مذہب کے خلاف ہو تو پولیس یا فوج کے اس سپاہی کا فرض ہوگا کہ اس حاکم کا حکم ماننے سے انکار کر دے۔ کیا آپ پولیس یا فوج کے سپاہی کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ خود ہی ایسے حکم کے متعلق فیصلہ کر لے کہ وہ مذہب کے خلاف ہے؟

جواب۔ یقیناً سے یہ حق ہے۔

سوال۔ فرض کیجیے پاکستان اور کسی دوسرے مسلم ملک کے درمیان جنگ چھڑ جائے اور فوجی سپاہی یہ محسوس کرے کہ پاکستان غلطی پر ہے اور دوسرے ملک کے کسی سپاہی پر گولی چلانا مذہب کے خلاف ہے کیا آپ ایسے سپاہی کو اپنے کمانڈنگ افسر کی نافرمانی میں حق بجانب سمجھیں گے؟

جواب ۔ایسی حالت میں فوجی سپاہی کو چاہیے کہ علما سے فتویٰ حاصل کرے۔

ہم نے اسلامی مملکت کے موضوع پر ذرا طویل بحث کی ہے۔اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہم ایسی مملکت کی مخالفت یا حمایت میں کوئی مقالہ ضبط تحریر میں لانا چاہتے تھے۔ بلکہ ہمارا محض یہ مقصد تھا کہ اگر اس نظریاتی ابتری کے صحیح اسباب صریحاً معین نہ کیے گئے جس نے فسادات کی وسعت وشدت میں اضافہ کر دیا تھا تو ان بے شمار امکانات کی ایک واضح تصویر سامنے آجائے، جو آئندہ واقع ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ابتری اور ژولیدگی موجود تھی ۔ ورنہ مسلم لیگی جن کی اپنی حکومت برسراقتدار تھی۔ اسکے خلاف کھڑے نہ ہو جاتے ۔سرکاری ملازموں کے دلوں سے وفاداری اور فرض عامہ کی بجا آوری کی حس رخصت نہ ہوگئی ہوتی ۔اور وہ اپنی ہی حکومت اور اپنے ہی افسروں کے خلاف دیوانوں کی طرح ہاؤ ہو نہ کرتے پھرتے ۔ عام آدمیوں کے دل سے انسانی جان و مال کا احترام غائب نہ ہو گیا ہوتا اور وہ ضمیر کی کسی ملامت یا تامل کے بغیر آزادانہ لوٹ مار میں مصروف نہ ہو جاتے ۔ارباب سیاست ان لوگوں کا سامنا کرنے سے احتراز نہ کرتے جنہوں نے ان کو عہدوں پر فائز کیا تھا۔اور نظم حکومت کے ذمہ دار اپنے واضح فرض کی بجا آوری میں تامل اور بے دلی محسوس نہ کرتے ۔ایک بات تو اس تحقیقات میں قطعی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ اگر ایک دفعہ عوام کو یہ یقین دلا دیا جائے کہ جو کچھ ان سے کہا جا رہا ہے وہ مذہبی اعتبار سے صحیح ہے یا مذہب نے اس کا حکم دیا ہے تو ان کو ہر عمل پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔جس میں وہ ضبط و نظم ، وفاداری، شائستگی ، اخلاق اور حس شہریت کے تمام مصالح کو آگ لگا دیں گے۔

عام آدمی پاکستان کو ایک اسلامی مملکت سمجھتا ہے۔حالانکہ ایسا نہیں ہے۔اس عقیدے کو اس مسلسل چیخ پکار سے تقویت پہنچی ہے جو اسلام اور اسلامی مملکت کے متعلق قیام پاکستان کے وقت سے اب تک مختلف حلقوں کی طرف سے مچائی جا رہی ہے۔ اسلامی مملکت کے خواب نے ہر زمانے میں مسلمانوں کو پریشان کیا ہے اور یہ اس شاندار ماضی کی یاد کا نتیجہ ہے جب اسلام دنیا کے ایک دور دست گوشے یعنی عرب کے بیابانوں سے طوفان کی طرح اٹھا اور چشم زدن میں دنیا پر چھا گیا۔ اس نے ان دیوتاؤں کو جو ابتدائے آفرینش سے انسان پر حکومت کر رہے تھے۔ان کی مسندوں سے اتار پھینکا۔صدیوں کے قدیم ادارات اور اوہام کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ ڈالا اور ان تمام تہذیبوں کا قلع قمع

کردیا جن کی بنیادیں انسان کی غلامی پر اٹھائی گئی تھیں۔ایک سوپچیس سال کی مدت انسانی تاریخ میں بلکہ کسی قوم کی تاریخ مین بھی کیا حیثیت رکھتی ہے۔لیکن اسلام اتنی مدت کے اندر اٹک سے اطلانتک اور سپین تک اور چین کی سرحد سے مصر تک پھیل گیا۔اور صحرا کے فرزندوں نے تہذیب وتمدن کے تمام پرانے مرکزوں پر قبضہ کرلیا مثلاً طیسیفون، دمشق، اسکندریہ، ہندوستان اور ان تمام مقامات پر جو سمیری اور آشوری تہذیبوں سے منسوب و متعلق تھے۔مورخین نے اکثر یہ سوال اٹھایا ہے کہ اگر معاویہ کا محاصرہ قسطنطیہ کامیاب ہوگیا ہوتا یا اگر جنوبی فرانس اور طورس کے میدانوں میں چارلس مارٹل کے خلاف جنگ کرتے ہوئے عبدالرحمٰن کے مجاہدین میں دفعتہً عربوں کی لوٹ مار کی پرانی جبلت بیدار نہ ہوگئی ہوتی تو آج دنیا کی حالت کیا ہوتی۔شاید مسلمان کولمبس سے بہت پہلے امریکہ کو دریافت کر چکے ہوتے اور ساری دنیا مسلمان ہوگئی ہوتی۔بلکہ شاید خود اسلام یورپ کے سانچے میں ڈھل گیا ہوتا۔عرب کے خانہ بدوشوں کی اس شاندار کامیابی کی کوئی مثال اس سے پیشتر دنیا نے نہ دیکھی تھی۔اور یہی وہ کامیابی ہے جس کی یاد کے باعث مسلمان ماضی کے تصورات میں غرق رہتا ہے اور اس عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے کا خواہاں ہے جو ایک زمانے میں اسلام سے وابستہ تھی۔

آج مسلمان یاد ماضی کا لبادہ اوڑھے صدیوں کا بھاری بوجھ اپنی پشت پر لادے مایوس و مبہوت ایک دوراہے پر کھڑا ہے اور فیصلہ نہیں کرسکتا کہ دونوں میں سے کس موڑ کا رخ کرے۔دین کی وہ تازگی اور سادگی جس نے ایک زمانے میں اس کے ذہن کو عزم مصمم اور اس کے عضلات کو لچک عطا کی تھی آج اس کو حاصل نہیں ہے۔اس کے پاس نہ فتوحات حاصل کرنے کے وسائل ہیں نہ اہلیت ہے اور نہ ایسے ممالک ہی موجود ہیں جن کو فتح کیا جاسکے۔مسلمان بالکل نہیں سمجھتا کہ جو قوتیں آج اس کے خلاف صف آرا ہیں وہ ان قوتوں سے بالکل مختلف ہیں جن سے اس کو ابتدائے اسلام میں جنگ کرنی پڑی تھی اور اس کے اپنے آباؤ اجداد ہی کی رہنمائی سے ذہن انسانی نے ایسے کارنامے انجام دیے ہیں جن کے سمجھنے سے وہ قاصر ہے۔لہٰذا وہ اپنے آپ کو عجیب بےبسی کی حالت میں پاتا ہے اور انتظار کر رہا ہے کہ کوئی آئے اور اسے اس بےیقینی اور ژولیدگی کی دلدل سے باہر نکلنے میں مدد دے لیکن وہ برابر یونہی انتظار کرتا رہے گا اور اس انتظار کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔صرف ایک ہی

چیز ہے جو اسلام کو ایک عالمگیر تصور کی حیثیت سے محفوظ رکھ سکتی ہے اور مسلمان کو جو آج ضد و قدامت کا پیکر بنا ہوا ہے دنیائے حال اور دنیائے مستقبل کا شہری بنا سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام کی نئی تاویل وتشکیل دلیرانہ کی جائے جو زندہ حقائق کو مردہ تصورات سے الگ کردے۔

واضح اور دلیرانہ فکر کا یہی فقدان ہے اور فہم و فیصلہ کی یہی نااہلیت ہے جس نے پاکستان میں یہ ابتری پھیلا رکھی ہے یہ ابتری برابر جاری رہے گی اور اس قسم کی صورت حالات جس کے متعلق ہم تحقیقات کر رہے ہیں بار بار پیدا ہوتی رہے گی تاوقتیکہ ہمارے لیڈر منزل مقصود کا اور اس تک پہنچنے کے ذرائع کا صاف اور واضح تصور قائم نہ کریں۔ یہ سمجھنے کے لیے کسی خاص تخیل کی ضرورت نہیں کہ ناقابل مصالحت عناصر ناقابل مصالحت ہی رہیں گے خواہ آپ کا یقین یا مقصود اس کے خلاف ہو۔ جو اصول باہم متصادم ہوں ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو گے تو نتیجہ بدنظمی اور ابتری کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ جب تک ہمارے لیڈروں میں اس امر کی خواہش اور قابلیت پیدا نہ ہوگی کہ وہ دو نظریوں کے تصادم پر کسی ایک کو منتخب کرلیں بے یقینی کی حالت برابر قائم رہے گی اگر ہم جہاں ''ریتی'' کی ضرورت ہے وہاں ''ہتھوڑا'' استعمال کرنا چاہیں گے اور اسلام سے ان عقدوں کے حل کرنے کی توقع رکھیں گے جن کو حل کرنا اس کا کبھی مقصود نہ تھا۔ مایوسی، نامرادی اور دل شکستگی برابر ہمارے شامل حال رہے گی۔ وہ مقدس دین جس کا نام اسلام ہے برابر زندہ رہے گا۔ خواہ ہمارے لیڈر اس کو نافذ کرنے کے لیے موجود نہ بھی ہوں۔ دین اسلام فرد میں، اس کی روح اور اس کے نقطہ نگاہ میں اور مہد سے لحد تک خدا اور بندوں کے ساتھ تعلقات میں زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اور ہمارے ارباب سیاست کو خواب سمجھ لینا چاہیے کہ اگر احکام الٰہی ایک انسان کو مسلمان نہیں رکھ سکتے تو ان کے قوانین یہ کام انجام نہیں دے سکتے۔

مطالبات کے متعلق خواجہ ناظم الدین کا ردعمل

ہم اس رپورٹ کے سابقہ حصوں میں بیان کر چکے ہیں کہ احمدیوں کے متعلق مطالبات کیونکر وضع کیے گئے اور پھر ''ڈائریکٹ ایکشن'' کی دھمکی کے ساتھ خواجہ ناظم الدین کے سامنے کیونکر پیش

کیے گئے۔ چونکہ خواجہ ناظم الدین نے علما کے ساتھ اکثر طویل گفتگوئیں کی ہیں۔ اس لیے سمجھ لینا چاہیے کہ دینی نقطہ نگاہ سے ان مطالبات کی صحت اور ان کے جواز کے مسئلے پر بھی ضرور بحث ہوئی ہوگی۔ خواجہ ناظم الدین ایک راسخ العقیدہ مذہبی آدمی ہیں۔ انہوں نے ان مطالبات کو بے تکلف مسترد نہیں کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کی معقولیت سے ضرور متاثر ہوئے ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں یہ بھی محسوس کر لیا ہوگا کہ مطالبات تو محض ''فانے کا پتلا سرا'' ہیں جو ٹھونکا جا رہا ہے اور اگر یہ اصول تسلیم کر لیا گیا کہ ایسے مذہبی مسائل کے متعلق بحث و فیصلہ مملکت کا کام ہے تو شاید انہیں اور بھی زیادہ دشوار مطالبات کا سامنا کرنا پڑے۔ انہوں نے یہ بھی سوچا ہوگا کہ ان مطالبات کی تہہ میں ایک لازمی مفروضہ یہ تھا کہ ایک اسلامی مملکت میں مسلموں اور غیر مسلموں کے حقوق کے درمیان بنیادی فرق ہوگا اور اس قسم کی مملکت کے معمولی فرائض میں یہ فیصلہ کرنا بھی شامل ہوگا کہ فلاں فرد یا فلاں جماعت مسلمان ہے یا نہیں۔ چودھری ظفر اللہ خان اور دوسرے احمدیوں کو جو مملکت کے اہم سرکاری عہدوں پر فائز ہیں، برطرف کرنے کا مطالبہ ایک اور پیچیدہ مسئلہ پیش کرتا تھا۔ چودھری ظفر اللہ خان بین الاقوامی دنیا میں نہایت مشہور و محترم شخصیت تھے۔ ان کی برطرفی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ اس کی وسیع اشاعت ہوتی اور اس پر بین الاقوامی تبصرے کیے جاتے اور ایسی تصریح شائع کرنا بے انتہا مشکل ہو جاتا جس سے بین الاقوامی شعور مطمئن ہو سکتا۔

قانون دستور کے ماتحت چودھری ظفر اللہ خان اور دوسرے احمدی عہدہ دار محض مذہبی عقائد کی بنا پر ملازمت سے علیحدہ نہیں کیے جا سکتے تھے کیونکہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۰ء ہی میں پاکستان کے شہریوں کے بنیادی حقوق کے متعلق ایک عبوری رپورٹ منظور کر چکی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ ہر مستند شہری مذہب، نسل، ذات، جنس اور مقام ولادت کے امتیاز کے بغیر مملکت کی ملازمت میں تقرر کا حقدار ہے اور اس امر کی ضمانت دی گئی تھی کہ آزاد ضمیر اور اپنے مذہب کے تسلیم تعمیل اور تبلیغ کا حق ہر شہری کے لیے محفوظ ہے۔ انجمن اقوام متحدہ (جس کا ممبر پاکستان بھی ہے) کی جنرل اسمبلی نے انسانی حقوق کے متعلق جو کمیشن مقرر کیا تھا اس نے انسانی حقوق کے بارے میں بین الاقوامی میثاق کا ایک مسودہ تیار کیا تھا۔ اس میثاق کی دفعہ ۱۳ کا منشا یہ ہے کہ ہر شخص کو فکر ضمیر اور مذہب کی آزادی کا حق ہوگا۔ جس میں اپنے مذہب اور عقیدے کو تبدیل کرنے اور اس مذہب یا عقیدے کو

تعلیم عمل عبادت اور ادائے رسوم میں ظاہر کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔ لہٰذا اگر یہ مطالبات منظور کر لیے جاتے تو بین الاقوامی حلقوں میں خاصا اضطراب پیدا ہو جاتا اور بین الاقوامی دنیا کی توجہ کسی نہ کسی طرح پاکستان کے واقعات کی طرف مبذول کرادی جاتی۔ اور مطالبات کی منظوری گویا اس امر کا اعلان عام سمجھی جاتی کہ پاکستان اپنی شہریت کو ان وجوہ پر مبنی قرار دے رہا ہے جو دوسری قوموں کے مقابلے بنیادی طور پر مختلف ہیں اور غیر مسلم محض اپنے عقائد مذہبی کی بنا پر پاکستان میں سرکاری عہدوں پر فائز ہونے سے محروم کیے جا رہے ہیں۔

ہندوستان پاکستان کو رسوا اور بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ لہٰذا وہ اس موقع سے بھی ضرور فائدہ اٹھاتا۔ ہندوستان میں بھی فرقہ وار مسئلہ موجود ہے وہ یقیناً پاکستان پر اس معاہدے کی خلاف ورزی کا الزام عائد کرتا جو ۸ اپریل ۱۹۵۰ء کو حکومت ہند اور حکومت پاکستان کے درمیان قرار پایا تھا اور جس کے ماتحت دونوں حکومتوں نے اقلیتوں کے افراد کو اس امر کی ضمانت دی تھی کہ ان کو اپنے اپنے ملک کی پبلک زندگی میں حصہ لینے، سیاسی اور دوسرے عہدوں پر فائز ہونے اور سول محکموں مسلح فوجوں میں ملازمت کرنے کے حقوق اکثریتوں کے افراد کے بالکل مساوی حاصل ہونگے اور یہ حقوق اس معاہدے میں بنیادی حقوق قرار دیے گئے تھے۔ اس معاہدے کی تکمیل کے وقت وزیر اعظم پاکستان نے اس قرارداد مقاصد کی طرف بھی اشارہ کیا تھا جو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے منظور کی تھی اور کہا تھا کہ اس قرارداد کی رو سے اقلیتوں کو سول کے محکموں اور مسلح فوجوں میں سرکاری عہدوں پر فائز ہونے کی ضمانت حاصل ہے۔ لیکن اب اسی قرارداد مقاصد کو علما بطور دلیل قاطع اپنے اس دعوے کی تائید میں استعمال کر رہے تھے کہ ایک اسلامی مملکت میں مسلم اور غیر مسلم رعایا کے درمیان فرق و امتیاز قرآن وسنت کی ہدایت کے مطابق بنیادی ہے اور قرآن اور سنت کے مطابق احمدیوں کو جو غیر مسلم ہیں کسی اہم عہدے پر فائز ہونے کا حق نہیں۔

ہندوستان کو احمدی مذہب یا احمدیوں سے کوئی غرض نہ تھی نہ ایسے مذہبی جھگڑوں سے کوئی سروکار تھا جن سے وہ بعافیت گزر چکا ہے۔ لیکن وہ مطالبات کی منظوری کے نتائج کو ضرور فوراً محسوس کرتا اور صحیح طور یہ مقدمہ پیش کرتا کہ اگر احمدیوں کو مملکت میں سرکاری عہدوں پر فائز ہونے کی

اجازت نہیں دی جاسکتی تو ہندوؤں کو (جن سے ہندوستان کو وابستگی ہے) کیونکر دی جائے گی۔ظاہر ہے کہ یہ تمام متعلقات خواجہ ناظم الدین کے ذہن میں موجود ہوں گے اور انھوں نے اپنے مذہبی عقائد اور ان نتائج کے درمیان جو مطالبات کی منظوری سے رونما ہوتے سخت تکلیف دہ کشمکش محسوس کی ہو گی۔لہٰذا انہوں نے علماء کے ساتھ اپنے مذاکرات کو اس امید موہوم میں طول دیا کہ وہ لوگ اپنے مطالبات ترک کردیں گے یا کوئی غیر متوقع واقعہ اس مسئلے کو حل کردے گا یا عقل انسانی اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کرلیگی۔انہیں اس امر کی ہرگز توقع نہ تھی کہ وہ علماء جو ان کے ساتھ اور ان کے رفقا کے ساتھ اس شرعی مسئلے پر طویل مذاکرات کر چکے ہیں ان کی حکومت کے خلاف ہو جائیں گے اور ایسی حرکت شروع کردینگے جس کو بغاوت سے کم نہیں سمجھا جاسکتا۔

آخر کار خواجہ ناظم الدین نے مطالبات کو رد کر دیا اور اس رد کے وجوہ بھی بیان کیے اس کے ساتھ ہی انہوں علما کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔ان گرفتاریوں پر مظاہرے ہوئے جلوس نکلے جلسے منعقد کیے گئے اور بدنظمی کی وہ کیفیت پیدا ہوئی جو ہم رپورٹ کے حصہ سوم میں پوری طرح بیان کر چکے ہیں۔سید فردوس شاہ ڈی ایس پی ۴ مارچ کی شام کو مسجد وزیر خاں کے اندر یا دروازے کے عین باہر قتل کردیے گئے۔جہاں مولانا عبدالستار خاں نیازی نے اپنے آپ کو اس شورش کا واحد حاکم و آمر بنا رکھا تھا۔۵ مارچ کو قتل اور آتش زنی اور لوٹ مار کے واقعات کی اطلاعات آنے لگیں اور پولیس کو اکثر جگہ گولی چلانی پڑی۔فوج کچھ نہ کرسکتی تھی کیونکہ اس کے ساتھ یہ مفاہمت کی گئی تھی کہ اس کا کام صرف سول کی قوت کو مدد دینا ہے وہ صرف پولیس کی معیت میں رہے گی اور کوئی حرکت بجائے خود نہ کریگی تا آنکہ کسی خاص صورتحالات کی اصلاح اس کے سپرد نہ کردی جائے۔بار بار گولی چلانے کے باوجود صورت حالات میں نہ صرف کوئی اصلاح نہ ہوئی بلکہ وہ بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔

۵ مارچ کی سہ پہر کو گورنمنٹ ہاؤس میں شہریوں کا جو اجلاس ہوا اس میں کوئی لیڈر کوئی سیاسی آدمی اور کوئی شہری اس پر آمادہ نہ ہوا کہ شہریوں سے عقل و ہوش اختیار کرنے کی اپیل دستخط کرے۔ سب خوفزدہ تھے کہ ایسا کرنے سے وہ عوام میں نامقبول ہوجائیں گے۔بلوائی ہجوم نے کوتوالی کا محاصرہ کررکھا تھا اور ۵ مارچ کی شام کو وزراء اور احکام کے اجلاس میں جو فیصلے کیے گئے ان کا مطلب

پولیس نے یہ سمجھا کہ گولی چلانا بالکل بند کر دیا جائے۔ لہٰذا بلوائی ہجوم نے کوتوالی کا محاصرہ کر رکھا اور ۶ مارچ کی صبح کو حکومت کی مشینری میں پورے سقوط کے آثار نظر آنے لگے۔ یہاں تک کہ حکومت نے طوائف الملوکی کے آگے کھلم کھلا ہتھیار ڈال دینے کا اعلان کر دیا۔ اس دن صبح کو چیف منسٹر کا بیان محض "میکیاویلیت" کا ایک نمونہ تھا لیکن یہ چال کامیاب نہ ہو سکی۔ صورت حالات بالکل قابو سے باہر ہو گئی اور شہریوں نے محسوس کیا کہ ان کے جان و مال کو سخت خطرہ درپیش ہے۔ اب فوج زیادہ دیر تک انتظار نہ کر سکتی تھی چنانچہ اس نے شہر کا چارج لے لیا۔ خلاصہ یہ ہے۔ وہ کوائف جو مارشل لا کے اعلان کے باعث ہوئے حسب ذیل تھے۔

(۱) نظم حکومت کی مشینری کامل طور پر بے اثر ہو گئی۔ سول کی قوت بالکل ناکام ہو گئی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت پنجاب نے ۶ مارچ کو مطالبات کی منظوری کا اعلان کر دیا۔

(۲) فساد و بدنظمی کی وسعت و شدت جس کی وجہ سے قوائے حکومت شل ہو گئے۔

(۳) بدنظمی کی وسعت و شدت براہ راست اس کیفیت کا نتیجہ تھی کہ حکومت کا احترام بالکل غائب ہو گیا تھا۔ مطالبات کو مذہبی شکل دے دی گئی تھی اور عوام میں یہ خیال وسیع پیمانے پر پھیلا دیا گیا تھا کہ احمدی رسول پاک صلعم کے مرتبہ عالی کو کم کر رہے ہیں اور اسلام کے ایک بنیادی عقیدے کو مضرت پہنچا رہے ہیں۔

(۴) کوئی شخص ان مطالبات کے نتائج و عواقب کا اندازہ نہ کرتا تھا اور اگر کسی کو ان کا اندازہ بھی تھا تو وہ ان کا اظہار عوام کے سامنے کرنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا کہ مبادا غیر ہر دلعزیز ہو جائے یا سیاسی حمایت کھو بیٹھے۔

(۵) یہ مطالبات بظاہر بہت معقول صورت میں پیش کیے گئے اور چونکہ ہر ایسی بات پر شدید زور دیا جاتا تھا جو کسی اعتبار سے اسلام یا اسلامی مملکت کے ساتھ بعید سے بعید تعلق بھی رکھتی ہو۔ لہٰذا کوئی شخص ان مطالبات کی مخالفت کا حوصلہ نہ کرتا تھا۔ یہاں تک کہ خود مرکزی حکومت نے بھی جس کے سامنے یہ تحریک کئی مہینے سے مع اپنے متعلقات و نتائج کے ظاہر تھی۔ اس موضوع پر ایک اعلان عام بھی جاری نہ کیا۔

حصہ پنجم

فسادات کی ذمہ داری

ذمہ داری

جو کوائف فسادات کا موجب ہوئے ان کو معلوم کرنے کے بعد اب ہم ان کی ذمہ داری عائد کرنے کے مسئلے پر گفتگو کریں گے۔ اس سلسلے میں پہلے ان جماعتوں کے خیالات و آراء کو بیان کرنا ضروری ہے جنھوں نے ہماری تحقیقاتی کاروائی میں حصہ لیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ حکومت پنجاب اور مسلم لیگ نے اس موضوع پر اپنے کوئی خیالات قائم ہی نہیں کیے۔ اول الذکر نے صرف چند سطروں کا ایک تحریری بیان دینے پر اکتفا کیا جس کا منشا یہ تھا کہ اس معاملے کے متعلق چونکہ حکومت پنجاب نے کوئی تحقیقات نہیں کی۔ اور اب اس پورے معاملے کی تفتیش کی غرض سے ایک تحقیقاتی عدالت مقرر ہو گئی ہے۔ اس لیے حکومت اس تحقیقاتی عدالت کے سامنے اپنے کوئی خیالات پیش نہیں کرے گی۔ لیکن بحث کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ پیش کردہ شہادت کی بنا پر یہ امر ثابت شدہ قرار دینا چاہیے کہ فسادات کی ذمہ دار حکومت پنجاب اور مسلم لیگ پر عائد ہوتی ہے۔ مسلم لیگ نے یہی کافی سمجھا کہ اپنی بعض منظور کردہ قراردادوں کی نقول عدالت کی معلومات کے لیے بھیج دے اور اس امر کے متعلق کوئی رائے ظاہر نہ کی کہ وہ کوائف کیا تھے جو فسادات کا موجب ہوئے اور کون کون سے افراد اور گروہ ان فسادات کے ذمہ دار ہیں۔

صدر انجمن احمدیہ ربوہ نے اپنے بیان میں فسادات کی ذمہ داری احرار، جماعت اسلامی، علما اور صوبائی و مرکزی حکومتوں پر عائد کی ہے۔ انجمن نے احرار کے خلاف یہ الزام عائد کیا ہے کہ انہوں

نے اپنی کھوئی ہوئی حیثیت کو عوام میں بحال کرنے کی غرض سے ایک مذہبی مسئلے کو استعمال کیا۔اسی قسم کے مقاصد جماعت اسلامی سے وابستہ کیے گئے ہیں اور دعویٰ کیا گیا ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلامی مملکت پر جو اصرار کیا ہے۔اس سے ان کا مدعا یہ تھا کہ مملکت میں سب سے اونچا مقام حاصل کر لیں اور اسی غرض سے جماعت اسلامی نے احرار اور دوسرے علما کے ساتھ اشتراک عمل کیا تھا۔ اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ آئندہ دستور پاکستان کے متعلق جماعت اسلامی کے آٹھ مطالبات میں اس نویں مطالبے کا اضافہ کہ احمدیوں کو دستور ہی میں ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے کسی مذہبی ضرورت سے نہیں بلکہ محض سیاسی غرض سے کیا گیا تھا۔یہی نیت علماء کی بتائی گئی ہے جنہوں نے احمدیوں کے خلاف مہم میں احراریوں کی ہم آہنگی اختیار کی۔ بیان کیا گیا ہے کہ علماء کا مقصد بھی جماعت اسلامی کی طرح بالکل یہی تھا کہ آئندہ دستور کے مذہبی پہلو پر اصرار کر کے سیاسی قوت و اقتدار حاصل کریں۔مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت کے خلاف بھی یہی الزام عائد کیا گیا ہے کہ شدید پروپیگنڈا کی وجہ سے جو طوفان عرصہ دراز سے پرورش پا رہا تھا اس کی طرف سے ان حکومتوں نے بے پروائی اختیار کیے رکھی اور اس کو روکنے کی کوئی کوشش نہ کی۔

بیان کیا گیا ہے کہ جب ۶ مارچ ۱۹۵۳ء کو چیف منسٹر نے یہ اعلان کیا کہ حکومت پنجاب مطالبات کو صحیح تسلیم کرتی ہے اور ایک صوبائی وزیر کو مرکزی حکومت کے سامنے پنجاب کا نقطہ نگاہ پیش کرنے کے لیے کراچی روانہ کر رہی ہے تو اس اعلان کی وجہ سے قانون وانتظام بالکل ختم ہو گئے اور احمدیوں کے خلاف انتہائی دہشت کا دور شروع ہو گیا۔اس بیان کے ثبوت میں قتل لوٹ مار اور آتش زنی کے متعدد واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جو لاہور میں اس اعلان کے بعد پیش آئے۔احراریوں کی رائے میں فسادات کی ذمہ داری اولاً تو بعض غیر ملکی طاقتوں پر عائد ہوتی ہے جو پاکستان کی حکمت عملی کو اپنے مفادات کے مطابق ڈھالنا چاہتی ہیں۔اس سلسلے میں برطانیہ عظمیٰ اور ریاستہائے متحدہ وامریکہ پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ زمانہ ماضی میں ان کی پالیسی مسلمانوں کے متعلق مخالفانہ رہی ہے اور انہوں نے چودھری ظفر اللہ خان کو اس مقصد کے لیے اپنا آلہ کار بنا رکھا ہے۔دوسرا فریق جس کو احرار نے فسادات کا ذمہ دار قرار دیا ہے وہ قادیانی ہیں خصوصاً مرزا بشیر الدین محمود احمد امام

جماعت احمدیہ اور چودھری ظفر اللہ خاں تیسرا فریق جو موردِ الزام ہے وہ خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان اور ان کے رفقا ہیں جن کی کمزوری اور قوت فیصلہ کے فقدان نے ایسی فضا پیدا کر دی جو فسادات کے لیے بہت موافق تھی اس الزام کا چوتھا نشانہ صوبائی حکومت اور اس کے حکام ہیں جنہوں نے قوت کے بیش از بیش استعمال سے عوام کو مشتعل کر دیا۔

مجلس عمل پنجاب کے تحریری بیانات کے مطابق فسادات کا تعلق ذیل کے وجوہ سے ہے۔

اول: احمدی تحریک اور احمدیوں کا اشتعال انگیز رویہ،

دوم: مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی طرف سے احمدیوں کے ساتھ ترجیحی سلوک۔

سوم: احمدی مسئلے کا بروقت حل تلاش کرنے میں ان دونوں حکومتوں کی ناکامی۔

چہارم: عوام کے پرامن اور آئینی مظاہروں کو فرو کرنے کے لیے بہت زیادہ قوت کا استعمال اور افسروں کا اشتعال انگیز رویہ،

پنجم: بعض احمدی افراد اور احمدیوں کی منظّم ٹولیاں جو جان بوجھ کر تشدد میں مصروف ہو گئیں تاکہ حکومت کو تحریک تحفظ ختم نبوت کے کچلنے کا بہانہ مل جائے۔

ششم: معاشرے کے وہ بدمعاش عناصر جنہوں نے اپنے مکروہ اغراض کی وجہ سے لاقانونی کی فضا پیدا کر دی۔

جماعت اسلامی نے اپنے تحریری بیان میں فسادات کی ذمہ داری اولاً خود احمدیوں پر اور ثانیاً مرکزی اور صوبائی دونوں حکومتوں پر عائد کی ہے۔ احمدیوں کے خلاف الزام ثابت کرنے کی کوشش میں جماعت نے مختصر لیکن مکمل طور پر ذیل کے امور کا حوالہ دیا ہے: احمدیوں کے مخصوص عقائد، جماعت احمدیہ کے بانی اور ان کے پیروؤں کی تحریریں اور تقریریں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ بے حد اشتعال انگیز اور مسلمانوں کے مذہبی حسیات کو مجروح کرنے والی ہیں۔ احمدیوں کی انقطاع پسندانہ اور غیر وفادارانہ سرگرمیاں اور اس امر کی مسلسل کوشش کہ عام ملت مسلمہ میں سے ایک علیحدہ اور منظّم جماعت کو الگ کر لیا جائے جو ملت سے کوئی وجہ اشتراک نہ رکھتی ہو اور فی الحقیقت ملت کے اتحاد کے لیے خطرہ بن جائے۔ حکومت کے خلاف یہ الزام ہے کہ اس نے اس معاملے میں کمزور غیر دانشمندانہ

اور متزلزل سی پالیسی اختیار کیے رکھی جس سے نہ صرف عوام بلکہ حکام میں سخت پریشانی اور ابتری پیدا ہوئی۔حکومت پر یہ الزام بھی عائد کیا گیا ہے کہ اس نے کئی مہینے تک پریس اور پلیٹ فارم پر مطالبات کی حمایت میں ایک تیز وتند شورش کو روا رکھا۔ حالانکہ وہ مطالبات ایک طرف تمام مسلمانوں اور دوسری طرف احمدیوں کے درمیان ایک صاف اور واضح مناقشے کی صورت اختیار کر چکے تھے۔اگر چہ علمانے جن میں امیر جماعت اسلامی بھی شامل تھے۔حکومت کو اس نازک صورت حالات کا احساس دلانے کی انتہائی کوشش کی جس کا لاوا بالکل پھٹنے کے قریب پہنچ چکا تھا لیکن حکومت برابر تغافل اور عدم فیصلہ کی پالیسی پر قائم رہی اور یہ نہ محسوس کیا کہ یہ مطالبات تمام مسلمانوں کے متفقہ مطالبات ہیں اور جب حکومت نے دفعتہً قلابازی لگائی اور ۲۷ فروری کو کراچی میں علماء کی گرفتاری کا حکم دے دیا پھر وسیع پیانے پر گرفتاریوں کی پالیسی اختیار کی اور دفعہ ۱۴۴ اور بیش از بیش قوت کا ستعال کیا تو یہ تو امور فسادات میں قطعاً اضافے کا باعث ہوئے۔ جماعت اپنے آپ کو ''ڈائریکٹ ایکشن'' سے بالکل بری اور بے تعلق ظاہر کرتی ہے۔اس کا بیان ہے کہ اس نے کبھی اس طرز عمل کی تائید نہیں کی اور اس اصول پر مصر ہے کہ ایک جمہوری ملک میں جب کوئی عمومی مطالبہ اتنی اہمیت اختیار کر جائے جتنی موجودہ حالت میں احمدیوں کے خلاف تحریک نے اختیار کر لی تھی تو اس کے مالہ وماعلیہ پر غور کر کے اس کا سامنا کرنا اور کسی فیصلے پر پہنچنا اشد ضروری ہے۔

مسٹر دولتانہ نے معزول وزارت کی جانب سے مندرجہ ذیل وجوہ کو اس صورت حالات کا ذمہ قرار دیا۔

(۱) مسلمانوں میں احمدیوں کی مخالفت کا قدیم جذبہ

(۲) خود احمدیوں کا کوتاہ نظرانہ رویہ جنھوں نے دوسرے مسلمانوں سے اپنے اختلافات کو کم کرنے کے بجائے ان کا اعلان عام کیا اور ان پر مصر رہے۔

(۳) پاکستان کے قومی نظریے کی مبہم مذہبی اساس جس پر موقع بے موقع زور دینے کی وجہ سے ملائیت کو تقویت پہنچی اور سیاسی اصولوں کے متعلق ملا کے طرز عمل کو مقبولیت حاصل ہوئی۔

(۴) احراریوں کی طرف سے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے ایک خطرناک صورت

حالات کا استعمال۔

(۵) شورش میں علما کے عام گروہ کی شرکت۔

(۶) فسادات کے پھوٹ پڑنے کے بعد شوریدہ سروں، پیشہ ور بدمعاشوں اور اسی قسم کے دوسرے عناصر کی سرگرمیاں۔

(۷) مرکزی حکومت کی قیادت جو لوگوں کی رہنمائی کرنے میں نا کام رہی۔

مسٹر دولتانہ نے فسادات کے ضمنی وجوہ میں ان چیزوں کو بھی بیان کیا ہے معاشرے کے تمام حصوں گہری بے اطمینانی، معاشی حالات کی روز افزوں اور سریع خرابی، خوراک کی بہم رسانی میں خلل، قومی مسائل مثلاً کشمیر جونا گڑھ اور ہندوستان سے تعلقات کا مسئلہ، دستور مسائل کے متعلق رویہ حکومت کی آئندہ شکل کے معین کرنے میں تاخیر، حکومت کے نظم ونسق کے خلاف شکایات، لیڈروں پر اعتماد کا فقدان اور ہر حلقے میں عام دل شکستگی اور بے حوصلگی لاہور اور بیرونجات کے جن افسروں نے تحریری بیانات داخل کیے ہیں ان میں سے اکثر نے احرار کو اور ان ملاؤں کو مورد الزام قرار دیا ہے جو شورش کی آگ کو ہوا دینے کے لیے احراریوں کے ساتھ ہو گئے تھے۔ بعض حکام نے مرکزی حکومت کے تغافل پر بھی تبصرہ کیا ہے جس نے عوام کی بروقت اور صحیح رہنمائی نہ کی۔ چند افسروں نے احمدیوں کو بھی واقعات کے لیے ذمہ دار قرار دیا ہے۔

آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کراچی
اور آل مسلم پارٹیز کنونشن لاہور

فسادات کی ذمہ داری ابتدأ آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کراچی اور آل مسلم پارٹیز کنونشن لاہور کے ممبروں پر اور ان بے شمار مذہبی انجمنوں پر عائد ہوتی ہے جن کے ممبر اپنی انجمنوں کے نمائندوں کی حیثیت سے ان کنونشنوں میں شامل ہوئے ''ڈائریکٹ ایکشن'' اختیار کرنے کی قرارداد پر عمل درآمد کرنے کے لیے ایک مرکزی مجلس عمل مرتب کرنے کا فیصلہ بھی اسی کنونشن میں کیا گیا۔ مجلس

عمل کا آئین اسی دن شام کو مکمل کر لیا گیا اور مجلس عمل کے مقرر کیے ہوئے ایک وفد کی وساطت سے ۲۲ جنوری کو خواجہ ناظم الدین کو یہ الٹی میٹم دے دیا گیا کہ مطالبات کو تسلیم کریں یا اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائیں اس وقت تک اس بات کا فیصلہ نہ ہوا تھا کہ مطالبات منظور نہ ہونے کی صورت میں ''ایکشن'' کی نوعیت کیا ہوگی اور نہ خواجہ ناظم الدین نے الٹی میٹم دینے والے ارکان وفد سے انٹرویو کے دوران میں اس کے متعلق کوئی سوال کیا۔

یہ الٹی میٹم ایک غیر فوجی بغاوت کے نوٹس سے کم نہ تھا اور فیصلہ یہ تھا کہ اگر اس الٹی میٹم کا جواب مجلس عمل کے نزدیک قابل اطمینان نہ ہو تو مجلس اس بغاوت کے آغاز، اس کی تنظیم اور اس کی ہدایت کاری کی ذمہ دار ہوگی۔ مجلس کا بیان یہ ہے کہ مطالبات کے مسترد ہونے کی صورت میں جس عمل کا فیصلہ کیا گیا تھا وہ نہ ''ڈائریکٹ ایکشن'' تھا نہ ''براہ راست اقدام'' تھا جس سے صرف یہ مقصود تھا کہ مطالبات رد ہونے پر عوامی بے اطمینانی کا کاملاً بے ضرر پر امن اور آئینی مظاہرہ کیا جائے اس بات کا قصد کبھی نہ تھا کہ یہ مظاہرہ سول بغاوت یا سول نافرمانی کی نوعیت اختیار کرے۔ اور اگر تحریک کے لیڈر جو اقدام کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنے والے تھے گرفتار نہ کر لیے جاتے تو ''ڈائریکٹ ایکشن'' کا قدرتی نتیجہ فسادات کی صورت میں رونما نہ ہوتا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ لیڈروں کی گرفتاری کا نتیجہ تھے اس لیے جو فسادات ان مظاہروں کے بعد ہوئے وہ انہی گرفتاریوں کی وجہ سے ہوئے اور ان کے لیے صوبائی حکومت اور مرکزی حکومت ذمہ دار ہیں لیکن یہ دعویٰ بالکل ناقابل قبول ہے اگر کسی حکومت کو یہ دھمکی دی جائے کہ اگر اس نے فلاں فلاں مطالبات فلاں تاریخ تک تسلیم نہ کر لیے تو مطالبات کرنے والی جماعت حکومت کے خلاف ''ڈائریکٹ ایکشن'' کرے گی۔ اور حکومت ان مطالبات سے اتفاق نہ کرتے ہوئے اس قسم کی دھمکی دینے والی جماعت کو گرفتار کر لے اور ان گرفتاریوں کی وجہ سے فسادات برپا ہو جائیں تو اس جماعت کو نہ یہ کہنے کی اجازت دی جا سکتی ہے اور نہ اس کے لیے یہ کہنا زیبا ہے کہ اگر گرفتاریاں نہ ہوتیں تو فسادات نہ ہوتے ''ڈائریکٹ ایکشن'' کی دھمکی ایک قائم شدہ حکومت کو دھمکی دینا ہے اور کوئی حکومت جو صحیح معنوں میں حکومت ہو اس قسم کی دھمکی کی طرف سے بے پروا نہیں ہو سکتی۔ سوائے اس حالت کے کہ وہ اس دھمکی کا سامنا

کرنے کی جرات نہ رکھتی ہو اور ہتھیار ڈال دینے اور اقتدار سے دست بردار ہو جانے پر آمادہ ہو جائے۔ تاہم موجودہ معاملے میں خواجہ ناظم الدین نے جو احمدیوں کے خلاف جذبے کی قوت سے پوری طرح باخبر تھے ان وجوہ کی ظاہری معقولیت سے بھی واقف تھے جن کی بنا پر یہ مطالبات پیش کیے گئے تھے۔ علما سے بحث کرنے اور انہیں وہ مشکلات سمجھانے کی ہر امکانی کوشش کی جو مطالبات کی منظوری میں حائل تھے اور وہ نتائج بھی بتائے جو اس منظوری سے رونما ہونے والے تھے۔ اگر چہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ ناظم الدین اور بعض علماء کے درمیان بڑی حد تک باہمی مفاہمت اور شاید اشتراک جذبات بھی موجود تھے لیکن نہ خواجہ ناظم الدین اور نہ علما کی مہارت اس عقدے کا کوئی حل تلاش کر سکی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۶ فروری کو مجلس عمل نے گورنر جنرل اور وزیر اعظم کی کوٹھیوں پر رضا کاروں کے دستے بھیجنے کا فیصلہ کر دیا۔ اگر چہ ایک مضبوط اور صاحب عزم حکومت علماء کے فیصلہ کردہ طرز عمل کی حماقت و شرارت کو محسوس کرنے کے بعد اس سے پہلے بھی گرفتاریاں کرنے میں حق بجانب ہوتی لیکن اب تو علما کو گرفتار کرنا بالکل ہی ناگزیر ہو گیا۔ اور ان گرفتاریوں کے ساتھ ہی احتجاجی مظاہرے اور فسادات شروع ہو گئے۔

اگر گرفتاریاں نہ کی جاتیں تو بھی بدنظمی اور لاقانونی ضرور برپا ہوتی۔ یہ ایک حقیقت ہے جس سے صرف اس تحریک کے علمبردار ہی انکار کر سکتے ہیں۔ وہ تمام لوگ جو اس تحریک سے متعلق یا اس کے ذمہ دار تھے، خوب جانتے تھے کہ ایسے نتائج ضرور رونما ہوں گے۔ پنجاب میں جو اس تحریک کا مرکز تھا ہزار ہا رضا کار بھرتی ہو چکے تھے اور انکی تعداد پچاس ہزار کی اس مقررہ تعداد سے بڑھ چکی تھی جس کے بھرتی کرنے کا ذمہ صاحبزادہ فیض الحسن نے لے رکھا تھا۔ ان رضا کاروں سے حلف ناموں پر دستخط کرائے جا چکے تھے۔ بے اندازہ سرمایہ فراہم کیا جا چکا تھا اور اضلاع کی مجالس عمل اور ان کے ڈکٹیٹروں کی فہرستیں تیار ہو چکی تھیں تا کہ یکے بعد دیگرے گرفتار ہوتے چلے جائیں۔ تحریک کو منظم کرنے والوں کے سامنے ملتان اور کراچی کی نظیریں موجود تھیں۔ اور ان میں سے اکثر خود اس کا تجربہ رکھتے تھے کہ ایسے موقعوں پر کیا ہوا کرتا ہے۔ لیڈروں کی عام تقریروں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اگر حکومت ڈائریکٹ ایکشن کی دھمکی کے آگے سر نہ جھکائے گی تو اس سے کس قدرتی نتیجے کی توقع

ہے اور الٹی میٹم دینے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی عوام سے جو اپیلیں کی جاتی تھیں ان میں گولیوں کا اور خون کا، رسول پاکؐ کی ناموس پر جانیں قربان کرنے کا، کفن کا، آگ کا، شعلہ ریزی کا اور تقسیم سے پیشتر ہندو مسلم فسادات کے ایام کا نہایت پر معنی ذکر موجود تھا جن لوگوں نے ان جذبات وحسیات کا اظہار کیا تھا وہ ہم سے یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ ہم ان کا یہ دعویٰ تسلیم کر لیں گے کہ انہیں ان واقعات کی توقع نہ تھی جو بعد میں پیش آئے نہ انہیں کبھی ایسے نتائج کا اندیشہ ہوا تھا حالانکہ یہ نتائج ان کے اپنے افعال سے پیدا ہوئے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ رضا کاروں کے دستے چوری چھپے جانے والے تھے تاکہ کوئی ہجوم ان کے ساتھ نہ ہو جائے یہ ایک ایسی صورت ہے جو وہ لوگ ہرگز پیش نہیں کر سکتے جن کی سرگرمیوں کی بنیاد ہی عوامی شورش اور پروپیگنڈا پر تھی۔ اس کی شہادت اس امر سے ملتی ہے کہ نہ صرف ۱۶ سے ۱۸ جنوری تک کراچی میں کنونشن کے جلسے کے وقت بلکہ ڈائریکٹ ایکشن سے پہلے دن کی شام کو بھی لوگوں کا بہت بڑا ہجوم جمع ہو گیا تھا اسی شام کو یہ اعلان کیا گیا کہ اگلے دن صبح کو ایک جلسہ عام ہو گا جس میں حکومت کے ساتھ ہونے والے مذکرات کا نتیجہ سنایا جائے گا۔ اور اگر وہ مذاکرات ناکام ہوئے تو آئندہ کے لیے اصلی پروگرام کا اعلان کیا جائے گا۔

ہمارے سامنے جو شہادت پیش ہوئی ہے اس سے ظاہر ہے کہ جب مجلس عمل کے ممبروں نے خواجہ ناظم الدین کو الٹی میٹم دینے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت ان کو خوب معلوم تھا کہ اگر مطالبات رد کر دیے گئے اور ''ڈائریکٹ ایکشن'' پر عمل درآمد شروع ہو گیا تو نتیجہ یہ ہو گا کہ بڑے پیمانے پر فسادات برپا ہو جائیں گے۔ جن میں آتش زنی، خونریزی اور شدید قسم کی عام بدنظمی شامل ہو گی۔ چونکہ واقعات نے بالکل وہی صورت اختیار کی جو متوقع تھی۔ لہٰذا ان فسادات کی ذمہ داری برارہ راست اس مجلس کے ممبروں پر عائد ہوتی ہے اور چونکہ مجلس عمل بہت سی مذہبی انجمنوں اور مذہبی رہنماؤں کے کارندے کی حیثیت سے کام کر رہی تھی۔ اس لیے جو اشخاص یا گروہ اس کراچی کنونشن کے ممبر تھے۔ جس نے ڈائریکٹ ایکشن کی قرارداد ایں منظور کی تھی۔ وہ سب کے سب فسادا اور اس کے نتائج ذمہ دار ہیں۔ آل مسلم پارٹیز کنونشن لاہور کے ممبر اس لیے ذمہ دار ہیں کہ انہوں نے ''ڈائریکٹ ایکشن'' کی

قرارداد منظور کی۔ وزیراعظم کو الٹی میٹم دینے کی تائید کی اور ڈائریکٹ ایکشن کے پروگرام کا سارا ساز وسامان فراہم کیا۔

بے شمار مذہبی انجمنوں اور واعظوں کی ذمہ داری کا تعین کرنے میں ہم نے نیابتی مسئولیت کے مسلمہ اصول اور کارفرما اور کارندے کے تعلقات کے متعلقہ قانون پر عمل کیا ہے۔ جو مجالس عمل آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کراچی اور آل مسلم پارٹیز کنونشن لاہور نے مقرر کی تھیں۔ وہ اپنی اپنی کنونشن کی نمائندہ اور کارندہ تھیں۔ اور جو فعل کسی مجلس نے کیا بشرطیکہ وہ فعل مجلس کے دائرہ اختیار میں تھا۔ اس کی ذمہ داری اس کے کارفرما پر عائد ہوتی ہے۔ کنونشن کے ممبروں نے ڈائریکٹ ایکشن کی قرارداد کی منظوری اور اس قرارداد پر عمل درآمد کے لیے مجلس عمل کا تقرر کر کے مجلس کو پورا اختیار دے دیا کہ وہ اس قرارداد کو عمل میں لانے کے ذرائع طے کرے۔ اس اعتبار سے مجلس کے تمام اعمال اس کنونشن کے اعمال تھے جس نے اس کو مقرر کیا تھا۔ لہٰذا جب تک کنونشن کا کوئی ممبر ڈائریکٹ ایکشن سے اپنی بے تعلقی کا علے اعلان اظہار نہ کرے وہ ڈائریکٹ ایکشن کے طبعی نتائج کا بالکل مجلس ہی کی طرح ذمہ دار ہے۔

پارلیمنٹ میں بجٹ پر عام مباحثے کے دوران میں خواجہ ناظم الدین نے بظاہر امر واقعہ کی حیثیت سے یہ بیان کیا کہ مختلف مذہبی انجمنوں کے بعض ممتاز علما نے باوجود اس کے کہ وہ مجلس عمل کے ممبر تھے اور انہوں نے احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے مطالبے کی تائید کی تھی ڈائرکٹ ایکشن کے پروگرام سے بے تعلقی اختیار کر لی ہے اور اگر اس حقیقت کی کافی وسیع اشاعت کی جاتی تو بعض علما اور مسجد کے بعض امام ہرگز تحریک میں حصہ نہ لیتے۔ لیکن ہمارے روبرو اس امر کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ کسی انجمن یا کسی شخص نے جو کراچی یا لاہور کی کنونشن کا ممبر تھا ڈائریکٹ ایکشن کی تحریک سے علے الاعلان بے تعلقی کا اظہار کیا ہو۔ اور اس قسم کے اظہار بے تعلقی کی عدم موجودگی میں سمجھنا ہرگز موزوں نہیں کہ دونوں کنونشوں میں سے کسی کے ممبر علماء میں سے کسی نے (اور کس نے) اس لائحہ عمل سے اختلاف کیا تھا جس کا فیصلہ مجلس عمل نے کیا تھا۔ اس مجلس عمل نے جو خود انہوں نے اس مقصد سے مقرر کی تھی۔ اور جس کے افعال کی ذمہ داری نہ صرف قانون کے رو سے بلکہ کردار انسانی کے عام اصولوں کے رو سے بھی انہی پر عائد ہوتی ہے۔

تعلیمات اسلامی بورڈ کے ممبر

یہ امر بے حد تعجب انگیز ہے کہ تعلیمات اسلامی کا بورڈ بھی جو ایک حکومت ادارہ ہے۔ اس ڈائریکٹ ایکشن کے کاروبار میں از سرتاپا کود پڑا۔ مولانا سلیمان ندوی (صدر) مولانا ظفر احمد انصاری (سیکرٹری) اور مولانا محمد شفیع ممبر بورڈ ان قراردادوں میں شامل تھے جو ڈائریکٹ ایکشن اور مجلس عمل کے قیام کے متعلق منظور کی گئی تھیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہ تمام حضرات حکومت کے ملازم ہیں اور معقول مشاہرے وصول کرتے ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ علما اپنی ہی دنیا میں زندگی بسر کرتے ہوں اور سب امور کو اپنے ہی معیاروں پر جانچتے ہوں لیکن کوئی ایسا اصول ہم کو کسی نے اب تک نہیں سمجھایا جس کے ماتحت کوئی شخص دیانت داری سے حکومت کا ملازم بھی رہے، سرکاری خزانے سے معقول تنخواہ بھی وصول کرے اور اس کے ساتھ ہی ایک ایسی تحریک میں بھی شامل ہو جو اسی حکومت کے خلاف بغاوت سے کم نہ ہو۔ اگر یہ حضرات قادیانی مسئلے پر اتنے ہی مضطرب تھے تو انہیں اپنی ہی حکومت کے خلاف ڈائریکٹ ایکشن کی قرارداد میں شریک ہونے سے پہلے دیانت دار آدمیوں کی طرح اس حکومت سے تعلق منقطع کر لینا چاہیے تھا۔ ان میں سے کسی نے علے الاعلان یہ کہنے کی جرأت نہ کی کہ وہ ڈائریکٹ ایکشن کے خلاف ہے نہ اس ہنگامے کی مذمت کی۔ جو اس اقدام کے نام پر برپا کیا جارہا تھا جس حالت میں ایسا کوئی اعلان موجود نہیں وہ بھی کنونشن کے دوسرے ممبروں ہی کی طرح فسادات کے ذمہ دار ہیں۔

جماعت اسلامی

جماعت اسلامی کی ذمہ داری کے مسئلے پر بحث کرنے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ اس جماعت کے اغراض و مقاصد اور اس کی سرگرمیوں کے دائرے کا مختصر حال بیان کر دیا جائے۔ جماعت اسلامی تقسیم سے پہلے موجود تھی۔ اس کا صدر مقام پٹھان کوٹ ضلع گورداسپور میں تھا اور

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اس کے بانی تھے، تقسیم کے بعد مولانا پاکستان چلے آئے اور انہوں نے ۱۹۵۲ء میں جماعت اسلامی پاکستان کے لیے ایک نیا آئین وضع کیا۔ ہندوستان کی جماعت اسلامی اب تک کام کررہی ہے اوراس کا اپنا علیحدہ آئین ہے۔

جماعت اسلامی کا نظریہ نہایت سادہ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا بھر میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم کی جائے جس کا دوسرے الفاظ میں یہ مطلب ہے کہ ایک ''دینی سیاسی'' نظام قائم کیا جائے جس کو جماعت ''اسلام'' کہتی ہے۔ اس نصب العین کے حصول کے لیے وہ نہ صرف پروپیگنڈا کوضروری سمجھتی ہے بلکہ آئینی ذرائع سے اور (جہاں ممکن ہو وہاں قوت سے) سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی خواہاں ہے جو حکومت جماعت کے تصور پر مبنی نہ ہو مثلاً جہاں اس کی بنیاد قومیت پر ہو، مولانا امین احسن اصلاحی کے نزدیک ''شیطانی حکومت'' اور خود مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے نزدیک کفر ہے اور تمام لوگ جو ایسی حکومت میں ملازمت یا کسی دوسری حیثیت سے حصہ لے رہے ہیں یا رضا مندی سے اس نظام کی اطاعت کرتے ہیں وہ گنہگار ہیں۔ لہٰذا جماعت مسلم لیگ کے تصور پاکستان کی علی الاعلان مخالف تھی اور جب سے پاکستان قائم ہوا ہے۔ جس کو ''ناپاکستان'' کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔ یہ جماعت موجودہ نظام حکومت اور اس کے چلانے والوں کی مخالفت کر رہی ہے۔ ہمارے سامنے جماعت کی جو تحریریں پیش کی گئی ہیں ان میں سے ایک بھی نہیں۔ جس میں مطالبہ پاکستان کی حمایت کا بعید سا اشارہ بھی موجود ہو۔ اس کے برعکس یہ تحریریں جن میں کئی ممکن مفروضے بھی شامل ہیں۔ تمام مخالف ہیں جس میں پاکستان وجود میں آیا اور جس میں اب تک موجود ہے۔ ایک فوجی عدالت میں اس جماعت کے بانی نے یہ بیان کیا کہ مسلح بغاوت کے سوا جماعت کا عقیدہ اور مقصد یہ ہے کہ موجودہ نظام حکومت کو توڑ کر جماعت اسلامی کے تصور کے مطابق حکومت قائم کی جائے۔ جماعت کے رئیس کو امیر کہتے ہیں اور اگرچہ اسکی رکنیت محدود ہے جس میں آج کل صرف ۹۹۹ ممبر شامل ہیں لیکن جماعت کی نشر و اشاعت کی مشینری خاصی وسیع ہے۔

ہم کسی موقع پر یہ بیان کر چکے ہیں کہ تین مطالبات مذہب پر مبنی بتائے جاتے ہیں۔ جماعت نے اور مولانا ابوعلیٰ مودودی نے اس سے انکار نہیں کیا لیکن دونوں نے احمدیوں کو اقلیت قرار

دینے اور ان کو کلیدی اسامیوں سے برطرف کرنے کی بہت سے دوسرے وجوہ پر بھی زور دیا ہے۔ ان وجوہ کے اظہار میں گویا یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ ان مطالبات کا ایک سیاسی و مجلسی پہلو بھی ہے۔ اب اگر یہ خیال درست ہو اور مطالبات کے مذہبی پہلو کو فی الحال نظر انداز کر دیا جائے۔ اور یہ معلوم ہو کہ جماعت ڈائریکٹ ایکشن کے فیصلے میں شریک تھی تو جماعت کا موقف یہ سمجھنا چاہیے کہ اگر حکومت کسی عوامی مطالبہ کو منظور نہ کرے یا اس پر غور کرنے کو تیار نہ ہو تو تمام آئینی ذرائع کو بالائے طاق رکھ کر حکومت کو سول بغاوت کا الٹی میٹم دے دینا چاہیے۔ ہمارے نزدیک اس موقف کو کوئی شائستہ حکومت برداشت نہیں کرسکتی۔ جسکو یقین ہو کہ وہ محض قوت کے بل پر نہیں بلکہ جمہور کی مرضی سے برسر اقتدار ہے اور جب کبھی ایسی حکومت کو ایسی صورت کا سامنا ہو۔ اس کا یہ واضح فرض ہے کہ الٹی میٹم کو رد کر دے۔ اور اس کی دھمکی کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے تمام امکانی وسائل کام میں لائے اگر جماعت اسلامی کے نزدیک ان مطالبات کے وجوہ مجلسی اور سیاسی نوعیت رکھتے تھے تو اس کے لیے واضح راہ عمل یہی تھی کہ وہ آئینی تحریک شروع کرتی۔ دستور ساز اسمبلی کے خیالات تبدیل کرنے کی کوشش کرتی یا آئندہ انتخابات تک انتظار کرتی اور اسی مسئلے پر الیکشن کی جنگ لڑتی موجودہ حالت میں ہمارے تمام معاملات غیر حل شدہ حالت میں ہیں اس حالت میں حکومت کے سینے پر پستول رکھ کر اسے کسی مطالبے کو پورا کرنے یا کوئی خاص طرز عمل اختیار کرنے پر مجبور کرنا نہ صرف غیر آئینی بلکہ صاف طور پر وطن دشمنی کا فعل ہے۔ اور یہ طریقہ صرف وہی جماعت اختیار کرسکتی ہے جو حکومت کی مشکلات میں اضافہ کرنے کی خواہاں ہو۔ اگر یہ مطالبات مذہبی وجوہ پر مبنی قرار دے کر پیش نہ کیے جاتے تو ظاہر ہے کہ کوئی بحران پیدا نہ ہوتا کیونکہ اس حالت میں حکومت ان مطالبات کو پیش کرنے والے فریق سے یہ خواہش ظاہر کرتی کہ وہ اپنے دعوے کو دلائل سے ثابت کرے تاکہ ان لوگوں کے خلاف مناسب اقدام کیا جاسکے جو مملکت کے خلاف سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک مطالبہ یہ کہ احمدیوں کو کلیدی عہدوں سے برطرف کیا جائے اور اس کی بنیاد صرف مذہب پر تھی کیونکہ چونکہ چودھری ظفر اللہ خان کے سوا کوئی احمدی کسی کلیدی عہدے پر فائز نہیں ہے اور خود جماعت اسلامی کلیدی عہدے کی یہ تعریف کرچکی ہے کہ وہ عہدہ جس کا کام پالیسی وضع کرنا ہو۔

مولانا امین احسن اصلاحی سے سوال کیا گیا کہ جب احمدیوں کو کلیدی عہدوں برطرف کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو ان سے کون سے دوسرے عہدے مراد ہیں تو وہ کسی ایسے عہدے کا نام نہ لے سکے جس پر کوئی احمدی فائز ہو۔ اسی طرح اگر چودھری ظفر اللہ خان کی موقوفی کا مطالبہ اس بنا پر کیا جاتا کہ ان کی سرگرمیاں مملکت کے مفاد کے لیے مضر ہیں تو حکومت ان کے احمدی ہونے کے علاوہ اس امر کا قطعی ثبوت طلب کرتی کہ وہ بعض ایسی سرگرمیوں میں مصروف ہیں جن کا علم وزیر اعظم کو نہیں ہے۔ اور جن سے مملکت کو ایسا نقصان پہنچ رہا ہے کہ ان کی برطرفی ضروری ہو گئی ہے۔ لہٰذا فسادات کے لیے جماعت کی ذمہ داری کے متعلق واحد سوال یہ ہے کہ آیا دوسری جماعتوں کی طرح جماعت اسلامی بھی اس فیصلے کی حامی تھی کہ اگر حکومت نے ان مطالبات کو جو بعض مذہبی عقائد پر مبنی بتائے جاتے تھے تسلیم نہ کیا تو اس کے خلاف ڈائریکٹ ایکشن شروع کر دیا جائے گا؟

جماعت اسلامی فسادات کی ذمہ داری قبول کرنے سے اس بنا پر انکار کرتی ہے کہ اس نے ڈائریکٹ ایکشن کی یا ایسے اقدام کے فیصلے کی تعمیل کے لیے کسی پروگرام کی کبھی حمایت نہیں کی۔ مجلس عمل، احرار اور احمدی جماعت اسلامی کے اس بیان کی تردید کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ معین کرنا ضروری ہے کہ آیا فسادات کی کوئی ذمہ داری جماعت پر بھی عائد کی جاسکتی ہے یا نہیں۔ ایک طرف جماعت اسلامی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے بیان اور دوسری طرف مجلس احرار اور مجلس عمل کے اظہار کے درمیان جو فرق ہے وہ اس رپورٹ کے ایک سابقہ حصے میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ اس امر سے جماعت اسلامی اور مولانا مودودی نے انکار نہیں کیا کہ ڈائریکٹ ایکشن کی قرارداد کراچی میں ۱۸ جنوری کو کنونشن کے ایک جلسے میں منظور کی گئی تھی جس میں مولانا خود موجود تھے۔ اس مجلس میں ایک اور قرارداد بھی منظور کی گئی جس کے ماتحت پندرہ ممبروں کی ایک مجلس عمل مرتب کی گئی جن میں سے آٹھ اسی وقت اتفاق رائے سے نامزد کر دیے گئے۔ اس مرحلے تک تو جماعت اسلامی اور مجلس عمل اور احرار کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ اختلاف اس مرحلے سے شروع ہوتا ہے جب اسی دن شام کو مجلس عمل کے ان آٹھ ممبروں کا اجلاس ہوا جو کنونشن میں چنے گئے تھے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور انکی جماعت کا بیان ہے کہ اس اجلاس کی کوئی اطلاع مولانا مودودی کو نہیں دی گئی حالانکہ وہ کراچی

میں موجود تھے۔ اس اجلاس میں نہ مولانا نے نہ جماعت اسلامی کے کسی نمائندے نے شرکت کی بلکہ وہ آٹھ ممبر بھی جو صبح منتخب ہوئے تھے سارے کے سارے حاضر نہ تھے جس میں خواجہ ناظم الدین کو الٹی میٹم دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ لہٰذا مجلس عمل خواجہ ناظم الدین کو الٹی میٹم دینے کا فیصلہ کرنے کی مجاز نہ تھی۔ اس لیے جماعت اسلامی اور مولانا مودودی ان واقعات کے ذمہ دار نہیں ہیں جو الٹی میٹم دینے کا فیصلہ کے بعد رونما ہوئے۔

اگرچہ شہادت سے ثابت ہے اور مجلس عمل اور احرار نے بھی تسلیم کیا ہے کہ ۱۸ جنوری کو کنونشن کے اجلاس میں جو لوگ مجلس عمل کے ممبر منتخب ہوئے تھے وہ سب کے سب مجلس عمل کے اس اجلاس میں شریک نہ تھے جو شام کو منعقد ہوا تھا۔ اور خواجہ ناظم الدین کو الٹی میٹم دینے کا فیصلہ شامل کردہ سات ممبروں کی غیر حاضری میں ان کی اطلاع کے بغیر کیا گیا تھا۔ احرار اور نمائندگان مجلس عمل کا یہ دعویٰ ہے کہ مجلس عمل کے اس اجلاس میں جماعت اسلامی کا ایک نمائندہ شامل ہوا تھا اور چونکہ اس نے الٹی میٹم کے فیصلے کو منظور کیا تھا۔ لہٰذا وہ منظوری جماعت اسلامی کی سمجھنی چاہیے۔ مولانا ابوالاعلی مودودی ان آٹھ ممبروں میں شامل تھے جو کنونشن میں منتخب کیے گئے تھے اور احرار کے ایک طلب کردہ گواہ سید مظفر علی شمسی کا بیان ہے کہ ڈائریکٹ ایکشن کی قرارداد مجھے حافظ کفایت حسین، ماسٹر تاج دین انصاری، مولانا عبدالحامد بدایونی اور خود مولانا مودودی نے لکھوائی تھی۔ شمسی کا یہ بیان بھی ہے کہ کنونشن میں اس امر کا اعلان کیا گیا تھا کہ مجلس عمل کے آٹھ نامزد ممبروں کا ایک اجلاس شام کے آٹھ بجے دفتر تحریک ختم نبوت میں منعقد ہوگا۔ گواہ نے یہ بھی کہا کہ اسی دن مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک دعوت طعام کے موقع پر کہا کہ وہ مجلس عمل کے اجلاس شام میں شریک نہ ہوسکیں گے کیونکہ انہیں ایک ضروری کام ہے اور یہ بھی بتایا کہ جماعت کی جانب سے مولانا سلطان احمد امیر جماعت اسلامی کراچی وسندھ اس مجلس کے اجلاس میں شریک ہوں گے۔ جب اسی دن شام کے آٹھ بجے دفتر تحریک ختم نبوت مین یہ اجلاس ہوا تو مولانا سلطان احمد اس میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی جانب سے شریک ہوئے اور انہوں نے کاروائی میں حصہ لیا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک الٹی میٹم تیار کرنے اور اسے خواجہ ناظم الدین کو بھیج دینے کا فیصلہ ہوگیا۔ مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد کا بیان ہے کہ جب شام

کے وقت مجلس عمل کے ممبروں کا اجلاس ہوا۔ تو مولانا ابوالاعلی مودودی نے یہ پیغام بھیجا کہ وہ چونکہ ایک اور کام کی وجہ سے مصروف ہیں اس لیے انہوں نے مولانا سلطان احمد امیر جماعت اسلامی کراچی کی ہدایت ہے کہ اجلاس میں شریک ہوں۔ چنانچہ جس وقت سات مزید ممبر شامل کیے گئے اور وہ اشخاص بھی منتخب کیے گئے جو خواجہ صاحب کو الٹی میٹم دینے والے تھے۔ اس وقت امیر موصوف اجلاس میں موجود تھے۔ مولانا کا یہ بھی بیان ہے کہ جماعت اسلامی کے اس نمائندے نے نہ تو مجلس عمل کے اجلاس پر آئین کے خلاف ہونے کا کوئی اعتراض کیا نہ اس کے فیصلے کے خلاف کوئی آواز اٹھائی۔ مولانا سلطان طلب نہیں کیے گئے۔ اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اس امر سے انکار کرتے ہیں کہ انہوں نے مولانا سلطان احمد کو مجلس عمل کے اجلاس میں بھیجا تھا۔ مولانا مودودی نے اس بیان کی بھی تردید کی ہے کہ کسی دعوت طعام کے موقع پر انہوں آٹھ ممبروں کے اجلاس میں شامل ہونے سے معذوری ظاہر کی تھی اور اپنی جگہ مولانا سلطان احمد کو اس اجلاس میں شریک ہونے کی ہدایت کی تھی۔

اب ایک طرف مولانا مودودی کا بیان ہے اور دوسری طرف مولانا ابوالحسنات محمد احمد اور سید مظفر علی شمسی کی شہادت ہے۔ ان دونوں میں جو اختلاف ہے اس کے پیش نظر یہ فیصلہ کرنا قطعی طور پر ناگوار اور کسی قدر مشکل ہے کہ کس بیان کو سچ سمجھا جائے۔ لیکن چونکہ جماعت اسلامی کی ذمہ داری صرف اسی واقعہ پر منحصر نہیں ہے۔ اس لیے ہم اس پر اپنی کوئی رائے دینے سے احتراز کرتے ہیں۔ ایک طرف جماعت اسلامی اور دوسرے طرف احرار اور مجلس عمل کے درمیان دوسرا اختلاف مولانا سلطان احمد کے اس رویے سے متعلق ہے جو انہوں نے دفتر تحریک ختم نبوت کراچی میں ۲۶ فروری کو مجلس عمل کے ایک اجلاس میں اختیار کیا۔ مولانا مودودی کا بیان ہے کہ اگرچہ انہیں اس اجلاس کی اطلاع موصول ہوگئی تھی لیکن چونکہ وہ بیمار تھے اس لیے انہوں نے ٹیلیفون پر مولانا سلطان احمد کو بعض ہدایات دے دیں اور اس کے ساتھ ہی ۲۲ فروری ۱۹۵۳ء کو ایک مفصل خط لکھ دیا۔ اس ٹیلیفونی پیغام اور خط کا خلاصہ یہ تھا کہ اس اجلاس میں جماعت اسلامی کی طرف سے اس رائے پر زور دیا جائے کہ ڈائریکٹ ایکشن نہ کیا جائے۔ نہ کوئی غیر آئینی قدم اٹھایا جائے اور اگر یہ تجویز قبول نہ کی جائے تو مولانا سلطان احمد اعلان کر دیں کہ جماعت اسلامی مجلس عمل کی ممبری سے مستعفی ہوتی ہے چونکہ مولانا

سلطان احمد طلب نہیں کیے گئے۔ اس لیے ہم نہیں جانتے کہ ان کو یہ خط کب ملا اور انہوں نے مجلس عمل میں کیا خیالات ظاہر کیے۔

مولانا مودودی نے مولانا سلطان احمد کے نام اپنے خط میں یہ لکھا تھا کہ مجھے ۱۸ جنوری کے اجلاس کنونشن کے بعد مجلس عمل کے کسی اجلاس کا علم نہیں۔ مجھے ان عام مظاہروں سے اختلاف ہے جو لاہور میں کیے جا رہے ہیں اور جن سے لوگوں کے دلوں میں یہ توقع پیدا کرنا مقصود ہے کہ ۲۲ فروری کو ایک جنگ عظیم شروع ہونے والی ہے۔ اگر اس توقع کے پیدا ہونے کے بعد کسی جنگ کا اعلان نہ کیا گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ مشترکہ مقصد ناکام ہو جائے گا۔ جماعت اسلامی اس مفاہمت کی بنا پر مجلس عمل میں شامل ہوئی تھی کہ ہر جماعت حصول مقصد کے لیے اپنا لائحہ عمل الگ تیار کریگی اور مجلس عمل کے حکم کے ماتحت یا اس کے بنائے ہوئے کسی پروگرام کی تعمیل میں کام نہ کرے گی جس سے اس کی اپنی حیثیت مدغم ہو جائے۔ مجلس عمل کا یہ رویہ غلط ہے کہ اس نے بطور خاص خواجہ ناظم الدین کے خلاف مظاہروں کا انتظام کیا ہے کیونکہ ایسے طرز عمل سے تحریک کے ساتھ بنگالیوں کی ہمدردی ختم ہو جائے گی اور چودھری ظفر اللہ خان کی برطرفی کے مطالبے پر اصرار کرنا بھی غلط ہے۔ بڑے پیمانے پر کسی شورش کے برپا کرنے کے لیے فضا سازگار نہیں ہے۔ کیونکہ اول: ابھی تعلیم یافتہ طبقے مطالبات کے جواز کے قائل نہیں کیے جاسکے۔ دوم: پنجاب اور بہاولپور کے سوا دوسرے صوبوں کو ابھی تک تحریک سے دلچسپی پیدا نہیں ہوئی۔ مجلس عمل نے اپنے لیے جو راہ عمل تجویز کی ہے اگر اس پر اصرار کیا گیا تو نتیجہ ناکامی ہوگا۔ مولانا سلطان احمد کو چاہیے کہ مجلس عمل کے ممبروں کے سامنے ان نکات پر زور دیں۔ اور اگر مجلس ان کے خیالات سے متفق نہ ہو تو وہ جماعت کو مجلس عمل سے منقطع کر لیں۔ اگرچہ اس خط میں مولانا سلطان احمد کو جو ہدایات دی گئی تھیں وہ واضح اور قطعی تھیں۔ لیکن ہمارے سامنے اس امر کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ مولانا مودودی کا نقطہ نگاہ مجلس عمل کے سامنے بیان کیا گیا تھا۔ اس کے برعکس ہمارے سامنے مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد اور سید مظفر علی شمسی کی یہ شہادت موجود ہے کہ مولانا سلطان احمد نے مجلس کے فیصلے کے خلاف کوئی اختلاف یا نامنظوری کا اظہار نہیں کیا۔ مقدمے کے اس حصے پر مولانا ابوالحسنات کی شہادت درج ذیل ہے۔

سوال۔ کیا آپ کو یاد ہے کہ مولانا سلطان احمد نے مجلس عمل کی کاروائی میں حصہ لیا تھا؟

جواب۔ جی ہاں

سوال۔ کیا انہوں نے اس قرارداد سے جو کاروائی میں مندرج ہے کسی اختلاف کا اظہار کیا تھا؟

جواب۔ جی نہیں۔ وہاں ہر شخص متفق تھا۔

(عدالت سے) مجھے قطعی یقین ہے کہ مولانا سلطان احمد نے مجلس کے فیصلے کے خلاف کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

سوال۔ کیا مولانا سلطان احمد نے یہ کہا تھا کہ وہ مولانا مودودی کی ٹیلیفونی ہدایات کے ماتحت اجلاس میں حاضر ہوئے ہیں اور جس خط کا مولانا مودودی نے ذکر کیا ہے وہ انہیں اب تک نہیں ملا؟

جواب۔ جی ہاں یہ صحیح ہے۔

سوال۔ کیا مولانا سلطان احمد نے یہ کہا تھا کہ مولانا مودودی کی طرف سے کوئی ہدایات نہ ملنے کی صورت میں وہ مجلس کے فیصلوں کے متعلق کوئی قطعی رویہ اختیار نہیں کر سکتے؟

جواب۔ جی نہیں۔ انہوں نے یہ نہیں کہا۔

اس سے قبل مولانا مودودی نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے لیے ذاتی طور پر مجلس عمل میں شریک ہونا ضروری نہیں اور وہ کسی دوسرے شخص کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیج سکتے ہیں۔ مولانا سلطان احمد نے یہ نہیں کہا کہ جب تک انہیں مولانا مودودی کا وہ خط نہ مل جائے جو آنے والا ہے وہ قرارداد پر کسی قسم کی رائے کا اظہار نہیں کر سکتے۔ مجھے قطعی طور پر یاد ہے کہ جب میں نے مولانا سلطان احمد سے پوچھا کہ آیا انہیں مجلس کے اجلاس مورخہ ۲۶ میں جماعت اسلامی کی نمائندگی کا پورا اختیار حاصل ہے تو انہوں نے صاف صاف اثبات میں جواب دیا تھا۔

سوال۔ آپ سے مولانا مودودی نے کب کہا تھا کہ وہ جماعت کی جانب سے اپنا (ایک نمائندہ پورے اختیار کے ساتھ بھیجیں گے؟

جواب۔ میں اس واقعہ کی تاریخ یا مہینہ نہیں بتا سکتا۔

اس شہادت کی تصدیق سید مظفر علی شمسی کے بیان سے اور (EX.D.E 336) یعنی مجلس عمل کی کاروائی کے ریکارڈ سے ہوتی ہے جس پر خود مولانا سلطان احمد کے دستخط ثبت ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس تحریر میں ممبروں کے دستخط کاروائی کے ریکارڈ کے اوپر ثبت ہیں لیکن مولانا ابوالحسنات کی شہادت اس نکتہ پر بالکل واضح اور قطعی ہے کہ اس تحریر میں اجلاس کی کاروائی اور اس کے فیصلوں کا اندراج بالکل صحیح ہے اور ان سے مولانا سلطان احمد بالکل متفق تھے۔ لہٰذا ہمیں اس رائے کے قائم کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ ۲۷ فروری کی صبح سے گورنر جنرل اور وزیر اعظم پاکستان کی کوٹھیوں پر پکٹنگ کرنے کا فیصلہ مولانا سلطان احمد کو قبول تھا۔ تاہم اس رائے سے مولانا مودودی کے اس بیان کی تردید مقصود نہیں کہ مولانا سلطان احمد کو اس قسم کے اقدام میں شریک نہ ہونے کی ہدایات دی گئی تھیں اور مولانا سلطان احمد کی رہنمائی کے لیے تفصیلی ہدایات اس خط میں مرقوم تھیں جو (Ex.D.E.66) کے طور پر شامل مسل ہے۔

اس مرحلے پر ہم جماعت اسلامی کے ایک بیان کا ذکر کریں گے جس میں ان کوائف کا اظہار کیا گیا ہے جن میں ۱۶ جنوری سے ۱۸ جنوری تک اور ۲۶ فروری کو کراچی میں کنونشن کے اجلاس ہوئے تھے۔ جماعت اسلامی اس مجلس عمل کی ممبر تھی جس کو آل مسلم پارٹیز کنونشن کے اجلاس لاہور مورخہ ۱۳ جولائی میں قائم کیا گیا تھا۔ مجلس عمل میں جماعت اسلامی کے دو نمائندے مولانا امین احسن اصلاحی اور ملک نصر اللہ خان عزیز تھے۔ بعد میں اصلاحی کی جگہ میاں طفیل محمد مقرر کر دیے گئے تھے۔ نومبر کے اواخر میں مجلس عمل کا ایک اجلاس ہوا جس میں ملک نصر اللہ خان عزیز اور میاں طفیل شریک ہوئے۔ اس میں صاحبزادہ فیض الحسن نے سول نافرمانی کی ایک قرارداد پیش کی جو بعد میں واپس لے لی گئی اور شیخ حسام الدین کی قرارداد منظور کر لی گئی جس کا منشا یہ تھا کہ کراچی میں کنونشن کا اجلاس طلب کیا جائے چنانچہ یہ کنونشن ۱۶ سے ۱۸ جنوری تک کراچی میں منعقد ہوئی جس میں مولانا مودودی شریک ہوئے۔ اس کے بعد پنجاب کی مجلس عمل کے اس اجلاس میں جو وسط فروری میں بمقام لاہور میں منعقد ہوا تھا ملک نصر اللہ خان عزیز نے مولانا مودودی کا ایک مکتوب پڑھ کر سنایا جس

کا منشا یہ تھا کہ پنجاب میں مجلس عمل جو کچھ کر رہی ہے وہ اس کی قانوناً مجاز نہیں ہے کیونکہ کراچی کی کنونشن منعقدہ ۱۸ جنوری میں ''راست اقدام'' کی کسی شکل کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ اور اسی مطالبہ کی تعمیل میں ۲۶ فروری کا اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں مولانا سلطان احمد شریک ہوئے۔ اسی اجلاس کے لیے مولانا سلطان احمد کو ہدایت کی تھی کہ اگر مجلس عمل کوئی غیر دانشمندانہ اور عاجلانہ قدم اٹھانے پر اصرار کرے تو اپنے آپ کو اور جماعت کو مجلس عمل سے علیحدہ کر لیں۔

مولانا مودودی ۲۴ جنوری کو کراچی سے واپس لاہور آئے اور آپ نے موچی دروازے کے باہر ایک جلسہ عام میں تقریر کی اس تقریر کا مفاد اس رپورٹ کے کسی سابقہ حصے میں بیان کیا جا چکا ہے۔

۱۸ فروری ۱۹۵۳ء کو میاں طفیل محمد، قیم جماعت اسلامی پاکستان نے جماعت اسلامی پاکستان نے جماعت کے ارکان اور متفقین کے نام اس مطلب کی ہدایات جاری کیں کہ مجلس عمل ایک ایسی جماعت ہے جس کو آل مسلم پارٹیز کنونشن نے مرتب کیا ہے اور جو انجمنیں مجلس میں شامل ہونے پر رضامند ہوئی ہیں۔ انہوں نے اپنی انفرادیت کو مجلس میں مدغم نہیں کیا۔ لہٰذا جماعت اسلامی کے کسی رکن یا متفق کو مجلس عمل کے حکم سے کسی حلف نامے یا اعلان پر دستخط نہ کرنے چاہئیں۔ یہ امر جماعت کے ضبط و نظم کے خلاف ہے کہ اس کا کوئی ممبر کسی اور جماعت کے جاری کیے ہوئے حکم کی اطاعت کرے اور اقدام کے کسی پروگرام پر عمل نہ کیا جائے۔ جب تک اس کا فیصلہ مرکزی مجلس عمل میں نہ ہو جائے جو عنقریب منعقد ہونے والی ہے۔ اور احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلانے کی جدوجہد میں کوئی ایسی حرکت نہ کی جائے جو غیر آئینی یا نامناسب ہو اور جس سے بدنظمی پیدا ہونے کا احتمال ہو۔

جب ۲۷ فروری کو کراچی میں گرفتاریاں کی گئیں تو مولانا مودودی نے یکم مارچ ۱۹۵۳ء کو ایک بیان جاری کیا جس میں گرفتاریوں کی اور اس پریس نوٹ کی مذمت کی جو حکومت نے گرفتاریوں کو حق بجانب ظاہر کرنے کے لیے جاری کیا تھا۔ مولانا نے اس بیان میں یہ کہا کہ حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جن میں سے کسی کی ذہنیت بھی ایک تھانیدار سے بہتر نہیں۔ یہ گرفتاریاں ایسے اشخاص کا فعل ہیں جو عقل و خرد سے بالکل عاری ہیں اور حکومت کے لیے سیدھا راستہ یہی تھا کہ یا تو مطالبات کو منظور کر لیتی یا عوام کو اس بات کا قائل کرتی کہ ان کے مطالبات حق بجانب نہیں ہیں یا

مستعفی ہو جاتی اور حکومت نے جو وسائل اختیار کیے ہیں ان سے مطالبات کو دبایا نہیں جا سکتا اور حکومت نے پریس نوٹ میں یہ بالکل جھوٹ لکھا ہے کہ یہ مطالبات احرار کے وضع کردہ ہیں جو پاکستان کے دشمن ہیں یہ مطالبات مسلمانوں کے متفقہ مطالبات ہیں گو ان مطالبات کو تسلیم کرانے کے ذرائع کے متعلق جماعت اسلامی اور دوسروں کے درمیان اختلاف رائے ہو سکتا ہے۔

''تسنیم'' مورخہ ۲ مارچ ۱۹۵۳ء میں ایک افتتاحیہ لکھا گیا جس میں مولانا مودودی کے اس بیان کا ایک حصہ دہرایا گیا جو مولانا نے ۲۷ فروری کو حکومت کے پریس نوٹ کے متعلق جاری کیا تھا اور انہی تین متبادل راستوں کا اعادہ کیا گیا جو مولانا نے اس بیان میں حکومت کے لیے تجویز کیے تھے۔ اسی اخبار نے اپنی اشاعت مورخہ ۳ مارچ میں اسی موضوع پر ایک اور مقالہ شائع کیا جس میں ان باتوں کی مذمت کی کہ عام جلسوں یا تقریروں کے دوران میں نامناسب نعرے لگائے جائیں اور جلوسوں میں غنڈہ پن ظاہر کیا جائے اور حکومت کے اکابر کے جنازے نکالے جائیں۔ اگرچہ اس مقالے میں ایسی تمام حرکات کی مذمت کی گئی لیکن یہ بھی کہا گیا کہ لوگوں نے یہ طرز عمل خود مسلم لیگ سے سیکھا ہے جس نے ملک خضر حیات خان ٹوانہ کے خلاف اسی قسم کی شورش منظّم کی تھی۔ اخبار نے یہ بھی بتایا کہ ایسی حرکات اس مقدس مقصد کے لیے مضرت رساں ہوں گی جس کے لیے عوام جدوجہد کر رہے ہیں۔

پھر ۴ مارچ ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں اس اخبار نے میاں طفیل محمد قیم جماعت کا ایک بیان شائع کیا جس میں لکھا تھا کہ مجھے یہ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے مکان اور تسنیم کے دفتر پر پکٹنگ ہونے والی ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ تحریک غیر ذمہ دار ہاتھوں میں پڑ چکی ہے اور جن لوگوں نے اس پکٹنگ کی تجویز کی ہے وہ نہیں جانتے کہ مجلس عمل کے خاتمے سے قبل جماعت اسلامی پر حملہ کیا تھا جس کا جواب مولانا مودودی کے پاس موجود ہے۔ ان لوگوں پر الزامات عائد کرنا عقل کی بات نہیں جو ایک مشترک مقصد کے حصول کے لیے کام کر رہے ہیں۔ جمہور عوام کو چاہیے کہ افواہوں سے متاثر نہ ہوں اور نادان دوستوں کے اکسانے پر ان لوگوں کو پریشان نہ کریں جو مشترک مقصد کے حصول کے لیے مصروف کار ہیں۔

۵ مارچ کی اشاعت میں تسنیم نے اپنے سٹاف رپورٹر کی ایک رپورٹ شائع کی کہ میں نے جماعت کے موقف کی وضاحت کے لیے جماعت اسلامی کے ذمہ دار اشخاص سے ملاقات کی ہے اور ایک شخصیت نے جو جماعت کی جانب سے ترجمانی کا حق رکھتی ہے یہ بیان کیا ہے کہ جماعت کا موقف ۴ مارچ کے تسنیم میں واضح کر دیا گیا ہے اور ایک شخص مولانا محمد یوسف جو گزشتہ روز مولانا اختر علی خان کے ساتھ گرفتار کیا گیا تھا اور بعد میں رہا کر دیا گیا ایسی حرکات کر رہا ہے جو مشترک مقصد کے لیے نقصان رساں ہیں عوام کو غیر ذمہ دار اشخاص کی پھیلائی ہوئی افواہوں پر یقین نہ کرنا چاہیے اور جماعت کو وہ کام کرنے کا موقعہ دینا چاہیے جو اس نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔

چالیس صفحوں کا ایک کتابچہ ''قادیانی مسئلہ'' ۵ مارچ ۱۹۵۳ء کو شائع کیا گیا جس میں مولانا مودودی کی اس رائے کی تائید میں کہ احمدی دائرہ اسلام سے خارج ہیں تفصیلی دلائل پیش کیے گئے تھے۔ اس کتابچے میں احمدی لٹریچر سے بے شمار اقتباسات نقل کیے گئے تھے اور کہا گیا تھا کہ پاکستان کی تمام مذہبی انجمنوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مسلم معاشرے سے اس سرطان (احمدیت) کو کاٹ کر پھینک دیا جائے اور ظفر اللہ خان کو اس عہدے سے موقوف کرایا جائے کیونکہ اس کی سرگرمیاں اس سرطان کی جڑوں کو بیرونی دنیا اور مسلمان ملکوں میں پھیل رہی ہیں کتابچے کے آخر میں محض برسبیل تذکرہ یہ اشارہ بھی کیا گیا تھا کہ مطالبات کو تسلیم کرانے کے لیے عام لوگ جس قسم کے مظاہرے تجویز کر رہے ہیں وہ مناسب نہیں ہیں اور سنجیدہ اور تعلیم یافتہ لوگ ان کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن اس اشارے کے ساتھ ہی یہ بھی بیان کر دیا تھا کہ لوگوں نے یہ مظاہرے مسلم لیگ کی شورش سے سیکھے ہیں جو اس نے ملک خضر حیات خان ٹوانہ کی وزارت کو توڑنے کے لیے برپا کی تھی اور یہ مظاہرے مُلا نے ایجاد نہیں کیے۔

اسی دن جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے ایک قرارداد منظور کی جس میں یہ اعلان کیا کہ مسلمانوں کے متفقہ مطالبات کو منوانے کے لیے موثر تدابیر اختیار کرنا ضروری ہے۔ اور تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے اس کو صحیح خطوط پر چلانا چاہیے۔ اس قرارداد میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ جمہور کے مطالبات حق بجانب ہیں۔ اگر ان مطالبات کے تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا تو عوام میں لازماً

بے اطمینانی اور غیظ وغضب پیدا ہوگا۔ اور ایسے معاملات میں تغافل کی پالیسی سے عوام غیر آئینی ذرائع کو کام میں لانے پر آمادہ ہو جایا کرتے ہیں۔حکومت کا یہ رویہ غلط ہوگا کہ وہ مطالبات کو قوت سے دبائے اور جب قوت کے استعمال کی وجہ سے لوگ مشتعل ہو جائیں تو انکے خلاف پولیس اور فوج استعمال کی جائے۔ یہ طرزِ عمل ملک کو لازماً خانہ جنگی کی طرف لے جائے گا۔اس قرارداد میں مولانا مودودی کی اس تقریر کا مفاد بھی درج کیا گیا تھا جو انہوں نے اس دن گورنمنٹ ہاؤس میں کی تھی۔ اس قرارداد میں مولانا مودودی کی تقریر کا حوالہ دے کر یہ کہا گیا تھا کہ مولانا نے اس تقریر میں جو کچھ کہا وہ یہ تھا کہ عوامی مطالبات کو رد کر دینے کے بعد حکومت کی طرف سے امن وامان کی اپیل بالکل بے کار ہے اور اگر حکومت عوام کے مطالبات کو قوت سے دبانے پر تلی ہوئی ہے تو اس اپیل سے کوئی مفید مقصد حاصل نہ ہوگا۔ اور اگر حکومت چاہتی ہے کہ صورت حالات میں مزید خرابی پیدا نہ ہو تو اس کو چاہیے کہ مطالبات کو قوت سے دبانے کی کوشش کو ترک کر کے عوام کے جذبات کو ٹھنڈا کرے اور عوام کے نمائندوں سے گفت وشنید شروع کر دے۔ جب تک دلیل کا مقابلہ دلیل سے کرنے کا اصول اختیار نہ کیا جائے گا بدنظمی اور خونریزی کے واقعات برابر جاری رہیں گے۔ اور اگر حکومت کو اس امر میں کوئی شبہ ہو کہ یہ مطالبات عوام کے متفقہ مطالبات ہیں تو یہ حکومت کا کام ہے کہ اس حقیقت کو معلوم کرنے کا کوئی اور طریقہ تجویز کرے اور اگر تمام معیاروں پر جانچنے کے بعد یہ مطالبات متفقہ ثابت ہوں اور حکومت پھر بھی انہیں تسلیم نہ کرے تو لوگوں کے لیے اور کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔

اس قرارداد میں واقعات وحوادث کے متعلق جماعت اسلامی کی رائے بھی ظاہر کی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ امیر جماعت اسلامی نے ڈائریکٹ ایکشن کی قرارداد کے بعد بار بار تحریک کے علم برداروں کی توجہ ان دو پہلوؤں کی طرف مبذول کرائی ہے کہ (۱) یہ مناقشہ صرف پنجاب تک محدود ہے اور (۲) پنجاب میں بھی تعلیم یافتہ طبقے اس مسئلے کے مذہبی، مجلسی اور سیاسی متعلقات ونتائج کا احساس نہیں رکھتے۔لیکن مجلس عمل کے ممبروں نے ان دو پہلوؤں کا مناسب لحاظ رکھے بغیر ڈائریکٹ ایکشن شروع کر دیا اور جب ڈائریکٹ ایکشن کا آغاز ہوا تو وہ ایسے واقعات فسادات سے داغدار ہو گیا جو اسلامی اخلاق کے لیے باعث توہین تھے اور جن سے ایک مقدس مقصد کی تذلیل ہوئی۔

قرارداد میں تحریک کے مقصد کے ساتھ جماعت اسلامی کی تائید وحمایت کا اعادہ کیا گیا۔لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا کہ مقصد تحریک کے حصول کے لیے جو طریقے اختیار کیے جا رہے ہیں انکی حمایت کر کے جماعت اپنے تمام اصولوں کو قربان نہیں کر سکتی ۔قرارداد میں بیان کیا گیا کہ اس سلسلے میں جماعت کی تین ذمہ داریاں ہیں اول: مطالبات کو تسلیم کرانے کے لیے موثر طریقے اختیار کرنا۔ دوم: تحریک کو حتی الامکان پرامن راستے پر چلانا اور اس کو شائستگی کی حدود کے اندر رکھنا۔سوم: تمام منصف مزاج لوگوں کو ترغیب دینا کہ وہ اس تشدد کو روکنے کی تدابیر معلوم کریں جو ملک کے امن اور اس کی سالمیت کے لیے ایک خطرہ بن رہا ہے۔اسی پرچے میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا ایک بیان شائع کی گیا جس میں انہوں نے دو برقی پیغامات کا ذکر کیا جو انہوں نے پوری صورت حالات واضح کرنے کے بعد حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ وہ عوام کے خلاف فوج اور پولیس کے استعمال کو روک دے اور مطالبات کی معقولیت کا اندازہ کرنے کی غرض سے مذاکرات شروع کر دے۔انہوں نے ریڈیو پر حکومت کی اپیل کے متعلق تعجب کا اظہار کیا اور کہا کہ حکومت نے قانون وانتظام کی بحالی کے لیے صرف اپیل پر اکتفا کیا۔مطالبات پر غور کرنے کے متعلق ایک لفظ نہ کہا۔سارا الزام عوام پر عائد کیا اور اپنے آپ کو بالکل بری رکھا:

اب جماعت اسلامی اور اس کے بانی کی سرگرمیوں کے تفصیلی بیان کے بعد جو حقائق جماعت اسلامی نے تسلیم کیے ہیں یا اس کے خلاف ثابت ہو چکے ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) جماعت اسلامی پنجاب کی مجلس عمل کی ایک فریق تھی۔

(۲) جماعت اسلامی اس مجلس عمل کی بھی ایک فریق تھی جو آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن نے قائم کی تھی اور جس نے ۱۸ جنوری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں ڈائریکٹ ایکشن کی قرارداد منظور کی تھی۔

(۳) مولانا سلطان احمد نے جو کراچی میں ۲۶ فروری کو مجلس عمل کے اجلاس میں شریک ہوئے تھے اپنے آپ کو مجلس عمل کی سرگرمیوں سے منقطع نہیں کیا۔گورنر جنرل اور وزیر اعظم پاکستان کی کوٹھیوں پر رضا کاروں کو بھیجنے کا پروگرام ان کی موجودگی میں

طے کیا گیا لیکن انہوں نے اس کے خلاف کوئی احتجاج نہ کیا۔

(۴) شروع سے آخر تک جماعت اسلامی کا ایک نہ ایک نمائندہ کراچی اور لاہور کی مجالس عمل کے اجلاسوں میں برابر شریک ہوتا رہا۔

(۵) ڈائریکٹ ایکشن کے منظور ہونے کی تاریخ سے لے کر فسادات کی پوری شدت تک جماعت اسلامی نے کوئی ایسا اعلان عام نہ کیا کہ وہ ڈائریکٹ ایکشن میں شامل نہیں ہے اور ان سرگرمیوں سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کرتی ہے جو مجلس عمل کے طے کردہ پروگرام کی تعمیل میں جاری تھیں۔

(۶) اس شہادت کے مطابق جس پر شبہ کرنے یا جس کو رد کرنے کی کوئی وجہ نہیں، کہ ۵ مارچ کو مولانا مودودی نے گورنمنٹ ہاؤس میں تقریر کرتے ہوئے بیان کیا کہ حکومت اور عوام کے درمیان خانہ جنگی جاری ہے اور جب تک حکومت قوت کے استعمال کو روک کر عوام کے نمائندوں سے مذاکرات شروع نہ کرے امن وامان کی اپیل جاری کرنے کا کوئی موقع نہیں۔ اور

(۷) جماعت اسلامی نے اپنی قرارداد مورخہ ۵ مارچ میں اسی رائے کو دہرایا جو اس دن مولانا مودودی نے گورنمنٹ ہاؤس میں ظاہر کی تھی۔

جماعت کو خوب معلوم تھا کہ ''ڈائریکٹ ایکشن'' کے پروگرام سے نہایت خوفناک قسم کے فسادات رونما ہوں گے کیونکہ مولانا مودودی نے اپنی بعض تقریروں میں جو ''تسنیم'' میں شائع ہوئیں۔ لفظ ''جنگ'' استعمال کیا۔ اور ۳۰ جنوری کو لاہور میں موچی دروازے کے باہر تقریر کرتے ہوئے ہندو مسلم فسادات کا حوالہ بھی دیا۔

۵ مارچ سے پہلے ''تسنیم'' کی مختلف تحریرات اور جماعت اسلامی کی جاری کردہ ہدایات میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ جماعت ''ڈائریکٹ ایکشن'' کے پروگرام کی حامی یا موید نہیں ہے۔ اس کے برعکس ان تحریروں میں اس حقیقت کا چھپا ہوا اعتراف کیا گیا ہے کہ جماعت اسلامی نے اس معاملے میں ایک خاص ذمہ داری لے لی ہے جس کو پورا کرنے میں وہ اپنی بہترین

قابلیت صرف کر دے گی۔ اس سے حافظ خادم حسین کی اس شہادت کی تائید ہوتی ہے کہ جماعت اسلامی اور دوسرے فریقوں کے درمیان تقسیم کار کی کوئی سکیم موجود تھی۔ جس کے قرائن مولانا امین احسن اصلاحی کے اس بیان میں پائے جاتے ہیں کہ جماعت کا پروگرام تقریریں کرنا اور لٹریچر شائع کرنا ہے۔ لہٰذا پھر بھی اگر یہ مان لیا جائے اور ہم یقین کر لیں کہ مولانا مودودی کے بیان کا یہ حصہ صحیح ہے اور جماعت اسلامی اور دوسرے فریقوں کے درمیان ڈائریکٹ ایکشن کے پروگرام کی تفصیلات کے متعلق اختلافات تھے اور جماعت آئینی ذرائع اختیار کرنے پر مصر تھی۔ پھر بھی اس امر کی حیثیت مجلس عمل کے ممبروں کے درمیان ایک گھریلو اور داخلی معاملے کی تھی اور اس سے ''ڈائریکٹ ایکشن'' کے قدرتی نتائج کے متعلق جماعت کی ذمہ داری پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ جماعت اسلامی ڈائریکٹ ایکشن کے فیصلے میں سنجیدگی سے شامل تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر جماعت نے علی الاعلان اور وضاحت کے ساتھ اپنے آپ کو ڈائریکٹ ایکشن کے پروگرام سے تعلق کر لیا ہوتا تو وہ ان واقعات کی ذمہ دار نہ ہوتی جو بعد میں رونما ہوئے۔ لیکن اس امر کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ جماعت نے ڈائریکٹ ایکشن سے اپنی بے تعلقی کا اعلان کیا ہو اس کی منظوری ظاہر کی ہو یا اس کی مذمت کی ہو۔ محض جلوسوں کی ترتیب کے انداز کو یا بناوٹی جنازے نکالنے کو یا جلسوں میں تقریروں پر نعرے لگانے کو ناپسند کرنے کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ ڈائریکٹ ایکشن کی مذمت کی گئی تھی یا ان تدابیر کو ناواجب قرار دیا گیا تھا جو ۲۶ فروری کے اجلاس میں اس اقدام کی تعمیل کے لیے طے ہوئی تھیں اور جب جماعت اسلامی کے لیڈر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے حکومت کی ان سرتوڑ کوششوں میں جو وہ ۵ مارچ کو فسادات کے روکنے کے لیے کر رہی تھی کسی قسم کا تعاون پیش نہ کیا تو ہمارے نزدیک جماعت کی ذمہ داری میں بہت بڑا اضافہ ہو گیا۔ بلکہ اس کے برعکس مولانا نے سرکشانہ رویہ اختیار کیا۔ تمام واقعات کا الزام حکومت پر عائد کیا اور فسادی عناصر کو ''تشدد کا شکار'' کہہ کر ان سے عام ہمدردی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ گورنمنٹ ہاؤس میں انہوں نے جو رویہ اختیار کیا۔ اس کے متعلق جو شہادت پیش ہوئی ہے۔ اس سے ہم یہی اثر قبول کر سکتے ہیں کہ وہ پورے نظام حکومت کے انہدام کی توقع کر رہے تھے۔ اور حکومت کی متوقع پریشانی اور حواس باختگی پر بغلیں بجا رہے تھے اور اگر اس

کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھ لی جائے کہ جماعت اسلامی کا مقصد اقتدار حاصل کرنا ہے کیونکہ اس کے خیال کے مطابق اللہ کی حاکمیت کے ماتحت مذہبی ادارات کے قیام کا مقصد حاصل کرنے کا موثر ترین ذریعہ یہی ہے تو اس امر میں ذرا بھی شبہ باقی نہیں رہتا کہ جو کچھ ہو رہا تھا اسے جماعت اسلامی کی پوری تائید وحمایت حاصل تھی۔

لہٰذا ڈائریکٹ ایکشن کی منظوری سے اور اس پروگرام سے جو مجلس عمل نے کراچی میں ۲۶ فروری کو طے کیا تھا کہ گورنر جنرل اور وزیراعظم پاکستان کی کوٹھیوں پر رضا کاروں کے دستے بھیجے جائیں اور مولانا ابوالحسنات کو تحریک کا پہلا ڈکٹیٹر مقرر کیا جائے جو طبعی نتائج پیدا ہوئے ان کی ذمہ داری جماعت پر بھی عائد ہوتی ہے۔ تحریک کے لیڈروں کی گرفتاریاں ناگزیر ہو چکی تھیں اور مجلس عمل مورخہ ۲۶ فروری کی کاروائی میں پہلے ڈکٹیٹر کی امکانی گرفتاری کا جو ذکر موجود ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ لیڈروں کو بھی اس معاملے میں کوئی شبہ باقی نہ رہا تھا جو واقعات گرفتاریوں کے بعد رونما ہوئے وہ چونکہ متوقع تھے اور یہ بھی معلوم تھا کہ عام احتجاجوں اور مظاہروں سے جو صورت حالت پیدا ہوگی اس کی درستی کے لیے حکام کیا تدابیر اختیار کریں گے۔ اس لیے جماعت کی طرف سے یہ دعویٰ بالکل نازیبا ہے کہ سارا الزام حکومت پر عائد ہوتا ہے کیونکہ اس نے ان فسادات کو فرو کرنے کے لیے جو نہایت سرعت سے نہایت تشویش انگیز صورت اختیار کر رہے تھے قوت کا استعمال کیا۔ سید فردوس شاہ کو ۴ مارچ کی شام کو ایک غضبناک ہجوم نے مسجد وزیر خاں کے اندر یا باہر قتل کر دیا۔ یہ بعد میں ہونے والے واقعات کا محض ایک پیش خیمہ تھا۔ لیکن اس حادثے کے بعد بھی جماعت اسلامی نے نہ اظہار تاسف کیا نہ اس وحشیانہ قتل کی مذمت میں ایک لفظ کہا بلکہ اس کے برعکس اس جماعت کے بانی نے آگ اور خون کے اس ہولناک ہنگامے کے درمیان ''قادیانی مسئلہ'' کا بم پھینک دیا۔ ہمارے نزدیک جماعت کے ذہن کی کیفیت صحیح صحیح یہ تھی کہ اگرچہ وہ اس پروگرام کو جائز نہ سمجھتی تھی جو ڈائریکٹ ایکشن کی قرارداد کی تعمیل کے لیے طے ہوا تھا۔ لیکن وہ شروع سے آخر تک لوگوں کے سامنے اپنے حقیقی خیالات کا دلیرانہ اور دیانت دارانہ اعلان اس خوف کی وجہ سے نہ کر سکی کہ مبادا وہ عوام میں غیر ہردلعزیز ہو جائے۔ لہٰذا وہ اپنی ذہنیت اور اپنے رویے کے اعتبار سے کسی دوسری سیاسی

شخصیت یا انجمن سے مختلف نہ تھی اور دوسروں ہی کی مانند ہر ایسے اقدام سے خائف تھی ۔ جو اسے عوامی تنقید کا نشانہ بنا دے۔

ہمیں جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کی اس حجت میں کوئی زور نہیں معلوم ہوتا کہ کراچی میں مجلس عمل کا جو اجلاس ۱۸ جنوری ۱۹۵۳ء کی شام کو منعقد ہوا تھا وہ بے قاعدہ اور غیر آئینی تھا لہٰذا اس کے بعد مجلس عمل نے جو کچھ بھی کیا وہ آئینی اعتبار سے ناجائز تھا۔ اگر یہ معاملہ صرف جماعت اسلامی اور مجلس عمل کے دوسرے فریقوں ہی کے درمیان ہوتا اور عدالت سے یہ مطالبہ کیا جاتا کہ وہ ایسی کاروائی میں جس میں پارٹیوں کے درمیان کسی حق یا کسی ذمہ داری کا تعین ضروری ہو، آئین کے اس مسئلے کا فیصلہ کر دے تو ہم غالباً جماعت کی رائے سے اتفاق کرتے ۔ لیکن ہمارے سامنے آئینی جواز یا عدم جواز کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوسکتا کیونکہ جماعت اسلامی اپنا نام مجلس عمل پنجاب اور مرکزی مجلس عمل دونوں میں شامل کرا چکی تھی ۔ وہ ڈائریکٹ ایکشن کی قرارداد میں ایک فریق کی حیثیت رکھتی تھی اور مجلس عمل کے اجلاس مورخہ ۲۶ فروری میں جماعت کا نمائندہ اس قرارداد میں شریک تھا کہ رضا کاروں کے دستے بھیجے جائیں اور اقدامات کے اجرا کے لیے ایک ڈکٹیٹر مقرر کیا جائے ۔ لہٰذا موجودہ تحقیقات میں اس نکتے کو کوئی حیثیت حاصل نہیں۔

میانوالی کے غلام صدیق اور سرگودہا کے سید احمد شاہ جماعت سے اس وقت خارج کئے گئے جب مارشل لاء کے نفاذ پر خاصی مدت گزر چکی تھی ۔ لہٰذا اس اخراج سے جماعت کے موقف کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ۔ بہت سے اضلاع کے ڈپٹی کمشنروں اور پولیس سپرنٹنڈنٹوں نے جو اطلاعات بصیغہ راز بھیجیں ۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی کے ممبروں نے فسادات میں حصہ لیا۔ ڈپٹی کمشنر منٹگمری نے اپنی ڈائری مورخہ ۲۸ مارچ ۱۹۵۳ء میں ایک شخص سلطان احمد کا ذکر کیا ہے اور اسی ضلع میں جماعت کے ایک اور ممبر محمد حسین کو گرفتار بھی کیا گیا تھا۔ گوجرانوالہ اور راولپنڈی کے پولیس سپرنٹنڈنٹوں نے بھی اپنی رپورٹوں میں ارکان جماعت اسلامی کی ان سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے دوران فسادات میں اختیار کی تھی۔

احرار

احراریوں کی ابتدا اوران کی سرگرمیوں کی پوری کیفیت اس رپورٹ کے کسی سابقہ حصے میں دی جا چکی ہے۔ احراریوں کی پالیسی کا غالب اور بنیادی اصول یہ ہے کہ وہ کسی کے ماتحت رہ کر کام نہیں کریں گے۔ اسی اصول کے مطابق وہ کانگرس سے علیحدہ ہوئے۔ گو اس کے بعد بھی انہوں نے کانگرس سے ملنے جلنے اور اس کے آگے دم ہلانے کا رویہ جاری رکھا۔ ان کے اور مسلم لیگ کے درمیان کامل مغائرت تھی اور مسلم لیگ کے پاکستان کو انھوں نے کبھی قبول نہیں کیا تھا جس زمانے میں مسلم لیگ قائداعظم کے زیر قیادت پاکستان کے لیے جدوجہد کر رہی تھی احرار برابر مسلم لیگ کی ممتاز شخصیتوں کو مغلظات سنا رہے تھے۔ اور ان پر غیر اسلامی زندگی بسر کرنے کے الزام عائد کر رہے تھے۔ اسلام ان کے لیے ایک حربے کی حیثیت رکھتا تھا جسے وہ کسی سیاسی مخالف کو پریشان کرنے کے لیے جب چاہتے بالائے طاق رکھ دیتے اور جب چاہتے اٹھا لیتے۔ کانگرس کے ساتھ سابقہ پڑنے کی صورت میں ان کے نزدیک مذہب ایک نجی معاملہ تھا اور وہ نظریہ قومیت کے پابند تھے لیکن جب وہ لیگ کے خلاف صف آرا ہوئے تو ان کی واحد مصلحت اسلامی تھی۔ جس کا اجارہ انہیں خدا کی طرف سے ملا ہوا تھا۔ ان کے نزدیک لیگ اسلام کی طرف سے محض بے پرواہی نہ تھی بلکہ دشمن اسلام تھی۔ ان کے نزدیک قائداعظم ''کافر اعظم'' تھے اسلامی طرز زندگی صرف انہی کو معلوم تھا اور مسلم لیگ کا ہر شخص مذہب سے سخت بیگانہ ہو کر زندگی بسر کر رہا تھا۔ انہوں نے اسلام کو حربہ بنا کر مسلم لیگ کو شکست دینے کی جو کوشش کی وہ احراری لیڈر مولانا مظہر علی کے بعض اقوال سے واضح ہوتی ہے۔ انہی مولانا سے وہ شعر منسوب کیا جاتا ہے۔ جس میں قائداعظم کو ''کافر اعظم'' کہا گیا تھا۔ یہ صاحب شیعہ ہیں لیکن انہیں ''مدح صحابہ'' جان سے زیادہ عزیز ہے۔ اور لکھنؤ کے شیعہ سنی فسادات کے ایام میں انہوں نے اور ان کے بیٹے یہی نعرہ اختیار کیا تھا جس سے ہر شیعہ غضبناک ہو جاتا تھا۔ اور یہ دونوں شیعہ سنی فسادات کی آگ کو بھڑکانے کے لیے لاہور سے لکھنؤ گئے تھے۔ بھاٹی دروازے کے بار احراریوں

کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے مولانا مظہر علی اظہر نے کہا کہ میں گزشتہ دو تین مہینوں سے مسلم لیگ سے سوال کر رہا ہوں کہ آیا پاکستان میں صحابہ کرام کے ناموں کی عزت کی جائے گی۔ لیکن مجھے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ کانگرسی وزارتوں کے صوبوں میں جہاں اب تک انگریز کا راج ہے اور مسلم لیگ کو اقتدار حاصل نہیں۔ لیگ والے صحابہ کا نام احترام کے ساتھ لینے کی اجازت نہیں دیتے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر لیگ برسر اقتدار آ گئی تو کیا پھر بھی صورت حالت یہی رہے گی جو آج لکھنؤ میں اور مسلم اکثریت کے صوبوں میں رونما ہے اور آیا ''مدح صحابہ'' جرم قرار پائے گی؟ آگے چل کر انہوں نے پوچھا کہ اگر لکھنؤ اور محمود آباد میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے لیے مدح الفاظ زبان پر نہیں لائے جا سکتے تو لیگ کے پاکستان میں کیا حالت ہو گی اور مسلمانوں کو ایسے پاکستان سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے (حوالہ شہباز مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۴۵ء)

نوائے وقت نے اپنی اشاعت مورخہ ۲ نومبر ۱۹۴۵ء میں ایک مکتوب شائع کیا جو انہی صاحب نے ایک اور احراری لیڈر کو لکھا تھا۔ چونکہ اس مکتوب کے اصلی ہونے پر سوال اٹھایا گیا تھا اس لیے ہم نے اس کے متعلق مولانا مظہر علی اظہر کا بیان لیا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے قطعی طور پر یاد نہیں ہے کہ میں نے یہ مکتوب لکھا ہو لیکن چونکہ یہ مکتوب لاہور کے ایک ممتاز اخبار میں شائع ہوا اور مولانا نے اس کی کوئی تردید نہیں کی اس لیے اس کا صرف یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ اصل مکتوب نوائے وقت کے قبضے میں موجود تھا اور اگر ضرورت پیش آتی تو اس مکتوب کے لکھنے والے کی شخصیت قطعی طور پر ثابت کر دی جاتی۔ اس مکتوب کا موضوع بھی ''مدح صحابہ'' ہی ہے اور یہ یاد رہے کہ مولانا خود شیعہ ہیں۔ اس چٹھی میں مولانا نے لکھا کہ مدح صحابہ کا حربہ مسلم لیگ کے خلاف موثر طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے اور الیکشنوں کے نتائج خواہ کچھ بھی ہوں اس مسئلے پر مسلم لیگ اور حکومت دونوں کو ہتھیار ڈال دینا پڑیں گے۔ مولانا کے اس طرز عمل سے بالکل واضح ہے کہ احرار اور دوسری جماعتیں اپنے سیاسی مقاصد کے لیے کس قدر آسانی سے مذہب کو استعمال کر لیتی ہیں۔

اس سلسلے میں ہم اسی قسم کی ایک اور کوشش کا ذکر بھی کریں گے جو خود مسلم لیگ نے ۱۹۴۶ء میں قیام پاکستان کی جدوجہد میں بڑے بڑے پیروں اور مشائخوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے کی

تھی۔ مسلم لیگ نے عوام کی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے بارہ ممبروں کی ایک مشائخ کمیٹی مقرر کی جن میں سے بعض نہایت علی مرتبت مذہبی پیشوا تھے۔ مثلاً پیر صاحب مانکی شریف، پیر جماعت علی شاہ، خواجہ نظام الدین (تونسہ شریف) مخدوم رضا شاہ ملتانی وغیرہم۔ لیکن اس معاملے کا ایک نہایت دلچسپ پہلو یہ ہے کہ خان افتخار حسین خان ممدوٹ، سردار شوکت حیات خان، ملک فیروز خان نون اور نواب محمد حیات قریشی بھی جو اپنی مذہبیت کے اعتبار سے چنداں مشہور نہ تھے اس کمیٹی میں شامل کر لیے گئے تھے اور انہیں بھی مذہبی القاب دے گئے تھے۔ یعنی خان افتخار حسین خان ممدوٹ کو ''پیر ممدوٹ شریف'' سردار شوکت حیات خان کو ''سجادہ نشین واہ شریف'' ملک فیروز خان نون کو ''دربار سرگودہا شریف'' اور نواب محمد حیات قریشی کو ''سجادہ نشین سرگودہا شریف'' ظاہر کیا گیا۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کمیٹی کے سیکرٹری مسٹر ابراہیم علی چشتی کو ''فاضل ہند سجادہ نشین پیسہ اخبار شریف'' کے لقب سے سرفراز کیا گیا۔ اس سے مشائخ کمیٹی کے تقرر کا واحد مقصد یہی ہوسکتا تھا کہ صوبے کے اہم سیاسی لیڈروں کو مسلمہ حیثیت کے مذہبی پیشواؤں میں خلط ملط کر دیا جائے اور انہیں مذہب کے نمائندوں کی حیثیت دے دی جائے تاکہ موقع آنے پر وہ عوام کو آسانی سے متاثر کر سکیں۔ اور موجودہ شورش ہی کے دوران میں احراری ''اخبار'' آزاد'' کے دو پرچوں میں (۷ دسمبر اور ۱۶ دسمبر ۱۹۵۲ء دو تقریریں درج ہوئیں ہیں۔ ایک حافظ قمر الدین سجادہ نشین سیال شریف کی اور دوسری قاضی احسان احمد شجاع آبادی کی جن میں نہ صرف مذہبی بغاوت کو جائز بلکہ کارثواب قرار دیا گیا۔

جہاں تک احراریوں کا تعلق ہے انہوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے لے مذہب کا مسلسل استعمال کیا ہے۔ انہوں نے کانگرس کو ترک کیا تو مذہبی وجوہ کی بنا پر کیا اور مسلم لیگ اور پاکستان کی مخالفت کی تو وہ بھی مذہبی بنا پر کی۔ مولانا مظہر علی اظہر نے ۱۹ ستمبر ۱۹۴۵ء کو امرتسر میں ایک بیان دیا کہ مسلم لیگ کا نعرہ پاکستان محض ایک سٹنٹ ہے اور میں نہ مسٹر جناح کو قائد اعظم مانتا ہوں نہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ تسلیم کرتا ہوں کیونکہ مسٹر جناح کی زندگی غیر اسلامی ہے۔ انھوں نے لوگوں سے اپیل کی کہ پاکستان کے نعروں سے گمراہ نہ ہوں اور آئندہ الیکشن میں ان لوگوں کو ووٹ دیں جو جمہور کی خدمت کر رہے ہیں۔ ''ملاپ'' (لاہور) نے اپنی اشاعت مورخہ ۲۷ دسمبر ۱۹۴۵ء میں

احراری لیڈر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ایک تقریر شائع کی جو انہوں نے علی پور کی احرار کانفرنس میں کی تھی۔ اس تقریر میں امیر شریعت نے ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کیا کہ مسلم لیگ کے لیڈر ''بے عملوں کی ٹولی'' ہیں جنہیں اپنی عاقبت بھی یاد نہیں۔ اور جو دوسروں کی عاقبت بھی خراب کر رہے ہیں اور وہ جس مملکت کی تخلیق کرنا چاہتے ہیں وہ پاکستان نہیں بلکہ ''خاکستان'' ہے۔ اسی رہبر محترم نے پسرور میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اب تک کسی ماں نے ایسا بچہ نہیں جنا جو پاکستان کی ''پ'' بھی بنا سکے (حوالہ استقلال نمبر روزنامہ جدید نظام ۱۹۵۰ء) چودھری افضل حق احراری لیڈر نے مسلم لیگ کے تصور پاکستان کے خلاف بہت طنزیہ اور توہین آمیز باتیں کہیں جو ''خطبات احرار'' کے صفحات ۴۱۔۸۲۔۸۳۔ اور ۹۹ پر درج ہیں۔ مولوی محمد علی جالندھری نے ۱۵ فروری ۱۹۵۳ء کو لاہور میں تقریر کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ احرار پاکستان کے مخالف تھے اور ان کے اس عقیدے کی وجہ عنقریب لوگوں پر ظاہر ہو جائیں گی۔ اس مقرر نے تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد بھی پاکستان کے لیے ''پلیدستان'' کا لفظ استعمال کیا اور ہمارے سامنے کیپٹن عبدالحی کی جو شہادت پیش ہوئی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فسادات کے دوران میں احراری لیڈر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے لاہور میں جو تقریریں کیں ان میں سے ایک تقریر میں انہوں نے کہا کہ پاکستان ایک بازاری عورت ہے جس کو احرار نے مجبوراً قبول کیا ہے۔

تقسیم کے موقع پر احراری ایک دل شکستہ اور مایوس جماعت کی حیثیت میں پاکستان آئے بعض احراری لیڈر وہیں رہ گئے۔ اور ''زمیندار'' مورخہ ۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء کی شائع کردہ ایک رپورٹ کی رو سے آل انڈیا مجلس احرار نے ایک قرارداد منظور کی جس میں قرار دیا گیا کہ آج احراری تنظیم ختم کی جاتی ہے کیونکہ ہندوستان میں کانگرس کے سوا کسی دوسری سیاسی تنظیم کا وجود مناسب نہیں۔ اس قرارداد میں مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا تھا کہ کانگرس میں شامل ہو جائیں اور مولانا ابوالکلام آزاد کی قیادت کو تسلیم کر لیں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ ان کی آئندہ سرگرمیاں خدمت خلق تک محدود رہیں گی۔ اور مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے مذہبی حقوق کی حفاظت کے لیے جمیعۃ العلماء کی تنظیم میں شامل ہو جائیں۔ پاکستان میں وہ کچھ مدت تک خاموش رہے اور اپنے لیے کوئی نیا نظریہ سوچنے کی کوشش

کرتے رہے۔ انہوں بار بار کہا کہ وہ سیاسیات سے دستبردار نہیں ہوئے اور ان کا ارادہ ہے کہ پاکستان میں حزب اختلاف کی شکل اختیار کریں (حوالہ ''آزاد'' ۲۶ دسمبر ۱۹۵۰ء، ۲۷ مئی ۱۹۵۲ء اور تعمیر نو ۵ دسمبر ۱۹۴۹ء۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ احراری ایک مدت تک بے حرکت رہنے کے بعد ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت سے بیدار ہونے لگے تھے۔ لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ پاکستان میں ان کے پرانے نظریات کے لیے کوئی گنجائش نہیں اور مسلم لیگ انہیں ابھرنے کا موقع نہ دے گی تو انہوں نے سیاسی میدان میں مسلم لیگ کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور اعلان کیا کہ آئندہ وہ تبلیغ میں مصروف رہیں گے لیکن ہمارے سامنے تسلیم کیا گیا ہے کہ احمدیوں کے سوا دوسرے غیر مسلموں کو مسلمان بنانا ان کے لائحہ عمل میں شامل نہ تھا اور تبلیغی سرگرمی کو صرف احمدیوں کے خلاف جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ احمدیوں کے ساتھ احرار کی دشمنی ایک چوتھائی صدی سے چلی آ رہی ہے اور اگر چہ یہ کہنا تو صحیح نہ ہوگا کہ تقسیم سے پہلے انہیں احمدیوں سے اور ان کے عقیدوں اور ان کی سرگرمیوں سے بہت زیادہ سروکار نہ تھا لیکن یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اب احراریوں نے احمدیوں کے خلاف نزاع کو اپنے اسلحہ خانے سے ایک سیاسی حربے کے طور پر باہر نکالا اور جو واقعات اس کے بعد پیش آئے وہ اس امر کی بین شہادت ہیں کہ وہ سیاسی جماعت کی حیثیت سے انتہائی فہم اور چالاک ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ اگر وہ عوام کے جذبات کو احمدیوں کے خلاف برانگیختہ کر دیں گے تو کوئی ان کی مخالفت کی جرات نہ کرے گا۔ اور ان کی اس سرگرمی کی جتنی بھی مخالفت کی جائے گی اسی قدر وہ ہر دلعزیز اور مقبول عام ہو جائیں گے اور بعد کے واقعات سے ظاہر ہوگیا کہ ان کا یہ مفروضہ بالکل صحیح تھا۔ لہٰذا انہوں نے اپنی پوری توجہ احمدیوں پر مرتکز کر دی اس کے بعد خواہ تبلیغ کانفرنس یا دفاع کانفرنس یا استحکام کانفرنس یا یوم تشکر یا یوم مطالبات کی تقریبات ہوں یا محض مویشیوں کا میلہ ہو۔ ان کانفرنسوں اور یوموں وغیرہ کے نام محض ڈھوکا تھے اور ان کا سب سے بڑا موضوع احمدی اور احمدیت ہوتا تھا۔ اگر وہ اس مذہبی نزاع کو دوسرے مذہبی نزاعات کی طرح جاری رکھتے تو غالباً ان کو بہت زیادہ تائید و حمایت حاصل نہ ہوتی۔ لیکن وہ اپنی عیاری کی وجہ سے خوب جانتے تھے کہ مسلمانوں کے جذبات کسی موضوع پر اس

قدر آسانی سے اور تیزی وتندی سے برانگیختہ نہیں کیے جاسکتے اور ان کے غیظ وغضب کو بیدار نہیں کیا جاسکتا جس قدر رسول پاک صلعم کی حقیقی یا خیالی توہین پر کیے جاسکتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے یہ ظاہر کرنا شروع کیا کہ ان کی سرگرمیوں کا مقصد یہ ہے کہ رسول پاکؐ کی نبوت کی حفاظت کی جائے اور آپ کی ناموس پر احمدیوں کے حملوں کا مقابلہ کیا جائے جو اس عقیدے کی نبوت کی اشاعت کرتے ہیں کہ رسول پاکؐ آخری نبی نہیں تھے اور ایک اور نبی پیدا ہوگیا ہے۔ جو رسول پاکؐ کے برابر بلکہ ان سے بہتر ہونے کا دعویدار ہے۔ یہ چال کامیاب ہوگئی۔ اور حاضرین کی کثیر تعداد ان کے جلسوں میں شریک ہونے لگی اور چونکہ بعض احرار مقرر الفاظ وفقرات کے انتخاب اور تشبیہ واستعارہ کے استعمال میں بڑے ماہر واقع ہوئے ہیں اور اپنی تقریروں میں طنز وظرافت کے چھینٹے بھی خوب دیتے ہیں (خواہ وہ ظرافت کتنی ہی متبذل کیوں نہ ہو)۔ لہٰذا وہ روز بروز مقبول عام ہونے لگے حکومت اس پر بہت پریشان ہوئی۔ اور مسٹر دولتانہ چیف منسٹر نے اس کی سرگرمیوں کے متعلق جو پہلی یاداشت قلمبند کی اس مین یہ بالکل صحیح لکھا کہ احراری اپنے لیے سیاسی مقام حاصل کرنے میں کوشاں ہیں۔ یہی رائے مولانا ابوالحسنات کی تھی جو آخر میں ''ڈائریکٹ ایکشن'' کے پہلے ڈکٹیٹر بن گئے۔ چنانچہ مولانا نے اپنے ایک بیان میں جو ''مغربی پاکستان'' مورخہ ۱۱ جولائی ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا یہ کہا کہ احرار نے ختم نبوت کی تحریک سیاسی مقصد سے شروع کی ہے، ہمارا عزم مصمم ہے کہ ہم کسی سیاسی جماعت کو مذہب سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع نہ دیں گے۔ ''مغربی پاکستان'' نے اپنے ۲ جولائی اور ۴ جولائی ۱۹۵۲ء کے پرچوں میں احرار کی سرگرمیوں پر جو تبصرہ کیا۔ اس کا منشا بھی یہی تھا اور احراریوں کی نیتوں کو مسٹر قربان علی خان انسپکٹر جنرل پولیس سے بہتر کوئی نہ جانتا تھا۔ انہوں نے شروع سے آخر تک بار بار اس نکتے پر زور دیا کہ احراریوں نے جان بوجھ کر ایک ایسا مسئلہ منتخب کیا ہے جس میں کوئی ان کی مخالفت کی جرات نہ کرسکے گا۔ اور وہ اسی مسئلے پر نہایت آسانی سے مسلم لیگ کو بھی شکست دے سکیں گے۔ اس مسئلے کے نتائج وعواقب ملک کے مستقبل اور اس کے استحکام کے متعلق نہایت دوررس اہمیت رکھتے ہیں۔ اور اگرچہ حکومت اس وقت ایک مشکل مسئلے سے دوچار ہے۔ لیکن بہر کیف کسی نہ کسی کو کہیں نہ کہیں کوئی فیصلہ کرنا ہوگا اور ایسے ہی مواقع ہوتے ہیں جن پر کسی ملک کی

قیادت کا امتحان ہوتا ہے۔ ہم اس بات کا ذکر کر چکے ہیں کہ احراریوں نے اپنی سیاسیات سے دست برداری کا اعلان کر کے مسلم لیگ کی طرف سے مخالفت کے امکان کا سد باب کر دیا تھا۔ اس کے بعد مسلم لیگ اور احراریوں کے اتحاد کی وجہ سے مسلم لیگ احراریوں کی سرگرمیوں کی طرف سے بے پرواہ رہی۔ بلکہ ان کو نظر انداز بھی کرتی رہی لیکن جب انہوں نے ختم نبوت کے مسئلے پر قریب قریب تمام مذہبی انجمنوں کو اپنے گرد جمع کر لیا تو وہ باہر نکل آئے۔ اور انہوں نے دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کے احکام کی خلاف ورزی شروع کر دی جو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں نے حکومت کی اعلان کردہ پالیسی کے ماتحت صادر کیے تھے۔

پہلے پہلے تو یہ احکام ان عام جلسوں پر عائد کیے گئے جن کے انعقاد یا انتظام کی ذمہ داری احرار پر ہوتی تھی۔ لیکن جب احراریوں نے مسجدوں میں جلسے کرنے شروع کر دیے تو ان احکام کا اطلاق ان جلسوں پر بھی کر دیا گیا۔ اس سے غیظ و غضب کا ایک طوفان برپا ہو گیا کیونکہ احراریوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ حکومت نے مسجدوں کے اندر جلسوں میں دخل دینا شروع کر دیا ہے۔ جو مداخلت فی الدین ہے یہ دلیل بہت آسانی سے کامیاب ہو گئی اور اس سابقہ دلیل ہی کی طرح موثر ثابت ہوئی کہ احرار نبوت کے دفاع اور رسول پاک صلعم کی حرمت کے لیے لڑ رہے ہیں۔ دفعہ ۱۴۴ کے احکام کی خلاف ورزی زیادہ کی جانے لگی اور خاصی مقبول عام ہو گئی اور جب بعض احراری مجرموں کے خلاف اس نافرمانی کی بنا پر مقدمے چلائے گئے تو وہ دفعتہً شہدا کا مرتبہ حاصل کر گئے۔ عوام میں بڑے زور و شور سے پراپیگنڈہ کیا گیا کہ حکومت نہ صرف مسجدوں کو عبادت گاہ کی حیثیت سے اور فرائض مذہبی کی بجا آوری کے لیے استعمال کرنے پر قیود عائد کر رہی ہے بلکہ ان لوگوں پر بیدردانہ مقدمے چلا رہی ہے جن کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ مساجد میں نماز پڑھتے ہیں اور مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ان دلائل کا کوئی جواب نہ تھا اور حکومت نے اس مکروہ پراپیگنڈا کو روکنے کے لیے کچھ نہ کیا بلکہ صرف ایک مبہم اور مختصر بیان شائع کر دیا کہ حکومت کو کسی کے مذہب میں مداخلت کرنا مقصود نہیں ہے۔

جب احرار نے حکومت کے ساتھ مفاہمت کا ڈھونگ رچایا اور ایک پیمان کر لیا (جس کی

اطلاع احرار میں سے صرف انہی کو تھی جنہوں نے وہ پیمان کیا تھا) کہ وہ احمدیوں کو نہ قتل کریں گے نہ لوٹیں گے۔ نہ بے آبرو کریں گے تو حکومت نے جھٹ اس یقین دہانی کو تسلیم کر لیا۔ لہٰذا جن احراری مجرموں کو سزائیں ہو چکی تھیں وہ رہا کر دیے گئے اور زیر سماعت مقدمے اور دفعہ ۱۴۴ کے احکام واپس لے لیے گئے۔ اس کے بعد احرار نے اپنی روایات کے مطابق اپنی سرگرمیاں زیادہ زور وشور سے شروع کر دیں اور چونکہ دفعہ ۱۴۴ کے احکام نافذ ہی نہ تھے جن کی خلاف ورزی کا سوال پیدا ہوتا اس لیے ان کے خلاف کوئی مقدمات دائر نہ ہوئے۔ اور حکام اضلاع نے ان سے کوئی تعرض نہ کیا۔

خواجہ ناظم الدین سے گفت وشنید شروع ہوئی اور جنوری کی کراچی کنونشن اور اس کی قائم کردہ مجلس عمل کی طرح یہاں بھی احرار ہی کا غلبہ وتسلط رہا۔ رضا کاروں کی بھرتی اور سرمایے کی فراہمی کا کام تمام تر احرار ہی کر رہے تھے اور جب مولانا اختر علی خاں نے تحفظ ختم نبوت کے نام پر خود روپیہ جمع کرنے کی کوشش کی تو اس پر بہت کم لوگوں نے لبیک کہی۔ لہٰذا سول بغاوت کا سارا سر وسامان احرار ہی کا کیا دھرا تھا۔

آل مسلم پارٹیز کانفرنس بھی احرار ہی کی ساختہ پرداختہ تھی اور اس کی کاروائیوں پر بھی انہی کا غلبہ رہتا تھا مجلس عمل میں ان کو ان کے حصے سے زیادہ نمائندگی حاصل تھی اور مجلس کے بعض ممبر جو دوسری جماعتوں کے نامزد کیے ہوئے تھے وہ بھی اصل میں احراری ہی تھے۔ بالآخر گرفتاری اور قید میں بھی احراریوں کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔ پس وہ فسادات کے لیے براہ راست ذمہ دار تھے۔

احرار کے رویے کے متعلق ہم نرم الفاظ استعمال کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کا طرز عمل بطور خاص مکروہ اور قابل نفرین تھا۔ اس لیے کہ انہوں نے ایک دنیاوی مقصد کے لیے ایک مذہبی مسئلے کو استعمال کر کے اس مسئلے کی توہین کی اور اپنے ذاتی اغراض کی تکمیل کے لیے عوام کے مذہبی جذبات و حسیات سے فائدہ اٹھایا۔ اس بات پر صرف احرار ہی یقین رکھ سکتے ہیں کہ وہ اپنے اعمال میں مخلص تھے کیونکہ ان کی گزشتہ تاریخ اس قدر واضح طور پر غیر مستقل رہی ہے کہ کوئی احمق ہی ان کے دعوئے مذہبیت سے دھوکا کھا سکتا ہے۔ خواجہ ناظم الدین نے ان کو دشمنان پاکستان قرار دیا اور وہ اپنی گزشتہ سرگرمیوں کی وجہ سے اسی لقب کے مستحق تھے۔ ان کے بعد کے رویے سے یہ واضح ہو گیا کہ نئی مملکت

کے وجود میں آنے کے بعد وہ اس کے مخالف ثابت ہوئے، جو پارٹی پاکستان اور مسلم لیگ اور اس کے تمام لیڈروں کی مخالفت اور کانگرس کی محض ایک کنیز تھی۔ اس کے لیے یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اپنے گزشتہ نظریات کو ترک کر دیتی اور قیام پاکستان پر جو اس کی مخالفانہ کوششوں کے باوجود وجود میں آ گیا تھا۔ راتوں رات اپنے عقائد کو بدل کر اس مملکت میں اسلام کی واحد اجارہ دار بن بیٹھتی جس کے قیام کے خلاف اس نے ایڑی سے چوٹی تک کا زور دیا تھا۔ کیا احرار پر اپنے نصب العین کا انکشاف تقسیم کے بعد ہی ہوا تھا؟ پاکستان کے لیے اسلامی مملکت کا جو نعرہ وہ لگا رہے تھے وہ اس وقت کہاں تھا۔ جب وہ ان جماعتوں اور ان لوگوں کے خلاف برسر پیکار تھے جو مسلمانوں کے لیے صرف ایک وطن کا مطالبہ کر رہے تھے؟ کیا ان کے ہندوستانی ساتھیوں کو جواب تک احرار ہی کہلاتے ہیں۔ کانگرس نے یہ کام سپرد نہیں کیا کہ وہ کشمیریوں کو بخشی کی حکومت گوارا کرنے پر آمادہ کریں؟

اگر یہ سب کچھ سچ ہے تو صرف پاکستان کے سادہ لوح لوگ ہی احراریوں کے مذہبی جوش کے اظہار سے دھوکا کھا کر بے وقوف بن سکتے ہیں۔ وہ جن نظریات کو پاکستان میں نافذ کرنا چاہتے ہیں ان کو اختیار کرنے کے متعلق ذرا ان کے صدر کے خیالات سنیے:

سوال۔ کیا آپ کو اقبال اور نہرو کے اختلاف کا کچھ علم ہے؟

جواب۔ جی ہاں۔

سوال۔ ازراہ کرم بیان فرمائیے کہ ان دونوں کے درمیان کس موضوع پر اختلاف تھا؟

جواب۔ نہرو وطن پر زور دیتے تھے لیکن علامہ اقبال مذہب پر اصرار کرتے تھے۔

سوال۔ تو گویا احرار کے اور علامہ اقبال کے نظریوں کے درمیان کھلا ہوا تصادم موجود تھا؟

جواب۔ جی ہاں۔

سوال۔ پھر احرار نے اپنا نظریہ تبدیل کیوں کر لیا؟

جواب۔ جب تک ہم کانگرس کے ساتھ تھے ہم سیاسی پارٹی تھے لیکن جب پاکستان وجود میں آ گیا تو ہم نے اپنے آپ کو ایک مذہبی پارٹی میں تبدیل کر لیا۔

سوال۔ جب احراری کانگرس کا ساتھ دے رہے تھے تو کیا وہ اس امر کو جزو مذہب سمجھتے تھے

کہ وہ ایک غیر منقسم ملک میں اچھے شہری بن کر رہ سکتے ہیں؟

جواب۔۔جی ہاں۔

سوال۔کیا آپ اب تک اس مذہبی عقیدے پر قائم ہیں؟

جواب۔۔جی نہیں۔

سوال۔کیا احرار قومیت پرست مسلمانوں کی ایک جماعت تھی؟

جواب۔۔جی ہاں۔

سوال۔کیا ان کا نظریہ وہی تھا جو کانگرس کا تھا؟

جواب۔۔جی ہاں

سوال۔کیا جمعیت العلمائے ہند بھی قومیت پرست مسلمانوں کی ایک جماعت تھی؟

جواب۔۔جی ہاں۔

سوال۔کیا آپ کی رائے میں مسلمان مستقبل کے اس دستور کے ماتحت جو احرار اور کانگرس کے تصور میں موجود تھا ایک مسلمان کی سی زندگی بسر کر سکتا تھا؟

جواب۔۔جی ہاں۔

سوال۔کیا آپ اب تک اس رائے پر قائم ہیں؟

جواب۔۔جی نہیں۔

سوال۔کیا کانگرس اور احرار کے نظریہ میں وطن غالب حیثیت رکھتا تھا؟

جواب۔۔جی ہاں۔

سوال۔کیا آپ کانگرس کے اس خیال سے متفق تھے؟

جواب۔۔جی ہاں۔

سوال: کیا آپ اسی نظریے کو پاکستان کے شہریوں کے لیے بھی موزوں سمجھ سکتے ہیں جو کانگرس کے ساتھ تعلق کے زمانے میں آپ کا نظریہ تھا؟

جواب۔۔جی نہیں۔

اس تبصرے کی کوئی ضرورت نہیں کہ پاکستان میں احرار کا سا ماضی رکھنے والی جماعت بھی اگر ایک بظاہر معقول مذہبی شاخسانہ کھڑا کردے تو وہ حکومت کا تختہ الٹ سکتی ہے۔

احمدی

احمدی براہ راست فسادات کے لیے ذمہ دار نہ تھے۔ کیونکہ فسادات حکومت کے اس اقدام کا نتیجہ تھے جو حکومت نے اس پروگرام کے خلاف کیا تھا جو ڈائریکٹ ایکشن کی قرارداد کے ماتحت آل مسلم پارٹیز کنونشن نے اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن مطالبات کا تعلق احمدیوں سے تھا اور وہ مطالبات اس لیے وجود میں آئے تھے کہ احمدیوں کے بعض عقائد اور ان کی سرگرمیاں مخصوص انداز کی تھیں اور وہ دوسرے مسلمانوں سے علیحدہ اور ممیّز ہونے پر زور دے رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مطالبات احمدیوں کے عقائد اور ان کی سرگرمیوں ہی کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ لہٰذا یہ معین کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ آیا فسادات کے اشتعال میں احمدیوں کا بھی کوئی حصہ تھا۔ عامۃ المسلمین کے ساتھ ان کے اختلافات نصف صدی سے زیادہ مدت سے چلے آ رہے تھے۔ اور تقسیم سے پیشتر وہ کسی روک ٹوک کے بغیر اپنے پروپیگنڈے اور اپنی تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف تھے تاہم قیام پاکستان سے صورت حالات بالکل بدل گئی۔ اس کے بعد اگر احمدی یہ سمجھتے تھے کہ اب اسلام کے سوا دوسرے مذاہب کی تلقین یا اسلام کے اندر فرقہ وار عقائد کی تبلیغ کی اجازت جن حدود کے اندر دی جائے گی۔ ان کے متعلق اگر وہ کوئی پالیسی وضع نہ کریں گے جب بھی ان کی سرگرمیوں کے خلاف کوئی برہمی پیدا نہ ہوگی اور نئی مملکت میں ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا تو وہ گویا اپنے آپ کو دھوکا دے رہے تھے۔ تاہم بدلے ہوئے حالات کے مطابق ان کی سرگرمیوں اور ان کی جارحانہ نشر و اشاعت میں کوئی تغیر پیدا نہ ہوا اور غیر احمدی مسلمانوں کے خلاف دل آزار باتیں برابر کہی جاتی رہیں۔

کوئٹہ میں مرزا بشیر الدین محمود احمد نے جو تقریر کی وہ نہ صرف نامناسب بلکہ غیر مآل اندیشانہ اور اشتعال انگیز تھی۔ اس تقریر میں انہوں نے بلوچستان کے صوبے کی پوری آبادی کو احمدی بنا لینے

اور اس صوبے کو مزید جدوجہد کے مرکز کی حیثیت سے استعمال کرنے کی علی الاعلان حمایت کی۔ اسی طرح جب انہوں نے اپنے پیرووں کو یہ ہدایت کی کہ تبلیغ احمدیت کے پروپیگنڈے کو تیز کر دیں تا کہ ۱۹۵۲ء کے آخر تک پوری مسلم آبادی احمدیت کی آغوش میں آجائے تو گویا مسلمانوں کو تبدیلی مذہب کے متعلق سرگرمیوں کا کھلا نوٹس دے دیا اور جب مرزا غلام احمد کو نہ ماننے والوں کے متعلق ''دشمن'' یا ''مجرم'' یا محض ''مسلمان'' کے الفاظ استعمال کیے گئے تو جن لوگوں کی توجہ ان اشارات کی طرف مبذول کرائی گئی ان کا مشتعل ہونا لازمی تھا۔ احمدی افسروں نے لوگوں کو احمدی بنانے کی مہم میں ازسرتاپا مصروف ہو جانا اپنا مذہبی فریضہ خیال کیا۔ ان کے اس رویے کی وجہ سے احمدیوں کو اس امر کا حوصلہ ہوا کہ جہاں کہیں انہیں افسروں کی حمایت حاصل تھی یا حاصل ہونے کی توقع تھی وہاں اپنے مقصد کے حصول میں زور و شور سے مصروف ہو جائیں۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ اگر ضلع منٹگمری کا حاکم اعلیٰ احمدی نہ ہوتا تو احمدیوں کو ہرگز جرات نہ ہوتی کہ غیر احمدی دیہات کے علاقے میں کھلم کھلا اپنے تبلیغی مشن پر روانہ ہو جاتے۔ جب کوئی سرکاری افسر اپنے فرقہ ورانہ عقائد کا علےٰ لاعلان اظہار کرتا ہے۔ جیسے کہ بعض احمدی افسروں نے کیا تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ جن تنازعات میں اس کی جماعت کا کوئی فرد ایک فریق ہو ان میں اس کی غیر جانب داری پر کسی کو اعتماد نہیں رہتا۔ اس کا فیصلہ کتنا ہی صحیح اور دیانت دارانہ ہو لیکن اگر وہ فیصلہ اس فریق کے خلاف ہو جو اس افسر کی جماعت سے تعلق نہ رکھتا ہو تو اس فریق کو یہ یقین دلانا غیر ممکن ہے کہ اس کو فرقہ وارو جوہ کی بنا پر ناانصافی کا شکار نہیں بنایا گیا۔ لہٰذا ان افسروں کا طرز عمل نہایت افسوسناک تھا اور اس امر کا مظہر تھا کہ وہ اس اصول کے فہم سے بالکل قاصر ہیں جس کے ماتحت کسی سرکاری افسر کو اپنا ظاہری رویہ معین کرنا چاہیے۔ لہٰذا ہمیں یقین ہے کہ اگرچہ احمدی براہ راست فسادات کے ذمے دار نہیں ہیں لیکن ان کے خلاف عام شورش کا موقع خود انہی کے طرز عمل نے بہم پہنچایا۔ اگر ان کے خلاف احساسات اتنے شدید نہ ہوتے تو ہم نہیں سمجھتے کہ احراری اس حالت میں بھی ہر قسم کی مختلف مذہبی جماعتوں کو اپنے گرد جمع کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔

مسلم لیگ

تحریک تحفظ ختم نبوت اور بعد کے فسادات کے متعلق مسلم لیگ کے بہت سے ممتاز ممبروں کی سرگرمیوں کا ذکر اس رپورٹ کے کسی سابقہ حصے میں تفصیل سے کیا جا چکا ہے۔ یہاں صرف یہ ضروری ہے کہ ان بڑے واقعات کا اعادہ کر دیا جائے جو مسلم لیگ، بعض مسلم لیگی افراد اور بعض مسلم لیگی عہدہ داروں سے تعلق رکھتے ہیں جو پارٹی کے ضبط کے ماتحت تھے۔ یاد ہوگا کہ زمانہ زیر تبصرہ کے دوران میں ۱۶ اپریل ۱۹۴۹ء سے ۲۰ اگست ۱۹۵۰ء تک میاں عبد الباری ۔۲۰ اگست ۱۹۵۰ء سے ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء تک صوفی عبدالحمید اور ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۱ء کے بعد مسٹر دولتانہ صوبائی مسلم لیگ کے صدر رہے۔ ممدوٹ وزارت کی موقوفی کے بعد میاں عبدالباری نے دفعہ ۹۲ االف کے نفاذ کے دوران میں مسلم لیگ کے بعض لیڈروں کو گورنر کے مشیروں کی حیثیت سے نامزد کر دیا تھا۔ اگرچہ صوبائی نظم ونسق کی ذمہ داری گورنر ہی پر عائد تھی۔ جو گورنر جنرل کی جانب سے کارفرما تھا۔ لیکن گورنر نے، وہی طرز عمل اختیار کیا جو منتخب عوامی وزارت کے برسراقتدار ہونے کی حالت میں ملحوظ رکھا جاتا ہے۔۔ لہٰذا مشیروں کی حیثیت وزیروں کی مانند تھی ۴ نومبر ۱۹۴۹ء سے ۲۴ جولائی ۱۹۵۰ء تک شعبہ قانون وانتظام کے مشیر ملک محمد انور تھے۔

اگرچہ مسٹر دولتانہ کے اخباری بیان مورخہ یکم اپریل ۱۹۵۲ء میں اور اس بیان کے ماتحت ۳ اپریل ۱۹۵۲ء کو جو ہدایات لیگیوں کے نام جاری کی گئیں ان میں مسلم لیگ کے ممبرں کو غیر لیگی جلسوں کی صدارت سے منع کر دیا گیا تھا اور ان کو ہدایت کی گئی تھی کہ ایسی سرگرمیوں میں کوئی حصہ نہ لیں جن سے پاکستان کے شہریوں کے مختلف طبقوں کے درمیان بیگانگی یا دشمنی پیدا ہونے کا احتمال ہو۔ لیکن لیگ کی کسی تنظیم نے ان ہدایات سے یہ مطلب اخذ نہ کیا کہ ان کے ممبروں کو تحریک تحفظ ختم نبوت کی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے منع کیا گیا ہے۔ ان ہدایات میں خالص مجلسی اور غیر سیاسی نوعیت کی تقریبوں کو مستثنےٰ قرار دیا گیا تھا۔ اور اگرچہ یہ بتا دیا گیا تھا کہ لفظ ''سیاسی'' کو اس کے ڈھیلے

ڈھالے مفہوم میں نہ لیا جائے بلکہ اس کا شدید اور معین مطلب سمجھا جائے لیکن متعدد اضلاع میں مسلم لیگ کے ممبروں نے دل و جان سے تحفظ ختم نبوت کی تحریک میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس ہدایت کی طرف بھی کوئی توجہ نہ کی گئی کہ مسلم لیگ کو ایسی سرگرمیوں میں حصہ نہ لینا چاہیے جن سے پاکستانی شہریوں کے مختلف طبقوں کے درمیان بیگانگی یا دشمنی پیدا ہونے کا احتمال ہو۔ اور لیگ کے عہدہ دار اور ممبر بلکہ مجلس قانون ساز کے وہ ممبر جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے۔ بے تکلف اس تحریک کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ اگر کبھی ان سرگرمیوں کی اطلاع صوبائی مسلم لیگ کو موصول بھی ہوئی تو اس نے اس کی پروانہ کی اور بعض ممبروں نے جو استفسارات اس سلسلے میں کیے ان کا بھی کوئی قطعی جواب نہ دیا گیا۔ سٹی مسلم لیگ گوجرانوالہ نے اپنے ایک اجلاس منعقدہ ۱۷ جولائی ۱۹۵۲ء میں ایک قرارداد منظور کی۔ جس میں اعلان کیا کہ ختم نبوت اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ ہے۔ مساجد پر دفعہ ۱۴۴ کے احکام کے اطلاق کی مخالفت کی ان احکام کو مداخلت فی الدین قرار دیا۔ اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ نہ صرف ان احکام کو واپس لے بلکہ ان کی خلاف ورزی کی وجہ سے جو مقدمات دائر کیے گئے ہیں ان کو بھی واپس لے لے۔ سٹی مسلم لیگ گوجرانوالہ کی قرارداد کے بعد ۲۰ جولائی کو سٹی مسلم لیگ سرگودہا نے بھی ایک قرارداد منظور کی جس میں مطالبہ کیا کہ احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ اور صوبائی مسلم لیگ اور آل پاکستان مسلم لیگ سے استدعا کی کہ وہ اس قسم کا اعلان کرانے کی غرض سے عملی تدابیر اختیار کریں اسی قسم کی ایک قرارداد میں سٹی مسلم لیگ کامونکے نے قادیانیوں کو مسلم لیگ کی ممبری کے حق سے محروم قرار دیا۔ اور لیگ سے انکے اخراج کا مطالبہ کیا۔ جن اہم لیگی اشخاص نے احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے متعلق قراردادوں کی حمایت کی (اور وہ قرارداد دیں صوبائی مسلم لیگ کے اس سالانہ اجلاس میں ۲۶۔ ۲۷ جولائی ۱۹۵۲ء میں منعقد ہونے والا تھا میں پیش کرنے کے لیے بھیج دی گئیں) ان اشخاص کے نام درج ذیل ہیں:

قاضی مرید احمد ایم ایل اے کونسلر پنجاب مسلم لیگ

صاحبزادہ محمود شاہ (گجرات) کونسلر پنجاب مسلم لیگ

محمد اسلام الدین ایم ایل اے

مولانا سید احمد سعید کاظمی ممبر صوبائی مسلم لیگ کونسل

خواجہ عبدالحکیم صدیقی صدر سٹی مسلم لیگ ملتان

صوفی محمد عبدالغفور لدھیانوی آفس سیکرٹری ڈسٹرکٹ مسلم لیگ وکونسلر پنجاب مسلم لیگ

محمد ابراہیم قریشی جنرل سیکرٹری سٹی مسلم لیگ جھنگ وکونسلر پنجاب مسلم لیگ

مسٹر دولتانہ (صدر) اور دوسرے عہدے داروں نے ان قراردادوں کا جائزہ لیا اور اگرچہ یہ معلوم نہیں کہ جس قرارداد کو ۲۷ جولائی کے دن کونسل کے دوسرے اجلاس میں پیش ہونا تھا اس کا مسودہ کس نے تیار کیا تھا۔ لیکن مسٹر دولتانہ نے اس قرارداد کی پوری ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ یہ قرارداد آٹھ کے مقابلے میں ۲۸۴ کی بھاری اکثریت سے منظور ہوئی جس میں کہا گیا کہ عقیدہ ختم نبوت کے متعلق مسلمانوں اور قادیانیوں کے اختلافات بنیادی ہیں۔ اور انہی اختلافات کی وجہ سے یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ دستور پاکستان میں احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ اور یہ تجویز کسی حد تک مسلمانوں کے اس ردعمل کی مظہر ہے جو مذہبی امور اور شہری ومجلسی زندگی کے دوسرے دوائر میں قادیانیوں کے قوی انقطاعی رجحانات سے پیدا ہوا ہے۔ اس تجویز میں آئینی اور قانونی نوعیت کے بعض سنگین اور اہم مسائل شامل ہیں جن پر نہایت گہرے غور وخوض کی ضرورت ہے اور یہ کام پورے اعتماد کے ساتھ پاکستان مسلم لیگ اور پاکستان دستور ساز اسمبلی کے لیڈروں کی پختہ کارانہ دانشمندی پر چھوڑا جاسکتا ہے اور اس اثنا میں مسلم لیگ کے ہر ممبر کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ سکون ومتانت کی فضا پیدا ہو جائے۔ کیونکہ صرف ایسی ہی فضا میں بنیادی دستوری پالیسی پر اثر ڈالنے والے معقول فیصلے کیے جاسکتے ہیں اور کونسل اس اصول سے اپنی غیر متزلزل وابستگی کا اظہار کرتی ہے کہ مسلمانان پاکستان کا صرف جمہوری ہی نہیں بلکہ مذہبی فرض بھی ہے کہ بلا امتیاز مذہب ملت مملکت کے ہر شہری کے جان ومال، آبرو اور تمام شرعی حقوق کی حفاظت کریں۔ اس قرارداد کی تہہ میں جو خیال مضمر ہے اس کی تصریح اس سے قبل مسٹر دولتانہ بمقام پسرور ضلع سیالکوٹ کی مسلم لیگی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے بھی کر چکے تھے اور قرارداد منظور ہو جانے کے بعد بھی ۳۰ اگست کو حضوری باغ لاہور میں اور ۱۳ ستمبر کو راولپنڈی میں مسٹر دولتانہ نے ختم نبوت کے متعلق اپنے اور تمام مسلمانوں کے

ایمان پر زور دیا۔اس عقیدے کو نہ ماننے کے نتائج واضح کیے۔ان مطالبات کی نوعیت واضح کی جو اس عقیدے کا نتیجہ یا اس عقیدے پر مبنی تھے۔اور اس موقف کا اعلان کیا کہ مطالبات کی نوعیت دستوری ہے۔لہٰذا ان پر غور و فیصلہ کا حق صرف مرکز کو حاصل ہے ان تقریروں میں انہوں یقیناً اس حقیقت پر بھی زور دیا کہ پاکستان کی مذہبی اقلیتیں اپنے جان و مال و آبرو کے تحفظ کی حقدار ہیں۔اس قرارداد سے اور ان تقریروں سے نہایت واضح اور قطعی طور پر یہ ظاہر ہے کہ مسلم لیگ اور ذاتی طور پر مسٹر دولتانہ خود بھی قادیانیوں کو غیر مسلم سمجھتے تھے۔کیونکہ حضوری باغ میں انہوں نے جو تقریر کی اس سے صرف یہی نتیجہ اخذ کرنا ممکن ہے کہ عقیدہ ختم نبوت کو معرض بحث میں لانا ہی ''کفر'' ہے اور ختم نبوت ہمارے ایمان کا ایک حصہ ہے جو ہر قسم کی دلیل اور منطق سے بالاتر ہے۔اور قادیانی اپنے علیحدگی پسند رجحانات کی وجہ سے خود ہی اس شدید جذبے کے ذمہ دار ہیں جو ان کے خلاف لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہے۔ان کی راولپنڈی کی تقریر سے بھی بالکل یہی نتیجہ نکلتا ہے۔۲۵ اکتوبر کو ظام آباد کے مقام پر ڈسٹرکٹ مسلم لیگ گوجرانوالہ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے مسٹر دولتانہ نے ایک مبہم سا اشارہ کیا کہ بعض لوگ مسلمانوں میں تفرقہ ڈال رہے ہیں۔اور یہ لوگ نہ صرف اتحاد اسلامی بلکہ پاکستان کی سالمیت کو تباہ کررہے ہیں لیکن اگر ان کے سابقہ اعلانات کو پیش نظر رکھا جائے تو اس اشارے کا تعلق مسلمانوں اور احمدیوں کے اختلافات سے نہیں ہوسکتا تھا۔کیونکہ مسٹر دولتانہ اپنی سابقہ تقریروں میں احمدیوں کو تو واضح طور پر دائرہ اسلام سے خارج قرار دے چکے تھے۔

دوسرا نکتہ جو اس قرارداد اور ان تقریروں سے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ احمدیوں کے متعلق مطالبات اپنی نوعیت کے اعتبار سے لازماً دستوری حیثیت رکھتے ہیں۔لہٰذا ان میں مداخلت کا حق صرف مرکزی ارباب اختیار کو ہے جن سے آل پاکستان مسلم لیگ مرکزی حکومت اور پاکستان کی دستور ساز اسمبلی مراد ہیں۔مسٹر دولتانہ اس موقف کے اظہار کے نتائج و عواقب سے یقیناً پوری طرح باخبر ہوں گے۔قرارداد کی زبان سے اور اس موضوع پر مسٹر دولتانہ کی تقریروں کے الفاظ و فقرات سے ایک بات نہایت صفائی سے واضح ہوگئی ہے کہ صوبے کو قانون و انتظام کے پہلو کے سوا ان مطالبات سے کوئی سروکار نہیں اور صرف مرکز ہی ہے جو ان مطالبات کی طرف متوجہ ہوسکتا ہے اور ان

کے تسلیم کرانے کے لیے ضروری تدابیر اختیار کرسکتا ہے اس کے بعد کسی شخص کو یہ کہنے کی جرات نہ ہو سکتی تھی کہ احمدی ایک الگ قوم نہیں ہیں بلکہ دائرہ اسلام کے اندر ہیں اور ان کے خلاف جو مطالبات کیے جارہے ہیں وہ بے بنیاد اور غیر حق بجانب ہیں اور مسترد کردینے چاہیں۔ جب مطالبات کو جائز و حق کو جائز و حق بجانب قرار دیا جاچکا تو اس کے بعد یہ لازم ہوگیا کہ ان کے متعلق ہر قسم کے معروضات اور دعوے مرکز میں پیش ہونے چاہیں اور ان مطالبات کو تسلیم کرانے کے لیے ہر قسم کی سرگرمیوں کا رخ مرکزی ارباب اختیار کی طرف ہونا چاہیے۔ یعنی خواجہ ناظم الدین کی طرف جو آل پاکستان مسلم لیگ کے لیڈر اور پاکستان کے وزیر اعظم ہیں کیونکہ اگر وہ چاہیں تو پارٹی کے اجلاس میں ان مطالبات کو تسلیم کرا کر دستور ساز اسمبلی سے بھی منظور کرا سکتے ہیں۔ لہٰذا حالات نے یہی صورت اختیار کرلی اور خواجہ ناظم الدین اپنے آپ کو ایک دشوار حالت میں پا کر بے حد مضطرب ہوئے بالکل اسی طرح جیسے دولتانہ صاحب اس صورت میں مضطرب ہوتے، اگر مطالبات کا تعلق صوبائی حکومت سے ہوتا۔

اب سرگرمیوں کا مرکز کراچی میں منتقل ہوگیا اور علما کے وفد پر خواجہ ناظم الدین سے ملاقات کر کے مطالبات پر گفتگو کرنے لگے۔ علما کے ساتھ ان ملاقاتوں اور ان کی سرگزشتوں کے تفصیلی حالات اس سے قبل بیان کیے جاچکے ہیں۔ چونکہ خواجہ صاحب نہایت مذہبی آدمی اور مخلص و راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ اس لیے انہوں نے اس موقع پر اپنے آپ کو عجب گومگو کی حالت میں پایا۔ وہ جلیل القدر علما کے دلائل کو رد نہ کر سکتے تھے کیونکہ وہ دلائل خود ان کے عقائد کے مطابق تھے انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ قائداعظم کے انتقال، قرارداد مقاصد کی منظوری اور مجلس اصول اساسی کی سفارشات کے وقت سے علماء کو مملکت میں بڑا اقتدار حاصل ہو چکا ہے۔ اگر وہ مطالبات کو رد کردیتے تو خود ان کے بیان کے مطابق علماء سے ان کا کھلم کھلا تصادم ہو جاتا اور وہ اس صورت سے ہر حال میں بچنا چاہتے تھے۔ وہ ان مطالبات کو تسلیم بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو پاکستان ضحوکہ روزگار بن جاتا اور بین الاقوامی دنیا پر اس دعوے کی حقیقت کھل جاتی کہ پاکستان ایک ترقی پذیر روشن خیال اور جمہوریت پسند مملکت ہے۔ تسہیل اور مفاہمت کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں۔ اگرچہ مسئلہ بالکل

صاف اور واضح تھا لیکن اس میں ایسے خطرناک اثرات وعواقب شامل تھے کہ ایک طرف یا دوسری طرف کوئی بھی قطعی فیصلہ کیا جاتا خواجہ صاحب کے لیے ضرور مصیبت کا باعث ہوتا۔

خواجہ ناظم الدین کو اس اندوہ ناک صورت میں کس نے مبتلا کیا۔ اس کا جواب یقیناً یہی ہے کہ مسلم لیگ کی قرارداد اور اس کی تصریح وتوضیح نے۔ جب لیگ نے مطالبات کے وجود اور ان کے جواز کو رسمی طور پر تسلیم کرلیا اور ان کی دستوری نوعیت کو قائم اور واضح کر دیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ شورش کا رخ کراچی کی طرف پھر جاتا۔ اسکے بعد صوبائی مسلم لیگ ممبر بے نیاز و بے پرواہ بھی رہ سکتے تھے اور اگر چاہتے تو مطالبات کی کھلم کھلا حمایت بھی کر سکتے تھے۔ لیکن خود لیگ کی قرارداد میں ان کی واضح تائید کی جاچکی تھی۔ لہٰذا نتیجہ یہ ہوا کہ اب مسلم لیگ کے ممبر کسی تامل وتکلیف کے بغیر مطالبات کی حمایت کا اعلان کرنے لگے جو بے شمار پوسٹر اور اشتہارات مطالبات کی تائید میں شائع ہو رہے تھے۔ ان میں لیگ کے اہم عہدے دار اور صوبائی اسمبلی کے مسلم لیگی ممبروں کے نام نہایت نمایاں حیثیت سے درج کیے جاتے تھے۔

صرف جولائی کے مہینے میں اس قسم کے پانچ پوسٹر شائع ہوئے ان میں سے ایک پوسٹر کا عنوان تھا ''ختم نبوت کے مسئلے پر مسلمان اپنا آخری قطرہ خون تک بہا دے گا''۔ یہ پوسٹر مجلس احرار اسلام لائل پور کے شعبہ نشر واشاعت نے شائع کیا تھا اور اس پر چودھری عزیز الدین ایم ایل اے صدر ڈسٹرکٹ مسلم لیگ لائل پور اور ممبر مجلس عاملہ پنجاب صوبہ مسلم لیگ، شیخ بشیر احمد صدر سٹی مسلم لیگ لائل پور اور چار دوسرے مسلم لیگی ایم ایل اے کے دستخط ثبت تھے۔ ایک اور پوسٹر ادارہ تحفظ ختم نبوت نے شائع کیا جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ تحریک میں گرفتار ہونے والے اشخاص کو رہا کر دیا جائے اور ان کوائف کی تحقیقات کرائی جائے جو شہدا ملتان کی موت پر منتج ہوئے۔ اس پوسٹر پر یہ نام درج تھے۔ ڈاکٹر علی محمد صدر مسلم لیگ سمندری، چودھری علی شیر جنرل سیکرٹیری مسلم لیگ سمندری، شیخ محمد عالم کونسلر ڈسٹرکٹ مسلم لیگ لائل پور، حکیم منصف علی ممبر مجلس عاملہ مسلم لیگ لائل پور؛ چودھری خدا بخش ممبر مجلس عاملہ مسلم لیگ سمندری، چودھری محمد علی مجاہد سمندری، چودھری محمد یعقوب سمندری اور چودھری عنایت اللہ سمندری۔ تیسرے پوسٹر پر محمد عاشق خان جنرل سیکرٹری سٹی مسلم لیگ قصور، سید

حسن علی شاہ ہمدانی کونسلر سٹی مسلم لیگ اور میاں خادم حسین ممبر مسلم لیگ قصور کے دستخط تھے۔ حکیم محمد عین الحق سیکرٹری پرائمری مسلم لیگ مگھیانہ، میاں گل محمد مجلس عاملہ مسلم لیگ مگھیانہ، حافظ ظفر احمد ممبر مجلس عاملہ مسلم لیگ مگھیانہ، حکیم عباس علی خاں ممبر مجلس عاملہ، ممبر مجلس عاملہ مسلم لیگ مگھیانہ، سید محمد سبطین ممبر مجلس عاملہ مسلم لیگ مگھیانہ، سید غلام عباس علی شاہ صدر پرائمری مسلم لیگ موضع جھرکی۔ حاجی اللہ جوایا کونسلر سٹی مسلم لیگ مگھیانہ، ماسٹر اللہ دتہ کونسلر مسلم لیگ مگھیانہ، میاں غلام قادر ممبر مسلم لیگ مگھیانہ، ماسٹر غلام نبی سینئیر نائب صدر مسلم لیگ مگھیانہ، میاں نذیر حسین کونسلر سٹی مسلم لیگ مگھیانہ، میاں احمد دین خزانچی مسلم لیگ مگھیانہ چودھری دوست محمد ممبر مسلم لیگ مگھیانہ، میاں امیر بخش جائنٹ سیکرٹری مسلم لیگ مگھیانہ، میاں خادم حسین سالار ڈسٹرکٹ مسلم لیگ جھنگ اور میاں رحمت اللہ کونویز پرائمری مسلم لیگ مگھیانہ، مجلس تحفظ ختم نبوت شیخوپورہ نے متفقہ مطالبات کے عنوان سے ایک پوسٹر شائع کیا۔ جس پر عطا محمد، خیر دین چشتی، محبوب الٰہی، محمد شریف، محمد اسلم، عبدالرحیم، امین گیلانی، ناصر قریشی اور چودھری مشتاق احمد ارکان مجلس عاملہ کونسلرز سٹی مسلم لیگ شیخوپورہ کے دستخط تھے۔ اس پوسٹر میں مطالبات کی حمایت کی گئی تھی۔ دفعہ ۱۴۴ کے احکام کو مداخلت فی الدین قرار دیا گیا تھا اور ان کو واپس لینے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

اسی مجلس نے اسی مضمون کے متعلق ایک اور پوسٹر شائع کیا جس پر چودھری عبدالغنی ایم ایل اے کونسلر پاکستان مسلم لیگ، حاجی محمد علی ایم ایل اے، چودھری لال خان صدر ڈسٹرکٹ مسلم لیگ شیخوپور اور چودھری محمد ابراہیم صدر سٹی مسلم لیگ شیخوپورہ کے دستخط ثبت تھے۔

مسلم لیگ کے ممبروں نے سرمائے کی فراہمی اور رضا کاروں کی بھرتی میں سرگرم حصہ لیا۔ ان میں سے بعض افراد اضلاع میں ڈکٹیٹر یا ڈائریکٹ ایکشن کمیٹیوں کے ممبر بن گئے۔ اور جب فسادات شروع ہوئے تو یہ لوگ دل و جان سے تحریک میں کود پڑے مسلم لیگ کے ۳۷۷ ممبر اس شورش میں شامل ہوئے۔ مسٹر محمد حسین سپرنٹنڈنٹ پولیس نے اضلاع سے موصول شدہ سرکاری اطلاعات کی مدد سے ایک فہرست تیار کی ہے۔ جس میں ان مسلم لیگیوں کے کوائف درج ہیں معلوم ہوتا ہے کہ میانوالی کے سوا باقی تمام اضلاع کے کے مسلم لیگی اس تحریک سے متاثر ہوئے۔ مندرجہ

ذیل فہرست سے معلوم ہوگا کہ ہر ضلع میں مسلم لیگ کے کتنے ممبر اس شورش میں شامل ہوئے۔

لاہور	۲۶	منٹگمری	۱۸
سیالکوٹ	۲۸	جھنگ	۱۰
شیخوپورہ	۲۱	ڈیرہ غازی خان	۳
گجرات	۳۷	مظفر گڑھ	۱۶
سرگودھا	۵۸	ملتان	۲۱
جہلم	۹	گوجرانوالا	۴۳
راولپنڈی	۳۱	لائل پور	۶۱
کیمبل پور	۵	کل میزان	۳۷۷

ان حضرات نے جلوسوں میں حصہ لیا۔ پر تشدد ہجوموں کی قیادت کی۔ دفعہ ۱۴۴ کے احکام کی خلاف ورزی کی۔ اور تحریک کی مالی امداد کے لیے سرمایہ فراہم کیا۔ اس فہرست میں جن اشخاص کے نام درج ہیں ان میں صوبے کی مختلف مسلم لیگیوں کے صدر، سنئیر نائب صدر، نائب صدر، سیکرٹری، خزانچی اور دوسرے عہدہ دار شامل ہیں۔ ان میں سے چار صوبائی مسلم لیگ کے کونسلر ہیں۔ پانچ مسلم نیشنل گارڈ کے ممبر ہیں، دو ایڈووکیٹ ہیں اور ایک روزانہ اخبار کا ایڈیٹر ہے۔ ان میں سے چوالیس زیر دفعہ ۳ (۳) اور چھ زیر دفعہ ۲۱ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ گیارہ زیر دفعہ ۱۸۸ تعزیرات پاکستان چھ زیر ضوابط مارشل لا، دو، لوٹ مار، آتش زنی اور قتل کے لیے اور ایک صاحب زیر دفعہ ۱۲۴ الف ۱۵۳ الف تعزیرات پاکستان گرفتار کیے گئے۔ ان میں سے دو مفرور ہو گئے اور ایک کو تنبیہ کر کے چھوڑ دیا گیا۔ ایک نمبردار تھا جو اس عہدے سے برخاست کر دیا گیا اور ایک کے ریوالور کا لائسنس معطل کر دیا گیا۔

صوبائی مسلم لیگ ان تمام سرگرمیوں کو بالکل اطمینان سے دیکھتی رہی۔ اور ہمارے سامنے کاغذات کا جو بھاری ریکارڈ موجود ہے اس میں کہیں بھی اس امر کی شہادت موجود نہیں کہ صوبائی مسلم لیگ نے ایسی سرگرمیوں کو ناپسند کیا ہو بلکہ متعدد حلقوں کی طرف سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس تحریک

کوصوبائی مسلم لیگ کی تائید وحمایت حاصل تھی۔

مطالبات اگر چہ احمدیوں کے متعلق تھے لیکن حکومت کے خلاف تھے اوران ایام میں آج کل کی مانند برسراقتدار حکومت مسلم لیگ کی حکومت تھی۔ یہ امر ہماری حس جواز شائستگی کے اعتبار سے بالکل ناقابل فہم ہے کہ وہ لوگ جو مسلم لیگ کے ضبط ونظم کے ماتحت تھے کس طرح ایک ایسی تحریک میں یا اس کے بعد ڈائریکٹ ایکشن کی مہم میں حصہ لے سکتے تھے۔ اور اس فعل کو جو مسلم لیگ کے انضباط اور اس کے ساتھ وفاداری کے قطعاً منافی تھا، واضح کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ گوجرانوالہ اور سرگودھا کے واقعات اس پہلو سے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ہم نے ان مقامات کے مسلم لیگیوں کے طرز عمل کی وضاحت طلب کی۔ ہماری کوشش کا نتیجہ درج ذیل ہے:

ڈپٹی کمشنر گوجرانوالہ نے اپنے تحریری بیان میں لکھا:

''سٹی مسلم لیگ میں جو گروہ برسراقتدار ہے اس نے قانون شکنی کی تائید کی۔ حکومت کے اقدام کی مذمت کی۔ جن شورش پسندوں کو عام جلسوں پر عائدشدہ پابندی توڑنے پر گرفتار کیا گیا تھا۔ ان کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ اس سلسلے میں ایک قرارداد بھی منظور کی گئی اور ایک پوسٹر بھی شائع کیا گیا.......................................

مقامی مسلم لیگ کے عہدہ دار حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے میں ناکام رہے اور لیگ میں اپنے مخالف گروہ مثلاً شیخ برکت علی، شیخ محمد عاشق وغیرہ سے لیڈری چھین لینے کی امید میں شورش پسندوں سے جا ملے''۔

مسٹر منظور حسن پنجاب اسمبلی کے ممبر ہیں جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے اس کے علاوہ گوجرانوالہ سٹی مسلم لیگ کے سیکرٹری بھی ہیں۔ یہ ایڈووکیٹ ہیں اور اس حیثیت میں انہوں نے ان ملزموں کی وکالت کی جن کے خلاف دفعہ ۱۴۴ کے احکام کو توڑنے کی بنا پر مقدمات دائر کیے گئے تھے۔ ان احکام کا مقصد یہ تھا کہ مسجدوں میں ایسے عام اجتماع منعقد نہ کیے جائیں۔ جن کی نوعیت مذہبی نہ ہو۔ جیسا کہ سابق میں بتایا جا چکا ہے ۲۰ جون ۱۹۵۲ء کو شیرانوالہ باغ مسجد کے ایک جلسہ عام بعد نماز جمعہ بعض ممتاز احراری لیڈروں نے تقریریں کیں۔ ایک دن پہلے اس جلسے کا اعلان بالکل عام

جلسوں کی طرح کیا گیا اور یہ جلسہ اس وقت منعقد کیا گیا جب نماز جمعہ ہو چکی تھی۔ مسٹر منظور حسن نے سٹی مسلم لیگ کے ایک اجلاس میں ایک قرارداد پیش کی جس میں ان اشخاص کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔ جو ۲۰ جون کو بعد نماز جمعہ ایک جلسہ عام منعقد کرنے اور اس میں تقریر کرنے کی وجہ سے گرفتار کیے گئے تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی احکام زیر دفعہ ۱۴۴ کو واپس لینے کا بھی مطالبہ کیا گیا۔ یہ صاحب اس تحقیقات کے ۷۹ گواہ کی حیثیت سے طلب کیے گئے۔ ان کے بیان کا متعلقہ حصہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

سوال۔ آپ نے اپنے تحریری بیان میں لکھا ہے کہ ایک گروہ آپ کا مخالف تھا جو ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کا منظور نظر تھا۔ ازراہ کرم اس گروہ کے ممبروں کے نام بتائے۔

جواب۔ (گواہ نے چند اشخاص کے نام لیے اور پھر کہا) ان میں سے سیٹھ غلام قادر، سیٹھ محمد عبداللہ، شیخ برکت علی اور شیخ عاشق حسین مسلم لیگ کے ممبر ہیں۔

سوال۔ کیا آپ کو علم تھا کہ اس قرارداد کو منظور کر کے آپ حکومت کی مذمت کر رہے ہیں؟

جواب۔ اس وقت مجھے اس بات کا احساس نہ ہوا تھا کہ حکومت نے دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کی جو گرفتاریاں کی ہیں ان کی مخالفت کر کے میں حکومت کی مذمت کر رہا ہوں۔

سوال۔ وہ کون لوگ تھے جو دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کے احکام کی خلاف ورزی کے لیے گرفتار کیے گئے تھے؟

جواب۔ صاحبزادہ فیض الحسن، ان کا بیٹا جس کا نام میں نہیں جانتا، مولوی عبدلواحد اور دیگر اشخاص، گرفتار شدگان میں زیادہ تر احراری تھے۔

سوال۔ جب یہ مقدمہ عدالت میں آیا تو کیا آپ ان لوگوں کے وکیل تھے؟

جواب۔ میں وکیل ہوں اور جب صاحبزادہ فیض الحسن کے لڑکے اور مولوی عبد الواحد کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔ تو میں نے ان کی وکالت کی۔

سوال۔ کیا ان میں سے کسی کے خلاف یہ الزام عائد کیا گیا تھا کہ اس نے دفعہ ۱۴۴ ضابطہ

فوجداری کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے تقریر کی تھی؟

جواب۔عدالت میں کوئی ابتدائی اطلاع کی رپورٹ پیش نہیں کی گئی تھی اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ ان لوگوں کے خلاف ایسا الزام لگایا گیا تھا۔..............................

میں نے سنا تھا کہ صاحبزادہ فیض الحسن نے دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک تقریر کی تھی

میں اس دعوے کو تسلیم نہیں کرتا کہ مسجد میں کوئی شخص جیسی تقریر چاہے کر سکتا ہے ۔۔ صاحبزادہ فیض الحسن نے یہ تقریر مسجد میں کی تھی۔

سوال۔اگر آپ اس اصول کو تسلیم نہیں کرتے کہ کوئی شخص اس امر کا حقدار ہے کہ مسجد میں جس قسم کی تقریر چاہے کر دے اور اگر آپ کو معلوم نہ تھا صاحبزادہ فیض الحسن نے مسجد میں کسی قسم کی تقریر کی تھی تو پھر آپ ایسی قرارداد کے منظور کرنے میں کیوں شامل ہوئے جس میں ایسی تقریر کے لیے صاحبزادہ فیض الحسن کی گرفتاری کی مذمت کی گئی تھی؟

جواب۔ہم اس امر کے مخالف تھے کہ مسجد میں کسی فعل کے خلاف ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کا اطلاق کیا جائے

سوال۔آپ نے قرارداد کی تجویز سے پہلے صدر پنجاب صوبہ مسلم لیگ سے مشورہ کر لیا تھا؟

جواب۔جی نہیں۔

....

دوسرے دن صبح کو مجھے میری مرضی کے خلاف گوجرانوالہ سے باہر لے جا کر پنڈی بھٹیاں میں پہنچا دیا گیا۔

سوال۔آپ گوجرانوالہ میں واپس کب آئے؟

جواب۔اس سے دوسرے دن۔

سوال۔کیا واپسی پر آپ نے ایک جلوس کی قیادت کی؟

جواب۔میں نے رضامندی کے ساتھ کسی جلوس کی قیادت نہیں کی۔۷ مارچ کو جب میں

پنڈی بھٹیاں سے واپس آیا اور گھنٹہ گھر کے پاس پہنچا تو میں نے ایک بہت بڑا جلوس دیکھا جو تیس یا چالیس ٹرکوں پر مشتمل تھا شورش پسندوں نے مجھے ایک ٹرک میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ یہ جلوس سٹی تھانے کے نزدیک مسجد کے باہر پہنچ کر ٹھہر گیا۔

سوال۔ کیا اس کے بعد آپ مسجد کے اندر گئے؟

جواب۔ مجھے جبراً مسجد کے اندر لے گئے اور مجھے دھمکی دے کر ایک تحریر پر میرے دستخط کرائے گئے جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں

سوال۔ جس تحریر پر آپ نے دستخط کیے کیا وہ مجلس عمل کا حلف نامہ تھا؟

جواب۔ اس تحریر کا فارم مجلس نے تیار کیا تھا۔

سوال۔ کیا فسادات کے آغاز سے پہلے مسلم لیگ نے کبھی کوئی ایسا جلسہ عام مرتب کیا تھا جس میں احراریوں کی تقریریں ہوئی ہوں؟

جواب۔ ایک دفعہ ۱۹۵۱ء کے اوائل میں ایک دفاع کانفرنس گوجرانوالہ میں منعقد کی گئی تھی۔ یہ کانفرنس چھ مختلف جماعتوں نے طلب کی تھی جس میں احرار، اسلام لیگ، جناح عوامی لیگ اور جماعت اسلامی شامل تھیں۔

سوال۔ کیا ۲۰ جون ۱۹۵۲ء کو یوم مطالبات کے موقع پر کوئی جلسہ عام منعقد کیا گیا تھا؟

جواب۔ اس تاریخ پر ایک جلسے کا اعلان کیا گیا تھا لیکن دفعہ ۱۴۴ کے ماتحت حکم صادر ہونے پر یہ جلسہ منسوخ کر دیا گیا تھا۔

سوال۔ اطلاع یہ ہے کہ یہ جلسہ مسجد شیرانوالہ باغ کے اندر منعقد کیا گیا اور اس میں صاحبزادہ فیض الحسن، شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین انصاری نے تقریریں کیں اور یہ سب گرفتار کر لیے گے؟

جواب۔ جہاں تک مجھے یاد ہے چونکہ دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کے ماتحت ایک حکم کی رو سے عام جلسے ممنوع قرار دیے گئے تھے اس لیے مسجد شیرانوالہ باغ کے اندر جمعۃ الوداع کے موقع پر ایک جلسہ منعقد کی گیا تھا۔ اس جلسے کے مقررین میں صاحبزادہ فیض الحسن، شیخ حسام

الدین اور ماسٹر تاج الدین انصاری شامل تھے۔

سوال۔کیا آپ کو بالکل یقین ہے کہ جس مقدمے میں آپ وکیل بنائے گئے تھے وہ اسی موقع کی تقریروں کی بناپر گرفتاریوں کی وجہ سے دائر کی گیا تھا؟

جواب۔یہ مقدمہ اسی موقع کی تقریروں کی بناپر دائر کیا گیا تھا۔

سوال۔کیا آپ کو یاد ہے کہ مولانا اختر علی خاں نے اس تحریک کے سلسلے میں گوجرانوالہ کے کسی جلسہ عام میں تقریر کی تھی؟

جواب۔جی ہاں۔

سوال۔چائے کی پارٹی کس نے دی تھی؟

جواب۔یہ پارٹی میں نے سیکرٹری سٹی مسلم لیگ کی حیثیت میں نہیں بلکہ مولانا کے ساتھ اپنے ذاتی تعلقات کی وجہ سے دی تھی اس پارٹی میں شہر کے تقریباً تمام مسلم لیگی شامل ہوئے تھے۔

سوال۔کیا کسی مسلم لیگی نے پبلک پلیٹ فارم پر اس شورش کی مذمت کی تھی؟

جواب۔یہ ممکن نہ تھا کیونکہ تحریک کی حمایت میں عوامی جذبات برانگیختہ تھے۔

سوال۔کیا مسلم لیگ کے کسی عہدے دار یا مقتدر ممبر نے اس شورش میں رضامندی سے حصہ لیا؟

جواب۔جی نہیں۔ان میں سے بعض کو حصہ لینے پر یقیناً مجبور کر دیا گیا تھا۔

مسٹر آفتاب احمد صدر سٹی مسلم لیگ گوجرانوالہ کا بیان حسب ذیل ہے:۔

سوال۔۔کیا مسلم لیگ نے من حیث الجماعت یا مسلم لیگ کے کسی لیڈر نے علی الاعلان اس شورش کی مذمت کی؟

جواب۔ہمیں صوبہ مسلم لیگ کی طرف سے کوئی ہدایات موصول نہ ہوئی تھیں۔جب چیف منسٹر ۷ فروری کو گوجرانوالہ آئے اور ہم نے ان سے ہدایات طلب کیں تو انہوں نے کہا کہ ان کو مرکز سے کوئی ہدایات نہیں پہنچیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر مرکز سے اس شورش کو کچل

دینے کی ہدایات موصول ہوں گی تو حکومت پنجاب ان کی تعمیل کرے گی۔

چیف منسٹر کے اصلی الفاظ یہ تھے صاحب میں تو اس شورش کو دو منٹ کے اندر ختم کر سکتا ہوں لیکن خواجہ صاحب مجھے کچھ نہیں کرنے دیتے چونکہ ہمیں نہ صوبے کی طرف سے نہ مرکز کی طرف سے کوئی ہدایات موصول ہوئی تھیں۔اس لیے ہم علی الاعلان اس تحریک کی مذمت کرنے سے قاصر تھے۔

سوال۔ان لوگوں کی ہمت افزائی کرنے سے حکام ضلع کا مقصد کیا تھا؟ (ان لوگوں سے مراد سٹی مسلم لیگ کے وہ اشخاص تھے جو مسٹر آفتاب احمد اور مسٹر منظور حسن کے گروہ کے مخالف تھے)

جواب۔اس ٹولی کا ہمیشہ سے یہی شیوہ رہا ہے کہ حکام کی خوشامد درآمد کی جائے۔ حکام ضلع بھی چاہتے تھے کہ اس گروہ کی حمایت کر کے ہر دلعزیز ہو جائیں۔جن کے متعلق خیال تھا کہ وہی تحریک کو چلا رہے ہیں۔ حکام ضلع مقامی مسلم لیگ کو پسند نہیں کرتے تھے۔اس لیے ان کی پالیسی یہی تھی کہ ایک حریف گروہ کو قائم رکھیں۔

سوال۔حکام ضلع مقامی مسلم لیگ کے خلاف کیوں تھے؟

جواب۔کیونکہ مسلم لیگ مقامی حکام کے نظم و نسق پر تنقید کیا کرتی تھی۔

قاضی مرید احمد مجلس قانون ساز کے ایک ممبر ہیں جو مسلم لیگ ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے۔آپ آل پاکستان مسلم لیگ کونسل کے بھی ممبر ہیں۔ ہمارے سوالات کے جواب میں انہوں جو کچھ کہا۔اس سے ان کی حیثیت واضح ہو جائے گی۔

سوال: آپ کس ٹکٹ پر انتخاب کے لیے کھڑے ہوئے تھے؟

جواب۔مسلم لیگ کے ٹکٹ پر۔

سوال۔کیا آپ اس سے پہلے بھی کبھی صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں امیدوار ہوئے تھے؟

جواب۔جی نہیں۔

سوال۔اگر آپ مسلم لیگ کا ٹکٹ حاصل نہ کرتے تو کیا آپ کے لیے اسمبلی کے الیکشن میں

کامیاب ہونے کی کوئی گنجائش تھی؟

جواب۔اگر مجھے لیگ ٹکٹ نہ دیتی اور مجھے آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہونا پڑتا جب بھی میں سمجھتا ہوں کہ میں کامیاب ہو جاتا۔

سوال۔آپ کتنی اراضی کے مالک ہیں؟

جواب۔بیس کنال۔

سوال۔آپ حصول معاش کے لیے کیا کام کرتے ہیں؟

جواب۔گرفتاری کے دن تک میں اناج کے کاروبار میں دلالی کا کام کرتا تھا۔

سوال۔آپ کو اس کام کا لائسنس کس نے دیا تھا؟

جواب۔حکام ضلع نے۔

سوال: آپ کتنا انکم ٹیکس ادا کرتے ہیں؟

جواب۔بالکل نہیں۔

یہ گواہ مجلس عمل سرگودھا کا صدر تھا۔اس نے شورش میں سرگرم حصہ لیا یہاں تک کہ ڈائریکٹ ایکشن کی قرارداد کے ماتحت پروگرام کے آغاز میں بھی شامل تھا۔چنانچہ اسی وجہ سے اس کی گرفتاری عمل میں آئی۔اس گواہ نے مجلس عمل کے لیے سرمایہ فراہم کیا اور مطالبات کی حمایت اور حکومت کی مخالفت میں بعض نہایت زوردار تقریریں کیں۔ان جلسوں میں جس قسم کی باتیں یہ شخص کہتا تھا۔وہ ذیل درج ہیں:۔

پولیس مین، تھانیدار اور ڈپٹی کمشنر کو اپنا حکمران نہ سمجھو۔ان سے نہ ڈرو۔اور ان کی کچھ پروانہ کرو۔"محمد علی (موجودہ وزیراعظم پاکستان) مسئلہ کشمیر کا حل تلاش کرنے کے لیے دہلی گیا۔ خیر اس میں کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن وہ اپنی بیوی ام المومنین کو ساتھ کیوں لے گیا۔بھائیو۔ اس کی بیوی ضرور ام المومنین ہوگی کیونکہ وہ خود امیر المومنین ہے۔خیر ام المومنین دہلی چلی گئی۔وہاں پینتیس لاکھ مسلمانوں کی موت وحیات کا مسئلہ پیش تھا۔لیکن جونہی اس کے ننھے بچے کے انگوٹھے پر ایک خراش آئی وہ بھاگی ہوئی کراچی پہنچ گئی۔

’’پینتیس لاکھ مسلمان کشمیر میں موت کا سامنا کر رہے ہیں۔اور یہ شخص (یعنی وزیر اعظم پاکستان) اپنے آپ کو نہرو کا چھوٹا بھائی کہتا ہے۔میں کہوں گا ’سگ باش برخورد مباش‘ اس تقریر میں اس نے حکام کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ سب انگریزوں کے چیلے اور بد اخلاق لوگ ہیں۔قمار بازی کرتے ہیں اور شراب پیتے ہیں۔میں نے ایک دفعہ مسٹر نون چیف منسٹر سے ذکر کیا کہ ایک ضلع کا ڈپٹی کمشنر ساری رات جوا کھیلتا ہے۔اور دن بھر عدالت میں اونگھتا رہتا ہے۔یہ بارہ لاکھ انسانوں کا نمائندہ قمار باز اور زنا کار ہے۔اس کا چال چلن نہایت مکروہ ہے۔لیکن وہ صاحب بہادر ہے۔اس شکایت پر کوئی کاروائی نہ کی گئی۔عدالت میں اس گواہ کی شہادت اس طرح جاری رہی:

سوال۔آپ نے اس قرارداد کا مسودہ تیار کیا تھا جو صوبہ مسلم لیگ کی کونسل کو بھیجی گئی تھی؟

جواب۔قرارداد کا مسودہ کونسل کے اجلاس سے دس پندرہ دن پہلے تیار کیا گیا ہوگا۔

سوال۔آپ نے اس قرارداد کا مسودہ تیار کرتے وقت کسی سے مشورہ کیا تھا؟

جواب۔یہ میرا انفرادی فعل تھا۔

سوال۔کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس قرارداد میں خطرناک امکانات مضمر تھے؟

جواب۔جی نہیں۔میں جو قرارداد پیش کرنا چاہتا تھا اس میں مجھے کوئی خطرہ نظر نہ آتا تھا۔

سوال۔کیا آپ نے قرارداد بھیجنے سے پہلے مسلم لیگ کے کسی اعلیٰ صاحب اختیار سے مشورہ کیا تھا؟

جواب۔جی نہیں۔

سوال۔کیا آپ ڈائریکٹ ایکشن کے حامی تھے؟

جواب۔میں نہیں جانتا ڈائریکٹ ایکشن کی چیز ہے۔جس عمل کا فیصلہ ہوا تھا وہ راست اقدام تھا۔

سوال۔آپ نے راست اقدام کا لفظ پہلے پہل کب سنا؟

جواب۔مجھے یاد نہیں۔

سوال۔ راست اقدام کی اصطلاح کس سلسلے میں آپ کے سامنے آئی؟

جواب۔ میں نے اخباروں میں پڑھا تھا کہ مرکزی مجلس نے ایک قرارداد منظور کی ہے جس میں یہ دھمکی دی ہے کہ اگر مطالبات پورے کیے گئے تو راست اقدام کیا جائے گا۔

سوال۔ آپ نے اس راست اقدام سے کیا مطلب سمجھا؟

جواب۔ میں اس اصطلاح سے یہ سمجھا کہ مسلمان اپنے مطالبات کو حکومت تک پہنچانے کے لیے عام جلسے کریں گے اور قراردادیں منظور کریں گے اس کے علاوہ اس سلسلے میں حکام اضلاع کے پاس وفد بھیجیں گے لیکن کوئی غیر آئینی طریقے اختیار نہ کریں گے۔

سوال۔ کیا راست اقدام کی قرارداد سے پہلے حکومت اور اس کے افسروں کے پاس وفد نہیں گئے اور صوبے کے قریب قریب ہر مقام پر مطالبات کی حمایت میں عام تقریریں نہیں کی گئی تھیں؟

جواب۔ جی ہاں۔ یہ تمام باتیں پہلے کی جا چکی تھی لیکن راست اقدام کی قرارداد کے بعد ان کو زیادہ زور شور سے کرنا مقصود تھا۔

سوال۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ آپکی ایم ایل اے کی حیثیت مسلم لیگ کی طفیل سے ہے؟

جواب۔ جی ہاں۔ میں خوب جانتا ہوں۔

سوال۔ کیا آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ برسراقتدار حکومت مسلم لیگی حکومت ہے؟

جواب۔ جی ہاں میں یہ بھی خوب جانتا ہوں۔

سوال۔ اگر راست اقدام سے سول نافرمانی یا قوانین ملکی کی خلاف ورزی مراد ہوتی تو آپ یقیناً اس تحریک میں شامل نہ ہوئے ہوتے؟

جواب۔ جی نہیں۔ اگر مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ راست اقدام سے مراد وہی ہے جو عدالت نے بیان کیا ہے تو میں اس تحریک میں شامل ہونے سے احتراز کرتا۔

سوال۔ کیا آپ اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ کسی مسلم لیگی کا کوئی فعل جس سے حکومت کو پریشان کرنا یا اس کو اقتدار سے محروم کرنا مقصود ہو۔ لیگ کے ساتھ وفاداری کے منافی ہے؟

جواب۔ اگر کوئی مذہبی معاملہ پیش آجائے تو میں مسلم لیگ یا مسلم لیگی حکومت کی کوئی پروانہ کروں گا۔

اب ان اشخاص کی شہادتوں سے جو نتائج مترتب ہوتے ہیں وہ یہ ہیں۔ سٹی مسلم لیگ گوجرانوالہ میں دو حریف گروہ ہیں۔ یعنی مسٹر آفتاب احمد اور مسٹر منظور حسن کا گروہ۔ اور شیخ برکت علی اور شیخ محمد عاشق کا گروہ۔ پہلا گروہ برسر اقتدار ہے۔ اور بین السطور سے ظاہر ہے کہ ضلع کے انتظام حکومت پر اپنا قابو رکھنا چاہتا ہے۔ دوسرا گروہ جو لیگ میں برسر اقتدار نہیں لیکن حکام ضلع کا پسندیدہ ہے پہلے گروہ کو بے دخل کرنے کا خواہش مند ہے۔ لہٰذا پہلا گروہ اپنے اقتدار کو بحال رکھنے کی غرض سے کوئی ایسا کام کرنا چاہتا ہے جس سے اس کو مقبولیت عامہ حاصل ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس گروہ کو ہر دلعزیز ہونے کے لیے ختم نبوت کی تحریک اور احمدیوں کے خلاف شورش سے بہتر موقع نہ مل سکتا تھا۔ لہٰذا اس گروہ کے نزدیک یہ بالکل جائز تھا کہ مساجد کے جلسوں پر دفعہ ۱۴۴ کے احکام کے اطلاق پر حکومت کی مذمت کرے۔ اس کے نزدیک وہ لوگ ہیرو تھے جن پر ان احکام کی خلاف ورزی کا الزام عائد ہوا۔ لہٰذا اس نے ان کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا۔ اس نے حکومت سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ ان احکام کو واپس لے لے کیونکہ ان سے مداخلت فی الدین لازم آتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں سٹی مسلم لیگ نے مسلم لیگی حکومت کی تائید کرنے اور لوگوں کو یہ سمجھانے کے بجائے کہ مساجد کو ایک ایسی سیاسی پارٹی کی جلسہ گاہ بنا دینا جو مسلم لیگ کی مخالف ہے، مساجد کی توہین ہے۔ حکومت کی مذمت کرنے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ اس مذمت سے برسر اقتدار گروہ زیادہ ہر دلعزیز ہوتا تھا۔ اور اس کے مخالف گروہ کی چالیں ناکام ہوتی تھیں۔ اسی مقصد سے مسٹر منظور حسن سیکرٹری سٹی مسلم لیگ نے احراریوں کے حلف نامے پر دستخط کیے۔ سرمایہ فراہم کیا۔ جلوسوں کی قیادت کی۔ اور ڈائریکٹ ایکشن کے پروگرام کے ماتحت ہر دوسری سرگرمی میں حصہ لیا۔ جب یہ گواہ کہتا ہے کہ اس نے یہ سب کچھ جبر کے ماتحت کیا تو ہمیں اس کے ایک لفظ پر بھی یقین نہیں آتا۔

قاضی مرید احمد سرگودھا میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ کوئی انکم ٹیکس ادا نہیں کرتا اور صرف بیس کنال زمین کا مالک ہے۔ لیکن کسی نہ کسی طرح مسلم لیگ نے اس کو قانون ساز اسمبلی میں منتخب کرا

دیا۔ وہ مسلم لیگ کی مخلوق ہونے کے باوجود اس امر کو بالکل جائز اور مناسب سمجھتا ہے کہ ضلع کی مجلس عمل کا ڈکٹیٹر بن جائے اور اپنے ضلع میں مسلم لیگی حکومت کے خلاف بغاوت کی رہنمائی کرے۔ نہ وہ اس امر کو نازیبا محسوس کرتا ہے کہ اپنے گرد ایک اجتماع کو جمع کر کے وزیر اعظم پاکستان اور انکی بیگم کے خلاف استہزا کرے اور ہر برسر حکومت شخص کو گالیاں دے اور ان تمام حرکات کو ختم نبوت کے نام پر جائز سمجھے۔

مسلم لیگیوں نے فسادات کے آغاز سے پہلے اور بعد میں جو حصہ لیا وہ ہمارے لیے ہرگز مقام تعجب نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ کے ممبروں کی یہ سرگرمیاں مسلم لیگی قرارداد اور صدر صوبہ مسلم لیگ کی تقریروں کا قدرتی نتیجہ تھیں۔ میر نور احمد ڈائریکٹر تعلقات عامہ کی سرگرمیوں کے متعلق شہادت میں تحریک کو خاص راستے پر لگانے کا لفظ استعمال کیا گیا تھا۔ لیکن اس لفظ کو صوبہ مسلم لیگ کی قرارداد اور اخباروں اور تقریروں میں اس کی پے در پے توضیح وتصریح کے اثرات واضح کرنے کے لیے بالکل موزوں طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جب مطالبات کی حمایت میں اخباروں کے مسلسل پراپیگنڈا اور ان کی آئینی نوعیت پر اصرار کا حال ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے علم میں آیا جو ماہ جولائی ۱۹۵۲ء میں لاہور آئے ہوئے تھے۔ اور ان سے یہ شکایت کی گئی کہ یہ پروپیگنڈا ان اخباروں میں کیا جارہا ہے جن کو بڑی بڑی رقوم حکومت سے ملی تھیں۔ اور اس پروپیگنڈا کو میر نور احمد چلا رہے ہیں تو ڈاکٹر صاحب نے افسر مذکورہ کو طلب کیا۔ اس افسر نے وزیر موصوف کے سامنے اعتراف کیا کہ جو کچھ وہ کر رہا تھا اس کا مقصد یہ تھا کہ تحریک کو ایک خاص راستے پر لگا دیا جائے۔ اگرچہ نور احمد نے اس اعتراف سے انکار کیا ہے۔ لیکن یہ اعتراف پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے۔ اور اس عجیب وغریب استعارے کا صرف یہی مطلب سمجھا جاسکتا ہے کہ میر نور احمد نے اس تحریک کے لیے ایک راستہ پیدا کر لیا تھا اور اس راستے کا رخ قدرتی طور پر کراچی کی طرف ہی ہوسکتا تھا کیونکہ آل پاکستان مسلم لیگ اور مرکزی حکومت دونوں کا مرکز کراچی تھا۔ تمام شہادت تقریری بھی اور تحریری بھی جس کی مقدار بہت زیادہ ہے اور جس میں اخباروں کے بے شمار مضامین اور تقریریں شامل ہیں، اس امر کی مظہر ہے کہ مسلم لیگ کی قرارداد مورخہ ۲۷ جولائی کے بعد ہر شخص جو اس تحریک سے وابستہ تھا اس آئینی موقف

کوخوب سمجھنے لگا تھا کہ صوبجات میں پروپیگنڈا کرنا بے سود ہے۔ اور جب تک یہ مطالبات باقاعدہ طور پر دستور ساز اسمبلی میں پیش نہ کیے جائیں گے۔ اس شورش کا کوئی محسوس نتیجہ نہ نکلے گا۔ لہٰذا تمام جماعتوں نے جو مطالبات کی منظوری کے لیے چیخ پکار کر رہی تھیں اپنی تمام سرگرمیوں کا رخ مرکزی حکومت کی طرف کر دیا جس کے رئیس خواجہ ناظم الدین تھے۔ اس لیے اگر خواجہ ناظم الدین ان مطالبات کو تسلیم نہ کر سکے اور نتیجہ یہ ہوا کہ ڈائریکٹ ایکشن شروع ہو گیا اور فسادات پھوٹ پڑے تو واقعات کی ذمہ داری واضح طور پر مسلم لیگ پر بھی اس طرح عائد ہوتی ہے۔ جس طرح آل پاکستان مسلم پارٹیز کانفرنس پر جس نے مطالبات وضع کیے تھے اور خواجہ ناظم الدین کے سینے پر پستول رکھ کر ان کے سامنے وہ مطالبات پیش کیے تھے۔ اس تمام دوران مسلم لیگ یا اس کے کسی لیڈر نے نہ تحریک کی مزاحمت کے لیے کچھ کیا اور نہ عوام کے سامنے کوئی مقابلے کا نظریہ پیش کیا۔ بلکہ اس کے برعکس مسلم لیگ نے اپنی قرارداد کے ذریعے سے اپنے آپکو اس قدر ناقابل انکار طور پر پابند کر لیا تھا کہ وہ بعد میں اس رائے سے روگرداں نہ ہو سکتی تھی جو اس نے رسمی حیثیت سے اپنی قرارداد میں ظاہر کر دی تھی اور جس کے بہترین مفسر خود لیگ کے صدر صاحب تھے۔ اگر وہ ایسا کرتی تو انتہائی تحقیر اور غیر ہر دلعزیزی کا شکار ہو جاتی۔

ہمیں اس امر میں ذرا سا شبہ بھی نہیں ہے کہ اس تمام جھگڑے کے ایک سے زیادہ معقول جواب دیے جا سکتے تھے۔ اگر مسلم لیگ کے لیڈروں کو ان مطالبات کے نتائج کو پوری طرح سمجھنے کی توفیق ہوتی اور وہ صوبے کو ذلت اور تباہی سے بچانے کے قابل اور اس کے خواہشمند ہوتے تو وہ ضرور اس میں کامیاب ہو جاتے۔ گوجرانوالہ اور سرگودھا کے مقدمات اور کیپ کے واقعہ میں بہت بڑے سبق پوشیدہ تھے۔ اگر وہ سبق صحیح طور پر پڑھائے جاتے تو عوام کی آنکھیں کھل جاتیں اور ان کو اس شورش سے باز رکھا جا سکتا تھا۔ جو چند سیاسی طالع آزماؤں نے ان کی حکومت کو شکست دینے کے لیے برپا کر رکھی تھی۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہمارا عام آدمی لازمی طور پر صحیح الدماغ ہے اور اگرچہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح بلکہ شاید ان سے زیادہ مذہبی واقع ہوا ہے لیکن اگر معاملات کو موزوں طریق پر اس کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ ان کی حقیقی صورت کو سمجھنے کی بھی پوری اہلیت رکھتا ہے وہ ایک نئی

مملکت کا دیانتدار اور محبّ وطن شہری ہے۔ اور اگر اسے یہ سمجھانے کی کوشش کی جاتی کہ چند سیاسی مایوسین نے اپنے پرانے گناہوں کو دھونے کی غرض سے جس عمومی جذبے کو برانگیختہ کیا ہے اس کے امکانات نہایت خطرناک ہیں تو وہ اپنے لیڈروں کی بات ضرور سنتا۔ اگر بازار کے عام آدمی کو موزوں طریق پر بتایا جاتا کہ ایک سیاسی جماعت جو مسلم لیگ کے حریف کی حیثیت سے میدان میں آنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مذہب کو محض ایک آلہ کار کے طور پر استعمال کر کے عوام میں مقبول ہونا چاہتی ہے اور عام آدمی کو بے وقوف بنا رہی ہے۔ تو وہ آدمی یقیناً اس بات کو سمجھ جاتا۔ گوجرانوالہ اور سرگودھا میں دفعہ ۱۴۴ کے احکام کی جو خلاف ورزیاں کی گئیں وہ اس امر کا واضح نمونہ تھی کیونکہ مذہب کو کس طرح سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ سرگودھا میں ایک باقاعدہ جلسہ عام جمعہ دن ایک مسجد میں دس بجے قبل دوپہر منعقد کیا گیا۔ اس موقع پر ضرورت صرف اس کی تھی کہ اس جلسے کے منتظمین کو چیلنج دیا جاتا کہ آیا جمعہ کی نماز دس بجے ہوا کرتی ہے؟ اور پھر لطف یہ ہے کہ اس جلسے کے صدور اور اس کے مقررین کے ناموں کا اعلان اس سے پیشتر رسمی طور پر کیا جا چکا تھا۔ یہی کیفیت گوجرانوالہ میں ہوئی۔ احرار نے جلسے سے ایک دن پیشتر پوسٹروں اور لاؤڈ سپیکروں سے اس جلسے کا اعلان کیا اور ان اعلانات میں بیان کیا گیا کہ فلاں فلاں احراری لیڈر مختلف مقامات سے جلسے میں تقریریں کرنے کے لیے آ رہے ہیں۔ جب خطیب خطبہ پڑھ رہا تھا اس وقت پھر ایک شخص نے جلسے کا اعلان کیا اور یہ جلسہ اصل میں اس وقت منعقد ہوا جب نماز جمعہ ہو چکی۔ اگر مسلم لیگ کے لیڈر احراریوں کی ان چالوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرتے تو ہمیں ذرا بھی شبہ نہیں کہ لوگ اپنے رویے میں ترمیم کر لیتے اور حکومت کا نقطہ نگاہ کو سمجھ کر اس کی قدر کرتے۔

ہمارے سامنے جماعتوں کے فاضل وکیل نے بار بار جمہوریت کے اصولوں کا اعادہ کیا ہے۔ اور اس پر بہت زور دیا ہے کہ مطالبات متفقہ ہیں اور کسی جمہوری ملک میں جب کسی مطالبے کی حمایت و تائید قوی اور عالمگیر ہو جائے تو حکومت اس کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوگی۔ خواہ اس تسلیم کے نتائج کچھ بھی ہوں یہ بھی کہا گیا کہ ہمارے سیاسی لیڈر چونکہ عوام کے ووٹ سے منتخب ہوئے ہیں۔ اور اپنی موجودہ کرسیوں پر محض اس لیے متمکن ہیں کہ عوام نے ان کو وہاں بٹھایا ہے۔ اس لیے ان کا

فرض ہے کہ ان کے ووٹر جو کچھ کہیں وہ اس کی تعمیل کریں۔ یہی اصول ہمارے سامنے وزارت اور مسلم لیگ کی طرف سے پیش کیا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ ایک نمائندہ حکومت میں کوئی سیاسی لیڈر صرف اسی صورت میں نمائندہ جمہور کہلاسکتا ہے کہ وہ جمہور کے احساسات، تعصّبات اور خواہشات کا احترام کرے اور ان کو عمل میں لائے لیکن ہمارے نزدیک یہ نہایت ادنیٰ نصب العین ہے جسے ہمارے لیڈر اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ ایک ایسے ملک میں جس کے اکثر لوگ غیر تعلیم یافتہ ہیں اور صرف قلیل سا تناسب خواندہ ہے۔ اگر اس اصول کو تسلیم کرلیا جائے تو اس کا پریشان کن نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے لیڈر ہمیشہ عوامی جہالت و تعصب کے پیکر اور بلند نصب العینوں سے بالکل خالی اور محروم رہیں گے۔ جہاں ووٹر اپنے ووٹ کی قدر و قیمت کو جانتا ہو۔ اپنے ملک کے مخصوص مسائل کو اور دنیا کے واقعات کی رفتار کو سمجھنے کے لیے ضروری عقل و فراست سے بہرہ ور ہو اور تمام قومی معاملات پر صحیح رائے قائم کرنے والا ترقی یافتہ ذہن رکھتا ہو۔ وہاں لیڈر یقیناً اس امر کا پابند ہوتا ہے کہ رائے عامہ کی پیروی کرے یا اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائے۔ لیکن ایک ایسے ملک میں جیسا ہمارا ملک ہے بلاشک و شبہ لیڈروں کا حقیقی وظیفہ یہ ہے کہ عوام کی رہنمائی کریں نہ کہ شروع سے آخر تک ان کی مرضی پر اور بقول مسٹر قربان علی خاں کے ہر وقت ریوڑ کے آگے آگے چلیں۔ خوف یہ تھا کہ اگر ہم نے جرأت و ہمت سے کوئی اقدام کیا تو عوام میں نامقبول ہو جائیں گے۔ زیادہ تر اسی خوف کا یہ نتیجہ تھا کہ ایک ایسی تحریک کا مقابلہ کرنے یا اس کو روکنے کے لیے جس نے اپنی بظاہر مذہبی اپیل کی وجہ سے جمہور پر نہایت سرعت سے قابو پالیا تھا۔ جس نظریے کی ضرورت تھی وہ بالکل ناپید رہا۔ لہٰذا ہماری رائے یہ ہے کہ ہمارے لیڈر اپنے فرض کی بجا آوری میں قاصر رہے۔ اور ایک ایسی صورت حالات کا مقابلہ کرنیکے قطعاً ناقابل ثابت ہوئے جو دوراندیشی دانشمندی اور حسن تدبیر کے تمام اوصاف کی متقاضی تھی۔ اس تمام دوران میں ایک بھی عوامی لیڈر نے شہریوں کی عام عقل وفہم کو اپیل کرنے کی جرأت نہ کی۔ یہاں تک کہ جب فسادات کی آگ پوری شدت سے بھڑک رہی تھی۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی عوام کو یہ سمجھانے کی تکلیف گوارا نہ کی کہ ان کو گمراہ کر کے ایک ایسے راستے پر ڈالا جا رہا ہے جس کا فوری نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ صدر صوبہ مسلم لیگ کہتے ہیں کہ اگر وہ

اپنے ارادے پر انحصار رکھتے تو انتہائی کوشش کرتے کہ یہ مطالبات وجود میں نہ آتے کیونکہ یہ مطالبات بجائے خود نہ بنیادی تھے نہ فوری طور پر ضروری تھے۔ اور ایسے گھریلو تنازعات کو چھیڑنا اس وقت تک بالکل بے موقع ہے جب تک پاکستان محفوظ نہ ہو جائے لیکن ہمارے سامنے کوئی ایسی شہادت موجود نہیں جس سے یہ ظاہر ہو کہ ۲۷ جولائی کی قرارداد سے پیشتر اس خیال کو عوام کے سامنے پیش کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش کی گئی نہ اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ اس مسئلے کو اہمیت دینے سے مسلم لیگ کی شاخوں کو باز رکھنے کی کوئی سعی عمل میں لائی گئی۔ بلکہ اس کے برعکس صوبہ مسلم لیگ نے ایک ناموزوں وقت پر اپنا سالانہ اجلاس منعقد کیا اور کونسلروں نے جو قرارداد منظور کی اس کا مسودہ خود جناب صدر نے مرتب کیا۔

اس مرحلے پر ہم ایک اور بات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو بے حد اہم ہے کسی خاص انتظام کے ماتحت جس کا اصول ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ صوبہ مسلم لیگ کا لیڈر صوبے کا چیف منسٹر بھی ہوتا ہے لہٰذا ایسا ہو سکتا ہے اور اس قصے میں ایسا ہوا کہ مسلم لیگ کا لیڈر قانون و انتظام کے محکمے کا انچارج بھی تھا۔ اگر ایک ہی آدمی دو مختلف عہدوں پر قابض ہو تو یہ امر ناگزیر ہے کہ جو فیصلے وہ یا اس کی پارٹی سیاسی دائرے میں کرے وہ اگر قانون و انتظام کے دائرے سے متعلقہ معاملات کے ساتھ دور یا نزدیک کا واسطہ رکھیں تو ان فیصلوں کا اثر آخر الذکر دائرے پر پڑے۔ لیکن ارباب سیاست کے وظائف ایک حاکم کے وظائف سے لازماً مختلف ہوتے ہیں۔ ایک شخص سیاسی آدمی ہونے کی حیثیت سے محض پالیسی وضع کرتا ہے۔ لیکن ایک حاکم کا کام یہ ہے کہ قانون کی موجودہ مشین کو بلا لحاظ کسی سیاسی مصلحت کے اس مقصد سے استعمال کرے کہ امن و انتظام قائم رہیں۔ اور معاشرے کی سلامتی پر جو حملے ہوں ان کو دفع کیا جا سکے۔ اس تحقیقات کے دوران میں یہ نکتہ اس حد تک ثابت و واضح ہو گیا ہے کہ اس قسم کے انتظامات کے سنگین نتائج کے متعلق شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ مسلم لیگ کے انتخابی اعلان میں اس نکتے کا ذکر بھی کیا گیا ہے کہ مسلم لیگ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ سے سخت نفرت کرتی ہے۔ اور ذمہ لیتی ہے کہ یہ قانون جو عام طور پر تشدد آمیز سمجھا جاتا ہے، منسوخ کر دیا جائے گا۔ لیکن پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کو قانون کی شکل دی گئی۔ کیونکہ موجودہ حالات میں اس قسم کے غیر

معمولی قانون کا نفاذ ضروری سمجھا گیا تا کہ اگر کسی خاص صورت حالت میں سلامتی عامہ اور قیام انتظام کو شدید خطرہ پیش آنے کا احتمال ہو تو ہیت منتظمہ کے پاس کافی اختیارات محفوظ ہوں۔ اس ایکٹ کی دفعہ ۳ کے ماتحت حکومت کو اختیار ہے کہ اگر اس کے نزدیک کسی شخص کو سلامتی عامہ یا نظم عمومی کے منافی عمل سے روکنا ضروری ہو تو اسکو نظر بند کردے اس ایکٹ کی دفعہ ۵ میں اسی مقصد سے حکومت کو اختیار دیا گیا ہے کہ کسی شخص کی حرکات وسکنات پر حکماً پابندی لگادے یا اسکو عام تقریریں کرنے سے روک دے۔ ایکٹ دفعہ ۶ میں حکومت کو پریس اور اخبارات پر وسیع اختیارات دیے گئے ہیں۔ لیکن ان اختیارات کا استعمال صرف اس حالت میں ہو سکے گا جب کسی اخبار کے طابع، ناشر یا ایڈیٹر کو کسی ایسی سرگرمی سے روکنا مقصود ہو جو سلامتی عامہ یا نظم عمومی کے قیام کے منافی ہو۔ دفعہ ۱۲ کے ماتحت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اختیار دیا گیا ہے کہ کسی پبلک مقام پر کسی جلوس یا مظاہرے یا عام جلسے کو ممنوع قرار دے دے۔ دفعہ ۲۱ کے ماتحت یہ امر جرم قابل سزا قرار دیا گیا ہے کہ کوئی شخص ایسی تقریر کرے یا کوئی ایسا بیان یا افواہ یا اطلاع شائع کرے جس سے عوام میں خوف یا دہشت پیدا ہو یا پیدا ہونے کا احتمال ہو یا اس سے پاکستان کی کسی حکومت یا حکومت کے کسی ملازم کی بدنامی ہو یا ہونے کا احتمال ہو یا اس سے کسی ایسی سرگرمی کو تقویت ملے یا تقویت ملنے کا احتمال ہو جو سلامتی عامہ یا نظم عمومی کے قیام کے منافی ہو۔ دفعہ ۲۳ کے ماتحت یہ امر قابل سزا ہے کہ کوئی بناوٹی رسم ادا کی جائے جو موت سے متعلق یا اس کے نتیجے سے منسوب ہو (مثلاً جنازے وغیرہ نکالنا) آخر میں دفعہ ۲۵ ایسے شخص کو قابل سزا قرار دیتی ہے جو کسی سرکاری ملازم یا مقامی ہیت مختار کے کسی ملازم کو یہ ترغیب دے یا ترغیب دینے کی کوشش کرے کہ وہ ایسے ملازم کی حیثیت میں اپنے فرائض کی بجا آوری کی پروا نہ کرے یا بجا آوری سے قاصر رہے۔

پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کی یہ وضاحت فوری ضرورت کے قانون کی نوعیت رکھتی ہیں۔ ان معنوں میں کہ یہ اس وقت استعمال کی جائیں گی جب معمولی قانون کام نہ دے اور عوام کے امن اور ان کی سلامتی کو شدید خطرہ درپیش ہو۔ اس ایکٹ کا استعمال اسی صورت میں مقصود ہے جب ان فوق العادۃ اختیارات کے استعمال کا جواز موجود ہو اور ملک کا معمولی قانون صورت حالات کا مقابلہ کرنے

کے لیے ناکافی ہو۔ اس لیے گو مسلم لیگ اس قانون کی مخالف تھی لیکن پھر بھی لیگ کے لیڈر کا جو قانون وانتظام کا انچارج بھی تھا یہ فرض تھا کہ اگر اس کے نزدیک امن عامہ اور نظم عمومی کو ایسا خطرہ لاحق تھا جس کے مقابلے کے لیے ایسے قانون کی ضرورت تھی تو وہ ان فوق العادۃ اختیارات کو استعمال کرتا۔ جس وقت سے احمدی غیر احمدی نزاع نے امن وامان اور سلامتی عامہ کے لیے خطرے کی صورت اختیار کی بعض افسروں نے جن کے نزدیک ان دفعات کا استعمال ضروری تھا۔ وزارت سے پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کی کسی نہ کسی دفعہ کے ماتحت کاروائی کی سفارش کی۔ لیکن جس وقت یہ معاملہ مسلم لیگ کے لیڈر کے سامنے صوبے کے چیف منسٹر کی حیثیت میں پیش ہوا۔ اس نے ایسے فیصلے کیے جن کا محرک مسلم لیگ کا نظریہ تھا۔ حالانکہ نظم ونسق حکومت کے نقطہ ونگاہ سے وہ فیصلے غلط تھے۔

جن مقدمات کے متعلق انتظامی افسروں کو کاروائی کرنی پڑی ان کے کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ وقتاً فوقتاً ایسی سفارشات کی گئیں کہ فلاں شخص کو زیر دفعہ ۳ گرفتار کیا جائے یا زیر دفعہ ۵ اسے تقریریں کرنے سے روک دیا جائے یا اس کی حرکات وسکنات کو کسی مقام میں پابند کر دیا جائے۔ یا زیر دفعہ ۲۱ حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کو گالیاں دینے یا ان کے جنازے نکالنے کی وجہ سے مقدمہ چلایا جائے۔ لیکن ارباب سیاست کو پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ سے نفرت تھی اور جب کبھی اس ایکٹ کے ماتحت کسی کاروائی کی سفارش کی گئی۔ اس کو ہمیشہ سیاسی عینک سے دیکھا گیا اور جو فیصلے کیے گئے۔ ان میں ہمیشہ ارباب سیاست نے حکام پر غلبہ حاصل کیا۔ قانون وانتظام کا انچارج حاکم جو اقدام بھی کرنا چاہتا ہے یا اسے کرنا پڑتا ہے اصل میں وہ صرف قانون وانتظام کے پہلو کو دیکھتا ہے۔ لیکن سیاسی آدمی کی سب سے پہلی مصلحت یہ ہوتی ہے کہ مجوزہ کاروائی سے اس کی اور اس کی جماعت کی ہر دلعزیزی پر کیا اثر پڑے گا۔ اس ذہنیت کی ایک دلچسپ مثال اس خیال میں ملے گی۔ جو مشیر شعبہ قانون وانتظام نے اس وقت ظاہر کیا تھا جب میاں انور علی نے ۳۰ دسمبر ۱۹۴۹ء کو یہ سفارش کی کہ بعض احراری لیڈروں کے خلاف زیر دفعہ ۱۵۳الف اور زیر دفعہ ۲۱ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ مقدمات چلائے جائیں۔ ملک محمد انور نے جو سیاسی آدمی تھے، اس مجوزہ کاروائی کے خلاف فیصلہ کیا اور لکھا کہ مسلمان چونکہ احمدیت کے معاملے میں بہت حساس ہو رہے ہیں لہذا اگر احراریوں کے خلاف

احمدیوں کو برا بھلا کہنے کی وجہ سے مقدمات چلائے گئے تو انہیں عوام کی نگاہوں میں وہ درجہ شہادت حاصل ہو جائے گا جس کے وہ مستحق نہیں ہیں۔ یہی خیال انہوں نے بعد میں بھی دہرایا۔ اور مسٹر دولتانہ کا رویہ بھی شروع سے آخر تک یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب کبھی انہوں نے (سمجھا کہ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت کوئی کاروائی عوام میں غیر مقبول ہوگی وہ ہمیشہ اس ایکٹ کے استعمال سے متنفر رہے۔ ایک مقدمے میں تو انہوں نے صاف صاف فتویٰ دیدیا کہ وہ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت کوئی کاروائی کرنے کے حامی نہیں ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد وہ افسر جن کے نزدیک سلامتی عامہ کی حفاظت اور نظم عمومی کے قیام کے لیے یہ ایکٹ بے حد کارآمد تھا۔ اس کی طرف سے بالکل ہی برگشتہ و بے نیاز ہو گئے۔ اب گویا صورت یہ ہوئی کہ جب کوئی سیاسی آدمی بحثیت حکمران بھی کام کر رہا ہو اس کا اصول یہ ہوگا کہ اگر کوئی اقدام قانون کے ماتحت جائز بھی ہو اور کسی واقعہ کی نوعیت اس کی متقاضی بھی ہو کہ ایسا اقدام کیا جائے تو وہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس سے عام بے اطمینانی پیدا ہوگی۔ یہ اصول قریب قریب ایسا ہی ہے جیسے مثلاً عوام کسی قتل پر تحسین و آفرین کر رہے ہوں اور قاتل کے خلاف قانونی چارہ جوئی سے عوام کے برہم ہو جانے یا ملزم کے ساتھ عوام کی ہمدردی میں اضافہ ہونے کی توقع ہو تو قاتل کو سزا دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس شورش کے دوران میں قانونی کاروائی کی جتنی تجاویز حکومت کے سامنے پیش ہوئیں۔ ان سب کا فیصلہ بظاہر اسی اصول کے ماتحت کیا گیا۔ ایک اور مثال یہ ہے کہ جب زیر دفعہ ۱۴۴ مسجدوں کے اندر عام جلسے منعقد کرنے کے خلاف احکام دیے گئے اور ان کی خلاف ورزی کی گئی تو احرار اور علماء نے عوام کے سامنے یہ بظاہر معقول دعویٰ پیش کیا کہ حکومت مسجدوں کے اندر ان افعال و اعمال کی ممانعت کر رہی ہے جو ہمارے مذہب کے نزدیک جائز یا واجب ہیں اور حکومت کے احکام جمہور کے مذہبی حقوق میں مداخلت کا حکم رکھتے ہیں۔

ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ مداخلت فی الدین غلط اور حکومت کے خلاف ایک بے بنیاد اتہام تھا لیکن حکومت کے کارندوں نے ان الزامات کی تردید کے لیے کوئی جوابی پروپیگنڈا نہ کیا۔ مجرمین عوام کے محبوب و ممدوح اور ہیرو سمجھے جانے لگے۔ اور چیف منسٹر صرف اسی فکر میں رہے کہ جس سیاسی

جماعت سے ان کا تعلق ہے اس کی حیثیت پر اس جذبے کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔اب ٹُپ کے واقعہ کو لیجیے۔اس میں پولیس نے قوت کا استعمال کیا جس سے کچھ جانی نقصانات بھی ہوئے۔ بعد میں قوت کے اس استعمال کو ہائیکورٹ کے ایک جج نے جو اس واقعہ کی تحقیقات پر مامور ہوا تھا حق بجانب قرار دیا۔لیکن جب اس واقعہ کی اطلاع موصول ہوئی اور اس پر عوام کے غیظ وغضب کا اندازہ کیا گیا تو حاکم نے سیاسی آدمی کے سامنے بالکل ہتھیار ڈال دیے اور صرف سزا یافتہ مجرمین ہی رہا نہ کر دیے گئے بلکہ زیر سماعت مقدمات اور دفعہ ۱۴۴ کے احکام بھی واپس لے لیے گئے۔اس کے بعد احراریوں یا دوسرے شورش پسندوں کے خلاف کسی قسم کی موثر کاروائی نہ کی گئی۔اور انہیں حسب منشا ہر مشکل اور ہر وسعت کا پروپیگنڈا کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا گیا۔لہٰذا نتیجہ یہ ہوا کہ تنبیہ سے زیادہ کسی قسم کی موثر کاروائی نہ کی گئی اور تنبیہوں کا قصہ یہ ہے کہ وہ احراریوں کو بے شمار دفعہ کی گئیں، یہاں تک کہ ان کا اعادہ مذاق معلوم ہونے لگا اور ان کے علاوہ بھی مختلف افسروں نے مختلف موقعوں پر انہی لوگوں کو بارہا تنبیہ کی اور اسی پر اکتفا کیا۔

بہت سے افسروں نے زیر دفعہ ۱۵۳ الف اور زیر دفعہ ۲۹۵ الف تعزیرات پاکستان بہت سے مقدمات چلانے کی سفارش کی۔اور اس باب میں کوئی دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ جن لوگوں کے خلاف یہ قانونی کاروائی تجویز کی گئی تھی وہ ان دونوں دفعات کے ماتحت جرائم کے مرتکب ہوئے تھے ۔لیکن نہ کسی مقدمے کے دائر کرنے کا حکم دیا گیا اور نہ کوئی مقدمہ دائر کیا گیا۔گو بہت ہی آخری مرحلے پر ایک پراسرار سا حکم دیا گیا تھا کہ جہاں معمولی قانون کے خلاف کسی جرم کا ارتکاب کیا جائے وہاں ملزموں کے خلاف قانونی کاروائی کی جائے۔جو لوگ احمدیوں اور ان کے لیڈروں کے خلاف انتہائی نفرت پھیلا رہے تھے ان کے خلاف مضبوط اور موثر کاروائی نہ ہونے کا نتیجہ ظاہر ہے۔ عقیدہ فرد کا ایک ذاتی معاملہ ہے اور خواہ وہ دوسروں کو کتنا ہی جھوٹا، غیر دیانت دارانہ اور مضحکہ خیز معلوم ہو لیکن ہوسکتا ہے کہ اس عقیدے کے لوگ نہایت خلوص و دیانت سے اس پر اعتقاد رکھتے ہیں۔اور ہمیں اس حقیقت میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ احمدی اپنی جماعت کے بانی کا اور بعد کے لیڈروں کا جن میں موجودہ امام جماعت بھی شامل ہے انتہائی احترام کرتے ہیں لہٰذا ان شخصیتوں پر حملہ ہونے سے

احمدیوں کے مذہبی جذبات یقیناً مجروح ہوئے ہوں گے۔اسمیں بھی کوئی شک نہیں کہ احمدیوں کے خلاف چونکہ تضحیک ودشنام طرازی کا پروپیگنڈا صوبے بھر میں نہایت بڑے پیمانے پر جاری کیا گیا تھا اس لیے احمدی نفرت وحقارت سے دیکھے جاتے ہوں گے۔لہذا جولوگ ایک چھوٹی سی جماعت کے خلاف عوامی جذبات کومسموم کرنے کے ذمہ دار تھے۔ان کے خلاف کسی کاروائی کے فقدان کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ ایسی تدبیر اختیار نہ کرنی پڑے جس سے عوام کی بے اطمینانی میں اضافہ ہوجائے۔ خواہ اس چھوٹی جماعت کوکتنا ہی گہرا اور شدید صدمہ پہنچا ہو۔اس تمام صورت حالات کی وجہ صرف یہ تھی کہ مسلم لیگ اوراس کے لیڈر عوام کے نزدیک ہردلعزیز رہنا چاہتے تھے۔اورکوئی ایسی حرکت نہ کرنا چاہتے تھے جس کی وجہ سے ووٹر ناراض ہوجائیں اور لیگ کواقتدارحکومت سے محروم کردیں۔

اسی خواہش نے مسٹر دولتانہ کو ٦ مارچ ١٩٥٣ء والا بیان شائع کرنے کی ترغیب دی۔ ہمارے سامنے یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ یہ بیان ان معنوں میں غیر دیانت دارانہ تھا کہ اس کی حیثیت ایک سیاسی چال سے زیادہ نہ تھی اور یہ چال اس لیے چلی گئی تھی کہ جس طرح بھی ہوسکے مارشل لانافذ نہ ہونے پائے یہی نتیجہ اس واقعہ سے بھی نکلتا ہے کہ بعد میں مسٹر دولتانہ نے ١٠مارچ کو یہ بیان خود ہی واپس لے لیا۔سوال یہ ہے کہ پھر یہ بیان جاری ہی کیوں کیا گیا خصوصاً ایسے وقت جب مسٹر دولتانہ کو معلوم ہوچکا تھا کہ مارشل لانافذ کرنے کا فیصلہ ہوچکا ہے یاعنقریب ہونے والا ہے؟

اس کا صرف ایک ہی جواب ممکن ہے کہ عوام میں ہردلعزیز رہنے کی خواہش نے مسٹر دولتانہ سے یہ بیان جاری کرایا مسٹر دولتانہ نے اس بیان کے اثرات ونتائج پرایک لمحے کے لیے بھی غور نہ کیا۔اوراس انتہائی پریشانی کا اندازہ بھی نہ لگایا جواس سے مرکزی حکومت کولاحق ہونی ضروری تھی۔ اور لاحق ہوئی ۔مسٹر دولتانہ نے سوچا کہ مرکزی حکومت خواہ کتنی ہی بڑی مصیبت میں مبتلا ہوجائے مجھے ضرورکوئی ایساقدم اٹھانا چاہیے جس سے میں ہردلعزیز ہوجاؤں۔

اخبارات

ہم زمانہ زیر بحث کے دوران میں اخباروں کی سرگرمیوں کا ذکر اور ان پر تبصرہ تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں۔ اس اعتبار سے بدترین مجرم ''آزاد''، ''زمیندار''، ''احسان''، ''آفاق'' اور ''مغربی پاکستان'' تھے۔ ان میں سے پہلا تو خالص احراری اخبار تھا۔ لیکن باقی چار یقیناً حکومت کے اثر کو قبول کر سکتے تھے کیونکہ وہ حکومت سے بڑی بڑی رقمیں وصول کر چکے تھے۔ ''آفاق'' عملاً مسٹر دولتانہ کا اپنا اخبار تھا۔ بہرکیف وہ براہ راست میر نور احمد کے اختیار اور نگرانی کے ماتحت تھا۔ جو ڈائریکٹر تعلقات عامہ کی حیثیت سے پالیسی کے معاملات میں مسٹر دولتانہ کے زیر اثر تھے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی طرح ہم بھی اس امر کا تصور نہیں کر سکتے کہ مسٹر دولتانہ اس مواد کی نوعیت اور مقدار سے بے خبر تھے جس کو اس طویل مدت کے دوران میں یہ اخبارات شائع کرتے رہے۔ اگر ''آفاق'' مورخہ یکم جون کا مقالہ تحریک کے متعلق اس کے گزشتہ رویے کا مظہر تھا تو اس وقت تک یہ اخبار اس نزاع کے متعلق معقول رائے ظاہر کر رہا تھا۔ لیکن جولائی کے اوائل میں اس کی پالیسی میں دفعتہً ایک انقلاب آیا اور اس نے نہ صرف اس شورش کی طرف غیر معمولی توجہ شروع کر دی بلکہ اس موضوع پر اپنے خیالات بالکل تبدیل کر لیے اور اس کے مضامین اپنی پالیسی اور دلائل کے اعتبار سے کاملاً مسلم لیگ کی قرارداد اور مسٹر دولتانہ کی تقریروں سے ہم آہنگ ہو گئے۔ غالباً اس نے اپنے خیالات قرارداد اور تقریروں سے مستعار لیے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے گو اس کی براہ راست کوئی شہادت نہیں کہ مسٹر دولتانہ اور میر نور احمد کے درمیان جو اس اخبار کی پالیسی کے نگراں تھے کچھ اشتراک عمل موجود ہو۔ تاکہ اس طوفان کا رخ کراچی کی طرف پھیر دیا جائے۔ بہرحال اس اخبار نے صوبہ مسلم لیگ کی قرارداد مورخہ ۲۷ جولائی کے بعد جو مضامین لکھے ان کا قدرتی اثر یہی تھا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ''زمیندار'' کی مقبولیت اور اشاعت کی وجہ یہ تھی کہ وہ احمدیوں کو متواتر دشنام و استہزا کا نشانہ بناتا رہا۔ تاہم ہمیں یقین نہیں ہے کہ اگر ڈائریکٹر تعلقات عامہ اس معقول مالی

امداد کے پیش نظر جو حکومت نے اس اخبار کو دی تھی۔ اس کی سرگرمیوں پر قابو رکھنے کی خواہش کرتے تو جب بھی یہ اخبار اپنے رویے پر مصر رہتا۔ خصوصاً ان تعلقات کے پیش نظر جو مولانا اختر علی خاں اور خود مسٹر دولتانہ کے درمیان قائم تھے۔ ''احسان'' اور ''مغربی پاکستان'' بھی ڈائریکٹر تعلقات عامہ کو ناراض کرنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ اول الذکر کو سرکاری امداد ایک غیبی عطیہ تھا اور آخر الذکر کو جو امداد دی گئی وہ اس کی قلیل اشاعت کے مقابلے میں بہت معقول تھی۔ ان اخباروں نے مطالبات کی حمایت میں بھی پرزور پراپیگنڈا جاری رکھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ امر روز بروز زیادہ واضح ہوتا چلا گیا کہ مطالبات کو تسلیم کرانے کے لیے یا تو خواجہ ناظم الدین کے خیالات بدلنا ضروری ہے یا انکو دھمکی دے کر مغلوب کرنا ہوگا۔

اس رپورٹ کے ایک سابقہ حصے میں ہم نے ان مضامین کا مفاد نقل کیا تھا جو ان اخباروں نے موجودہ نزاع پر قلمبند کیے تھے انہوں نے اس موضوع پر بار بار مضامین لکھ کر اس سے جس غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا اور جس طریقے سے مطالبات کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس سے ان کا یہ مقصد صاف طور پر واضح ہوتا تھا کہ شورش کی آگ کو ہوا دی جائے اور حتی الامکان اس کو وسیع پیمانے پر پھیلایا جائے۔ ان اخباروں کے کالموں میں کہیں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ملتا جس میں ان واقعات کو ناپسندیدہ اور قابل نفریں قرار دیا گیا ہو جو اس سلسلے میں صوبے بھر کے اندر رونما ہو رہے تھے۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ احمدی ایک الگ قوم ہیں۔ طویل اور مدلل مضامین شائع کیے گئے۔

شورش کے سلسلے میں رونما ہونے والے واقعات کی ہیجان خیز خبریں درج کی گئیں۔ ملاقاتوں کے نتائج مساجد میں اور دوسرے مقامات پر ہونے والے جلسوں، اور منظور شدہ قراردادوں کا اندارج کیا گیا۔ ان سب افعال کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ شورش کی وسعت و شدت میں اضافہ ہو۔ اور اس نتیجے سے یہ اخبارات صرف باخبر ہی نہ تھے بلکہ ان کا مقصد بھی یقیناً یہی ہوگا۔ مزید برآں ان اخباروں نے اس نکتے پر جو زور دیا کہ یہ مطالبات مرکز کے دائرہ اختیار میں ہیں۔ اس کا اثر بھی صرف یہی ہو سکتا تھا کہ شورش کی رفتار کا رخ کراچی کی طرف پھر جائے۔ اس سے قبل ہم اس بیان کو تسلیم کر چکے ہیں کہ ڈائریکٹر تعلقات عامہ تحریک کو کراچی کے راستے پر لگانے کی پالیسی میں شریک

تھے اور ''آزاد'' کے سوا باقی سب مذکورہ اخبارات ڈائریکٹر تعلقات عامہ کے ممنون اور ان سے اثر پذیر تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی پالیسی میں بھی وہ ڈائریکٹر ہی کے پیرو تھے۔ لہٰذا مطالبات کے رد ہونے سے جو صورت حالات پیدا ہوئی۔ اس کے لیے یہ سب ذمہ دار ہیں۔ اس لیے بعد میں رونما ہونے والے فسادات کی ذمہ داری انہی پر ہے۔

مرکزی اور صوبائی حکومتیں

خواجہ ناظم الدین بنام مسٹر دولتانہ

مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت دونوں کے رئیس علی الترتیب خواجہ ناظم الدین اور مسٹر دولتانہ تھے۔ فریقوں نے ان دونوں کو بھی ذمے داری میں شریک بتایا ہے۔ خواجہ ناظم الدین کے خلاف یہ بیان کیا گیا ہے کہ اگرچہ جماعتوں نے یہ مطالبات اگست ۱۹۵۲ء ہی میں رسمی طور پر ان کی خدمت میں پیش کر دیے تھے۔ لیکن انہوں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی بلکہ جب ۲۲ جولائی کو انہیں الٹی میٹم دے دیا گیا اسکے بعد بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ انہیں ۲۶ فروری کو اس فیصلے کا علم ہوا کہ اگلی صبح کو ان کی کوٹھی پر پکٹنگ کیا جائے گا۔ درحقیقت مسٹر دولتانہ کے دعوے کے مطابق فساد کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ خواجہ ناظم الدین خاموش رہے۔ ان کا رویہ مذبذب رہا اور وہ علماء سے اکثر طویل مذاکرات کرتے رہے۔ تاہم جماعتیں اس امر پر متفق نہیں ہیں کہ خواجہ ناظم الدین کا رویہ کیا ہونا چاہیے تھا۔ احمدیوں کا قول یہ ہے کہ اگر مرکزی حکومت مطالبات کو فی الفور علی الاعلان رد کر دیتی اور صوبے کو ایک واضح اور ذمہ دارانہ ہدایت دے دیتی کہ جو لوگ مطالبات کے لیے شورش برپا کر رہے ہیں ان کے متعلق مضبوط کاروائی کی جائے اور انکے خلاف قانون کی پوری مشینری کو استعمال کیا جائے تو فسادات بالکل واقع نہ ہوتے۔ لیکن غیر احمدی جماعتیں متفقہ طور پر یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ اگر مطالبات کے ساتھ اتفاق کا اعلان شروع ہی میں کر دیا جاتا اور ان کو تسلیم کرانے کے لیے ضروری تدابیر اختیار کی جاتیں یا اختیار کرنے کا وعدہ کر لیا جاتا تو کسی قسم کی بے چینی یا بدنظمی ظہور میں

نہ آتی۔ مسٹر دولتانہ نے کچھ نہیں بتایا کہ خواجہ ناظم الدین کو مطالبات کے متعلق کیا اقدام کرنا چاہیے تھا۔ ان کو صرف یہ شکایت ہے کہ خواجہ ناظم الدین کو کسی پالیسی کا فیصلہ کر کے اس کا اعلان کر دینا چاہیے تھا خواہ وہ پالیسی کچھ بھی ہوتی۔

خواجہ ناظم الدین ایک خاص طور پر دشوار ذاتی مسئلے سے دوچار ہو رہے تھے۔ ہر قرینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے مطالبے کا مذہبی پہلو خواجہ صاحب کو متاثر کر چکا تھا اور یہ بالکل واضح ہے کہ وہ مطالبات کے قطعی استرداد سے علما کو ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے وہ اپنے عقائد مذہبی میں صادق اور مخلص تھے اور علماء کا بے حد احترام کرتے تھے وہ اس امر سے بھی باخبر تھے کہ علما اب امور ملکی پر بہت بڑا اثر و نفوذ رکھتے ہیں۔ ان کا بلند موقف قرار داد مقاصد میں واضح تھا اور تحریک سے وابستہ ہونے والے بعض علماء دستور ساز اسمبلی کے ملحقہ تعلیمات اسلامی بورڈ کے ممبر تھے لہٰذا ان کے ساتھ براہ راست متصادم ہونا بالکل خارج از بحث تھا۔ بلاشبہ خواجہ صاحب ان مطالبات کو تسلیم کر سکتے تھے یا شخصی طور پر ان کی حمایت کا وعدہ کر سکتے تھے۔ اس حالت میں کوئی گڑ بڑ پیش نہ آتی تا آنکہ معاملہ دستور ساز اسمبلی میں پیش ہوتا فسادات بالکل رونما نہ ہوئے ہوتے۔ اور خواجہ ناظم الدین پاکستان میں ہر دلعزیز ہیرو بن چکے ہوتے۔ احمدی ایک چھوٹی سی جماعت تھے اور ان کی طرف سے کسی مزاحمت یا فساد بدنظمی کا امکان نہ تھا۔ بلاشبہ چودھری ظفر اللہ خان کی برطرفی پر بین الاقوامی حلقوں میں کسی قدر حرکت پیدا ہوتی لیکن پاکستان کی آبادی اس برطرفی پر تحسین و آفرین کے نعرے لگاتی۔

پھر خواجہ ناظم الدین نے یہ راستہ کیوں اختیار نہ کیا؟ ان کا قول یہ ہے کہ یہ راستہ محض اس لیے اختیار نہ کیا گیا کہ ایسا اعلان دوسرے مسلم ممالک میں موثر نہ ہوتا۔ بلکہ اس اقدام کے دوررس نتائج کا خیال حائل ہو گیا جو اس رپورٹ میں کسی دوسرے مقام پر بیان کیے جا چکے ہیں۔ اگر یہ مطالبات تسلیم کر لیے جاتے تو پاکستان بین الاقوامی برادری سے خارج ہو گیا ہوتا۔

اب دو متبادل سامنے تھے علما سے براہ راست تصادم اور پاکستان کا عالمی برادری سے اخراج، خواجہ ناظم الدین کے لیے صرف یہی راستہ باقی رہ گیا تھا کہ ملک کا واسطہ دے کر اور ان عوام کا

نام لے کر جوعنقریب فاقہ کشی کا شکار ہونے والے تھے۔علماء سے رحم کی درخواست کریں۔لیکن اللہ کے منشا اور حکم کے سامنے وطن ،قوم اور بھوک جیسی پست مصلحتیں کیا حقیقت رکھتی تھیں۔اور اللہ ہی کے منشا اور حکم کے ماتحت علماء خواجہ ناظم الدین کے پاس آئے تھے۔لہٰذا وہ اپنی ضد اور ہٹ پر پختگی سے قائم رہے۔خواجہ ناظم الدین نے ان کو یاد دلایا کہ چودھری ظفر اللہ خان کو خود قائداعظم نے اس عہدے پر مقرر کیا تھا۔کیا علما مملکت کے مرحوم بانی کے فیصلے کا احترام نہ کریں گے؟ لیکن دنیا کی ہر چیز بدل سکتی ہے مگر علما کی رائے جب ایک دفعہ قائم ہو جائے تو اس میں کوئی تغیر نہیں آسکتا چنانچہ وہ اس دلیل سے بھی قائل نہ ہوئے۔شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ ناظم الدین نے ان میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش بھی کی اور ایک فریق کو وزارت میں ایک عہدہ بھی پیش کیا۔خواجہ ناظم الدین اس قدر بلند اخلاق اور عزت دار آدمی ہیں کہ ان سے ایسی چالوں کی توقع نہیں ہوسکتی۔لیکن وہ سیاسی آدمی بھی ہیں اور سیاسیات میں آدمی اکثر سیاسی آدمی ہو کر ہی رہ جاتا ہے اور علماء میں بھی ایسے آبرومند لوگ موجود ہیں جو جوعقائد کی پختگی اور جرات کے سرمایہ دار ہیں اور کسی دنیاوی کشش سے مسحور نہیں کیے جاسکتے لہٰذا پھوٹ ڈالنے اور رشوت دینے کی کوشش ناکام ہوگئی۔اس کے بعد خواجہ صاحب نے ٹال مٹول کا طرز عمل اختیار کیا۔بلکہ ایک دفعہ یہ ارادہ بھی کرلیا کہ پوری دنیائے اسلام کے علما کو جمع کر کے ان سے اس مشکل سے نجات دلانے کی استدعا کریں۔لیکن علماء اب تک کافی انتظار کر چکے تھے اور مزید انتظار پر آمادہ نہ تھے چنانچہ انہوں نے ڈائریکٹ ایکشن کے پروگرام کا فیصلہ کرلیا۔

اب خواجہ ناظم الدین کے لیے اس کے سوا کوئی راہ عمل باقی نہ رہی کہ اس چیلنج کو قبول کرلیں یا وزارت سے دست بردار ہو جائیں ،انہوں نے پہلی راہ اختیار کی اور علما کو گرفتار کرلیا۔اس واقعہ کے کئی ہفتے بعد جب پارلیمنٹ میں بجٹ پر عام مباحثہ ہورہا تھا۔خواجہ ناظم الدین نے ایک تقریر کی جس میں لاہور کے اندر مارشل لا کے اعلان کی وجوہ بیان کرتے ہوئے علما کے اس فعل کو غیر جمہوری اور خلاف اسلام بتایا۔آپ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اکثر علما ڈائریکٹ ایکشن کے خلاف ہیں اور صرف علما کے احراری گروہ نے یہ اقدام شروع کیا ہے لیکن ان کا یہ بیان درست نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ ڈائریکٹ ایکشن کی قرارداد ۱۸ جنوری ہی کی آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن میں اتفاق آرا

سے منظور ہو چکی تھی جس میں تمام مذاہب و مسالک کے علما موجود تھے۔ البتہ ڈائریکٹ ایکشن کی صورت کا فیصلہ بعد میں کیا گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر خواجہ ناظم الدین کے ذہن پر یہ حقیقت روشن تھی کہ ڈائریکٹ ایکشن غیر جمہوری اور خلاف اسلام ہے اور ملک کے بہترین مفادات کے منافی ہے تو انہوں نے اس سے قبل یہی بات علی الاعلان کیوں نہ کہی جب ۲۲ جنوری کو علما کے ایک وفد نے ان کو اس اقدام کا الٹی میٹم دے دیا تھا۔ علما کے ساتھ ان کے طویل اور مسلسل مذاکرات کی خبریں تقریباً تمام اخباروں میں شائع ہو رہی تھیں اور لوگوں کے دلوں میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا تھا کہ وہ علماء کے نقطہ نگاہ کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اور جب ۲۷ فروری کو انہوں نے مطالبات کو مسترد اور علما کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب بھی اس کارروائی کے جو وجوہ بیان کیے وہ اطلاع عام کے لیے شائع نہ کیے گئے۔ بلکہ فی الحقیقت حکومت پنجاب کو واضح طور پر ہدایت کی گئی کہ جن خیالات کی اشاعت کا اسے حکم دیا گیا ہے وہ مرکزی حکومت سے منسوب نہ کیے جائیں۔ اب مرکزی حکومت کے خیالات کو خفیہ رکھنے کی ہدایات سے کیا نتیجہ مترتب ہوتا ہے؟ نتیجہ صرف ایک ہی ہے کہ مرکزی حکومت کو اپنے موقف و مقام کے متعلق پورا یقین نہ تھا اور وہ ایسے اقدام کا اپنے آپ سے منسوب ہونا پسند نہ کرتی تھی جو بعد میں غیر مقبول اور ناپسندیدہ قرار پائے۔

مرکزی حکومت کئی مہینوں تک عدم فیصلہ تامل اور تذبذب کی جس پالیسی پر کاربند رہی اس کا اثر صوبے کی صورت حالات پر پڑا۔ بلاشبہ قانون و انتظام ایک صوبائی مضمون تھا۔ لیکن ایسی صورتوں میں جب پوری آبادی کسی مذہبی جوش میں مبتلا ہو رہی ہو۔ محض قانون و انتظامی آلات کو حرکت دینے سے زیادہ کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ''چیز'' پنجاب میں موجود نہ تھی اور مرکز نے اس پر غور ہی نہ کیا تھا۔ لہٰذا نتیجہ یہ ہوا کہ فساد برابر پرورش پاتا رہا اور جب پھوٹا تو نہایت شدت سے پھوٹا۔ اس کو روکنے یا اس سے دست و گریباں ہونے کا موزوں ترین موقع وہ تھا جب خواجہ ناظم الدین کو ڈائریکٹ ایکشن کی دھمکی دی گئی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یا تو خواجہ صاحب نے اس کو محض ایک خالی خولی دھمکی خیال کیا۔ یا انہوں نے علماء کے ساتھ اپنے ذاتی تعلقات پر بھروسہ کیا۔ ہمارے سامنے جو تحریری بیانات پیش ہوئے، جو زبانی شہادتیں دی گئیں اور جو بحث کی گئی، ان میں مسٹر دولتانہ

کے خلاف یہ بیان کیا گیا کہ انہوں اعلیٰ سیاسیات کا کھیل کھیلنے کے لیے اس شورش کو خود جاری کیا اور چلایا اور مسٹر فضل الٰہی نے تو ایک وقت پر یہ اشارہ بھی کیا تھا کہ مسٹر دولتانہ کی اس سیاست بازی کا مقصد صرف داخلی نہ تھا بلکہ بین الاقوامی سیاسیات سے بھی متعلق تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ خواجہ ناظم الدین کو اقتدار کی کرسی سے اتار پھینکیں خود اپنی قیادت میں ایک مرکزی حکومت قائم کریں اور پاکستان کو ایک کمیونسٹ مملکت بنا دیں۔ ہم نے معاملے کے اس حصے کی شہادت کی نہایت احتیاط سے جائزہ لیا ہے لیکن ہمارا یہ خیال نہیں کہ مسٹر دولتانہ اس شورش کے ابتدائی مرحلوں میں اس کے آغاز اور اس کی ہمت افزائی سے کوئی خاص مقصد پورا کرنا چاہتے تھے۔ پنجاب میں ان کو سہولت اور آرام کی پوزیشن حاصل تھی اور ہم نہیں سمجھتے کہ پاکستان کی وزارت عظمیٰ جو کانٹوں کی سیج ہے ان کے لیے کوئی دلکشی رکھتی تھی۔ ہمارے نزدیک وہ اتنے حریص جاہ بھی نہ تھے کہ بین الاقوامی سیاسیات کا کھیل ختم نبوت کے مسئلے پر کھیل سکتے۔ یہ امکانات ہمیں کچھ بعید سے معلوم ہوتے ہیں اور ان امور سے تعلق رکھتے ہیں جن کا ثبوت مہیا نہیں کیا جا سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر دولتانہ نے آغاز کار ہی میں یہ سمجھ لیا تھا کہ طوفان پرورش پا رہا ہے اور اس کی شدت و وسعت روز بروز لازماً بڑھتی چلی جائے گی وہ بھی خواجہ ناظم الدین ہی طرح علماء سے براہ راست تصادم سے بچنے کے خواہاں تھے۔ لیکن خواجہ صاحب تو انسانی دانش و عیاری پر بھروسا کرتے رہے کہ وہ آنے والے طوفان کو نابود کرنے کا کوئی نہ کوئی وسیلہ دریافت کر لے گی اور مسٹر دولتانہ کی معقولیت نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ انسانی دانش ایسے معاملات میں کوئی بھروسہ کی چیز نہیں اور ایسے مسائل حالات و کوائف کے ناگہانی اور اتفاقی اختلاط سے حل نہیں ہوا کرتے۔ انہیں معلوم تھا کہ طوفان آنے والا ہے لیکن وہ خواجہ ناظم الدین کی طرح یہ محسوس نہ کر سکتے تھے کہ اگر وہ اپنا سر ریت میں چھپا لیں گے تو وہ طوفان خود بخود گزر جائے گا۔ جب انہیں اس پرشور آندھی کے آثار صاف صاف نظر آ گئے۔ تو ان کے لیے یہی چارہ باقی رہ گیا کہ یا تو اس سے باہر رہیں یا اگر ممکن ہو تو اس کے رخ کو موڑنے کی کوشش کریں۔

ہمارے سامنے اس امر کی بھی کافی شہادت موجود نہیں کہ مسٹر دولتانہ نے دانستہ اس تحریک کو شروع کیا یا لاہور میں آل مسلم پارٹیز کانفرنس مورخہ ۱۳ جولائی ۱۹۵۲ء کے اجلاس سے پہلے اس کو

تقویت پہنچانے کی کوئی کوشش کی۔ مولانا اختر علی خاں نے اس عدالت میں حاضر ہونے سے پہلے دو بیانات دیے تھے۔ ایک اس وقت جب ان کا مقدمہ ایک خاص فوجی عدالت میں پیش تھا اور ایک درخواست کی شکل میں جو انہوں نے ۱۲ اپریل ۱۹۵۳ء کو موجودہ چیف منسٹر کو ارسال کی۔ ان دونوں میں مولانا نے بیان کیا کہ مسٹر دولتانہ نے جن کے ساتھ ان کے خاصے گہرے تعلقات تھے ایک سے زیادہ دفعہ ان کو ہدایت کی کہ مرکزی حکومت کے خلاف تحریک کو چلائیں اور حکومت پنجاب کو اس سے باہر رکھیں۔ فوجی عدالت والے بیان میں انہوں نے ماسٹر تاج الدین انصاری سے اپنی ایک گفتگو کا ذکر بھی کیا۔ جس کے دوران میں انصاری نے بتایا تھا کہ مسٹر دولتانہ نے احمدیوں کے خلاف پراپیگنڈا سے اتفاق ظاہر کیا ہے۔ اسی بیان میں آگے چل کر مولانا اختر علی خاں نے یہ بھی بتایا کہ ماسٹر تاج الدین انصاری اور مولانا ابوالحسنات دونوں نے انہیں اطلاع دی تھی کہ ۱۶ فروری کو لاہور میں جو ہڑتال کی جارہی ہے اس کو ''برسر اقتدار'' لوگوں کے زیر ہدایت منظم کر کے کامیاب بنایا جائے گا۔

مولانا داؤد غزنوی نے بھی ایک فوجی افسر کے سامنے بیان دیتے ہوئے مسٹر دولتانہ کے خلاف اسی قسم کی باتیں کہیں۔ مثلاً کہا کہ ایک دفعہ مولانا اختر علی خاں نے مجھے اطلاع دی تھی کہ مسٹر دولتانہ نے تحریک کے لیے سرمایہ مہیا کرنے کا وعدہ کیا ہے اور ایک اور موقع پر بعض لیڈروں نے جن میں ماسٹر تاج الدین انصاری اور مولانا ابوالحسنات شامل تھے مجھے یہ بتایا تھا کہ اب وہ کراچی میں تحریک شروع کرنا چاہتے ہیں۔ جب میں نے اس کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے بتایا کہ جب تک ہم چیف منسٹر سے مشورہ نہ کرلیں لاہور میں ڈائریکٹ ایکشن کا آغاز نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا داؤد غزنوی نے اس بیان میں یہ بھی ذکر کیا کہ جو خیال ماسٹر تاج الدین انصاری اور مولانا ابوالحسنات نے ظاہر کیا تھا اسکی تصدیق مولانا اختر علی خاں نے مجلس عمل کے اجلاسوں کے دوران میں کی اور مولانا اختر علی خاں نے مجلس عمل کے ایک بعد کے اجلاس میں اس امر کو تسلیم کیا تھا کہ مسٹر دولتانہ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ پنجاب میں کوئی شخص احمدیوں کے خلاف تحریک میں حصہ لینے کی وجہ سے گرفتار نہیں کیا جائے گا۔

اس تحقیقات میں جب ہم نے مولانا اختر علی خاں سے مسٹر دولتانہ کے ساتھ ان کی گفتگو کے

متعلق استفسار کیا تو انہوں نے اس سے انکار کیا۔ لہٰذا فوجی عدالت میں ان کا سابقہ بیان کوئی قطعی شہادت نہیں۔ مولانا اختر علی خاں اور مولانا داؤد غزنوی کے بیانات کے باقی حصے چونکہ محض سنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں اس لیے قطعاً ناقابل قبول ہیں۔ مسٹر دولتانہ کے خلاف دوسری شہادت مولانا امین احسن اصلاحی کے بیان میں اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی لکھی ہوئی ایک چٹھی میں شامل ہے۔ لیکن یہ بیان اور یہ چٹھی ایک ''رائے'' سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ اس لیے ان کے متعلق بھی ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ یہ غیر متعلقہ ہیں۔ لہٰذا ہم شہادت کے ان ٹکڑوں میں سے کسی پر بھی حصر نہیں کر سکتے۔ اسی طرح ڈاکٹر عنایت اللہ سلیمی نے شہادت دی ہے کہ ایک دفعہ ان سے مولانا غلام غوث سرحدی نے کہا تھا کہ مسٹر دولتانہ اس تحریک کے حامی ہیں۔ لیکن یہ شہادت بھی سنی سنائی ہونے کی وجہ سے ناقابل قبول ہے۔ انہوں نے مزید بیان کیا کہ شیخوپورہ کے مسلم لیگیوں کی سرگرمیوں سے عوام نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ تحریک کو حکومت کی حمایت حاصل ہے لیکن یہ بھی محض ایک غیر متعلقہ رائے ہے۔

خواجہ ناظم الدین نے بیان کیا ہے کہ مسٹر دولتانہ مرکزی حکومت میں پنجاب کے نمائندے کے تقرر پر اپنا اقتدار چاہتے تھے۔ خواجہ ناظم الدین کو یہ احساس صرف اس وقت ہوا جب مجلس اصول اساسی کی سفارش دوبارہ تجویز مساوات کے متعلق ان کے اور مسٹر دولتانہ کے درمیان اختلافات رونما ہوئے مجلس اصول اساسی کی رپورٹ دسمبر میں کسی وقت شائع ہوئی تھی۔ لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ رپورٹ کی اشاعت سے پہلے مسٹر دولتانہ کے پیش نظر اس مقصد کا ہونا ممکن نہیں۔ رپورٹ کی اشاعت کے بعد مساوات نمائندگی کے مسئلے پر بنگال اور پنجاب کا جھگڑا شدید صورت اختیار کر گیا۔ ناظم الدین فرما رہے تھے کہ یہ قضیہ ان دونوں حضرات کے درمیان قریب قریب ذاتی مناقشے کی صورت اختیار کر گیا۔ خواجہ ناظم الدین کا بیان ہے کہ مسٹر دولتانہ نے مجلس اصول اساسی کی رپورٹ پر دستخط کیے تھے جس میں مساوات نمائندگی تجویز کی گئی تھی۔ اور مسٹر دولتانہ یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اس تجویز کی قطعی اور غیر مشروط حمایت کبھی نہیں کی اور انہوں نے ایک اختلافی نوٹ لکھنے کے بعد مجلس اصول اساسی کی رپورٹ پر مشروط دستخط کیے تھے۔ حقیقی صورت کچھ بھی ہو یہ دستاویز ہمارے سامنے نہیں جس سے ہم معلوم کر سکیں کہ کونسا بیان صحیح ہے۔ لیکن اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ رپورٹ کی اشاعت کے بعد

مسٹر دولتانہ نے پنجاب کے نقطہ نگاہ کی حمایت ڈر کر کی اور اس کی تائید میں رائے عامہ کو متحد اور منظم کر لیا۔ خواجہ ناظم الدین کا اپنا بیان یہ ہے کہ جب میں اس جھگڑے کے متعلق رائے عامہ کا اندازہ کرنے کے لیے پنجاب آیا تو میرے سامنے بہت سے وفد پیش ہوئے جن کو مسٹر دولتانہ نے خود وکالت کے لیے ہدایات دے کر بھیجا تھا۔ چنانچہ ہر وفد نے ایک ہی قسم کے دلائل پیش کیے جو بالکل یکساں الفاظ میں لکھے ہوئے تھے۔ خواجہ صاحب کا بیان ہے کہ یہ تمام تحریری وکالت نامے تمام وفدوں کو خود مسٹر دولتانہ نے مہیا کیے تھے۔ لہٰذا یہ واضح ہے کہ اس قضیہ پر خواجہ ناظم الدین اور مسٹر دولتانہ کے درمیان کشمکش تھی اور یہ بالکل ممکن ہے کہ مسٹر دولتانہ نے یہ سوچا ہو کہ اگر وہ خواجہ ناظم الدین کو اکھیڑنے میں کامیاب ہو جائیں تو مساوات نمائندگی کی تجویز سے پنجاب کی نجات کے مواقع بہتر ہو سکتے ہیں اور ممکن ہے اس مقصد کو سامنے رکھ کر زیادہ اطمینان قلب کے ساتھ انہوں یہ کوشش کی ہو کہ خواجہ ناظم الدین کی مخالفت کو ختم کرنے کے لیے انکو کسی مصیبت میں مبتلا کر دیا جائے لیکن جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں مسٹر دولتانہ تحریک کا رخ کراچی کی طرف پھیرنے کی پالیسی، مجلس اصول اساسی کی رپورٹ شائع ہونے سے بہت پہلے اختیار کر چکے تھے۔ اور ہمارے سامنے اس امر کی کوئی شہادت نہیں کہ اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد انہوں نے علماء یا دوسرے علم برادران تحریک کو اپنی سرگرمیاں تیز کر دینے کی کوئی ہدایت کی ہو۔ علما رپورٹ کی اشاعت سے پہلے خواجہ ناظم الدین سے کئی ملاقاتیں کر چکے تھے اور بعد میں انہوں نے کراچی میں جو سرگرمیاں اختیار کیں جن میں ڈائریکٹ ایکشن کی قرارداد کی منظوری اور الٹی میٹم کا ارسال بھی شامل تھا۔ وہ محض اسی لائحہ عمل کا نتیجہ تھا جس کا فیصلہ وہ پہلے کر چکے تھے۔

مندرجہ بالا نتائج سے ہماری اس رائے کی تردید نہیں ہوتی۔ جو ہم نے مسلم لیگ کے خلاف بحث کرتے ہوئے قلمبند کی تھی کہ لاہور میں آل مسلم پارٹیز کنونشن کے بعد اور خصوصاً مسلم لیگ کی قرارداد مورخہ ۲۷ جولائی کے بعد مسٹر دولتانہ کی مستقل پالیسی یہ تھی کہ تحریک کا رخ کراچی کی طرف موڑ دیا جائے تاکہ پنجاب اس شورش کی تباہ کاری سے بچ جائے یہ رائے ان چیزوں پر مبنی ہے:

خود لیگ کی قرارداد کے الفاظ، مسٹر دولتانہ کی اپنی تقریریں جن میں ان کا بیان مورخہ ۶ مارچ

۱۹۵۳ء بھی شامل ہے اور جس کے اثرات کے متعلق ہم ''مسلم لیگ'' کے عنوان کے ماتحت اوپر پوری طرح بحث کر چکے ہیں۔ اخبارات کے بے شمار مضامین میر نور احمد ڈائریکٹر تعلقات عامہ کی سرگرمیاں اور دوسری کیفیاتی شہادت۔ خواجہ ناظم الدین نے اپنی شہادت میں ایک نہایت موزوں تشبیہ استعمال کی ہے اور شکایت کی ہے کہ مسٹر دولتانہ چاہتے تھے کہ میں ''ننھے کو لیے رہوں'' اگر مطالبات کو ایک ننھے بچے سے تشبیہ دی جائے تو ذمہ داری کے پورے موضوع کو ایک فقرے میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً احرار نے ایک بچہ جنا، جسے انہوں نے متبنیٰ بنانے کے لیے علماء کی خدمت میں پیش کیا۔ علماء نے اس کا باپ بننا منظور کر لیا۔ لیکن مسٹر دولتانہ نے سمجھ لیا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر پنجاب میں شرارت کرے گا۔ لہٰذا انہوں نے اس کو ایک نہر میں بہا دیا۔ جو میر نور احمد کی مدد سے کھودی گئی تھی اور جس کو پانی اخباروں نے اور خود مسٹر دولتانہ نے مہیا کیا تھا۔ جب یہ بچہ حضرت موسیٰ کی طرح بہتا ہوا خواجہ ناظم الدین تک پہنچا تو انہوں نے دیکھا کہ بچہ خوبصورت تو ہے لیکن اس کے چہرے پر ایک چین جبین اور غیر معلوم سی ناگواری نظر آتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس کو گود میں لینے سے انکار کیا۔ اور پرے پھینک دیا اس پر بچے نے ایڑیاں رگڑنا اور شور مچانا شروع کر دیا۔ اس شور نے اس کی پیدائش کے صوبے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور خواجہ ناظم الدین اور مسٹر دولتانہ دونوں کو موقوف کرا دیا۔ یہ بچہ ابھی زندہ ہے اور راہ دیکھ رہا ہے کہ کوئی آئے اور اسے اٹھا کر گود میں لے لے۔ اس مملکت خداداد کو پاکستان میں سیاسی ڈاکوؤں، طالع آزماؤں اور گمنام و بے حیثیت آدمیوں، غرض سب کے لیے کوئی نہ کوئی روزگار موجود ہے۔ ہمارے سامنے صرف دو ایسے آدمی ہیں جنہوں نے اس قسم کا روزگار قبول کرنے سے انکار کیا ہے یعنی سردار بہادر خان وزیر مواصلات اور مسٹر حمید نظامی ایڈیٹر ''نوائے وقت''۔ انہوں نے اس بچے کو اور اس کے تمام نتائج کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

حصہ ششم

صورت حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے سول حکام نے جو تدابیر اختیار کیں آیا وہ کافی تھیں یا نہیں

اس حصے میں بطور خاص ان تدابیر کے کافی یا ناکافی ہونے پر بحث کی گئی ہے۔ جو سول حکام نے شورش کا مقابلہ کرنے کے لیے اختیار کیں لیکن یہ حصہ اپنی نوعیت کی وجہ سے ان کوائف سے تعلق رکھتا ہے جو ۶ مارچ ۱۹۵۳ء کو لاہور میں مارشل لا نافذ ہونے پر نتیجہ ہوئے کسی کسی مقام پر لامحالہ ذمہ داری کے حصے کا ذکر بھی آجائے گا۔ کیونکہ سارا معاملہ ایک ہی ہے اور ہر چیز کو سختی سے الگ الگ رکھنا ممکن بھی نہیں اور مناسب بھی نہیں۔

گواہ

ہم ان اشخاص کی شہادت اور طرز عمل پر بحث کر رہے ہیں جو آج بھی ملک کی سیاسی یا سرکاری زندگی میں ممتاز درجوں پر فائز ہیں۔ بعض کے ساتھ ہمارے دوستانہ تعلقات ہوں گے۔ دوسروں کے ہم مداح ہیں اور یہ مداحی ان کی دانشمندی، ذہانت یا نیک نیتی کی وجہ سے ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کے متعلق کسی ''لیڈر'' سے بے لحاظ اعتماد کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرنا ہمارے لیے خاصی پریشانی کا موجب ہوگا۔ جہاں کہیں شہادت متضاد ہے اور معاملہ اہم نہیں وہاں ہم یہی کہنا بہتر سمجھتے ہیں کہ فیصلہ سنانا غیر ضروری ہے اور جہاں معاملہ اہم ہے وہاں ہم صرف یہی کہیں گے کہ فلاں امر ثابت ہوگیا ہے یا ثابت نہیں ہوا۔ اسکے ساتھ ہی واضح رہنا چاہیے کہ ہم نظم حکومت کی مشینری کا

بحیثیت مجموعی جائزہ لے رہے ہیں کسی خاص افسر کے طرز عمل سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ یہ طرز عمل صرف اسی حد تک متعلقہ سمجھا جائے گا جس حد تک اس کا تعلق اس مشینری کے چلنے سے ہے۔ جب کوئی خاص افسر صورت حالات کی ضرورت سے زیادہ بوجھ دانستہ خود اپنے ذمے لے لے۔ مثلاً ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور۔ صرف اسی صورت ہی یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ آیا وہ بوجھ پوری طرح اٹھایا گیا تھا۔ اور جب کسی افسر نے اپنی پالیسی پر خارجی مصالح کے اثر کو گوارا کر لیا ہو جیسے ڈائریکٹر تعلقات عامہ نے غالباً کیا۔ صرف اسی صورت میں انفرادی حیثیت سے اس کی تنقیح کی جائے گی۔

گواہوں کی اکثریت نے یہ سمجھ کر شہادت دی ہے کہ ان کی شہادت ذہین اشخاص لے رہے ہیں اور ذہانت کی توہین کرنا ایک اخلاقی جرم ہے۔ ہم ان کے شکر گزار ہیں ہم اس نیک نیتی سے خاص طور پر متاثر ہوئے ہیں جو خواجہ ناظم الدین کی خصوصیت تھی۔ ہوسکتا ہے کہ سب لوگوں کو ان کے خیالات سے اتفاق نہ ہو لیکن جب وہ بول رہے تھے تو بعض اوقات ان سے ایک ایسی روشنی کے شرارے ظاہر ہوتے تھے جو ''ردسحر میں نایاب'' تھی بعض گواہوں میں ایسی صاف بیانی نظر نہیں آئی ہم ان کے شکر گزار نہیں ہیں لیکن چونکہ ہمیں معلوم ہے کہ عادت فطرت ثانیہ ہوتی ہے۔ اس لیے ہم اس امر کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ ٹال مٹول اور ٹیڑھی ترچھی باتیں کرنا ایسے عیب ہیں جو کسی قانونی عدالت میں ایسے ہی مکروہ ہیں جیسے کسی بلوے کی صورت حالات میں فیصلے کی غلطی ناگوار ہوسکتی ہے۔ ایسے حضرات کو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ اپنے ذہنی سروسامان کو نئے سرے سے درست کر لیں۔

دراصل ہماری محنتوں کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے اس تحقیقات کا حکم دینے سے حکومت کا کچھ بھی مقصد ہو بہر حال اس نے ہمیں اس امر کا موقع دیا ہے کہ ہم اپنے افسروں سے جن پر نظم حکومت کا بوجھ ہے یہ گزارش کریں کہ اس بوجھ کو ''فولادی چوکھٹے'' کی روایات کے مطابق اٹھائیں جب ہم یہ نظارہ دیکھا کرتے تھے کہ ایک حاکم ضلع جوش میں بھرے ہوئے ایک جلوس کے درمیان تیر کی طرح سیدھا کھڑا ہے۔ اس کے مضبوط دہانے پر ایک ہلکا سا تبسم ہے اور عزم مصمم اس کے چہرے پر لکھا ہوا ہے، ہم خاص طور پر انہی حضرات کو اپنا مخاطب بنانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ارباب سیاست ایک جج کے لیے ہمیشہ مایوسی کا باعث ہوتے ہیں انہیں ہونا بھی چاہیے اور جو چیز ایک شخص

کے لیے گوشت ہے وہ دوسرے کے لیے زہر ہوسکتی ہے۔حکومت کے قوی ملازم،لوگوں کے لیے خدا کی نعمت ہیں اور اگر حکومت لوگوں کی ہے تو وہ حکومت کے لیے بھی نعمت ہیں۔آپ کو یاد ہوگا کہ کراچی میں تین چار مضبوط اور قوی سرکاری ملازم ہی تھے جنھوں نے کشتی کو غرقاب ہونے سے بچالیا تھا۔

''قانون''اور''انتظام''میں فرق

ہم ان حقائق سے آغاز کرینگے جو بالکل واضح ہیں۔قانون وانتظام کا قیام صوبائی حکومت کا ابتدائی وظیفہ ہے اور اس میں دوسرے مصالح کا کوئی لحاظ نہیں ہونا چاہیے لیکن قانون اور انتظام دو مختلف اصطلاحات میں ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کوئی تقریر کرے یا کوئی کتابچہ لکھے جو قانون کے تو خلاف ہو لیکن اس سے کسی قسم کی بدنظمی پیدا نہ ہو سکے۔لہٰذا جو حکومت ایسی تقریر کو محض اس بنا پر نظر انداز کردے گا کہ اگرچہ اس تقریر کو کیے ہوئے اور اس کتابچے کو لکھے ہوئے ایک مہینہ گزر چکا ہے اور کوئی ناگوار واقعہ رونما نہیں ہوا تو وہ حکومت اپنے آدھے فرض سے کوتاہی کی مرتکب ہوگی۔اس امر کو فراموش کردیا جاتا ہے کہ اس رویے سے قانون کے جلال کی توہین ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ مقرروں، مصنفوں اور بے شمار پڑھنے والوں کے دلوں میں حقارت نشوونما پاجاتی ہے۔جزوی طور پر اسی قسم کی ذہنی کیفیت کے باعث حکام کو ذلیل کن چیلنج دیے جاتے ہیں چونکہ یہ چیز بالآخر انتظامی صورت حالات پر اثر انداز ہوتی ہے۔اس لیے حاکم کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عوام کو قانونی حدود کے اندر رہنے کی تربیت دنیا اشد ضروری ہے۔

قانون وانتظام کے حکام

صوبائی دائرے میں چیف منسٹر میاں ممتاز محمد خان دولتانہ قانون وانتظام کے انچارج وزیر تھے جن کے مددگار چیف سیکرٹری، ہوم سیکرٹری، انسپکٹر جنرل پولیس اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل سی آئی ڈی تھے کاروبار حکومت کے قواعد کے رو سے چیف سیکرٹری''امن وسکون عامہ''کا انچارج ہوتا ہے اور پولیس کے دوسرے معاملات کے متعلق جن میں پبلک سیفٹی ایکٹ کا استعمال بھی شامل ہے۔سیکرٹریٹ کا کام ہوم سیکرٹری انجام دیتا ہے۔اور قانون وانتظام کے دائرے میں چیف سیکرٹری کا

مددگار ہوتا ہے قانون وانتظام کے متعلق تمام امور چیف سیکرٹری کی وساطت سے گزرتے ہیں جو سی آئی ڈی کی سیاسی برانچ کا اعلیٰ افسر بھی ہوتا ہے۔ انسپکٹر جنرل ہوم ڈیپارٹمنٹ میں جائنٹ سیکرٹری ہوتا ہے اور اندرونی دفاع کا کام اس کے سپرد ہے۔ ڈی آئی جی، سی آئی ڈی صوبے کی انٹیلی جنس آرگنائزیشن (تنظیم استخبارات) کے لیے ذمہ دار ہوتا ہے اور حکومت اور حکام اضلاع کو مدد دیتا ہے۔ وہ سیاسی معاملات کے متعلق تمام کاغذات بلحاظ نوعیت مضمون براہ راست چیف سیکرٹری یا ہوم سیکرٹری کو بھیجتا ہے لیکن جرائم کے متعلقہ کاغذات انسپکٹر جنرل کی وساطت سے ارسال کرتا ہے۔ اخبار و اطلاعات کی فراہمی سی آئی ڈی اور ضلع کے سیکیورٹی سٹاف کی ذمہ داری ہے۔ آخر الذکر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ماتحت ہوتا ہے اور دونوں مل کر کام کرتے ہیں۔ لاہور میں خاص کر اطلاعات زیادہ تر صوبے کی سی آئی ڈی فراہم کرتی ہے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ضلع کے انتظامی فوجداری کا حاکم اعلیٰ ہے اور قانون وانتظام کے قیام کا ذمہ دار ہے۔ ضلع میں پولیس فورس ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عمومی نگرانی اور ہدایت کے ماتحت کام کرتی ہے۔

ہوم سیکرٹری اور ڈی آئی جی (سی آئی ڈی)
ذمہ داری کا بوجھ اٹھاتے ہیں

حکومت کی نوازش سے ہمیں مجلس احرار اور متعلقہ امور کے متعلق سی آئی ڈی کی ایک سو سے زیادہ مسلیں دستیاب ہوئیں جن میں سے بہت سی مسلوں کو ہم نے اول سے آخر تک پڑھا ہے۔ ہم نے یہ دیکھا کہ جب کوئی معاملہ ڈی آئی جی (سی آئی ڈی) کے سامنے آتا ہے وہ اسے ہوم سیکرٹری کے پاس بھیج دیتا ہے۔ لیکن چند موقعوں پر انسپکٹر جنرل نے اور ان سے بھی کم موقعوں پر چیف سیکرٹری نے بھی کچھ لکھا یہ بات ہم پر واضح نہیں ہوئی کہ عملاً چیف سیکرٹری اور انسپکٹر جنرل کس حد تک اس قصے میں شامل ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ بوجھ ہوم سیکرٹری اور ڈی آئی جی ہی اٹھاتے ہیں۔

چیف منسٹر صرف پالیسی وضع کرتا ہے

جہاں تک ہم سمجھتے ہیں چیف منسٹر پالیسی وضع کرتا ہے اور سیکرٹری اسکی تفصیلات طے کرتے

ہیں لیکن مسٹر دولتانہ نے خود اعتراف کیا ہے (اور پالیسی کے عمل درآمد کا جائزہ لیتے وقت اس امر کو ذہن میں رکھنا چاہیے) کہ اگر بے عملی کا کوئی واضح کیس ان کے علم میں آئے گا تو ان کا فرض ہوگا کہ مداخلت کریں۔

مسٹر دولتانہ کا دعویٰ۔ مضبوطی کی پالیسی

تفصیلات کے ذمہ دار افسر

مسٹر دولتانہ کا دعویٰ یہ ہے کہ جہاں تک قانون و انتظام کا تعلق ہے ان کی پالیسی مضبوطی کی ہے اور انہوں نے اپنے افسروں کے مشورے کے خلاف کبھی کچھ نہیں کیا۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تفصیلات طے کرنے میں کسی کمزوری کا سراغ ملے تو اسکی ذمہ داری افسروں پر عائد ہوگی۔ انہوں نے مزید یہ کہا کہ قانون و انتظام کی صورت حالات اس لیے دشوار ہوگئی کہ افق پر ایک نیا منظر نمودار ہوگیا۔ جس نے پورے ملک پر اپنا اثر ڈالا اور جس کے متعلق آخری فیصلہ صرف مرکز ہی کرسکتا تھا۔ برطانوی راج کے ماتحت جب مسلمان کئی محاذوں پر ایک سیاسی جنگ لڑ رہے تھے تمام لوگوں کا جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے نام نہاد سا اتحاد ضروری تھا۔ جب پاکستان مسلمانوں کی ایک قومی مملکت کی حیثیت سے وجود میں آ گیا تو وطن اور ملک کے مقابلے میں مسلمان ملت کے تصور سے سرشار ہوگئے۔ قرارداد دستور کے منظور ہونے کے بعد کسی شخص کو یہ کہنے کا حق نہ رہا کہ ملک کے مستقبل کے متعلق سیاسی بحث کرتے ہوئے مذہبی مسائل غیر متعلق شے ہیں۔

پاکستان میں ملت کے تصور نے چیزوں کی صورت مختلف کردی

احرار کا ماضی بلاشبہ نہایت مکروہ تھا لیکن انہوں نے نہایت عیاری سے کام لے کر اپنے پرانے اسلحہ خانے سے ایک مذہبی قضیہ منتخب کیا اور علماء کی بڑی جماعت نے ان کے ساتھ اتفاق کر لیا۔ جسکی جزوی وجہ جہانگیر پارک کراچی میں احمدیوں کا وہ جلسہ تھا ۱۷۔۱۸ مئی ۱۹۵۲ء کو زیر صدارت چودھری ظفر اللہ خان منعقد ہوا تھا (انہوں نے یہ نہیں کہا کہ وہ احرار تھے جنہوں نے علماء سے اتحاد کر لیا تھا) تین مطالبات کے متعلق مرکز سے ایک مضبوط پالیسی کا اعلان کرانے کی بارہا کوشش کی گئی

لیکن خواجہ ناظم الدین علما کے ساتھ ''اندھا دھند تصادم'' سے بچنے کے لیے ہمیشہ مذبذب رہے آخر تک علما کے ساتھ مذاکرات کرتے رہے اور بالآخر پوری دنیائے اسلام کے علماء کی ایک کانفرنس پر بھروسہ کرتے رہے۔

خواجہ ناظم الدین مطالبات کے حامی تھے

اس امر کے قرآین موجود تھے کہ خواجہ ناظم الدین مطالبات کے حامی ہیں: مجلس اصول اساسی نے ان کی منظوری سے یہ سفارش کی کہ علما کی ایک کمیٹی مجلس وضع قوانین کی کاروائی پر ویٹو کا اختیار استعمال کرے۔ انہوں نے مجلس عمل کے ساتھ مساوی حیثیت سے براہ راست مذاکرات جاری رکھے۔ ۱۶ اگست ۱۹۵۲ء کو ایک کمیونک communique (اعلان نامہ) شائع کیا گیا جس میں وزراء اور حکام کو اس امر پر ملامت کی گئی کہ وہ اپنے مذہبی عقائد کے پروپیگنڈے کے لیے اپنی سرکاری حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ کمیونک براہ راست احمدیوں کے خلاف تھا۔ مرکزی حکومت کے ایک وزیر چودھری ظفر اللہ خاں کو پریس اور پلیٹ فارم سے نہایت بدتمیزی سے گالیاں دی جاتی رہیں لیکن کوئی کاروائی نہ کی گئی۔

مسلم لیگ کونسل ۲۲ جولائی ۱۹۵۲ء مسٹر دولتانہ کا رویہ

اگرچہ ہم لیگی عموماً اس مسئلے کو مذہبی مسئلہ سمجھتے تھے اور اپنے آپ کو اسکی جذباتی اپیل سے الگ نہ رکھ سکتے تھے لیکن مسٹر دولتانہ نے کونسل کے اجلاس مورخہ ۲۶۔۲۷ جولائی ۱۹۵۲ء میں ان کو اس منشا کی قرارداد منظور کرنے سے محترز رہنے پر آمادہ کر لیا کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دیا جائے اور کونسل کو سمجھا دیا کہ صوبائی تنظیم ایسے مسائل کا فیصلہ کرنے کی اہل نہیں جو مرکزی کونسل اور اسمبلی کے دائرہ عمل میں آتے ہیں۔ انہوں نے کونسل کے ممبروں پر یہ واضح کر دیا کہ مرکز کچھ بھی فیصلہ کرے صوبے کا فرض یہ ہے کہ قانون وانتظام کو بحال رکھے اور جان و مال کی حفاظت کرے (سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۲۸ جولائی ۱۹۵۲ء)۔

لیگ کے حامی اخباروں کا رویہ

اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے جولائی ۱۹۵۲ء میں لیگ کے حامی اخباروں پر بھی اپنے خیالات واضح کر دیے چنانچہ اس کے بعد ''احسان''، ''آفاق'' اور ''مغربی پاکستان'' نے فرقہ وارانہ پروپیگنڈا بند کر دیا۔ لیگ کا چوتھا حامی اخبار ''زمیندار'' مرکز کا منظور نظر تھا اور اس سے بے شمار فوائد حاصل کر رہا تھا۔

فرقہ وار جلسوں کے خلاف کارروائی

مسٹر دولتانہ نے اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ یہ آخری اور اہم بات یہ ہے کہ فرقہ وار جلسوں کے خلاف کافی انتظامی کارروائی کی گئی احمدیوں اور احراریوں دونوں کے جلسے جون ۱۹۵۲ء میں ممنوع قرار دیے گئے جس پر یہ مکروہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ حکومت مسجدوں میں مداخلت کر رہی ہے کیونکہ جب حکم امتناعی دیا گیا تو احراریوں نے مسجدوں میں جلسے منعقد کیے پھر بھی بعض مقدمات دائر کیے گئے اور بعض اشخاص سزایاب بھی ہوئے اور اس کا نتیجہ مفید ہوا۔ احراری ۱۹ جولائی ۱۹۵۲ میں ایک وفد لے کر آئے اور اس کے بعد ایک بیان شائع کیا کہ ان کا ارادہ ہرگز تشدد اختیار کرنے کا نہیں اور وہ حکومت کو قانون و انتظام کے قیام میں مدد دیں گے اس یقین دہانی پر مسٹر دولتانہ نے حکم امتناعی واپس لے لیا مقدمے بھی واپس لے لیے اور سزایافتوں کو رہا کر دیا۔

یکطرفہ کارروائی ممکن نہ تھی

مسٹر دولتانہ کا دعویٰ ہے کہ ان کے لیے قانون و انتظام کی حفاظت کی غرض سے احرار کے خلاف یکطرفہ کارروائی کرنا ممکن نہ تھا۔ اول اس لیے کہ ممکن ہے اس سے مرکز یا صوبوں کے ساتھ پالیسی کا تصادم ہو جاتا۔ دوم اس لیے کہ جب ۱۸ اگست ۱۹۵۲ء کو وزرائے کابینہ، چیف منسٹروں اور گونروں کے اجلاس کراچی میں یہ فیصلہ ہو گیا کہ علما سے براہ راست تصادم سے پرہیز کیا جائے اور ذاتی اثر کا دباؤ ڈالا جائے تو اقدامات کا راستہ کھلا نہ رہا۔ آخری بات یہ ہے کہ ۱۹۵۳ء کے آغاز میں صورت حالات خاص طور پر بری نہ تھی۔ جون اور جولائی ۱۹۵۲ء کی شورشوں پر قابو پایا گیا تھا۔ احرار

نے عہد و پیمان کر لیا تھا اور مرکز علما سے مذاکرات کر رہا تھا۔

ختم نبوت۔احمدیوں کے جنونی رجحانات

خود شورش کے متعلق مسٹر دولتانہ کا خیال یہ تھا کہ ختم نبوت کا عقیدہ اسلام کا ایک مقدس اصول ہے اور احمدی غیر مسلم ہیں۔اس شورش کو خود احمدیوں کے مخصوص علیحدگی پسندانہ، نا قابل مفاہمت اور جنونی رجحانات سے تقویت پہنچی۔احرار نے اپنے کھوئے ہوئے اعتماد اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے احمدیوں کے اس رویے سے فائدہ اٹھایا۔بہر حال یہ تحریک ایک ایسے وقت پر بالکل بے موقع تھی جب ملک اندرونی اور بیرونی خطرات سے دو چار تھا بین الاقوامی حالات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ نہایت قابل بحث قضیہ تھا اور اس کے خلاف نہایت دقیع سیاسی اور عملی دلائل دیے جاسکتے تھے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر تحریک جو فرقہ وار تلخی کو اکسانے والی ہو سنگین نتائج کی حامل ہوا کرتی ہے۔

لیکن مختصراً ہم سب کو روکے بغیر اس کے اثر پر قابو نہ پا سکتے تھے۔

خواجہ ناظم الدین کا دفاعی جواب:

صوبے نے شورش کا رخ مرکز کی طرف پھیر دیا

خواجہ ناظم الدین نے یہ تسلیم کیا کہ مسٹر دولتانہ نے مرکز سے کوئی فیصلہ کرنے کے لیے اصرار کیا تھا لیکن اس سے ان کی غرض یہ تھی کہ ذمہ داری مرکز کی طرف منتقل ہو جائے۔خواجہ صاحب نے مارچ ۱۹۵۳ء میں دستور ساز اسمبلی کو بھی یہ بتا دیا تھا کہ یہ شورش سیاسیات اقتدار کی بھڑکائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔انہوں اس امر سے انکار کیا کہ کراچی کی اگست کانفرنس میں کوئی ایسا فیصلہ ہوا تھا کہ علماء سے براہ راست تصادم پیدا کرنے سے گریز کیا جائے۔اس گفتگو کا عام رجحان یہ تھا کہ صورت حالات کا مقابلہ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان اصولوں کو اختیار کیا جائے جو ۱۴ اگست کے کمیونک (اعلان نامہ) میں قائم کیے گئے تھے اگر ان اصولوں پر مناسب طریق سے عمل درآمد کیا جائے تو اس سے اصل شورش کی بنیاد ختم ہو جائے گی۔اور وہ بنیاد اس شکایت پر ہے کہ مذہبی پراپیگنڈا

سرکاری سرپرستی میں کیا جارہا ہے۔ خواجہ صاحب اس خیال پر قائم تھے کہ اس کمیونک (اعلان نامہ) میں مطالبات کے متعلق مرکز کے رویے کی وضاحت ہوگئی تھی۔ باقی رہا علما کا معاملہ تو چونکہ خواجہ صاحب نے ہمیشہ ان مطالبات کو ناقابل عمل قرار دیا تھا، اس لیے علما نے یہی اثر قبول کیا ہوگا کہ وہ ناقابل تسلیم ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے قطعی اور آخری طور پر انہیں مسترد نہیں کیا۔ لیکن علما کو یہ مشورہ دیا کہ ان پر زور نہ دیں اور ان کو یہ بھی بتایا کہ انسانی دانشمندی ضرور کوئی ایسا حل تلاش کرسکتی ہے جس میں مطالبات کے منظور یا مسترد کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔ انہوں نے علماء سے یہ بھی کہہ دیا کہ آبادی کے کسی حصے کو اقلیت قرار دینا حکومت کے فرائض میں داخل نہیں ہے اور یہ وظیفہ دستور ساز اسمبلی کا ہے خواجہ صاحب نے بیان کیا کہ وہ خود بھی احمدیوں کو اقلیت قرار دلانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ لیکن وہ یہ بات علما سے کہنے پر آمادہ نہ تھے تاہم انہوں نے علما کو بتا دیا کہ ان مطالبات پر زور دینا مفاد ملکی کے منافی ہے اور ان کو تسلیم کرنا بے حد مشکل ہے بلکہ دستوری دستاویز میں بھی لفظ ''مسلم'' کی ایسی تعریف کرنا آسان نہ ہوگا جو احمدیوں کو تو اس تعریف سے خارج کردے اور کسی دوسرے طبقے کو خارج نہ کرے۔

فتاویٰ کفر اور اس کا اثر

خواجہ صاحب کا اپنا عقیدہ یہ تھا کہ اگر نوے فیصد علما اس پر اتفاق کرلیں کہ مرزا غلام احمد کو ماننے والا کافر ہے اور اس کو سنگسار کرکے ہلاک کردینا چاہیے تو وہ اس فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کردیں گے۔ لیکن کفر کا فتوے کسی جماعت کو لازماً ایک غیر مسلم اقلیت نہیں بنا دیتا۔ لہٰذا مطالبات کی بنیاد ایک اسلامی مملکت کے مطالبہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ خلفائے اربعہ کے بعد سے تاریخ اسلام میں کفر کے فتوؤں کا رواج عام رہا ہے لیکن ان کا نتیجہ کبھی نہیں ہوا کہ ان افراد یا جماعت کو جن کے خلاف فتویٰ دیا گیا ہو شہری حقوق سے محروم کردیا جائے۔ یہ بیان ایک ایسی مملکت میں واقعی بے حد غنیمت اور تسلی بخش ہے جس میں فتویٰ غالباً توپ اور مکھن کی مانند ضروری بننے والے ہیں۔ یہ آخری فقرہ ہمارا ہے۔

وہ علما کو آزادی اظہار کا حق دینا چاہتے تھے

خواجہ ناظم الدین نے اقرار کیا کہ انہوں نے مسٹر دولتانہ کو یہ مشورہ نہیں دیا کہ وہ علما کو علی الا علان اپنے عقائد مذہبی کے اظہار سے منع کریں کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اظہار خیالات کی آزادی میں مداخلت کی جارہی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اظہار خیالات کی آزادی کا مطلب ''مادر پدر آزادی'' نہیں۔ اور جب مقررین حد سے تجاوز کرنے لگے اگر اس حالت میں حکومت پنجاب تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۱۵۳۔ الف اور فعہ ۲۹۵۔ الف کا ہوشمندانہ استعمال کرتی تو صورت حالات اس حد تک بگڑنے نہ پاتی۔ پھر تو کیفیت یہ ہوگئی کہ اگر علما بھی ڈائریکٹ ایکشن کے فیصلے سے منحرف ہونا چاہتے تو رائے عامہ کے خوف سے ایسی جرات نہ کرسکتے۔

اگست ۱۹۵۲ء کی کانفرنس

چونکہ خواجہ ناظم الدین تسلیم کرتے ہیں کہ وہ علما کے ساتھ تصادم سے احتراز کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے اس سوال کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی کہ آیا اگست ۱۹۵۲ء کی کانفرنس میں تصادم سے بچنے کا کوئی فیصلہ کیا گیا تھا یا نہیں تاہم مسٹر دولتانہ کے اپنے دو گواہوں یعنی سردار عبدالرب نشتر اور خان سردار بہادر خاں نے بھی مسٹر دولتانہ کی تائید میں کچھ نہیں کہا۔ یہی وہ گواہ تھے جو اگست کی کانفرنس کے متعلق استفسارات کے لیے طلب کیے گئے تھے۔ اول الذکر نے کہا کہ جب صوبجاتی نمائندوں سے ان کے خیالات دریافت کیے گئے تو خاں عبدالقیوم خاں نے قوت کے استعمال کے متعلق تامل کا اظہار کیا کیونکہ اس کا اثر ان کے صوبے پر پڑنے کا اندیشہ تھا لیکن مسٹر دولتانہ کی رائے یہ تھی کہ اگر مرکز قطعی فیصلہ کردے کہ اس تحریک کو ختم کر دیا جائے تو ایسی حالت میں حکومت پنجاب کسی قدر کوشش کے بعد صورت حالات کا مقابلہ کامیابی سے کرسکے گی۔ سردار عبدالرب نشتر یہ نہیں بتا سکے کہ آیا وزیر اعظم نے کسی خیال کا اظہار کیا تھا یا کوئی رسمی فیصلہ کیا گیا تھا لیکن ان کے قول کے مطابق اتفاق آراء اسی پر تھا کہ تحریک کو بزور نہ دبایا جائے۔ خواجہ ناظم الدین کا عام رویہ بھی یہی تھا وہ مطالبات کے حامی معلوم نہ ہوتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ رائے عامہ کو دبانے کے لیے قوت بھی استعمال نہ کرنا

چاہتے تھے۔

خان سردار بہادر خاں

خان سردار بہادر خان نے کہا کہ مسٹر دولتانہ نے مرکزی حکومت سے کسی صاف اور واضح فیصلے کے لیے اصرار کیا تا کہ پنجاب میں نظم حکومت کی مشینری قوی تر ہو جائے اگر ایسا فیصلہ صادر ہو گیا تو حکومت اپنی سیاسی مشینری (یعنی مسلم لیگ اور اخبارات) کو عوام کی صحیح تعلیم کے لیے آمادہ کر لے گی۔

مسٹر دولتانہ کے ایک اور گواہ چندریگر تھے لیکن ان سے اس کانفرنس کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا گیا۔

خواجہ ناظم الدین کے بیان کی نفی نہیں ہوتی

اس شہادت سے خواجہ ناظم الدین کے اس دعوے کی نفی نہیں ہوتی کہ کانفرنس کے نزدیک ۱۴ اگست کا اعلان نامہ اس مسئلے کا بہترین حل تھا۔ سردار عبدالرب جنھوں نے وزیراعظم کے زیر ہدایت اس اعلان نامے کا مسودہ تیار کیا تھا بیان کرتے ہیں کہ گو یہ مسودہ اس کانفرنس میں تیار نہیں ہوا لیکن ممکن ہے یہ اس کانفرنس کی گفت وشنید ہی کا نتیجہ ہو۔ خواجہ ناظم الدین نے اس امر سے بلا تامل انکار کیا ہے کہ اس کانفرنس میں علما کے ساتھ تصادم سے احتراز کا فیصلہ کیا گیا تھا خواجہ صاحب کے اس انکار کے کچھ معنی ضرور ہوں گے۔ اگر کانفرنس نے اس قسم کا کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا تو پھر مسٹر دولتانہ کے اس قول میں کوئی جان نہیں رہتی کہ ۱۸ اگست ۱۹۵۲ء کے بعد ان کے لیے کسی کارروائی کا دروازہ کھلا نہ رہا تھا اور اگر ۱۴ اگست کے اعلان نامہ اس کانفرنس کی گفت وشنید کا نتیجہ تھا تو اعلان نامے کو نئی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔

۱۴ اگست کے اعلان نامے سے

خواجہ ناظم الدین کا رویہ واضح ہو جانا چاہیے تھا

یہ تحریک کو ''راستے پر لگانے'' کی ایک کوشش تھی (یہ محاورہ آگے چل کر عام فہم ہو جائے

گا) اور اس سے خواجہ ناظم الدین کے ذہن میں جھانکنے کا موقعہ ملتا ہے۔ مولانا اختر علی خاں ایڈیٹر ''زمیندار'' نے جن کی سرکردگی میں ایک وفد کراچی گیا تھا، ۲ اگست کو یا اس کے قریب ایک فتح مندانہ اعلان کیا کہ مرکزی حکومت ۱۴ اگست کو بعض مطالبات تسلیم کر لے گی لیکن انکو اس اعلان نامے میں پریشان کن جواب ملا۔ خواجہ ناظم الدین کا بیان ہے کہ انھوں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا اور صرف یہی کہا تھا کہ وہ یوم پاکستان کی تقریر میں اس موضوع کے متعلق کچھ کہیں گے۔ یہاں پھر مسٹر دولتانہ نے ایک بیان دیا ہے جو ان کے وکیل نے دوسرے گواہوں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش نہیں کی: مرکزی وزارئے خواجہ ناظم الدین سے کہا کہ انہیں مولانا اختر علی خاں سے کوئی وعدہ نہ کرنا چاہیے تھا اور اگر وہ کر چکے ہیں تو اس کو پورا کرنے کا عزم کر لیں۔'' اس پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ پالیسی کا کوئی واضح اعلان نہ ممکن ہے نہ قریب مصلحت ہے اور اس قضیے سے دامن چھڑانے کے لیے عوام کو کسی قسم کا دلاسہ دے دیا جائے۔ چنانچہ اس کے بعد یہ اعلان نامہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔'' مسٹر دولتانہ نے اس امر کی صراحت نہیں کی کہ وزرا کیونکر اپنے اس بلند بانگ اصرار سے کہ خواجہ ناظم الدین اپنا وعدہ پورا کریں نیچے اتر کر اس پر رضامند ہو گئے کہ محض ٹالنے کی خاطر ایک اعلان نامہ شائع کر دیا جائے جس میں مطالبات کا کوئی ذکر تک نہ ہو۔ لہٰذا ہم اس اعلان نامے کو اسکی ظاہری حیثیت میں قبول کر کے یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ اگر ''زمیندار'' کی پیدا کی ہوئی توقعات کے باوجود خواجہ ناظم الدین نے مطالبات پر نہیں بلکہ اس چیز پر اپنی توجہ مبذول کی جس کو وہ بنیادی سبب سمجھتے تھے تو ظاہر ہے کہ ان کے دل میں مطالبات کے متعلق کو لمبا چوڑا جذبہ نہ تھا اور اگر علما کو ان سے کوئی امیدیں تھیں تو وہ امیدیں خدا ہی سے ہونی چاہیے تھیں۔

اعلان نامے کا اثر بے حیثیت رہا

ہم کو معلوم نہیں کہ مسٹر دولتانہ کے وکیل نے مسٹر انور علی کے اس بیان سے کیا فائدہ حاصل کیا ہے کہ جب ''زمیندار'' کے اعلان کی کوئی تردید نہ کی گئی تو عوام کے دلوں میں امیدیں پیدا ہو گئیں۔ اگر اعلان نامے سے کوئی وسیع بلوہ رونما ہو گیا ہوتا تو بارہ دن کی مختصر مدت کے لیے امیدیں پیدا ہو جانا بطور دلیل قابل توجہ ہو سکتا تھا۔ مسٹر انور علی کا دوسرا بیان بھی جو کم و بیش متضاد سا ہے ہماری سمجھ میں نہیں

آیا کہ اعلان نامے ہی سے احرار اور ان کے دوستوں نے یہ اثر قبول کیا کہ ان کا نقطہ نگاہ جزوی طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے اور مزید منظوری کا اعلان عنقریب کیا جائے گا اگر اس اعلان نامے سے احرار خوش ہوئے تو ایک طرف خواجہ ناظم الدین نے تحریک کو ''راستے پر لگانے'' کی جو کوشش کی تھی وہ کامیاب ہوگئی اور دوسری طرف ''زمیندار'' نے جن امیدوں کو بیدار کیا تھا وہ بھی خاک میں ملنے سے بچ گئیں۔ بہرحال خواجہ ناظم الدین کا یہ مقصد تو نہ تھا کہ احراریوں کو کسی حالت میں بھی حکومت کے کسی فعل پر زیادہ سے زیادہ مسرت نہ ہو جس حد تک احراریوں کی شکایات صحیح معلوم ہوتی تھیں خواجہ ناظم الدین کے لیے راستہ کھلا ہوا تھا بلکہ درحقیقت یہ ضروری تھا کہ وہ انسدادی تدابیر اختیار کریں۔

مسٹر دولتانہ نے فیصلے پر اصرار کیا

خواجہ ناظم الدین اس سے انکار نہیں کرتے کہ مسٹر دولتانہ وقتاً فوقتاً کسی فیصلے کے صدور پر اصرار کرتے رہے دوسرا موقع ۲۶ اگست ۱۹۵۲ء کو مری میں پیدا ہوا اور ان کے بیان کے مطابق تیسرا موقع وہ تھا جب اکتوبر میں مسلم لیگ کا اجلاس ڈھاکہ میں ہو چکا تھا اور آخر ۱۶۔۱۷ فروری ۱۹۵۳ء کو اس معاملے کو دوبارہ زندہ کیا گیا۔ جب خواجہ ناظم الدین لاہور گئے تھے یہی موقع تھا جس پر خواجہ ناظم الدین نے انکو بتایا کہ وہ علما کے ساتھ براہ راست متصادم کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔

مسٹر چندریگر کی شہادت

مسٹر چندریگر جو مری اور لاہور کے مذاکرات کے شاہد ہیں، مری کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اور مسٹر دولتانہ نے وزیر اعظم سے اصرار کیا کہ مرکز کے رویے کا تعین اور اعلان ضروری ہے کیونکہ مسلم لیگ اور دوسرے سنجیدہ طبقے اس وقت تک جوابی پروپیگنڈا جاری نہیں کر سکتے جب تک انہیں مرکزی حکومت کے رویے کا علم نہ ہو جائے اور صورت حالات کے زیادہ بگڑ جانے کا احتمال ہے۔ خواجہ صاحب نے جواب دیا کہ وہ سردار عبدالرب نشتر کی حج سے واپسی پر اس معاملے کے متعلق علماء سے گفتگو کریں گے اور پھر کوئی پالیسی وضع کی جائے گی وہ ایک ایسا فارمولا تیار کرنے کی فکر میں تھے جو سب کے لیے قابل قبول ہو اور پھر کوئی پالیسی وضع کی جائے گی وہ ایک ایسا فارمولا تیار کرنے

کی فکر میں تھے جو سب کے لیے قابل قبول ہو اور پھر اس فارمولا کی تائید پاکستان مسلم لیگ کونسل سے کرانا چاہتے تھے ہمارے ایک سوال کے جواب میں مسٹر چندریگر نے تسلیم کیا کہ وزیراعظم نے کہا تھا ''ان مطالبات کا ذکر کیے'' بغیر''اور اگر قانون و انتظام کا سوال پیدا ہوا تو اس کا تدارک صوبائی حکومت کا کام ہوگا۔لیکن انہوں نے یہ تسلیم نہ کیا کہ مرکزی حکومت کی پالیسی (موافق ہو یا مخالف یا مرکزی حکومت کے تذبذب کا کوئی اثر قانون وانتظام پر بھی پڑے گا''۔

مسٹر چندریگر کا بیان ہے کہ اس کے بعد ۱۶ فروری کو مزید بات چیت ہوئی اور وزیراعظم نے بتایا کہ وہ مختلف مسالک کے علما سے گفتگو کرنے کے بعد پرامید ہیں اور وہ ان کے اختلاف رائے پر بھروسہ کر کے یہ توقع رکھتے ہیں کہ ان میں سے بعض ڈائریکٹ ایکشن کی حمایت سے باز رہیں گے اور ممکن ہے کہ ڈائریکٹ ایکشن ہو ہی نہ سکے اگر اس امر میں ناکامی ہوئی تو وہ ساری دنیائے اسلام کے علما کی ایک کانفرنس طلب کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

حکومت پنجاب کے وکیل مسٹر فضل الٰہی نے گواہ کو یاد دلایا کہ ۲۶۔ اگست کو مری میں وزیر اعظم کی رائے یہ تھی کہ اگرچہ مطالبات قابل تسلیم نہیں ہیں لیکن اگر ایسا اعلان کر دیا گیا تو شورش پسندوں کو موقع ملے گا کہ عوام کو مشتعل کریں گواہ نے جواب دیا کہ''۲۶ اگست کو وزیراعظم نے ایسی کوئی رائے ظاہر نہیں کی تھی میری موجودگی میں انہوں نے یہ خیال پہلی دفعہ پہلی ۱۶ فروری ۱۹۵۳ء کو لاہور میں ظاہر کیا تھا۔''

مسٹر چندریگر کی شہادت میں دو اہم نکتے

جو سوال ہم نے قانون و انتظام کی نسبت خواجہ ناظم الدین کے رویے کے متعلق کیا اور جو سوال مسٹر فضل الٰہی نے مطالبات کے متعلق ان کے رویے کی نسبت کیا ان سوالوں سے خواجہ ناظم الدین کے جواب کے دو نہایت اہم پہلو واضح ہوئے لیکن اگر ان کو مسٹر چندریگر کے اس بیان کے ضمیمے کے طور پر نہ پڑھا جائے جو انہوں نے مسٹر دولتانہ کے وکیل کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے ۲۶ اگست اور ۱۶ فروری کے اجلاسوں کے متعلق دیا تھا تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ ناظم الدین علما کے

سوا اور کسی چیز پر غور کر ہی نہیں رہے تھے اگر یہ سوال نہ کیے جاتے تو اس امر کا احتمال تھا کہ ہم ان کے طرز عمل کے متعلق نامکمل سی رائے قائم کرتے اور اس میں شک نہیں کہ خواجہ صاحب کے ذہن پر بڑی حد تک علما ہی چھائے ہوئے تھے لیکن ان جوابات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں قانون و انتظام کی صورت حالت تک پہنچا دی تھی۔ اگر یہ درست ہے تو صوبائی حکومت کیا جاننا چاہتی تھی اور ۲۱ فروری ۱۹۵۳ء کو چیف سیکرٹری کے دستخطوں سے جو چٹھی وزارت داخلہ کو لکھی گئی تھی اور درخواست کی گئی تھی کہ ''ان مطالبات کے متعلق مضبوط پالیسی کا اعلان کرے'' تا کہ اس اعلان سے ہمارے ہاتھ مضبوط ہو جائیں'' اس کا کیا مطلب تھا۔

علما سے رعایات دوسرے مقاصد کے لیے

مسٹر دولتانہ نے اپنے بیان کے ایک مرحلے پر شکایت کی تھی کہ خواجہ ناظم الدین علماء کو رعایات دینے کی پالیسی پر اس لیے کاربند ہو رہے تھے کہ انہیں دوسرے محاذوں پر استعمال کر سکیں۔ میرے نزدیک ان کی پالیسی یہ تھی کہ اپنی پوری توجہ مذہبی قضیوں پر مرتکز کر دیں اور اسطرح ہر دلعزیزی حاصل کر کے مساوات نمائندگی اور زبان جیسے مسائل دستوری میں کامیاب ہو جائیں۔ عدالت کے ایک سوال پر بطور تصریح انہوں نے یہ کہا............... ''کہ میرے پاس ان کے مذہبی خلوص پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ وہ مذہبی احساسات کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کر رہے تھے اور خوش قسمتی کی بات یہ تھی کہ ان کے مذہبی عقائد اور ان کی سیاسیات دونوں کا رخ ایک ہی طرف تھا'' اگر حقیقت یہی ہے تو یہ کہنا قرین انصاف نہ ہوگا کہ وہ بعض دوسرے مقاصد کی خاطر علما کے آگے جھک رہے تھے لیکن مسٹر دولتانہ کے وکیل کا موقف اس وقت زیادہ استوار تھا جب اس نے خواجہ ناظم الدین سے یہ سوال کیا کہ ایک اسلامی مملکت کے تصور کے متعلق ان کے مذہبی عقائد کیا ہیں بظاہر اس سوال کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ ان کی سیاسیات پر ان عقائد کا کس قدر گہرا اثر ہے۔ خواجہ ناظم الدین کا قول یہ تھا کہ خود قائداعظم کا نصب العین بھی اسلامی دستور تھا۔

اسلامی مملکت کے متعلق خواجہ صاحب کا تصور

اور حقیقت میں پاکستان اسی یقین کی بنا پر حاصل کیا گیا تھا خواجہ صاحب نے اس خیال کو تسلیم نہیں کیا کہ قائداعظم پاکستان میں مسلموں اور غیر مسلموں کو واحد قوم بنانا چاہتے تھے جس میں سب کے شہری حقوق مساوی ہوں کیونکہ اگر ان کا نقطۂ نگاہ یہی ہوتا تو وہ مسلم لیگ کی ازسرنو تنظیم کا مشورہ نہ دیتے جب خواجہ صاحب کو یاد دلایا گیا کہ قائداعظم نے ۱۱/اگست ۱۹۴۷ء کو دستور ساز اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے یہ امید ظاہر کی تھی کہ ''کچھ وقت گزر جانے پر ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے مذہبی مفہوم کے اعتبار سے نہیں کیونکہ یہ ہر فرد کے ذاتی یقین و ایمان کا معاملہ ہے بلکہ وہ سب سیاسی مفہوم میں مملکت کے شہری ہوں گے''۔ تو خواجہ صاحب نے صاف کہا کہ مذہب یا اسلامی مملکت کے متعلق ان کا یہ نقطہ نگاہ نہیں ہے انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ خان لیاقت علی خاں کی زندگی میں آئندہ دستور کے متعلق مجلس اصول اساسی کی جو عبوری رپورٹ پیش کی گئی تھی اس میں جو نظام مدنظر تھا وہ مذہبی مملکت کا نہ تھا۔ آپ نے مزید یہ بیان کیا کہ موجودہ رپورٹ علما کے ساتھ طویل مذاکرات کے بعد تیار کی گئی تھی جن میں تین دوسرے وزرا بھی شامل تھے اور ان میں سے ایک سردار عبدالرب نشتر تھے مختصر یہ کہ جس فضا میں موجودہ رپورٹ نے جنم لیا وہ خشک مذہبیت کی فضا تھی بھلا جو حکومت مذہب میں ازسرتاپا مستغرق ہو اس کے لیے یہ کیونکر ممکن تھا کہ مطالبات کو رد کر دیتی۔

علما پر خواجہ صاحب کے رویے کا کیا اثر مترتب ہوا

اس دلیل میں یقیناً قوت ہے اور دوسرے کوائف کی عدم موجودگی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ خواجہ ناظم الدین کے رویے سے علما پر یہ اثر پڑا کہ شاید وہ کچھ مدت کے بعد ان مطالبات کو منظور کر لیں گے لیکن بعض علما نے جو بحیثیت وفد خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے ہمارے سامنے ایسے بیانات دیے ہیں جن سے ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ خواجہ صاحب کا رویہ ہر ذہین آدمی پر روشن ہو جانا چاہیے تھا۔ مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش نے ۱۳ اور ۱۶ اگست ۱۹۵۲ء کو دو دفعہ تین چار دوسرے اشخاص کی معیت میں خواجہ صاحب سے ملاقات کی۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ آپ لوگوں

کا یہ مطالبہ کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دیا جائے دستور ساز اسمبلی کے دائرہ اختیار میں ہے ہم نے اس سے سوال کیا کہ آیا وہ اسمبلی کے لیڈر کی حیثیت سے اسمبلی میں یہ سوال اٹھائیں گے یا نہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں اس معاملے پر غور کروں گا''۔ چودھری محمد ظفر اللہ خاں کے متعلق ''انہوں نے قطعی طور پر یہ رائے ظاہر کردی کہ وہ اس معاملے میں کوئی کاروائی نہیں کرینگے''

احمدیوں کا کلیدی اسامیوں سے برطرف کرنے کے متعلق انہوں نے کہا کہ وفد کو یہ کیس ہمارے سامنے پیش کرنا پڑے گا (اسکا مطلب کچھ بھی ہو) پھر ہم اس پر ہمدردانہ غور کرینگے اس کے ساتھ ہی انہوں نے ارکان وفد سے پوچھا کہ کیا آپ لوگوں نے ۱۴راگست کا پریس کمیونکے (اعلان نامہ) دیکھا ہے؟ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ تھا کہ وہی کافی ہے۔

مولانا ابوالحسنات

اگر مولانا ابوالحسنات کے بیان پر اعتبار کیا جائے تو حقیقت میں خواجہ صاحب نے بالکل یہی کہا تھا ''ہم نے پھر ان سے سوال کیا کہ آیا حکومت نے مطالبات ثلاثہ کے متعلق کوئی فیصلہ کیا ہے انہوں نے ہم سے دریافت کیا کہ کیا آپ لوگوں نے مرکزی حکومت کا وہ اعلان نامہ پڑھا ہے کہ حکومت کے وزرا اور سرکاری افسروں کو فرقہ وار اور مذہبی تبلیغ سے باز رہنا چاہیے؟ ہم نے کہا کہ ہم وہ اعلان نامہ اور اس کے متعلق چودھری ظفر اللہ خاں کے خیالات بھی پڑھ چکے ہیں اس کے بعد خواجہ ناظم الدین نے کہا کہ حکومت کے اس اقدام سے (یعنی اعلان نامے کی اشاعت سے) آپ لوگوں کو مطمئن ہو جانا چاہیے۔ ہم نے کہا کہ اعلان نامے کا ان مطالبات سے کوئی تعلق نہیں جو ہم نے آپکی خدمت میں پیش کیے ہیں۔

پھر مولانا ابوالحسنات

چار یا پانچ ماہ بعد مولانا ابوالحسنات نے پھر خواجہ صاحب سے ملاقات کی اس دفعہ مولانا اختر علی خاں اور بعض دوسرے اشخاص ان کے ساتھ تھے یہ واقعہ غالباً دسمبر ۱۹۵۲ء کا ہے کیونکہ اس کے بعد جنوری میں پھر ملاقات ہوئی تھی۔ خواجہ ناظم الدین نے وفد کو بتایا کہ میں نے اس مسئلے پر بہت غور کیا

ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میرے لیے ان مطالبات کو تسلیم کرنا مشکل ہے۔ جنوری میں انہوں نے ارکان وفد سے کہا کہ اگر میں نے چودھری محمد ظفر اللہ خاں کو کابینہ سے برطرف کر دیا تو پاکستان کو امریکہ سے گندم کا ایک دانہ بھی نہ ملے گا۔ جب ارکان وفد نے یہ سنا تو دوسرے دو مطالبات کے متعلق کوئی ذکر نہ کیا۔

مولانا بدایونی

مولانا عبدالحامد بدایونی مرکزی مجلس عمل کے پانچ دوسرے ممبروں کی معیت میں ۱۸ جنوری ۱۹۵۳ء کو یا اس کے بعد خواجہ صاحب سے ملے۔ ان کی شہادت اتنی واضح تو ہے کہ اس سے کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکے لیکن کچھ زیادہ یقین انگیز نہیں۔ مولانا کا بیان یہ ہے وزیر اعظم نے کہا کہ چودھری محمد ظفر اللہ خاں کو چونکہ ہندوستان و پاکستان کے تنازع انہار اور غذا کی صورت حالات میں بڑی اہمیت حاصل ہے اس لیے میں انہیں برطرف کرنے سے قاصر ہوں لیکن جہاں تک اصل مسئلے کا تعلق ہے میں اس پر غور کرنے کے لیے تیار ہوں۔ جب مولانا سے یہ سوال کیا گیا کہ جس حالت میں اصل مسئلے کے متعلق وزیر اعظم مائل بہ کرم تھے تو پھر مجلس عمل نے ڈائریکٹ ایکشن کیوں شروع کر دیا۔ تو مولانا نے جواب دیا کہ باقی دو مطالبات کے متعلق خواجہ صاحب کا جواب تسلی بخش نہ تھا اس سے پہلے کوئی چھ سات مواقع پر وزیر اعظم مطالبات کو منظور کرنے کا وعدہ کر چکے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ذرا انتظار کیجیے۔ لیکن مولانا کے خیال میں کسی دوسری دشواری سے الگ ہو کر وہ ان مطالبات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھے۔

واضح طور پر نہیں کہا

خود خواجہ ناظم الدین بھی یہ نہیں کہتے کہ انہوں نے کسی موقع پر بالوضاحت علما سے کہہ دیا تھا کہ وہ احمدیوں کو اقلیت قرار دینے پر آمادہ نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ علماء کے ساتھ تصادم سے بچنا چاہتے تھے ان سے کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ "براہ راست تصادم" کے معنی کیا ہیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس کا مفہوم یہ تھا: اگر آپ کسی شخص سے یہ کہہ دیں کہ میں تمہارا مطالبہ منظور نہیں کروں گا تم جہنم

میں جاؤ تو وہ اپنے مقصد کے لیے بے انتہا جوش وخروش کا پیکر بن جائے گا۔لیکن اگر آپ اس کے نقطہ ءنگاہ سے ہمدردی کا اظہار کریں لیکن اسکے ساتھ ہی تاسف کے ساتھ یہ کہہ دیں کہ میں نہایت شدید مشکلات کی وجہ سے آپ کا مطالبہ منظور کرنے سے قاصر ہوں تو اس سے اتنا جوش پیدا نہیں ہوگا۔ایسے حالات میں آپ ہر وقت معاملے پر مزید غور وفکر کے لیے آمادہ رہتے ہیں لیکن اگر کسی سچے پبلک آدمی کی اس قسم کی باتوں اور اسکے حسن نیت اور خیر سگالی کے جذبے سے کوئی شخص بہشت کا تصور باندھنے لگے تو وہ بہشت کسی عقل مند کا بہشت نہ ہوگا (یعنی جنت الحمقا ہوگا)

اپنے آپ کو حالات کی لہر پر چھوڑ دینے کی پالیسی

مسٹر دولتانہ نے اپنے بیان کے ایک اور مرحلے پر یہ بھی کہا کہ مرکز کی پالیسی اپنے آپ کو حالات کی لہر پر چھوڑ دینے کی پالیسی تھی اس سے کسی منشا یا ارادے کا اظہار نہیں ہوتا۔ بلکہ قوت فیصلہ کے فقدان ہی پتہ چلتا ہے لیکن اگر مرکز اپنے دائرے میں بے بسی سے بہا جا رہا تھا تو کیا صوبائی قیادت کو اس سے یہ تحریک نہ ہوتی تھی کہ وہ اپنے آپ کو اس بہاؤ سے بچانے کے لیے اپنے فرض کو بہتر طریق پر محسوس کرتی ؟ ہم مستثنےٰ قسم کی اس قیادت کا تصور نہیں کرتے ہیں جو کسی ضرورت کے وقت سطح پر ابھر آیا کرتی ہے بلکہ ہم اس عام قسم کے آدمی کا تصور کر رہے ہیں جو اوسط سے کسی قدر بلند ہوتا ہے اور عام دانشمندی اور محنت سے کام لے کر کسی خرلنگ کو بھی منزل مقصود پہنچا سکتا ہے۔مسٹر دولتانہ نے جواب دیا کہ وہ اپنی حکومت کو اس بہاؤ سے بچانے کا کوئی بہتر طریقہ دریافت نہ کر سکتے تھے کیونکہ اگست ۱۹۵۲ء کی کراچی کانفرنس میں اور اسکے بعد بھی اس امر کا واضح اشارہ کر دیا گیا تھا کہ مطالبات اور تقریریں اس وقت تک ممنوع نہیں قرار دی جا سکتیں جب تک وہ حدود قانون کے اندر ہیں۔انہیں آخری لمحے تک یقین نہیں آیا کہ وزیر اعظم مطالبات کو تسلیم نہ کرینگے۔علما کے ساتھ مذاکرات کا مقصد یہ معلوم ہوتا تھا کہ لیڈروں کو کسی نہ کسی طرح اس امر پر آمادہ کر لیا جائے کہ وہ مطالبات پر فوری مقصد کی حیثیت سے اصرار نہ کریں۔اگر مسٹر دولتانہ نے وزیر اعظم کے طرز عمل سے یہ اثر قبول کیا تو افسوسناک ہے لیکن متعلقہ فریق یعنی علما کا تاثر بالکل ہی مختلف تھا اور ان کا محض تاثر ہی نہ تھا بلکہ انہوں

نے سب باتیں خود شخص متعلق کے منہ سے سنی تھیں۔ لہٰذا علما کے ساتھ مذاکرات کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ انکو جھکنے کی ترغیب دی جائے اور انہیں دوٹوک جواب دے کر ناراض نہ کیا جائے مزید برآں اگر چہ یہ صحیح ہے کہ وزیراعظم نے آزادی اظہار (خصوصاً مذہبی فکر کے معاملے میں) کی حمایت کی لیکن ان کا دعویٰ یہ ہے کہ تقریریں حدود قانون کے اندر نہ رہیں اور اس کے باوجود انہیں ممنوع قرار نہ دیا گیا۔ عنقریب یہ واضح ہو جائے گا کہ یہ دعویٰ بلاوجہ نہ تھا۔

مقصد بظاہر تشدد کے حق میں نہ تھا

یہ دلیل دی گئی ہے کہ وزیراعظم نے علما کے ساتھ تصادم سے بچنے کی جو ہدایات دی تھیں ان کی وجہ سے صوبائی دائرے میں کوئی اقدام نہ کیا جا سکا۔ اس دلیل میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ علما گویا شوریدہ سر اور دشنام باز دیوانوں کا ایک گروہ تھے جو تشدد کی تلقین کرتے تھے اور خون کے نظارے دیکھنا چاہتے تھے۔ شاید وہ ''مذہبی دیوانہ'' کہلانے سے تو انکار نہ کریں لیکن ان میں سے ایک بھی ہمارے سامنے یہ اعتراف کرنے پر تیار نہ ہوا کہ اس نے تشدد کی مذمت نہیں کی۔ مولانا میکش نے علما کے کیس پر نمایاں زور بیان سے بحث کی لیکن احمدیوں کے خلاف خود اپنے مجنونانہ جوش کے باوجود انہوں نے ان تمام دشنام آمیز تقریروں کی مذمت کی جو ادنیٰ درجے کے لیڈروں نے کی تھیں۔ بیان واقعات سے معلوم ہوگا کہ ایسی تقریریں سید عطا اللہ شاہ بخاری، مولوی محمد علی جالندھری، سید مظفر علی شاہ شمسی، ماسٹر تاج الدین اور چند دیگر اشخاص نے کی تھی (اور ہمیں مولانا اختر علی خان کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیے) لیکن ان حضرات کو یہ دعویٰ بھی نہیں ہے کہ انہیں مذہب کے متعلق کوئی گہرا علم حاصل ہے یا وہ علما کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ سید عطا اللہ شاہ بخاری سے جب یہ سوال کیا گیا کہ آپ کے تصور میں آئندہ حکومت کی کیا شکل ہونی چاہیے تو آپ نے جواب دیا کہ اس سوال کا جواب علما ہی دے سکتے ہیں اس لیے وہ تنہا ''امیر شریعت'' ہیں جو مذہب کے قلمدان سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔

علما سے تصادم کے متعلق خواجہ ناظم الدین کے اندیشے غیر حقیقی تھے

لیکن مسٹر دولتانہ کو مرکز کے خلاف جو شکایات تھیں ان کے جواب میں سب کچھ کہنے کے بعد

اس شدت خوف کو سمجھنا مشکل ہے جو خواجہ ناظم الدین کو علما کے ساتھ تصادم کے متعلق لاحق تھا۔ ''اگر مطالبات کو رد کرنے کا فیصلہ کر دیا جاتا تو نتیجہ یہ ہوتا کہ بے شمار مسلمان ذبح ہو جاتے جو نیک نیتی سے اپنی جانیں دے دیتے اور سمجھتے کہ وہ درجہ شہادت پر فائز ہو رہے ہیں۔ اگر اب تک کوئی خونریزی ہوئی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میں اللہ کے حضور میں اس کا جواب دہ قرار نہ دیا جاؤں گا لیکن اگر میں نے جارحانہ رویہ اختیار کیا ہوتا اور ملک کو ایک مذہبی جنگ کے حوالے کر دیا ہوتا تو یقین ہے کہ میں دنیا و عقبیٰ دونوں میں روسیاہ ہو جاتا۔ اگر یہ جنگ قانون و انتظام کے سوال پر نہیں بلکہ صرف اپنے مالہ و ماعلیہ کی بنا پر لڑی جاتی تو صورت حالت دس گنا زیادہ بدتر ہو گئی ہوتی اور یہ امر بھی مشتبہ ہے کہ آخر میں ہم کامیاب ہو جاتے''۔

ہم بڑے احترام کے ساتھ یہ کہیں گے کہ ہمیں خواجہ صاحب کا یہ ارشاد اپنے روشن خلوص کے باوجود جذبات سے متاثر معلوم ہوتا ہے کہ احمدیوں اور سرکاری افسروں کے سوا جو دوسرے لوگ فسادات کا شکار ہوئے وہ دو طبقوں سے تعلق رکھتے تھے ایک وہ لوگ جنھوں نے درجہ شہادت حاصل کرنے کی کوشش کی اور دوسرے وہ جو اپنے مجرمانہ منصوبوں کو پورا کرنے کے لیے ایسے موقعوں سے ناجائز فائدہ اٹھایا کرتے ہیں۔ ان دونوں طبقوں میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جو قانون و انتظام کی صورت حالات اور مقاصد کی جنگ میں کوئی امتیاز کر سکتا۔ مذہبی دیوانہ تمام حالت میں یہی سمجھتا ہے کہ وہ ایک بلند مقصد کے لیے لڑ رہا ہے ضرورت صرف اسکی ہے کہ کوئی بخاری اسے اسکا یقین دلا دے۔ چور اور بدمعاش کو اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ وہ جس چیز کے لیے اپنی جان کو خطرے میں ڈال رہا ہے وہ ناموس رسولؐ ہے یا بائیسکل کی درجن بھر ٹیوبیں ہیں۔ یہاں بھی صرف کسی بخاری کا یہ اعلان چاہیے کہ ناموس رسولؐ خطرے میں ہے۔ ۲۷ فروری کی صبح کو لاہور کے بہت ہی کم لوگوں کو اسکی خبر تھی کہ علما اس لیے گرفتار کیے گئے ہیں کہ انہوں نے وزیر اعظم کی کوٹھی پر رضا کاروں کے دستے بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ یہ گرفتاریاں اس لیے ہوئی ہیں کہ مطالبات منظور نہیں کیے گئے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خان عبدالقیوم خاں نے خواجہ ناظم الدین کو سرحد اور قبائل کے متعلق کچھ بتایا تھا اور خواجہ ناظم الدین سمجھتے تھے کہ اگر مطالبات رد کر دیے گئے تو جہاد کا اعلان ہو جائے گا۔

بہرحال اب مطالبات رد کیے جا چکے ہیں بلکہ وہ سال گزشتہ فروری کی ۲۷ تاریخ کو رد کئے گئے تھے لیکن قبائل کو کچھ معلوم نہیں کہ لاہور میں جو ایک ہلکا سا جھونکا چلا تھا وہ مطالبات کے رد ہونے کا نتیجہ تھا یا جرائم پیشہ لوگوں کے شور شغب سے واقع ہوا تھا جو بڑے شہروں میں عموماً ہوا ہی کرتا ہے۔ ہر بات اس پر منحصر ہے کہ آپ لوگوں کو کیا بتاتے ہیں اس لیے واقعات کا انحصار اس شخص پر ہے جو لوگوں کو زبان سے بتاتا ہے یا اس اخبار پر ہے جو انہیں قلم سے بتاتا ہے یعنی یا تو وہ شخص ہے جو زبان دشنام طرازی اور عناد کا آلہ سمجھتا ہے یا وہ شخص جو یہ خیال کرتا ہے کہ وہ اپنے طاقتور قلم سے ہر غلیظ جوہڑ کے پانی کو حرکت دے سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ جمہور کی ''تعلیم'' کا مسئلہ ہے جیسے مولانا مودودی پر اواخر فروری ۱۹۵۳ء میں منکشف ہوا یا کسی مذہبی یا سیاسی رجحان کو ''راستے پر لگانے'' کا معاملہ ہے جیسے میر نور احمد کو مدت دراز سے علم تھا۔

علماء دوسرے ماہرین کی طرح یک گیر ذہن رکھتے ہیں

علماء کا طبقہ فاضل اشخاص کا طبقہ ہے اور تمام دوسرے خدام علم کی طرح بے حد احترام کا مستحق ہے لیکن تمام فاضل اشخاص کی طرح جنکی دماغی قوتیں کسی فن میں تخصیص حاصل کرنے کے درپے رہتی ہیں۔ ہمارے علما کا ذہن بھی یک گیر ہو گیا ہے اور یک گیر ذہن میں خطرناک امکانات مضمر ہوتے ہیں۔ آپ کا گزارا مخصصین (specialists) کے بغیر نہیں ہوتا لیکن آپ کو ''جنرل پریکٹیشنر'' (معالج عمومی) کی ضرورت ہوتی ہے جو ان تمام مضامین سے شناسائی رکھتا ہو (جن میں سپیشلسٹ بطور خاص مہارت پیدا کرتے ہیں) تاکہ ان کی سرگرمیوں کو جمع کر کے ان سے کام لے سکے۔ سپیشلسٹ کا دائرہ نگاہ اپنے خاص مضمون کے سوا دوسرے مضامین کے متعلق لازماً تنگ ہوتا ہے ہم ''ملائیت'' یا ''مذہبی دیوانگی'' جیسی پست اصطلاحات کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ ایک عام گریجوئٹ جو اپنے مضامین میں سے کسی ایک کے متعلق نہایت سطحی علم رکھتا ہے اس قسم کی اصطلاحات کو نہایت نخوت سے استعمال کرتا ہے۔ گویا وہ کوئی بڑی اعلیٰ ہستی ہے کیا آپ کسی ماہر حیوانیات پر ماہر حیوانیات ہونے یا کسی ماہر امراض پا پر ماہر امراض پا ہونے کا الزام عائد کر سکتے ہیں؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ علما کا دائرہ نگاہ اس لیے تنگ ہے کہ وہ علما ہیں بلکہ اس دائرے کی تنگی کی وجہ یہ ہے کہ وہ زندگی کی صرف ایک

شاخ کے ماہرین خصوصی ہیں۔ وہ بارش کے خواہاں صرف اس لیے ہوتے ہیں کہ انکی چھوٹی سی کھیتی ہری بھری ہو جائے نہ وہ جانتے ہیں نہ اس امر کی پروا کرتے ہیں کہ اس بارش سے پانچ میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی کھیتی کو کیا نقصان پہنچ جائے گا

دوسرے ممالک کے مسلمانوں سے بے پروائی

علما نے ہم سے صاف صاف کہہ دیا ہے (اور یہ کہتے ہوئے انہوں نے آنسو بہانا تو ایک طرف رہا آنکھ تک نہیں جھپکی) کہ جب تک ہمارے خاص نمونے کا اسلام یہاں رائج ہے ہم کو اس بات کی کچھ پروا نہیں کہ دوسرے ممالک کے مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا۔صرف ایک مثال سن لیجیے۔ امیر شریعت نے کہا کہ باقی ۲۴ کروڑ (یہ عدد ان کا اپنا ہے) کو اپنی تقدیر کا فیصلہ خود کرنا چاہیے" ان کروڑوں مسلمانوں کے لیے جو حل مولانا محمد علی کاندھلوی (سیالکوٹ) نے تجویز کیا ہے وہ شاید سب سے زیادہ قابل عمل ہے کہ ان مسلمانوں کو اپنے عقائد اور مذہبی نظریات بدل کر ویسے ہی بنا لینے چاہیں جیسے لاہور، دہلی یا ٹمبکٹو میں رائج ہیں۔لہٰذا جن لوگوں کو صرف یہیں کی کھیتیوں کی نہیں بلکہ چین اور پیرو کی فصلوں کی دیکھ بھال بھی کرنی ہے ان کے لیے اشد ضروری ہے کہ تمام اطراف کے مفادات کا خیال رکھیں اور جہاں مناسب سمجھیں آب پاشی کو روک دیں۔اگر خواجہ ناظم الدین کو یقین تھا کہ مطالبات منظور نہیں کیے جاسکتے تو انہیں ان کے رد کرنے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے تھا۔وہ علما کو کچلنے کے کام سے گھبراتے تھے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ مطالبات کے رد کرنے کا (استعارے کے مفہوم کے سوا) یہ نتیجہ کیونکر ہوسکتا تھا کہ علما کچلے جاتے۔

خواجہ ناظم الدین کے نزدیک علما کی عزت

بہر حال انکے دل میں علما کی اس قدر عزت تھی کہ ۲۷ فروری ۱۹۵۳ء کو جب ڈائریکٹ ایکشن انکے گھر کے دروازے پر پہنچنے ہی والا تھا انہوں نے استعفے کی دھمکی دی۔اس امید میں کہ "اگر علما عقل کی بات نہیں سنتے اور یہ محسوس نہیں کرتے کہ وہ پاکستان کی سلامتی کو خطرے میں ڈال رہے ہیں تو غالباً میرے استعفے کی پیشکش سے انہیں صدمہ ہوگا اور وہ اس حقیقت کو محسوس کرلیں گے"

اس ارشاد میں خوش عقیدگی جس افراط سے موجود تھی اس پر ہم چونک اٹھے اور ہم نے کہا کہ علماء تو شاید خواجہ صاحب کے استعفے کا خیر مقدم کرتے بلکہ اسے اپنی ٹوپیوں کے لیے (ان میں سے بعض اب ٹوپیاں پہنتے ہیں) طرہ افتخار سمجھتے اور اسے اسی قسم کے حالات میں آئندہ حکومتوں کے خلاف بھی استعمال کرتے۔ان کا یہ خیال بھی معلوم ہوتا ہے کہ علماء جمہور کے نمائندے ہیں۔اس سے پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ کوئی مطالبہ عوامی مطالبے کی حیثیت کیونکر حاصل کر لیتا ہے۔اور خود خواجہ ناظم الدین یہ بیان کر چکے ہیں کہ مولانا مودودی نے اس وجہ کی بنا پر ''ڈائریکٹ ایکشن'' سے بے تعلقی اختیار کی تھی کہ ان کے نزدیک ابھی اسکے لیے وقت موزوں نہ تھا۔دوسرے الفاظ میں ابھی مطالبات کی کافی اشاعت نہ ہوئی تھی۔ایک مقام پر (اس عدالت کے سامنے نہیں) مولانا مودودی نے یہ بیان کیا تھا کہ اس تحریک کا چرچا ابھی صرف پنجاب اور بہاول پور ہی میں ہے اور ان علاقوں میں بھی اسے تعلیم یافتہ طبقے کی حمایت حاصل نہیں۔اور جمہور کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے ابھی بہت پروپیگنڈے کی ضرورت ہے۔لہٰذا مطالبات کے متعلق یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ اولاً احرار کے اور بعد میں علما کے مطالبات ہیں۔اگر یہ مطالبات آغاز ہی میں رد کر دیے جاتے تو حکومت کو کافر حکومت کہا جاتا۔لیکن اب حکومت اور خواجہ ناظم الدین کے خلاف اس سے بدتر باتیں کہی گئیں ہیں اور ان کا کچھ بھی نہیں بگڑا۔شاید خان سردار بہادر خاں کا یہ خیال درست ہے کہ عوام کی تین قسمیں ہیں۔اول: وہ جو مطالبات پر مخلصانہ یقین رکھتے ہیں۔دوم: وہ جو ان سے سیاسی فوائد حاصل کرنے کے خواہاں ہیں اور سوم: وہ جنھیں یہ سمجھایا گیا تھا کہ اگر پورے اصرار اور دباؤ سے کام لیا جائے تو مرکزی حکومت ان مطالبات کو قبول کر لے گی۔خاں صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا کہ عوام کی اکثریت چونکہ تیسرے گروہ سے تعلق رکھتی تھی اس لیے اگر مرکز ایک واضح رویہ اختیار کر لیتا تو یہ لوگ تحریک سے دست بردار ہو جاتے۔آرا ہمیشہ مختلف ہوتی ہیں اور قطعی بھی ہو سکتی ہیں۔

عوامی مطالبہ کس کو کہتے ہیں

لیکن ہمارے نزدیک لوگ جس چیز کو عوامی مطالبہ کہتے ہیں وہ کوئی ایسی مقدس چیز نہیں ہوتی

اگر چہ وہ مطالبہ کسی حقیقی بات پر مبنی نہ ہو لیکن اگر اسکو ایک مقبول عام اخبار اور ایک فصیح البیان مقرر کی تائید حاصل ہو جائے تو اسکو خاصی تقویت پہنچ جاتی ہے اور اگر یہ مطالبہ حکومت کے خلاف ہو خواہ وہ کوئی حکومت ہو تو اس کو سامعین زیادہ سرگرمی سے سنیں گے اس امر کے باوجود کہ بعض لوگ اب حکومت کو اپنی حکومت کہتے ہیں۔ اسکے متعلق ان کا تصور اب تک ایک اجنبی راج ہی کی مانند ہے وہ اس کو اپنی حکومت اس لیے سمجھتے ہیں کہ اس کو انتہائی طفلانہ شوخی سے غلیظ گالیاں دے سکتے ہیں۔ وہ اس لیے اسکو اپنی حکومت خیال کرتے ہیں کہ وہ دفتر کے اوقات کو تمباکو نوشی میں گزار دیتے ہیں اور انہیں موقوفی کا خوف نہیں ہوتا۔ غرض اسی قسم کے اور اچھے اور برے وجوہ بے شمار ہیں ہم نے مقبول عام اخبار کا ذکر کیا تھا۔ مقبول عام اخبار کی ایک مثال زمیندار ہے اور آپکو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیوں مقبول عام ہے۔

خواجہ ناظم الدین کا طریق فکر مذہبی تھا

لہٰذا اس موضوع کے متعلق خالص مذہبی طریق فکر ہی تھا جس کی وجہ سے خواجہ ناظم الدین یہ سمجھتے تھے کہ اگر علما کے ساتھ صاف گوئی سے کام لیا گیا تو کوئی قومی مصیبت نازل ہو جائے گی وہ اس اعتقاد پر مخلصانہ قائم تھے۔ لیکن اسکے ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی باخبر تھے کہ جو شخص مرکز سے کسی فیصلے کے لیے اصرار کرتا ہے۔ اسکی نیت یہ ہے کہ ذمہ داری مرکز کی طرف منتقل ہو جائے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایسی حالت میں اگر فوج یا پولیس کسی پر گولی چلائے گی تو صوبائی لیڈر یہ کہیں گے کہ یہ سب کچھ مرکز کے حکم سے ہو رہا ہے اگر اس کشمکش میں مرکزی حکومت ٹوٹ گئی تو صوبائی حکومت لوگوں سے کہے گی کہ ہم تو شروع سے آخر تک تمہاری تائید کرتے رہے ہیں۔ کسی ناگوار اقدام کی ذمہ داری اٹھانے کا یہی طبعی لیکن افسوسناک خوف ہے جس سے یہ تلخ نتائج رونما ہوئے ہیں۔ خواجہ ناظم الدین کا کیس یہ ہے کہ اگر صورت حالات کا تدارک قانون و انتظام کے پہلو سے بوجہ احسن کیا جا سکتا تھا تو اس امر پر اصرار کیوں ضروری سمجھا گیا کہ مطالبات کے متعلق کوئی فیصلہ ضرور کرنا چاہیے۔ اگر اسطرح صورت حالات کا تدارک ہو سکتا تھا اور اگر وقتاً فوقتاً یہ امر واضح کیا جا چکا تھا۔

مقصد مرکز کو پریشان کرنا تھا

کہ مرکز مطالبات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہے تو ''مضبوط'' فیصلے پر اصرار کرنے اور لوگوں کو بار بار یہ بتانے سے کہ صرف مرکز ہی کوئی فیصلہ دے سکتا ہے صرف ایک ہی مقصود ہو سکتا تھا کہ مرکز کو پریشان کیا جائے۔ ہمارے نزدیک اس دلیل کی وقعت اسی صورت میں واضح ہو سکتی ہے کہ ہم دونوں حکومتوں کو ایک ''عضوی کل'' سمجھیں۔ جس کے ایک حصے کو صدمہ پہنچے تو پورے جسم کو تکلیف ہوگی اگر شدید صدمے اور خفیف صدمے میں سے انتخاب کرنا ہو تو کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ شدید صدمے سے بچنا چاہیے۔ یہ رائے اس مفروضے پر مبنی ہے کہ انتخاب ایک ہی شخص کو کرنا ہوگا۔

دو خرابیوں میں سے ایک کا انتخاب

اگر مطالبات رد کر دیے جاتے تو مرکز نامقبول ہو جاتا اور اگر قانون و انتظام کے پہلو سے کوئی اقدام کیا جاتا تو اس سے صوبہ غیر ہر دلعزیز ہو جاتا۔ لیکن دونوں صورتوں میں نامقبولیت کی نوعیت مختلف ہوتی۔ اول الذکر صورت میں چونکہ ایک مذہبی مطالبے کا استرداد لازم آتا اس لیے مذہبی جنون کو مشتعل کرنے کی بہت بڑی گنجائش ہوتی۔ اور آخر الذکر صورت میں موجودہ قانون کے ماتحت اقدامات کیے جاتے اور الزامات یہ ہوتے کہ ملک کی رعایا کے کسی طبقے کی شدید توہین کی گئی یا حکومت کے کسی وزیر کو برا بھلا کہا گیا یا لوگوں کو خونریزی پر اکسایا گیا۔ آخر الذکر اقدام کی بنیاد قانونی اور اخلاقی ہوتی اور اگرچہ اس سے کسی قدر اشتعال پیدا ہوتا لیکن اس اقدام کو کسی دلیل و برہان کے بغیر حق بجانب قرار دیا جا سکتا تھا۔ اگر ایک تنہا نقطہ نگاہ سے دیکھا جاتا تو دونوں فریقوں کے پیش نظر اپنا اپنا مفاد ہوتا اور حقیقت یہی ہے کیونکہ لوگ لازماً عام آدمی کی بہبود پر نظر نہیں رکھتے بلکہ اپنے سیاسی مستقبل کا خیال رکھتے ہیں۔ مسٹر انور علی کا بیان ہے۔ ایک دفعہ چیف منسٹر نے مجھ سے کہا کہ اگر میں نے کوئی اقدام کر دیا اور مرکز نے مطالبات منظور کر لیے تو مجھے اندیشہ ہے کہ میری پوزیشن نازک ہو جائیگی۔

قانون وانتظام کے متعلق مرکزی حکومت کی تشویش

اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم قانون وانتظام کے پہلو اور اس میں مرکز کے حصے کا جائزہ لیں۔ آج سے بہت پہلے یعنی ۷ ستمبر ۱۹۵۱ء کو وزارت داخلہ نے نہایت واضح الفاظ میں احمدیوں اور احراریوں کے نزاع کے متعلق تمام صوبائی حکومتوں پر اپنے خیالات ظاہر کر دیے تھے۔ مرکزی حکومت کا خیال یہ ہے کہ مذہبی عقائد کی اشاعت کے متعلق کسی فرقے یا جماعت کے جائز حقوق پر نامناسب پابندی عائد نہ کرنی چاہیے اور مختلف عقائد رکھنے والوں کے درمیان کسی قسم کا امتیاز ملحوظ نہ رکھنا چاہیے۔ لیکن مذہبی نزاعات کو معقول حدود تک مقید رکھنا چاہیے اور انہیں ایسے نقطے تک پہنچ جانے کا موقع نہ دینا چاہیے کہ امن وسکون عام خطرے میں پڑ جائے۔ مرکزی حکومت کی رائے میں جنگجویانہ اور جارحانہ فرقہ آرائی کو سختی سے دبا دینا چاہیے۔

مرکزی حکومت نے حکومت پنجاب کی کاروائی کو پسند کیا

چونکہ اس کے بعد مذہبی اور فرقہ وار نزاعات میں نمایاں اضافہ ہو گیا جس سے بعض مقامات پر نقص امن واقع ہوا۔ اس لیے یہی خیالات ۲ جولائی ۱۹۵۲ء کو دہرائے گئے۔ مکتوب ذیل کے الفاظ پر ختم ہوا:

''حکومت پاکستان نے اس اقدام کو بنظر اطمینان دیکھا ہے جو پچھلے دنوں حکومت پنجاب نے فرقہ وار شورش کے تدارک کے لیے اختیار کیا۔ یہ اشارہ اس اقدام کی طرف ہے کہ جون ۱۹۵۲ء میں احمدیوں اور احراریوں کے جلسوں پر پابندی عائد کی گئی اور بعض اشخاص کے خلاف اشتعال انگیز تقریروں کی بنا پر مقدمات دائر کیے گئے۔ حکومت پنجاب اپنے افسروں کی رہنمائی کے لیے وقتاً فوقتاً جو پالیسی تجویز کرتی رہی وہ ان گشتی مراسلوں سے ظاہر ہے جو رپورٹ کے سابقہ حصوں میں تفصیل سے نقل کی گئی ہیں۔ اب اس بیان واقعات میں ان کا ذکر ان کے مناسب مقام پر کیا جائے گا۔ ہم اپنے موجودہ مقصد کے لیے زیر جائزہ مدت کو مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:

اول: سردار عبدالرب نشتر کی حکومت زیر دفعہ ۹۲ الف تا اپریل ۱۹۵۱ء۔

دوم: مسٹر دولتانہ کی حکومت تا ۱۹ جولائی ۱۹۵۲ء جب احرار کی اس یقین دہانی پر کہ وہ قانون و انتظام کی حالت کو مناسب طور پر بحال رکھیں گے ان کے جلسوں پر سے پابندی اٹھالی گئی۔ اور ان کے خلاف دائر مقدمات واپس لے لیے گئے۔

سوم: ڈائریکٹ ایکشن کے چیلنج تک کی مدت جس میں ڈائریکٹ ایکشن کا چیلنج بھی شامل ہے۔

چہارم: ۲۶۔ فروری ۱۹۵۳ء سے ۶ مارچ ۱۹۵۳ء تک۔

اول: دفعہ ۹۲ الف کی حکومت

مسٹر دولتانہ نے نے اس زمانے کو اپنے لیے قابل تقلید نمونہ قرار دیا ہے۔ یہ زمانہ احراریوں کی سرگرمیوں کے اندر جھانکنے کے اعتبار سے بھی مفید ہے اس لیے اس زمانے کے چند متعلقہ واقعات کا ذکر کر دینا چاہیے۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۴۹ء کو مسٹر انور علی ڈی آئی جی نے سیالکوٹ میں مولوی غلام اللہ کی تقریر پر کاروائی کی تجویز پیش کی اور پھر جنوری ۱۹۵۰ء میں ملتان کی ان تقریروں کو قابل اقدام قرار دیا۔ جن میں جنرل نذیر احمد اور چودھری محمد ظفر اللہ خاں کے خلاف احمدی ہونے کی وجہ سے نکتہ چینی کی گئی تھی۔

مشیروں کی حکومت کے دوران میں احرار کو تنبیہ

چیف ایڈوائزر شیخ محمد انور کسی کاروائی کے خلاف تھے اس بنا پر کہ اس سے مقررین کو ''سستی شہادت'' مل جائے گی۔ سردار عبدالرب نشتر نے کہا کہ حکام اعلیٰ کو گالیاں دینا مذہبی عقائد کی تبلیغ و اشاعت سے مختلف شے ہے اور انہوں نے قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور مولوی غلام غوث سرحدی سے جو گفتگو کی تھی اس سے ان لوگوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ آپ نے مشیر سے کہا کہ صدر احرار ماسٹر تاج الدین سے بات چیت کریں۔ مشیر نے اس ہدایت کی تعمیل کی اور واضح طور پر

کہہ دیا کہ اگر اس تنبیہ پر توجہ نہ کی گئی تو حکومت مجبوراً اشد ید اقدام کرے گی۔ یہ دوسری تنبیہ تھی۔

احرار نے الشہاب کو دوبارہ چھاپا

اس اثنا میں احراریوں نے ایک گمنام کتابچہ جو اصلاً پاکستان کے لاٹ پادری مولانا شبیر احمد عثمانی کا لکھا ہوا تھا بظاہر مصنف کی اجازت سے دوبارہ چھاپ لیا۔ اس کتابچے میں حکومت افغانستان کے اس فعل کو حق بجانب قرار دیا گیا تھا کہ اس نے کئی سال پیشتر دو احمدیوں کو سنگسار کر دیا تھا۔ جون ۱۹۵۰ء میں مسٹر انور علی نے لکھا کہ ''بعض بین وجوہ کی بنا پر'' اس پمفلٹ کو ممنوع قرار دینا تو مناسب نہ ہوگا لیکن ماسٹر تاج دین اور دوسرے لیڈروں کو تنبیہ کرنی چاہیے۔ چیف سیکرٹری (حافظ عبدالمجید) چیف ایڈوائیزر اور گورنر نے اس سے اتفاق کیا اور گورنر نے یہ بھی کہا کہ سابقہ تنبیہات چونکہ موثر ثابت نہ ہوئیں، اس لیے ان لوگوں کو بتا دینا چاہیے کہ اگر وہ اپنی سرگرمیوں سے باز نہ آئے تو حکومت کارروائی کرنے پر مجبور ہوگی۔ مسٹر انور علی نے ۲۸ مئی ۱۹۵۰ء کو ایک اور سلسلے میں ایک مزید یادداشت لکھی جس میں تقسیم کے بعد احراریوں کی سرگرمیوں کی تفصیل بیان کر کے موثر اقدام کی تجویز پیش کی۔ اس یادداشت میں لکھا تھا کہ ایک احمدی فوجی افسر کوئٹہ میں ہلاک کیا جا چکا ہے۔ امام جماعت احمدیہ اور ان کے والد کو زناکار کہا گیا ہے۔ چودھری محمد ظفر اللہ خاں کو گدھا، مکار اور غدار کی سی گالیاں دی گئی ہیں اور کہا گیا ہے کہ انہوں نے قادیان کی خاطر کشمیر کو بیچ دیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے اپنی ایک تقریر میں یہ اعلان کیا ہے کہ اگر مرزا غلام احمد نے آجکل کے زمانے میں نبوت کا دعویٰ کیا ہوتا تو وہ انہیں اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر دیتے۔ اس جلسے کے حاضرین میں سے ایک آدمی بیچ میں اٹھ کر کہنے لگا کہ میں چودھری ظفر اللہ خاں کو ہلاک کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ایک اور موقع پر مرزا بشیر الدین محمود احمد کو ہلاک کر دینے پر بھی آمادگی ظاہر کی گئی۔

مسٹر انور علی کی تجویز کہ احرار کو خلاف قانون جماعت قرار دیا جائے

مسٹر انور علی نے تجویز کی کہ

(۱) جہاں عملی تشدد کی تلقین کی جائے وہاں سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۱۳ استعمال کی جائے۔

(۲) جہاں وزیر خارجہ کو گالیاں دی جائیں وہاں دفعہ ۲۱ کا اطلاق کیا جائے

(۳) فحش تقریریں مثلاً وہ تقریر جس میں مہاتما گاندھی اور خلیفہ قادیان کی ہم بستری کا ذکر کیا گیا ہے برداشت نہ کی جائیں اور

(۴) احرار کو خلاف قانون جماعت قرار دینے کے متعلق سنجیدگی سے غور کیا جائے۔

الشہاب: خواجہ شہاب الدین کی رائے

اس یادداشت میں مسٹر انور علی نے پھر ''الشہاب'' کا ذکر کیا اور بتایا کہ وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین ایک دفعہ آئے تھے تو انہوں نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ یہ کتابچہ فی الفور ضبط ہونا چاہیے کیونکہ اس میں تشدد کی تلقین کی گئی ہے۔ وزیر موصوف نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر احرار کے خلاف اب کوئی اقدام نہ کیا گیا تو ان کی مقبولیت کئی گنا بڑھ جائے گی اور تاخیر سے جو کارروائی کی جائے گی وہ سیاسی مشکلات پیدا کرنے کے علاوہ ان لوگوں کو شہید کی حیثیت دے گی۔

ہمیں اس موقع پر یہ دہرانے کی ضرورت نہیں کہ چیف سیکرٹری اور مشیر نے کیا کہا۔ البتہ مسٹر انور علی کی یادداشت ہمارے نزدیک صورت حال کا بہترین نقشہ پیش کرتی ہے۔ چیف سیکرٹری نے صرف زیر دفعہ ۳ اقدام کرنے سے اتفاق کیا۔ مشیر نے پھر سستی شہادت کا عذر پیش کیا گورنر کی یادداشت کا یہ فقرہ خاص طور پر اہم ہے۔ انہوں نے مسٹر تاج الدین سے کہا کہ یہ یقین کیا جاتا ہے اور غالباً صحیح بھی ہے کہ احرار ہردلعزیزی حاصل کر کے اپنے سیاسی مقاصد کی پیش برد کے لیے ختم نبوت کی تحریک سے کام لینا چاہتے ہیں۔

ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ آیا مسٹر دولتانہ اپنے تجویز کردہ نمونے کے مطابق کارروائی کا بخوبی آغاز کر سکتے لیکن یہ امر ہمارے دائرہ تحقیقات سے باہر ہے۔ شاید سابقہ حکومت نے اپنے لیے یہ قاعدہ قرار دیا تھا کہ کسی اقدام سے پہلے تین دفعہ رسمی تنبیہ کرنا ضروری ہے پہلی محض تنبیہ ہوگی، دوسری کڑی تنبیہ اور تیسری شدید تنبیہ۔ حتیٰ کہ ''الشہاب'' بھی ضبط نہ کیا گیا تا آنکہ خواجہ شہاب الدین نے اسکے متعلق سختی سے اظہار خیال نہیں کیا۔

احرار نے سوچا کہ اب نئی حکومت ہے اس لیے تنبیہات کی تختی صاف سمجھنی چاہیے اور نئے سرے سے آغاز کار کرنا چاہیے۔ مطلب یہ کہ پہلی تنبیہیں بالکل محو ہو چکی ہیں۔

دوم: مسٹر دولتانہ کی حکومت تا ۱۹ جولائی ۱۹۵۲ء

مال روڈ پر جلوس ایک تجویز

مسٹر دولتانہ کے زمانے سے متعلق پہلی فائل وہ تھی جس کا عنوان ''یوم تشکر'' تھا۔ اس پر مسٹر انور علی کی یہ یاداشت موجود ہے:۔

''قبل تقسیم کے ایام میں مال روڈ پر جلوسوں کو گزرنے کی اجازت نہ دی جاتی تھی'' اگر وہ پرانی کتاب سے ایک ورق نکال کر اس پر عمل شروع کر دیں تو یہ کتنی بڑی نعمت ہوا گر لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ جلوس کو دونوں مال روڈوں پر جانے کی اجازت نہیں تو ان کے لیے جلوس کی آدھی دلکشی غائب ہو جائے گی اور شاید وہ سوچ سمجھ کر جلوس نکالنے کا خیال ہی ترک کر دیں اس جلوس میں کوئی لطف نہیں جو ہائیکورٹ اور ڈین باربر کی دکان کے آگے سے نہ گزرے یہ ایسا معاملہ ہے جس پر حکومت کو ضرور غور کرنا چاہیے۔ البتہ چیرنگ کراس کی جائے ملاقات کو جہاں حکام عام طور پر جلوسوں کا استقبال کیا کرتے ہیں بہت سے افسر حسرت سے یاد کرینگے۔

اب ہم چند مخصوص نوعیت کے واقعات کا ذکر کرتے ہی:۔

محمد علی جالندھری منٹگمری میں ۱۵ اپریل ۱۹۵۱ء

(۱) اس عہد حکومت کی پہلی تقریر شاید وہ تھی جو مولوی محمد علی جالندھری نے ۱۵ اپریل ۱۹۵۱ء کو منٹگمری کانفرنس میں کی۔ اس تقریر میں انہوں نے کہا کہ ان کے پاس اس امر کی تحریری شہادت موجود ہے کہ سازش راولپنڈی سے احمدیوں کا تعلق ہے۔ یہ بلاشبہ مہمل بات تھی اور مسٹر انور علی نے بالکل صحیح کہا کہ اس سے غیظ و غضب پیدا ہوگا۔ لہٰذا تنبیہ ہونی چاہیے انہوں نے تین سابقہ تنصیبات کا

ذکر بھی کیا۔

جھوٹا پروپیگنڈا

یہ واضح طور پر نفرت کی تلقین تھی اور نفرت بھی نہایت مکروہ قسم کی کیونکہ نہ تو مولوی محمد علی ایسے اہم تھے کہ ایسی شہادت ان کے قبضے میں ہوتی اور نہ کوئی ایسی تحریر اس کے بعد مقدمہ سازش کے ٹربیونل کے سامنے پیش کی گئی لیکن اس قسم کی شبہ انگیز خبر نہایت آسانی سے لوگوں کے دماغوں میں گھر کر لیتی ہے اور اس کا کوئی ثبوت پیش کیا جائے یا نہ کیا جائے، سامعین اسکو بالکل صحیح اور شک وشبہ سے بالاتر سمجھ لیتے ہیں۔ ڈی آئی جی نے حسب سابق تنبیہ کرنے کی تجویز کی لیکن حسب سابق کوئی تنبیہ نہ کی گئی۔ مسٹر دولتانہ نے انکی یاداشت پر محض اپنے مختصر دستخط ثبت کر دیے۔ انہوں نے اپنی شہادت میں (موجودہ یاداشت کی نسبت نہیں) یہ صراحت کی ہے کہ جو فائلیں ان کے پاس بغیر اطلاع بھیجیں جاتی تھی۔ ان پر وہ صرف اپنے مختصر دستخط کر دیا کرتے تھے لیکن یہ فائل تو کسی قطعی اقدام کی متقاضی تھی۔

(۲) ۱۹ اگست ۱۹۵۱ء کو سید عطا اللہ شاہ بخاری نے موچی دروازے کے باہر ایک تقریر کی جس میں بعض مخصوص فقروں کا مفہوم ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

عطا اللہ شاہ بخاری لاہور میں: ۱۹ اگست ۱۹۵۱ء

"ہمارا ایک دشمن تو سرحد پر ہمارے سامنے ہے اور دوسرا دشمن ہمارے درمیان موجود ہے تم اس سانپ سے بالکل بے خبر ہو جو تمہاری آستین میں چھپا بیٹھا ہے۔ میں نے بارہا بتایا ہے کہ احمدی پاکستان کے وفادار نہیں ہیں، ڈسکہ میں چودھری محمد ظفر اللہ خاں کے بھتیجے کی شادی کے موقع پر مرزا صاحب کہہ چکے ہیں کہ احمدیوں کا بھلا اکھنڈ ہندوستان ہی میں ہے اور اگر تقسیم ہو بھی جائے تو دونوں حصے کسی نہ کسی طرح پھر مل جائیں گے۔ کیا تم اس سے زیادہ غداری کا تصور کر سکتے ہو؟ مجھے اور مرزا صاحب دونوں کو ہتھکڑیاں لگا دو اور ایک کمرے میں بند کر دو۔ صبح سے پہلے پہلے جھگڑے کا فیصلہ ہو جائے گا اگر وہ صبح تک زندہ رہیں اور مجرم ثابت ہو جائیں تو تم کو چاہیے کہ

قادیان اور ربوہ کے درمیان ہر درخت پر ایک ایک احمدی کو پھانسی دے دو۔ ساغر نے کہا ہے کہ مرزا صاحب اور چودھری محمد ظفر اللہ خاں نے کشمیر کا بیڑا غرق کر دیا اگر یہ جھوٹ ہے تو اسکو جیل میں بھیجو اور اگر یہ سچ ہے تو ظفر اللہ خاں کو جیل میں بھیجو۔

شیخ بشیر احمد کا احتجاج

اس پر شیخ بشیر احمد ایڈوکیٹ امیر جماعت احمدیہ لاہور نے ایک شکایت ڈپٹی کمشنر کو بھیجی جس نے وہ کمشنر کے پاس بھیج دی اور کمشنر نے ہوم سیکرٹری (سید احمد علی) کے پاس ارسال کی اور ہوم سیکرٹری نے اس پر لکھا کہ میں نے اس معاملے کے متعلق چیف منسٹر سے گفتگو کی ہے جنھوں نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں انسپکٹر جنرل کی وساطت سے احراری لیڈروں کو یہ تنبیہ کر دوں کہ وہ حدود سے تجاوز کر رہے ہیں (انکو یہ بھی بتا دیا جائے کہ اگر انہوں نے اس تنبیہ کو قبول نہ کیا تو حکومت کو ان کے خلاف کاروائی کرنی پڑے گی۔ چنانچہ انسپکٹر جنرل نے شیخ حسام الدین سیکرٹری مجلس احرار کو تنبیہ کر دی جنھوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس تنبیہ کو مناسب حلقوں تک پہنچا دیں گے۔

مرکزی حکومت کی تشویش

مسٹر جی احمد سیکرٹری وزارت داخلہ نے بھی ۴ ستمبر ۱۹۵۱ء کو چیف سیکرٹری سے پوچھا کہ آیا تقریر کی یہ رپورٹ صحیح ہے کہ وزیر خارجہ قادیان کے لیے کشمیر کو فروخت کر رہے ہیں چیف منسٹر نے جواب دیا کہ یہ صحیح ہے اور مقرر کو تنبیہ کی جا چکی ہے۔

بخاری مظفر گڑھ میں: اکتوبر ۱۹۵۱ء

(۳) لیکن اس تنبیہ کا نتیجہ ملاحظہ ہو۔ دو مہینے بعد اکتوبر ۱۹۵۱ء میں سید عطا اللہ شاہ بخاری نے مظفر گڑھ میں تقریر کی جس میں تقسیم کے متعلق احمدیوں کے رویے کی نسبت اپنے اکثر خیالات کا اعادہ کیا اور ایک نیا راگ اس میں شامل کر دیا۔ ''ایک احمدی جاسوس ایک شخص گوپال داس کی معیت میں گرفتار کیا گیا ہے اور میں نے حکومت کو اس سلسلے میں عمدہ معلومات مہیا کی ہیں''۔ کیا عام سیدھے سادے لوگ تصور کر سکتے ہیں کہ یہ بزرگ جو اپنی کہن سالی کے بوجھ سے زیر بار ہونے کے باوجود

شمشیر کی طرح تیز ہے گوپال داس کے ساتھی کے متعلق ایسی کہانی تصنیف کرے گا جس کو سچائی سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں؟ اگر یہ سچ ہو تو کیا اس سے غداروں کے خلاف شدید جذبات مشتعل نہ ہو جائینگے؟ اگر آپ یہ جانتے ہوئے کہ اس تقریر کی بنا جھوٹ پر ہے، اس کو نظر انداز کر رہے ہیں تو یہ مقرر کے سفید بالوں کا احترام تو شاید ہو لیکن آپ اس مرض سے تغافل کر رہے ہیں جو اس نے آپ کی قوم میں پھیلا دیا ہے۔

ڈی آئی جی نے کاروائی کی سفارش کی

اس پر مسٹر انور علی نے تجویز کی کہ (۱) ایک دو احراریوں کی زبان بندی کی جائے (۲) سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی نقل و حرکت اسکے گاؤں کے اندر محدود کردی جائے اور (۳) مجرمانہ تقریروں کے لیے قانون کے ماتحت مقدمات چلائے جائیں۔

انسپکٹر جنرل نے مضبوط اقدام کی تجویز کی

خان قربان علی خاں نے بھی ایسا ہی زوردار نوٹ لکھا۔ انہوں نے کہا کہ احرار نے اتنا کچھ کیا ہے کہ ان کے خلاف مضبوط اقدام بالکل حق بجانب ہے۔ آخری تنبیہ وہ تھی جو انہوں نے خود شیخ حسام الدین کو کی۔ لیکن یہ واضح تھا کہ تنبیہات بالکل بے کار ہیں اور اگر احراری من حیث الجماعت باز بھی آ جائیں تو سید عطاء اللہ شاہ بخاری کبھی باز نہیں رہ سکتے۔ ان کے ذہن میں تو گالی کے سوا اور کچھ نہیں۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ ان کی زبان بندی کے باعث ایک مرتی ہوئی پارٹی میں نئی جان پڑ جائے لیکن اس کا فیصلہ ارباب سیاست کا کام ہے۔ خاں صاحب نے لکھا کہ ذاتی طور پر وہ مضبوط اقدام کے حامی ہیں تا کہ رواداری کی فضا پیدا ہو سکے کہ چیف سیکرٹری نے اپنی رائے محفوظ رکھتے ہوئے یہ تجویز کی کہ چیف منسٹر ان سب افسروں کی معروضات سن لیں اور پھر کسی فیصلے پر پہنچیں۔

افسروں کی کانفرنس: نتیجہ: پالیسی کی چھٹی مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۵۱ء

۲۱ نومبر ۱۹۵۱ء کو چیف منسٹر کے سیکرٹری نے ظاہراً چیف منسٹر کی ہدایت کے ماتحت یہ یادداشت لکھی کہ جب تک چیف منسٹر فلاں جگہ سے واپس نہ آ جائیں کوئی کاروائی نہ کی جائے۔ اسکے بعد ۶

دسمبر کو چیف منسٹر اوران کے افسروں کی کانفرنس ہوئی اور پھر ۲۴ دسمبر ۱۹۵۱ء کو پالیسی کی چٹھی جاری کی گئی یہ پالیسی کی چٹھی قریب قریب مرکزی حکومت کی چٹھی مورخہ ۷ ستمبر ۱۹۵۱ء کے خطوط ہی پر مرتب کی گئی تھی اوراس میں ڈپٹی کمشنروں کو بتایا گیا تھا کہ کسی قوم یا کسی فرقے کو اپنے مذہبی عقائد کی تعمیل کے جو جائز حقوق حاصل ہیں ان پر کسی قسم کی ناواجب پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔لیکن یہ امر اہم ہے کہ مذہبی نزاعات کو بڑھنے کا موقع نہ دیا جائے۔خصوصاً اس حد تک کہ امن وسکون عامہ خطرے میں پڑ جائے بدنظمی کے واقعات وہیں رونما ہوئے ہیں جہاں ڈپٹی کمشنر چوکنے نہ رہے اور انھوں نے بروقت انسدادی تدابیر اختیار نہ کیں یا جہاں انہوں نے فرق وامتیاز سے کام لیا۔لہذا جذبات سے الگ ہوکر اقدام نہ کر سکے۔حکومت کو معلوم تھا کہ بعض حکام ضلع اپنے مذہبی عقائد کی وجہ سے غیر احمدی مقررین کی طرفداری کرتے رہے ہیں۔

اس کا مطالعہ خوشگوار ہے

اب کاغذ پر اور حالات وکوائف سے الگ ہوکر دیکھا جائے تو اس چٹھی کا مطالعہ بہت ہی خوشگوار ہے اور یہ چٹھی سول سروس کی بہترین روایات کے مطابق ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت کو فرقہ وار سرگرمیوں کے اثرات کا پورا اندازہ ہے،اس خطرے کا بھی احساس ہے جو احکام ضلع کے عقائد مذہبی سے خود ان حکام کو اور نظم حکومت کو لاحق ہوتا ہے اور مذہبی عقائد کی تعمیل کے ان جائز حقوق کی حفاظت بھی منظور ہے جو ہر شخص کو حاصل ہیں۔لیکن سوال یہ ہے کہ اس نے ’’امیر شریعت‘‘ کے متعلق کیا کیا؟ کیا حکومت نے لوگوں کو اس امر کا موقع نہیں دیا کہ جو زہر ان کو دیا جارہا ہے اس کو بے تکلف پیتے چلے جائیں؟

لیکن اصل معاملے کو نظر انداز کر دیا

ڈی آئی جی مسٹر انور علی نے بعض نہایت موثر تجاویز پیش کی ہیں۔انسپکٹر جنرل نے یہ بتایا ہے کہ تین دفعہ سابقہ حکومت کے عہد میں اور دو دفعہ نئی حکومت کے زمانے میں تنبیہ کی جاچکی ہے لیکن ان تنبیہات کا کوئی اثر نہیں ہوا اور رواداری کی فضا پیدا کرنا ضروری ہے اس کے بعد ان پانچ حضرات

کی ایک کانفرنس ہوتی ہے جن پر حکومت کے نظم ونسق کا بار ہے۔ان حضرات نے کوئی دو گھنٹے سید عطا اللہ شاہ بخاری کی زبان بندی کے امکانی اثرات پر بحث کرنے میں صرف کیے یعنی اگراس کے خلاف کوئی کاروائی کی گئی تو آیا احرار سے گندم ملے گی یا کسی مہربان آسمان سے بارش حاصل ہو سکے گی؟اور آیا ایک قریب مرگ پارٹی میں ازسرنو جان پڑ جائے گی۔کسی مرتے ہوئے انسان میں ازسرنو جان پڑ جانا امیر شریعت کے خلاف اقدام کرنا کوئی معجزہ نہیں۔لیکن اگر آج سے دس سال پہلے اسکے خلاف کوئی اقدام نہ کیا جاتا تو یقیناً ایک معجزہ ہوتا۔

ایک لفظ کی اکثر توہین کی جاتی ہے ''مضبوط اقدام''

آئی جی اور ڈی جی نے اپنی یاداشتوں میں لکھا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ''مضبوط اقدام'' کیا جائے اس لفظ کی اتنی دفعہ بے حرمتی کی گئی ہے کہ اب اس کو دہراتے ہوئے سننے سے ہمیں متلی کا احساس ہوتا ہے۔یہ لفظ ۲۱ جنوری ۱۹۵۳ءکو بھی استعمال کیا گیا تھا جب چیف سیکرٹری نے وزارت داخلہ سے کہا تھا کہ مطالبات کے متعلق ''مضبوط پالیسی'' کا تعین کرے۔تاہم کم ازکم یہ دونوں پولیس افسر جانتے تھے کہ اس لفظ سے کیا مراد ہے چنانچہ ان کی یادداشتوں میں اسکا مطلب یہ بتایا گیا ہے کہ ان لوگوں میں سے ایک دو کو جیل خانے میں بھیج دیا جائے اور تیسرے کو نظر بند کر دیا جائے۔کیا یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ ان افسروں نے کانفرنس میں اپنا ارادہ بدل لیا ہو؟ اگر انہوں نے ایسا کیا تو اس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ دوسرے تین افسروں کا خیال ''مضبوط اقدام'' کے متعلق ان سے مختلف تھا۔

پالیسی کی چٹھی مورخہ ۳ نومبر ۱۹۵۱ء پہلے ہی موجود تھی

جو گشتی چٹھی ۲۴ دسمبر ۱۹۵۱ءکو جاری کی گئی قطعی طور پر بیکار تھی اور یہ امر اور بھی واضح ہو جاتا ہے جب یہ حقیقت سامنے رکھی جائے کہ کم وبیش اسی قسم کی چٹھی ۳ نومبر ۱۹۵۱ءکو بھی جاری کی جا چکی تھی۔چٹھی میں یہ کہا گیا تھا کہ ایسی مثالیں حکومت کے علم میں آئی ہیں کہ مختلف فرقوں کے افراد نے ایک دوسرے کے خلاف قابل اعتراض پروپیگنڈا کیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ لوگوں کے جذبات کو صدمہ پہنچا ہے اور اکثر شخصی تشدد بھی کیا گیا ہے اور بعض اوقات مقامی افسر نے بھی ان مقاصد سے

اپنی وابستگی ظاہر کی ہے اور یہ امر صوبے میں سخت اضطراب اور حکومت کے لیے سخت تشویش کا باعث ہو رہا ہے۔حکومت کا یہ خیال ہے کہ کسی قوم یا فرقے کے ان جائز حقوق پر کوئی نامناسب پابندی عائد نہ کی جائے جو اسے اپنے عقائد مذہبی پر عمل درآمد کے متعلق حاصل ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اس کے بعد مرکزی حکومت کی چٹھی مورخہ ۷ ستمبر ۱۹۵۱ء کے ترشے ترشائے الفاظ دہرا دیے گئے ہیں۔آخر میں ڈپٹی کمشنروں کو ہدایت دی گئی کہ جنگجویانہ اور جارحانہ فرقہ پرستی کو ''مضبوطی'' سے دبایا جائے۔ مقامی افسروں کو چاہیے کہ ''جب کبھی فرقہ وار اشتعال انگیز تقریروں اور کشیدگی پیدا کرنے والی سرگرمیوں کی وجہ سے گڑ بڑ کی احتمال ہو تو مضبوط اقدام کریں اور اس مقصد کے لیے احکام امتناعی کی ان دفعات کو کام میں لائیں جو قانون فوجداری ہیں درج ہیں''۔

پالیسی کی چٹھیوں میں یہ فرض کرلیا گیا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ قانون کے ماتحت عمل نہیں کرتے جب تک انہیں واضح طور پر بتایا نہ جائے

یعنی حکام اضلاع کی رہنمائی یہ امر واضح طور پر بتانا پڑا کہ ملک کے قانون فوجداری میں ایسی دفعات موجود ہیں جن کا اطلاق ایسی تقریروں پر ہو سکتا ہے لیکن جب شیخ بشیر احمد نے اگست ۱۹۵۱ء کی موچی دروازے والی تقریر کے خلاف ڈپٹی کمشنر سے شکایت کی تو شیخ صاحب قانون سے واقف تھے اور ڈپٹی کمشنر سے شکایت کرنے کا واضح مقصد یہی تھا کہ افسر مذکورہ قانون کو استعمال کرے کیا حکومت نے کوئی گشتی چٹھی بھیج کر حکام اضلاع کو حکم دے رکھا تھا کہ حکومت سے پوچھے بغیر قانون کے ماتحت کوئی کاروائی نہ کریں یا اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈپٹی کمشنر سید عطاللہ شاہ بخاری کے خلاف مقدمہ چلانے پر آمادہ نہ تھا کیونکہ (۱) کہن سال بزرگ تھے یا (۲) وہ ایک غوغائی پارٹی یعنی احرار میں سے تھے یا (۳) وہ تقریریں صرف چودھری محمد ظفر اللہ خاں کے خلاف کی گئی تھیں جو صرف ایک احمدی تھے یا (۴) اس لیے کہ ڈپٹی کمشنر یہ بوجھ کمشنر کے کندھوں پر ڈال دینا چاہتا تھا یا (۵) اس کی رائے میں تقریر کاروائی کے قابل ہی نہ تھی؟ آپ ان وجوہ میں کسی کو بھی منتخب کر لیجیے۔اس سے یہی ظاہر ہوگا کہ نظم حکومت کی بنیادیں کھوکھلی ہو رہی تھیں اپنے حکام اضلاع کو خود اعتمادی سکھائے۔اگر یہ چیز ان

کے کردار میں موجود نہیں ہے تو ان کو دوسری اسامیوں پر مقرر کیجیے اور ان کی جگہ ایسے آدمی مہیا کیجیے جن کے کندھے ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے لیے کافی فراخ ہوں۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو اپنے آپ پر اعتماد نہیں

۶ دسمبر ۱۹۵۱ء کی کانفرنس میں اس سوال پر بھی غور ہونا چاہیے تھا کہ لاہور اور مظفر گڑھ کے ڈپٹی کمشنروں سے کیوں جواب طلب نہ کیا جائے کہ جس حالت میں انہیں ۳ نومبر کی گشتی چٹھی پہنچ چکی تھی انہوں نے قانون کے ماتحت کوئی اقدام کیوں نہ کیا۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے خوابیدہ افسروں کو بیدار کر کے انہیں ذمہ داری کا احساس دلایا جا سکتا ہے یہ زیادہ تر چیف سیکرٹری کا کام ہے لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جب ایک کانفرنس ایک یا دو تقریروں پر غور کرنے کے لیے منعقد کی جائے تو چیف منسٹر کو یہ خیال ہی نہ آئے کہ مقامی افسر نے کچھ بھی نہیں کیا۔

بھلوال میں احمدی کانفرنس ۲۲ ستمبر ۱۹۵۱ء

(۴) ۲۲ اور ۲۳ ستمبر ۱۹۵۱ء کو بھلوال میں ایک احمدی تبلیغ کانفرنس منعقد ہوئی اس کے مقابلے پر محض چڑانے کے لیے سامنے کی مسجد میں ایک سنی کانفرنس فی البدیہہ کر لی گئی۔ پولیس کی رپورٹ مظہر ہے کہ احمدیوں نے کوئی ناگوار بات نہیں کی لیکن احراریوں نے ایسی باتیں کیں۔ مسٹر انور علی نے تجویز کی کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس مقامی لیڈروں کو تنبیہ کرے۔ خان قربان علی خاں نے ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو یہ بھی کہا کہ ''اگر وہ فرقہ وارانہ شرارت کریں تو قانونی کاروائی کی جائے''۔ یہ محض احراریوں کے طرز عمل کی مثال پیش کرنے کے لیے بیان کیا گیا ہے۔

ملتان میں احمدی کانفرنس ۱۸ نومبر ۱۹۵۱ء

(۵) ۱۸ نومبر ۱۹۵۱ء کو احرار نے ملتان میں احمدیوں کے ایک جلسے کو درہم برہم کر دیا۔ شیخ بشیر احمد نے پھر شکایت کی اور اس دفعہ حکومت کو بھیجی کہ لائلپور میں ایک اور جلسہ بھی اسی طرح درہم برہم کیا گیا ہے۔ انہوں نے حکومت کو یاد دلایا کہ ہفتے کے آخر میں احمدیوں کا ایک اور سالانہ جلسہ سیالکوٹ میں ہونے والا ہے اور حفاظت کا مطالبہ کیا۔ مسٹر قربان علی نے کہا کہ میں اس چٹھی کے ایک

ایک لفظ سے اتفاق کرتا ہوں اور اسکے ساتھ ہی ''مضبوط پالیسی'' کی استدعا کی۔

ملتان کے جلسے کو درہم برہم کرنے کا واقعہ خاص طور پر مسٹر دولتانہ کے علم میں لایا گیا۔ چنانچہ انہوں نے اس معاملے کے متعلق اپنے افسروں سے بات چیت کی اور معاملہ ڈپٹی ہوم سیکرٹری کی ایک یادداشت پر ختم ہوگیا۔ جو چیف منسٹر کی جانب سے لکھی گئی تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ ''اس اطلاع پر کوئی علیحدہ کاروائی ضروری نہیں ہے''۔

سیالکوٹ میں ۱۶ فروری ۱۹۵۱ء

سیالکوٹ کا جلسہ خود احمدیوں کی رضامندی سے ملتوی کرنا پڑا۔ کیونکہ فضا میں بہت تناؤ تھا آخر یہ جلسہ ۱۶۔۱۷ فروری ۱۹۵۲ء کو منعقد ہوا لیکن اس وقت بھی پولیس کو اس جلسے کے گرد خاردار تار کا جنگلہ لگانا پڑا۔ احراری کچھ دور کھڑے رہے اور انہوں نے جلسے کے بعد احمدیوں پر پتھر پھینکے۔ ڈپٹی کمشنر نے قوت کی نمائش کر کے صورت حال کو بد سے بدتر نہ ہونے دیا اور احمدیوں کو پولیس کے پہرے کے ساتھ ٹرکوں میں بٹھا کر گھروں کو روانہ کر دیا۔ ۷ فروری کو جلسہ ہونے والا تھا اس کے متعلق خود احمدیوں ہی نے سوچا کہ اس کا انعقاد خطرے سے خالی نہیں چنانچہ انہوں نے اس دن جلسہ نہ کیا۔

احرار کانفرنس اوکاڑہ میں ۲۴ نومبر ۱۹۵۱ء

(۶) ۲۴۔۲۵ نومبر ۱۹۵۱ء کو اوکاڑہ میں ایک احرار کانفرنس منعقد ہونے والی تھی اور چونکہ اوکاڑہ احمدیوں اور احراریوں کے نزاع کا ایک اڈا تھا۔ (۱۹۵۰ء میں یہاں ایک احمدی مارا گیا تھا) اس لیے چیف منسٹر نے ڈی آئی جی کا یہ مشورہ قبول کر لیا کہ یہ جلسہ ممنوع قرار دیا جائے۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ منٹگمری کے ڈپٹی کمشنر مسٹر مشتاق احمد چیمہ اس شرط پر اس جلسے کے انعقاد کی اجازت دے چکے ہیں کہ اس میں کوئی قابل اعتراض تقریر نہیں کی جائے گی۔ مسٹر دولتانہ اس وقت کراچی میں تھے اور چونکہ مسٹر قربان علی کے نزدیک بہترین رویہ یہی تھا کہ وعدے کا ایفا کیا جائے۔ لہٰذا انہوں نے ڈپٹی کمشنر کو اطلاع دی کہ اگر آپ کو اعتماد کہ ہو کہ کوئی ناگوار واقعہ پیش نہیں آئے گا تو آپ جلسے کی

اجازت دے سکتے ہیں۔

منٹگمری کا ڈپٹی کمشنر

اس جلسے کا افتتاح خود مسٹر چیمہ نے کیا اور دوسرے دن اختتامی تقریر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے کی جس میں انہوں نے احرار کا شکریہ ادا کیا کیونکہ اس جلسے کا نام ''دفاع کانفرنس'' رکھا گیا تھا۔مندرجہ ذیل دو تقریروں کے اقتباسات قابل ملاحظہ ہیں:۔

ا: قاضی احسان احمد شجاع آبادی: مرزائیوں سے خبردار رہو یہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں اور حکومت پاکستان کو چاہیے کہ خان لیاقت علی خان کے قتل کی تحقیقات کرتے وقت انکو ذہن میں رکھیں،انکو پاکستان میں اپنے مذہب کی تبلیغ کا کوئی حق نہیں ہے۔

(ان لوگوں کی تعریف کرنی پڑتی ہے کہ یہ تمام قومی مصائب کی تحقیقات کے گم شدہ سلسلے دریافت کرنے میں یدطولیٰ رکھتے ہیں)

۲۔سید عطاء اللہ شاہ بخاری: ملک کے دفاع کو مضبوط کرنے کی ضرورت پر زور دینے کے بعد آپ نے کہا ایک غدار ایک کروڑ سؤروں سے بدتر ہے اگر حکومت مجھے غدار سمجھے تو اس چاہیے کہ مجھے گولی مار دے۔نہایت افسوس ہے کہ مرزا بشیر الدین نے ایک دفعہ پاکستان کو ہندوستان سے متحد کرنے کی کوششوں کی کھلم کھلا حمایت کی تھی یہ پاکستان سے غداری تھی۔

ڈپٹی کمشنر اور چیف سیکرٹری کے درمیان اس مسئلے پر کچھ خط وکتابت بھی ہوئی کہ ایسی کانفرنس کی صدارت کرنا کس حد تک جائز تھا۔ہمیں بحیثیت مجموعی اتفاق ہے کہ مسٹر چیمہ کے طرز عمل کے خلاف ایک سے زیادہ وجوہ کی بنا پر اعتراض ہونا چاہیے تھا لیکن تاہم یہ امر موجب اطمینان ہے کہ حکومت سے استصواب کیے بغیر ڈپٹی کمشنر نے بعض شرائط کے ماتحت ایک جلسے کے انعقاد کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ان کو فیصلے کی غلطیاں کرنے دو،وہ کچھ تو کریں جس سے یہی ظاہر ہو سکے کہ وہ فیصلہ کی غلطیاں کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

رگڑا مست قلندر دا۔ مارچ ۱۹۵۲ء محض ایک تنبیہ

(۷) مارچ ۱۹۵۲ء میں ایک کتابچہ مسٹر انور علی کے علم میں آیا جس کا نام تھا۔ ''رگڑا مست قلندر دا''۔ جو سائیں آزاد قلندر بھیروی نے لکھا تھا جس میں سی آئی ڈی کے بیان کے مطابق بانی احمدیت پر ''دشنام آمیز اور توہین انگیز'' نکتہ چینی کی گئی تھی۔ جس کے خلاف زیر دفعہ ۲۹۵ الف تعزیرات پاکستان اور زیر دفعہ ۹۴ الف ضابطہ فوجداری کارروائی ہوسکتی تھی مسٹر انور علی نے ایک یاداشت میں لکھا کہ اگرچہ تازہ ہدایات کے مطابق ایسے اشخاص کے خلاف ''مضبوط'' کارروائی ہونی چاہیے لیکن اس کتابچے کا مصنف کوئی خاص ممتاز حیثیت نہیں رکھتا اور اگر اس کے خلاف قانونی کارروائی کی گئی تو رسوائے عالم ہو جائے گا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجرموں کو رسوائی عام سے کیوں محروم کیا جائے۔ لیکن ہمیں تو اس مشورے کی پشت پر وہی خیال کارفرما نظر آتا ہے جس کے ماتحت ۱۹۵۰ء میں چیف ایڈوائزر نے احرار کو بہ حیثیت مجموعی ''سستی شہادت'' کا مرتبہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔

مجرموں کو ''رسوائی عام'' اور سستی شہادت کا حق دینے سے انکار

یعنی اندیشہ یہ تھا کہ پیمانہ اقدار میں ان کا رتبہ بلند ہو جائیگا اور وہ قید ہونے کے بعد اہم اشخاص بن جائیں گے لیکن لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ اقدام نہ ہونے کی صورت میں لوگ بدگوئی اور گالی گلوچ کو زندگی کا عام منظر سمجھ لیتے ہیں اور بالآخر جب یہ دشنام طرازی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے اور اس کو روکنے کے لیے کوئی کوشش کی جاتی ہے تو لوگ اس کو ''آزادی تقریر میں ناواجب مداخلت'' قرار دینے لگتے ہیں یہی جولائی ۱۹۵۲ء میں ملتان میں ہوا۔ مہینہ بھر قانون کی خلاف ورزی میں جلوس نکلتے رہے اور جب آخر ان پر پابندی عائد کی گئی اور فرض شناس پولیس افسر نے اس پابندی کو نافذ کرنے کی کوشش کی۔

جولائی ۱۹۵۲ء کو ملتان میں جو گولی چلی وہ احکام کے عدم نفاذ کا نتیجہ تھی

تو انسانی بھڑوں کا ایک چھتا اس کے تھانے کے گرد جمع ہو گیا جس نے آہنی کٹہرا توڑ ڈالا۔ انسانوں اور سامان پر اینٹیں پھینکیں آگ لگانے کی کوشش کی چند سرکاری افسروں کو زخمی کر دیا اور اس

وقت تک ٹھنڈے نہ ہوئے جب تک چھ گولیاں چھ سینوں میں ٹھنڈی نہیں ہوگئیں۔

اس پر ''تسنیم'' مورخہ ۲ جولائی ۱۹۵۲ء نے لکھا۔ ہم اس پولیس افسر کی غیر ذمہ داری کی مذمت کیے بغیر نہیں رہ سکتے جس نے ایک اجتماع پر محض اس لیے لاٹھی چارج کیا کہ وہ نعرے لگا رہے تھے اور دفعہ ۱۴۴ کے ایک حکم کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سرگودھا اور دوسرے مقامات پر بھی ایسے احکام توڑے گئے ہیں۔

تاہم ہوم سیکرٹری نے ڈی آئی جی سے اتفاق کیا اور کتابچے کے مصنف کو صرف تنبیہ کر دی گئی۔ چیف منسٹر نے دورے سے واپس آنے پر اس کارروائی کو پسند کیا۔شاید یہ نظم ہی بہت اچھی تھی!

دو مہینے بعد مئی ۱۹۵۲ء میں احراریوں نے ایک پوسٹر شائع کیا جس کا عنوان یہ تھا:۔

''خلیفہ قادیان مرزا بشیر الدین کی گاندھی جی سے ہم بستری اور اکھنڈ ہندوستان''

ہم بستری والا پوسٹر تنبیہ بھی نہ کی گئی

ہم اس عنوان کا انگریزی میں ترجمہ نہیں کر سکتے اس لیے کہ لفظ 'ہم بستری'' کے دو معنی ہیں اس لفظ کو مرزا بشیر الدین نے ایک معنی میں استعمال کیا ہے اور احرار نے اس کا دوسرا مفہوم لیا ہے جو فحش ہے۔ یہ پوسٹر بھی فحش و ناشائستہ مواد سے لبریز ہے۔

اس میں جسٹس سکیمپ کے ایک فیصلے کا ذکر بھی کیا گیا ہے جس میں جسٹس موصوف نے مرزا صاحب سے خرابی اخلاق منسوب کی ہے حالانکہ دراصل جسٹس سکیمپ نے ایک ایسی تحریر کا اقتباس نقل کیا ہے جسکے خلاف احمدیوں نے اعتراض کیا تھا۔ یہی تحریر اسی طریقے سے ایک اور قابل اعتراض کتاب جانباز پاکٹ بک میں نقل کی گئی تھی اور ہم میں سے ایک نے اسی بنا پر کتاب کے مصنف کو توہین عدالت کی پاداش میں ایک ماہ قید کی سزا دی تھی۔ڈی آئی جی نے اس کیس میں کوئی خاص سفارش نہ کی اور چیف منسٹر نے اس یادداشت پر محض مختصر دستخط کر دینے پر اکتفا کیا۔

سرگودھا کانفرنس ۲۴ مارچ ۱۹۵۲ء

(۸) اس کے بعد ایک اہم واقعہ ''استحکام پاکستان احرار کانفرنس'' ہے جو ۲۴۔۲۵ مارچ

۱۹۵۲ء کوسرگودھا میں منعقد ہوئی۔ سیکرٹری انجمن احمدیہ سرگودھا نے مرکزی حکومت کو ایک احتجاجی تار بھیجا جس میں تشدد کی اس کھلی تلقین اور لاقانونی کی شکایت کی جس نے احمدی جماعت کو شدید خطرے میں مبتلا کر رکھا تھا مرکزی حکومت نے چیف سیکرٹری سے رپورٹ طلب کی چنانچہ مقامی سپرنٹنڈنٹ پولیس کی رپورٹ کی ایک نقل بھیج دی گئی لیکن اس پر مسٹر انور علی نے اپنی حکومت سے پرزور احتجاج کیا۔

مرکزی حکومت نے رپورٹ طلب کی ڈی آئی جی نے احتجاج کیا

اور کہا کہ مرکزی حکومت کو تمام مختلف معاملات کے متعلق رپورٹیں طلب کرنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ اس سے کام میں خوامخواہ اضافہ ہوتا ہے حالانکہ مرکزی حکومت ان معاملات میں احکام صادر کرنے کی آئینی اہلیت نہیں رکھتی۔ بہتر یہ ہوتا کہ مرکزی حکومت اس تار کو ضروری کاروائی کی غرض سے صوبائی حکومت کے پاس بھیج دیتی۔ قانون و انتظام کے معاملے میں صوبائی حکومت ''مختار کل'' ہے اور جب اس سے رپورٹیں طلب کی جائیں تو لوگوں کو جرأت ہو جاتی ہے کہ اس حکومت کو نظر انداز کر کے مرکز کو مداخلت کی دعوت دیں۔

یہ بالکل ٹھیک ہے لیکن اس امر کے باوجود کہ مسٹر انور علی کے نزدیک قانون و انتظام کے معاملے میں صوبائی حکومت مختار کل تھی۔ ۲۱ فروری ۱۹۵۳ء کو ''مضبوط پالیسی'' والی چٹھی مرکزی حکومت کو مسٹر انور علی ہی کے ایما پر بھیجی گئی تھی۔

تقریریں: جالندھری نے کہا زندیق واجب القتل ہیں بخاری

سی آئی ڈی نے جن تقریروں کو قلمبند کیا ان میں مولوی محمد علی جالندھری کا یہ فقرہ بھی تھا کہ ''مرزائی'' زندیق ہیں اور زندیق شریعت اسلامی کے رو سے واجب القتل ہیں۔ سید عطا اللہ شاہ بخاری نے کہا کہ چودھری ظفر اللہ خان جان بوجھ کر کشمیر کی گتھی کو الجھا رہے ہیں اور افغانستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات کی تلخی کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اس مقرر نے اپنے سامعین کو حکم دیا کہ ایک جلوس نکالیں اور وزیر خارجہ کی برطرفی کا مطالبہ کریں۔ اور نعرہ لگائیں ''مرزائیت مردہ باد۔

ظفر اللہ مردہ باد، مرزا بشیر مردہ باد'' اس جلوس کے متعلق اس رپورٹ کا مفاد نقل کرنا ہوگا جو سپرنٹنڈنٹ پولیس نے حکومت کو ارسال کی:۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس کی رپورٹ جلوس کے متعلق

''۲۸ مارچ کو عطاء اللہ شاہ بخاری کی ہدایت کے مطابق کوئی دو سو آدمیوں کا جلوس نکالا گیا۔ میں نے مولوی عبداللہ احراری (تاجر کتب) عبدالرشید اشک اور دوسرے لوگوں سے کہا کہ وہ جلوس کی قیادت نہ کریں کیونکہ اس سے نفرت وحقارت پیدا ہونے اور فساد کے پھوٹ پڑنے کا احتمال ہے لیکن انہوں نے میرے مشورے پر کان نہ دھرا اور کہا کہ احتجاج کا صرف یہی طریقہ ہے انہوں نے اپنے پیرووں سے مردہ باد کے نعرے لگوائے۔ جلوس جتنا آگے بڑھتا گیا اس میں اضافہ ہوتا گیا، کچہری بازار میں ایک اور بڑا جلوس آن ملا۔

قانون وانتظام بالکل اٹھ چکا ہے

اور پھر یہ دونوں جلوس مل کر میونسپل باغ کی طرف چلے عبدالرشید اشک ان کو حوصلہ دلا رہا تھا کہ بے خوف آگے بڑھے چلو۔ ایک وقت پر تو معلوم ہوتا تھا کہ قانون وانتظام بالکل ہی اٹھ چکا ہے ڈپٹی کمشنر نے بھی اس جلوس کو دیکھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔احراری کارکن امن اور سلامتی کو برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان کا ظاہری مقصد تو احمدیوں کی مذمت کرنا ہے لیکن اندرونی مقصد یہ ہے کہ بدنظمی اور لاقانونی پیدا کی جائے۔ میں مندرجہ ذیل کاروائی کرنا چاہتا ہوں جس کے لیے حکومت کی اجازت کا طالب ہوں۔

ایس پی نے اقدام کی تجویز کی

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مجھ سے متفق ہیں کہ مضبوط اقدام کرنا چاہیے میری تجویز یہ ہے کہ مولوی عبداللہ احراری، مولوی صالح محمد اور عبدالرشید اشک کو زیر دفعہ ۳ سیفٹی ایکٹ پندرہ دن کے لیے گرفتار کرلیا جائے۔ مندرجہ ذیل سات آدمیوں نے (یہاں ان کے نام نقل کیے گئے ہیں) چونکہ جلوس میں سرگرم اور نمایاں حصہ لیا تھا اس لیے میری یہ تجویز ہے کہ ان کے خلاف دفعہ ۱۵۱/۱۰۷ ضابطہ فوجداری

استعمال کی جائے۔ یہ مذکورہ بالا تین اشخاص کے نہایت پرجوش پیرو ہیں اور اس امر کا احتمال ہے کہ وہ احمدیوں کو زدوکوب یا ان کی توہین کر کے امن وامان میں خلل انداز ہونگے''۔

پھر ارادہ بدل لیا

یہ تحریر ۲۸ مارچ کو لکھی گئی تھی۔ ۴ اپریل کو انہوں نے ایک اور چٹھی لکھی۔ ''میں نے ۲ اپریل کو ان تین مولویوں کو طلب کر کے انہیں مشورہ دیا کہ جلوس نہ نکالیں اگر احراری کارکن اور ان کے حامی تمیز سے کام لیں گے اور مزید جلوس نہ نکالیں گے تو میں ان کے خلاف کاروائی ملتوی کردونگا۔

یہ رویہ اس پالیسی کے مطابق نہ تھا جو ۲۴ دسمبر ۱۹۵۱ء کی چٹھی میں معین کی گئی تھی اور اگر معاملہ یہیں رہ جاتا تو محض یہ کہہ دیا جاتا کہ مقامی افسروں کا کام تسلی بخش نہیں ہے۔ گویا ایک تاجر کتب سپرنٹنڈنٹ پولیس سے کہتا ہے کہ تم دخل در معقولات نہ دو، جاؤ اپنا کام کرو اور سپرنٹنڈنٹ پولیس اس کا کوئی خیال نہیں کرتا حالانکہ اس کا ''اپنا کام'' یہ تھا کہ نقص امن کو روکے اور فوری گرفتاریاں کرے۔ ایک موقع پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ قانون وانتظام بالکل اٹھ چکا ہے۔

اسے کیا کرنا چاہیے تھا

اور صرف سپرنٹنڈنٹ پولیس اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہی اسکے حامل باقی رہ گئے ہیں اور ان کی جو تصویر کھینچی گئی ہے اس سے ظاہر ہے کہ وہ دونوں یتیموں کی طرح ادھر ادھر دھکے کھا رہے تھے ہمیں ان پر رحم آتا ہے اس نظام حکومت پر رحم آتا ہے جس نے انکو پیدا کیا ہے

ڈی آئی جی نے اقدام کی تجویز کی

لیکن معاملہ یہیں تک نہیں رہا۔ ڈی آئی جی نے ایک پرزور یادداشت لکھ کر سپرنٹنڈنٹ پولیس کی رائے کی تائید کی اور یادداشت انسپکٹر جنرل کو بھیج دی۔ اس کے بعد ڈی آئی جی کے اسسٹنٹ نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ٹیلیفون پر بتایا کہ ڈی آئی جی نے پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت نہیں بلکہ زیر دفعہ ۱۵۱/۱۰۷ ضابطہ فوجداری کاروائی کرنے کا مشورہ دیا ہے، اس سے پہلے یا شاید بعد میں ڈی آئی جی نے پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کی رائے طلب کی اور ۲ اپریل ۱۹۵۲ء کو انہیں بتایا گیا کہ تعزیرات پاکستان

کی دفعہ ۱۵۳ الف اور ۲۹۵ الف اور ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۰۸ کا اطلاق کیا جاسکتا ہے ۳ اپریل کو ڈی آئی جی نے ایک یادداشت لکھی کہ چیف منسٹر نے رپورٹ ملاحظہ کرلی ہے۔

لیکن چیف منسٹر سے ملاقات کے بعد ارادہ بدل لیا

اور پراسیکوٹنگ ایجنسی نے یہ مشورہ دیا ہے کہ تقریروں کے خلاف مقدمات نہیں چلائے جاسکتے۔ پراسیکوٹنگ انسپکٹر کے مشورے کی یہ تعبیر نہایت عجیب ہے لیکن اگر ڈی آئی جی نے چیف منسٹر کے ساتھ ملاقات کے بعد اپنی رائے ہی بدل لی تھی تو انہوں نے الزام پراسیکوٹنگ ایجنسی پر کیوں رکھا؟

مولوی محمد شفیع سرگودھا ۲۴ جون ۱۹۵۲ء

تین ماہ بعد مولوی محمد شفیع خطیب جامع مسجد سرگودھا نے ۲۴۔ جون ۱۹۵۲ء کو جمعۃ الوداع کے موقع پر ایک تقریر کی اور سپرنٹنڈنٹ پولیس نے اس کی رپورٹ تیار کی جو کم وبیش ان الفاظ میں تھی:۔

اس کے متعلق ایس پی کی رپورٹ

۲۴ جون ۱۹۵۲ء کو عید گاہ میں مولوی محمد شفیع نے حکومت کے خلاف نفرت پھیلانے کی مہم جاری رکھی۔ یہ شخص واضح طور پر اور شدت کے ساتھ حکومت کا مخالف ہے۔ یہ مجلس احرار سے تعلق رکھتا تھا اور یونینسٹوں کی حمایت کیا کرتا تھا۔ اس نے ایک بہت بڑا اشتہاری تختہ مسجد کے اندر لگا رکھا ہے جس پر ہر روز حکومت کے خلاف مولانا مودودی کے خیالات چاک سے لکھ دیتا ہے۔ سرگودھا کے ایک شخص صابر علی نے جو زیر دفعہ ۳ پبلک سیفٹی ایکٹ گرفتار کیا گیا تھا بیان کیا کہ ایک دفعہ کہ مولوی محمد شفیع نے اس اشتہاری تختے پر لکھا کہ سابق وزیراعظم نے امریکہ کے دورے پر سرکاری روپے کا غلط استعمال کیا۔ اس شخص سے کوئی توقع نہیں کہ اپنی اصلاح کرلے گا یہ شخص بلاشبہ تفرقہ انگیز ہے۔

ایس پی نے کوئی کاروائی نہ کی

تاہم ۲۶ جون کو ایس پی نے لکھا کہ میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور پراسیکوٹر ڈی ایس پی سے اس مسئلے پر گفت وشنید کی ہے کہ مولوی محمد شفیع کے خلاف ایک حکم امتناعی کی خلاف ورزی کے لیے زیر دفعہ ۱۸۸ تعزیرات پاکستان مقدمہ چلایا جائے لیکن اس سب نے یہ فیصلہ کیا کہ ان تقریروں کے

خلاف کوئی کاروائی نہ کی جو جمعۃ الوداع کے موقع پر کی گئی تھیں۔ڈی آئی جی نے اس رپورٹ کی اطلاع انسپکٹر جنرل اور حکومت کو دی انسپکٹر جنرل نے کہا اسمیں شک نہیں کہ وہ مسجد کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے۔

آئی جی نے سنجیدگی سے اسکا نوٹس لیا،لیکن چیف منسٹر نے کوئی نہ کی

لیکن جب تک ہم یہ تسلیم نہ کرلیں کہ مسجد قانون شکنوں کے لیے مامن ہے ہم اس ذمہ داری سے آزادنہیں ہوسکتے کہ قانون ملکی کا احترام ہر حال میں قائم رکھا جائے گا۔چیف منسٹر نے ۴ جولائی کو اس یاداشت کو ملاحظہ کیا۔

کاروائی ہونی چاہیے تھی

مسٹر دولتانہ نے ہمیں عدالت میں بتایا کہ جب کبھی کوئی فائل ان کے پاس صرف بغرض اطلاع بھیجی جاتی تھی وہ اس پر صرف مختصر دستخط کردیا کرتے تھے ایک اور مقام پر انہوں نے کہا کہ وہ عام طور پر اپنے افسروں کی سفارشات سے اتفاق کرلیا کرتے تھے۔ایک اور موقع پر انہوں نے تسلیم کیا کہ اگر کسی شدید بے عملی کی اطلاع ملتی تھی تو وہ اس کے متعلق اقدام کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔یہ صورت کم از کم بے عملی کا کیس تو ضرور تھی اور اس مضبوط اقدام کے قطعاً خلاف تھی جس کا تصور ۳ نومبر اور ۲۴ دسمبر ۱۹۵۱ء میں کیا گیا تھا۔ایک شخص نے جسکو سپرنٹنڈنٹ پولیس نے افتراق انگیز دیوانہ بتایا ہے امتناع جلسہ کے احکام کو توڑ کر ایک جلسہ منعقدہ کرلیا۔اسکی کوئی وجہ بھی نہ بتائی گئی حتیٰ کہ یہ بھی نہیں کہا گیا کہ یہ جمعۃ الوداع کا موقع تھا اور جمعۃ الوداع ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔اس کے علاوہ یہ ایک ایسا کیس تھا جس کے متعلق انسپکٹر جنرل نے کاروائی کی سفارش کی تھی اور کہا تھا کہ اگر کوئی کاروائی نہ کی گئی تو حکومت قانون ملکی کو نافرمان سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری سے آزاد نہ ہوسکے گی۔

مئی میں ڈی آئی جی، سی آئی ڈی کی طرف سے
صورت حالات کا عمومی جائزہ اور پالیسی کی نئی چٹھیوں کا اجرا

۲۰ مئی ۱۹۵۲ء کو مسٹر انور علی نے ایک جامع یادداشت لکھی جس میں ۱۹۵۰ء سے لیکر احرار کے افعال اوران کے اثرات کا خلاصہ درج کیا جس کا اختصار درج ذیل ہے:۔

(۱) اکتوبر ۵۰ء میں اوکاڑہ کے مقام پر احمدی مبلغین کو راستے میں روک کران کے منہ کالے کیے گئے (ظاہر ہے کہ یہ ''جارحانہ فرقہ پرستی'' کا نتیجہ تھا) ایک سکول کا مدرس ہلاک کردیا گیا۔

(۲) قریب قریب اسی زمانے میں ایک احمدی پنڈی میں مارا گیا۔ گو اسکی ہلاکت کا فوری سبب مذہبی اختلافات سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔

(۳) جنوری ۱۹۵۱ء میں احراریوں نے سیالکوٹ میں احمدیوں کا ایک جلسہ درہم برہم کردیا

(۴) فروری میں چک جھمرہ کے مقام پر مولوی عصمت اللہ احمدی کے بیٹے کو ریلوے سٹیشن پر احرار نے چھرا مار دیا۔

(۵) مارچ میں گوجرانوالہ کے مقام پر ایک احمدی دکاندار پر حملہ کیا گیا لیکن پولیس نے اسکی جان بچالی۔

(۶) اپریل میں لائل پور کے مقام پر غلام نبی جانباز کی دھمکی کے بعد ایک احمدی دکاندار پر حملہ کیا گیا۔

(۷) مئی سمندری کے مقام پر احمدیوں کی ایک مسجد جلادی گئی۔

(۸) نومبر میں لائل پور میں احمدیوں کا ایک جلسہ درہم برہم کیا گیا جسکے باعث طرفین کو جانی نقصان اٹھانا پڑا۔

(۹) اسی مہینے میں احرار نے ملتان میں احمدیوں کے ایک جلسے کو منتشر کرنے کی کوشش کی۔

(۱۰) مارچ ۱۹۵۲ء میں سرگودھا کے مقام پر حکم امتناعی کے باوجود احراریوں کا ایک جلوس

نکالا گیا ہم ابھی اس کا ذکر کر چکے ہیں۔

(۱۱) اپریل ۱۹۵۲ء میں راولپنڈی کے ایک جلسے میں ایک نوجوان نے کھڑے ہو کر لوگوں کو چودھری ظفر اللہ خاں کے قتل کی ترغیب دی۔

(۱۲) اسی مہینے گوجرانوالہ میں چودھری محمد ظفر اللہ خاں کے دو جنازے نکالے گئے جن کے ساتھ یہ توہین آمیز نعرے لگائے گئے ''ظفر اللہ پتر چوردا۔ نعرہ مار وزوردا''۔

(۱۳) مئی ۱۹۵۱ء میں لائل پور کے مقام پر سید عطا اللہ شاہ بخاری نے بڑے پیمانے پر مظاہروں کا اعلان کیا۔

(۱۴) سی آئی ڈی نے دوران مراسلت میں ایک چٹھی پکڑی جس میں لکھا تھا کہ جو شخص وزیر خارجہ کو قتل کرے گا اسکو جنت الفردوس میں جگہ ملے گی۔

مسٹر انور علی نے کہا کہ احراری جو تقسیم کے بعد مسلمانوں کو اپنا منہ نہ دکھا سکتے تھے۔ اب جارحانہ رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ وہ لوگوں کو بتا رہے ہیں کہ انہوں نے مسلم لیگ کے اعلیٰ لیڈروں سے صلح کر لی ہے۔ گورنر، چیف سیکرٹری اور انسپکٹر جنرل نے ان کو وقتاً فوقتاً تنبیہ کی۔ لیکن ان تنبیہات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اب انہوں نے متعدد مقامات پر اپنی شاخیں کھول دی ہیں اور ان کے ممبروں کی کل تعداد ۱۰۲۶ ہے۔ اگر انہیں قوت اور ہر دلعزیزی حاصل کرنے کا موقع دے دیا گیا تو ان کا تدارک روز بروز دشوار ہوتا چلا جائے گا آخر میں انہوں نے لکھا کہ ''ہوم سیکرٹری اور انسپکٹر جنرل سے بات چیت کرنے کے بعد ان کی سفارشات حسب ذیل ہیں:۔

ڈی آئی جی نے دوبارہ سفارش کی کہ احرار کو خلاف قانون جماعت قرار دیا جائے

۲۰ مئی ۱۹۵۲ء (۱) جیسا کہ انہوں نے ۱۹۵۰ء میں تجویز کی تھی احراریوں کو خلاف قانون جماعت قرار دے دینا چاہیے۔

(۲) سید عطا اللہ شاہ بخاری، قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور مولوی محمد علی جالندھری

نظر بند یا محبوس کر لیے جائیں۔

(۳) احراریوں کے جلسے ہر حال میں ایک یا دو سال کے لیے ممنوع قرار دے دیے جائیں۔

مسٹر قربان علی خان کی پیش گوئی اور تنبیہ

اس کے بعد مسٹر قربان علی خاں نے ایک پیشگویانہ اور عمیق یاداشت لکھی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صورت حالات کا کتنا صحیح اندازہ کر رہے تھے اور حکومت کا کوئی فیصلہ کن قدم نہ اٹھانا ان کے نزدیک ''سیاسی تامل'' کا نتیجہ تھا۔ ہم اس کا صرف مفاد ذیل میں درج کرتے ہیں:

''آخر کب تک یاداشتیں لکھنے ہی کے مرحلے پر مقیم رہیں گے؟ مجھے کامل یقین ہے کہ اگر حکومت نے احرار کو ہاتھ نہ لگانے کی موجودہ پالیسی جاری رکھی تو یہ لوگ جلد یا بدیر کسی ایسے ہولناک جرم کا ارتکاب کریں گے کہ حکومت کو اس امر کی جواب دہی سخت مشکل ہو جائے گی کہ سی آئی ڈی کی مسلسل اور پرزور رپورٹوں کے باوجود اس نے کوئی بروقت اقدام کیوں نہ کیا۔ میں جانتا ہوں کہ اس قسم کا فیصلہ کرنا مشکل ہے لیکن کسی نہ کسی طرح حکومت کو خواہ وہ کہیں بھی ہو عوام کی صحیح رہنمائی لازماً کرنی ہوگی۔ اگر ہر پارٹی کو یہ خوف ہے کہ احراری اپوزیشن سے جا ملیں گے تو قانون و انتظام کو بحال رکھنا بے حد مشکل ہو جائے گا۔ آج احرار کوئی قوت نہیں رکھتے لیکن کل وہ نہایت قوی ہو سکتے ہیں اگر حکومت کو یقین ہے کہ ان کا طرز عمل کسی نہ کسی کاروائی کا متقاضی ہے تو اس کاروائی کا بہترین موقع آج ہی ہے''۔

مسٹر قربان علی خاں نے عدالت میں اپنے بیان کی تصریح کی

سوالات کرنے والوں نے مسٹر قربان علی خاں سے سوال کیا تھا کہ دونوں حکومتوں کی اضافی ذمہ داری کے متعلق اس یاداشت کا مفہوم کیا ہے؟ خاں صاحب کے تحریری بیان سے ذیل کے فقرات نقل کیے جاتے ہیں:

(۱) صاف اور دوٹوک جواب یقیناً مرکزی حکومت کی پریشانی کا موجب ہوتا اور صوبائی

حکومت کواس سے اور بھی زیادہ گھبراہٹ ہوتی ۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اس مسئلے کا تعلق صرف پنجاب سے نہ تھا''

(۲)''میں نے اس بات پر زور نہیں دیا کہ مطالبات کا جواب کیونکر دیا جائے بلکہ میں نے مقامی حکومت سے یہ کہا تھا کہ عوام کی صحیح رہنمائی کر کے انہیں بتائے کہ ایک باقاعدہ منظم حکومت میں عوامی مطالبات کس طریقے سے پیش کرنے چاہئیں ۔ میں نے حکومت پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ جو لوگ حکومت کو ایک خاص فیصلے پر مجبور کرنے کی غرض سے تشدد کا وعظ اور تشدد دہی کا استعمال کر رہے ہیں ۔ ان کے خلاف شدید تعزیری اور موثر انسدادی کاروائی کرنی چاہیے۔ یہ سوال میرے ذہن میں کبھی نہ تھا کہ صوبائی حکومت مرکزی حکومت کی منظوری کے بغیر کوئی دوٹوک جواب دینے کی ذمہ داری لے لے۔

(۳)میرے لیے یہ محسوس کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ صوبائی حکومت مرکزی حکومت سے یہ چاہتی ہے کہ وہ صورت حال کی ناگواری ذمہ داری کا سامنا خود کرے۔میرے خیال میں یہ دونوں ہی (اس ناگوار ذمہ داری سے بچنے کی کوشش کر رہی تھیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔میں اپنی یاداشتوں میں جو گزارش کر رہا تھا وہ یہ تھی کہ حکومت پنجاب اس خیال سے بالکل خالی الذہن رہے کہ مرکزی حکومت مطالبات کے متعلق کیا کرتی ہے اور خود لاقانونی کے ظہور پر مستعدی اور مضبوطی سے تدارک کی تدبیر اختیار کرے۔ اگر مرکزی حکومت کوئی مضبوط فیصلہ کر دیتی تو بہت بڑی مدد کا باعث ہوتی لیکن اگر اس نے کوئی مضبوط فیصلہ نہیں کیا تو اس سے صوبائی حکومت قانون وانتظام کے قیام کی ذمہ داری سے سبکدوش تو نہ ہوگئی تھی۔

اس طریق سے مسٹر قربان علی خاں نے ذیل کے معاملات کی طرف حکومت کی توجہ بطور خاص مبذول کرادی

(۱) آپ لوگ سی آئی ڈی کے مشورے کو مسلسل نظرانداز کر رہے ہیں اور اگر کوئی واقعہ ہوگیا تو آپکے لیے اپنی ناکامی کی توجیہ کرنا مشکل ہوجائے گا

(۲) اگر آپ اس لیے کوئی کاروائی نہیں کرتے کہ اس سے آپ کو پریشانی ہوتی ہے تو مرکزی حکومت کا یہ اندیشہ بھی بالکل صحیح ہے

(۳) لیکن چونکہ آپ لوگ قانون انتظام کے ذمے دار ہیں اس لیے آپ کو مرکز سے استصواب کیے بغیر ہر صورت حالات کا تدارک کرنا چاہیے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا ۲۵ مئی کو چیف منسٹر اور دوسرے افسروں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جنکے فیصلے پالیسی کی اس تیسری چٹھی میں ظاہر کیے گئے جو ۵ جون ۱۹۵۲ء کو جاری کی گئی۔ اس میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو ہدایت دی گئی تھی کہ بلا استثنا احمدیوں اور احراریوں کے تمام جلسوں کو ممنوع قرار دیں اور جہاں کہیں کوئی جلسہ ہونے والا ہو وہاں دفعہ ۱۴۴ عائد کر دیں۔

چیف منسٹر اور افسروں کی کانفرنس پالیسی کی چٹھی مورخہ ۵ جون

اس چٹھی نے ۲۴ دسمبر ۱۹۵۱ء والی چٹھی کو منسوخ کر دیا جس میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو اختیار تمیزی کے استعمال کا موقع دیا گیا تھا۔ ایک اعتبار سے یہ گویا اس حقیقت کا اعتراف تھا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تمام معاملات میں اختیار تمیزی کے استعمال کی اہلیت نہیں رکھتے۔ تاسم ۱۰۴۶ آدمیوں کی ممبری خلاف قانون قرار نہ دی گئی نہ کسی شخص کی زبان بندی یا نظر بندی کی گئی۔ یہ معقول سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ جس حالت میں حکومت کے کم سے کم ناگوار اقدام سے مطلوبہ نتیجہ مترتب ہوسکتا تھا تو کسی شدید تدبیر کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن عنقریب واضح ہو جائے گا کہ مطلوبہ مقصد حاصل نہیں ہوا تھا۔ احرار مسجد میں منتقل ہو گئے اور چونکہ جمعتہ الوداع سر پر آ رہا تھا لہٰذا حکومت نے ۱۹ جون کو ایک لاسلکی ہدایت صادر کی کہ اگر احراری جمعتہ الوداع کی نماز سے قبل یا بعد جلسے منعقد کرنے کا ارادہ کریں تو مقام جلسہ کا ذکر کیے بغیر امتناعی احکام صادر کر دیے جائیں۔ اور مقامی اماموں کو تنبیہ کر دی جائے۔

۱۹ جون کی چٹھی

تاہم اگر امتناع کے باوجود جلسہ منعقد ہو جائے تو اس میں کوئی مداخلت نہ کی جائے اور خلاف ورزی احکام کے لیے گرفتاریاں کچھ دیر توقف کے بعد کی جائیں۔

۲۸ جون کی چٹھی

۲۸ جون کو ایک اور چٹھی جاری کی گئی جسکا منشا یہ تھا کہ اگر حکم امتناعی کی خلاف ورزی کی جائے تو قانونی کاروائی صرف احرار کے اوران میں بھی ممتاز اشخاص کے خلاف کی جائے۔ مقصد یہ تھا کہ انہیں عوام سے منقطع کر دیا جائے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ مئی اور جون ۱۹۵۲ء میں جو کاروائی کی گئی وہ بالکل ہی ناکافی تھی۔ لیکن چونکہ مسٹر دولتانہ کہتے ہیں کہ صرف یہی کاروائی ممکن تھی اس لیے اس موقف کا مزید جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان کے قول کے مطابق اس اجلاس میں جو سب سے پہلا معاملہ زیرِ غور آیا وہ یہ تھا کہ آیا مطالبات پیش کرنا بھی ممنوع قرار دیا جائے۔ دوسرا معاملہ یہ تھا کہ ان مطالبات کی حمایت میں پروپیگنڈا روک دیا جائے۔ اور تیسرا مسئلہ یہ تھا کہ آیا احرار کے خلاف یکطرفہ اقدام کیا جائے۔

کانفرنس کے متعلق مسٹر دولتانہ کا بیان

احراریوں کو خلاف قانون جماعت کیوں قرار نہ دیا جاسکا:

پہلے تین معاملات کا انحصار اس امر پر تھا کہ آیا مطالبات حق بجانب ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ ان کے مالہ وماعلیہ کے متعلق فیصلہ صوبائی حکومت کے اختیار سے باہر تھا۔ باقی رہا تیسرا معاملہ تو اس امر کے متعلق نہ کوئی قطعی معلومات اور نہ کوئی گہرا شبہ موجود تھا کہ احراری مملکت کے خلاف سازش کر رہے ہیں یا کسی دشمن طاقت کے کارندے ہیں یا کھلم کھلا تشدد کی حمایت کر رہے ہیں۔ لہٰذا ہم ان کے خلاف تعزیری یا انسدادی کاروائی مرکز کے مشورے کے بغیر نہ کر سکتے تھے لیکن قانون وانتظام کے پہلو سے ہم نے سخت کاروائی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کانفرنس کی عام رائے یہی تھی کہ جب تک مرکز کوئی پالیسی وضع نہ کرے کوئی اقدام نہیں کیا جاسکتا۔

مسٹر دولتانہ کے مفروضات غلط ہیں:

مسٹر انور علی یا مسٹر قربان علی نے اپنی یاداشتوں میں یہ نہیں لکھا تھا کہ احراریوں کو اس بنا پر خلاف قانون جماعت قرار دیا جائے کہ وہ مملکت کے خلاف سازش کر رہے ہیں یا کسی دشمن طاقت

کے کارندے ہیں بلکہ اس کاروائی کوحق بجانب ثابت کرنے کے لیے تشدد اور لاقانونی کے متعدد واقعات چیف منسٹر کے علم میں لائے گئے تھے۔دلیل دی گئی ہے کہ انسدادی یا تعزیری کاروائی مرکز کے مشورے کے بغیر نہیں کی جاسکتی لیکن قانون وانتظام کے پہلو سے سخت کاروائی کا فیصلہ کرلیا گیا ہے۔اس دلیل کی بنیاد دو مفروضات پر ہے۔اول: کہ انسدادی یا تعزیری کاروائی قانون وانتظام کے پہلو سے نہیں کی جاتی اور دوم: کہ کسی انجمن کو خلاف قانون قرار دینے سے پہلے مرکز سے مشورہ کرنا ضروری ہے یہ دونوں مفروضات غلط ہیں۔

مرکز کے فیصلے کا تصور ے جولائی تک نہ تھا:

اس کے علاوہ جب ۲۴مئی ۱۹۵۲ کی کانفرنس منعقد ہوئی اس وقت مرکز سے مشورہ کرنے کا خیال کسی کے ذہن میں نہ آیا تھا۔یہ بات مسٹر دولتانہ کو پہلے پہل ۷ جولائی ۱۹۵۲ءکوسوجھی تھی۔جب وہ نتھیا گلی میں مقیم تھے۔اور ایک فائل ان کے پاس بھیجی گئی تھی یہ فائل ہوم سیکرٹری مسٹر غیاث الدین احمد کی بعض تجاویز سے متعلق تھی جو انہوں نے وزارت داخلہ کی چٹھی مورخہ ۲ جولائی ۱۹۵۲ء سے برانگیختہ ہوکر پیش کی تھیں۔ہم اس سے قبل اس چٹھی کا ذکر کر چکے ہیں۔مرکزی حکومت نے صوبجات کی رہنمائی کے لیے جو دو گشتی چٹھیاں جاری کی تھیں۔ان میں یہ چٹھی دوسری تھی اس میں سابقہ ہدایات کی طرف توجہ دلائی گئی تھی کہ جنگجویانہ اور جارحانہ فرقہ پرستی کو سختی سے دبایا جائے اور آخر میں حکومت پنجاب کے ''تازہ'' اقدامات پر اظہار اطمینان کیا گیا تھا۔یہ وہی اقدامات تھے جن کا ہم اب جائزہ لے رہے ہیں اس پر مسٹر غیاث الدین احمد نے یہ رائے ظاہر کی۔

ہوم سیکرٹری نے مرکز کی چٹھی مورخہ ۲ جولائی پر تبصرہ کیا:

کہ اب وقت آ گیا ہے کہ جب مرکز سے اونچی سطح پر ایک پالیسی وضع کرنے کی استدعا کی جائے ''جس مذہبی جنون اور فلسفہ نفرت کی تلقین احرار نے کی ہے اسکو اگر نابود نہ کیا گیا تو یہ فتنہ صرف صوبے تک محدود نہ رہے گا۔تحریک ختم نبوت کے متعلق مرکز ہمیں بتائے کہ ہم کس طریق پر عمل کریں کیا ہم ان سرگرمیوں سے اغماض کریں جن کا مقصد یہ ہے کہ ایک چھوٹے طبقے کو جسمانی یا مذہبی

اعتبار سے کاملاً ان سرگرمیوں سے مغلوب کر دیا جائے۔۔۔۔مرکز کو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ آیا قانون و انتظام کی مصلحتوں کو عقائد مذہبی پر ترجیح دینی چاہیے۔ چودھری محمد ظفر اللہ خان کے متعلق عام آدمیوں میں روز بروز یہ خیال پھیل رہا ہے کہ خود ان کے بعض رفقا اس تحریک کے پیچھے ہیں۔''

ہوم سیکرٹری نے تجویز کی کہ چیف منسٹر وزیراعظم پاکستان کو ایک ذاتی چٹھی لکھیں۔

چیف سیکرٹری کا جائزہ:

چیف سیکرٹری حافظ عبدالمجید نے اس فائل کو اوپر بھیجتے ہوئے ایک یاداشت لکھی جس میں صورت حالات کا اندازہ اور جائزہ ہماری رائے میں بے نظیر تھا۔ ان کی تحریر کا مفاد یہ ہے: ''ہمیں قانون و انتظام کے قیام کے لیے کاروائی کرنے میں مرکز کی تائید و حمایت کی ضرورت نہیں لیکن احرار نے جو یہ اثر پیدا کیا ہے کہ مرکز یا بعض وزرا یا حکام ان کی شورش کے حامی ہیں تو اس اثر کو دور کرنے کے لیے ایک بیان کی اشاعت ہمارے نزدیک ضروری ہے۔ ہوم سیکرٹری نے اس ذکر کو حذف کر دیا ہے کہ مرکز کی پالیسی وزارت داخلہ کی چٹھی مورخہ ۷ ستمبر جولائی ۱۹۵۲ء میں واضح کی جا چکی ہے اور پی یو سی چٹھی مورخہ ۲ جولائی ۱۹۵۲ء میں اس کا اعادہ بھی کیا جا چکا ہے۔

مرکز اپنا مافی الضمیر ظاہر کر چکا ہے:

پالیسی یہ ہے کہ اس قسم کے نزاعات کو مناسب حدود سے تجاوز کی اجازت نہ دینی چاہیے وغیرہ۔ مرکز نے حکومت پنجاب کے ''تازہ اقدام'' پر اظہار اطمینان بھی کیا تھا۔ رہے دوسرے مسائل یعنی احمدیوں کو اقلیت قرار دینا اور وزیر خارجہ کو برطرف کرنا تو ان سے ہمارا کوئی سروکار نہیں ہم پہلے مطالبہ کے متعلق مرکز کے فیصلے کی امکانی توقع نہیں رکھتے۔ اس لیے کہ اس کا فیصلہ کرنا دستور ساز اسمبلی کا کام ہے اور ہم وزیراعظم کو یہ مشورہ دینے کے اہل نہیں ہیں کہ وہ وزیر خارجہ پر اپنے اعتماد کا اظہار کریں۔

اس تحقیقات کے دوران میں شروع سے آخر تک جب کبھی کوئی ایسی یاداشت یا کوئی ایسا بیان ہمارے سامنے آیا ہے جس میں یہ کہا گیا تھا کہ مرکز کو اپنا خیال ظاہر کرنا چاہیے تو ہمارا بھی احساس

کچھ اسی قسم کا رہا ہے مرکز کو معلوم تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور اس نے کہہ دیا تھا کہ ان لوگوں کو جائز حدود تک مذہبی پروپیگنڈا کرنے دو لیکن اگر ان کا رویہ جارحانہ ہو جائے تو انکی سرکوبی کر دو۔تم نے مئی اور جون ۱۹۵۲ء میں جلسوں کا امتناع اور مقدمات کی تیاری کر کے جو قدم اٹھایا ہے وہ ہمارے نزدیک بالکل درست ہے۔ بہر حال جب یہ فائل نتھیا گلی میں مسٹر دولتانہ کے پاس پہنچی تو انہوں نے ۷ جولائی کو اس پر ایک لمبا نوٹ لکھا جس کا اختصار یہ ہے:۔

مسٹر دولتانہ کو تسلیم ہے کہ مرکز نے اپنا خیال ظاہر کر دیا ہے اور قانون و انتظام کے معاملے کا تعلق مجھ سے ہے:

''میں اس امر کی تدبیر کر رہا ہوں کہ مرکز سے ایک مستقل اور قطعی پالیسی وضع کراؤں۔ چنانچہ غالباً اس مہینے کے آخر میں ایک کانفرنس کراچی میں منعقد ہو گی اب وزارت خارجہ کی چٹھی مورخہ ۲ جولائی ۱۹۵۲ء (پی یو سی) کے پیش نظر مرکز کوئی رسمی مراسلہ بھیجنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ حقیقت ظاہر و باہر ہے کہ ہمیں قانون و انتظام کے قیام کے فرض کا احساس دلانے کے لیے کسی رہنمائی کی حاجت نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ لوگوں کو تشدد پر اکسانے والوں کا سختی سے تعاقب کریں اور اپنی غیر جانب داری کو نشر و اشاعت کے ذریعے سے بالکل واضح کر دیں۔ ہمیں جلسوں کے موجودہ امتناع کو قائم رکھنا چاہیے لیکن عوام کی ''ذکاوت حس'' کے پیش نظر مسجدوں میں مداخلت نہ کرنی چاہیے۔ مسجدوں کے متعلق یہ پالیسی بلاشبہ منطق کی رو سے غلط ہے لیکن انتہائی اصطلاحی قانونی رویہ اختیار کرنے سے لوگ مشتعل ہوں گے علاوہ بریں مساجد کے اندر ہونے والے جلسوں میں شورش انگیزی کی اہلیت نہیں ہوتی''۔

کوئی شہادت نہیں کہ ۲۴ مئی کی کانفرنس میں مرکز سے استصواب کا کوئی ذکر کیا گیا تھا:

مسٹر دولتانہ نے اپنے تحریری بیان میں ایک علیحدہ عنوان ''کوششیں'' کے ماتحت اپنی ان کوششوں کا ذکر کیا ہے جو ان کی حکومت نے مرکز سے فیصلہ حاصل کرنے کے لیے کیں۔ ان کے قول

کے مطابق پہلی کوشش نتھیا گلی میں کی گئی جہاں انہوں نے خواجہ شہاب الدین، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی سردار عبدالرب نشتر اور دوسرے حضرات سے ملاقات کی اور ان میں دو پہلے حضرات نے انہیں یقین دلایا کہ وہ مسٹر دولتانہ کا نقطہ نگاہ وزیر اعظم کی خدمت میں پیش کر دینگے جس کیس کا نتیجہ ۲۴ مئی ۱۹۵۲ء کے فیصلے کی شکل میں نکلا نہ اسکی فائل میں اور نہ کسی دوسری فائل میں اس امر کے آثار نظر آتے ہیں کہ اس ملاقات میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اس معاملے پر غور کرنا مرکز کا کام ہے۔ مسٹر غیاث الدین اور مسٹر انور علی نے جو طویل بیانات دیے ان کے دوران میں ان میں سے کسی سے بھی یہ سوال نہیں کیا گیا کہ آیا ایسا کوئی موضوع زیر بحث آیا تھا لہٰذا احرار کو خلاف قانون جماعت قرار نہ دینے کی جو دلیل پیش کی گئی ہے اس میں کوئی جان نہیں۔

اس کے بعد مسٹر دولتانہ نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ ان دونوں پولیس افسروں نے بھی اپنی پرزور یاداشتوں کے باوجود کانفرنس کے دوسرے حاضرین نے بھی میرے ساتھ ایک فیصلے پر اتفاق کرلیا پوری صورت حالات پر بحث کی گئی اور آخر میں ہر شخص کی رائے یہی تھی کہ کسی سیاسی پارٹی کو خلاف قانون قرار دینا بے حد شدید اقدام ہے اور مجلس احرار چونکہ ایک آل پاکستان انجمن ہے۔ اس لیے ایسا اقدام آل پاکستان سطح ہی پر کیا جا سکتا ہے اور پھر اسکو ان لوگوں کے سامنے حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کرنی ہوگی جو حکومت کے نظام جمہوریت کو قبول کر چکے ہیں۔

ڈی آئی جی کا خیال ہے کہ پرانی حکومت میں زیادہ مضبوط اقدام کیا گیا ہوتا:

اول۔ چونکہ حکومت پنجاب کے وکیل نے یہ دعویٰ پیش کیا تھا کہ مسٹر دولتانہ عام طور پر اپنے افسروں کے مشورے پر ٹھنڈا پانی ڈال دیا کرتے ہیں اس لیے مسٹر دولتانہ کے وکیل کا یہ کام تھا کہ جس جس بڑے موقع پر پالیسی کی ضرورت محسوس ہوئی تھی ان کے متعلق افسروں سے بطور خاص سوال کر لیتے۔ آخر مسٹر انور علی سے یہ کیوں نہ پوچھا گیا کہ جس تجویز نے ان کو ۱۹۵۰ء سے مبتلائے پریشانی کر رکھا تھا اس کی قطع و برید پر وہ کیونکر متفق ہو گئے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک سوال کے جواب میں

انھوں نے بیاں کیا کہ ''میری یاداشت مورخہ ۲۰ مئی ۱۹۵۲ کی بنیاد پر حکومت نے شدید اقدام کیا اور جلسوں کا امتناع کر دیا''۔

لیکن ایک اور مقام پر انہوں نے یہ بھی کہا کہ ''اگر احرار میری تجویز (۱۹۵۰ء) کے مطابق خلاف قانون جماعت قرار دیے گئے ہوتے تو ۱۹۵۲ء میں نے پھر یہی تجویز کی اور اس وقت بھی اس کے اختیار کرنے کی گنجائش ابھی موجود تھی''۔ آگے چل کر کہا کہ جو کاروائی میری تجویز پر وقتاً فوقتاً کی جاتی تھی اس سے مجھے محسوس ہوتا تھا کہ پرانی حکومت میں یہی اقدام زیادہ سریع اور موثر ہوتا'' جب تک یہ فرض نہ کرلیا جائے کہ میاں انور علی نے دو متضاد پوزیشنوں کو (یعنی ۱۹۵۰ء کی اپنی پوزیشن اور مسٹر دولتانہ کی بالکل مختلف پوزیشن) تطابق دینے کی کوشش کی ہے معمولی تعبیر کی رو سے تو ہم شدید اقدام کو محض تقابلی مفہوم ہی دے سکتے ہیں یعنی اقدام ان واقعات کے مقابلے میں شدید تھا جو اس وقت تک رونما ہو رہے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مسٹر انور علی اپنے ذہن میں فقرے کے پہلے حصے پر زور دیتے ہوں (یعنی: میری یاداشت کی بنیاد پر'') کیونکہ ابتداً انہیں صرف یہی فکر ہونی چاہیے تھی کہ اپنی پوزیشن کو صاف کریں اور بتائیں کہ انہوں نے صورت حالات کی سنگینی سے حکومت کو مطلع کرنے میں کس حد تک کوشش کی تھی۔

کسی انجمن کو خلاف قانون جماعت قرار دینا ہرگز جمہوریت کے منافی نہیں:

دوم۔ ان دو باتوں کے درمیان کوئی منطقی یا سببی تعلق نہیں معلوم ہوتا کہ (۱) احرار ایک آل پاکستان انجمن تھی اور (۲) ان کے خلاف من حیث الجماعت جو اقدام کیا جائے گا۔ اس کو ''لوگوں کے سامنے حق بجانب ثابت کرنا پڑے گا جو جمہوری نظام حکومت کو قبول کر چکے ہیں'' اگر احرار صرف صوبائی انجمن ہوتے تو کیا انہیں خلاف قانون جماعت قرار دینا جمہوریت کے خلاف نہ ہوتا؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انکے جلسے ممنوع قرار دیے گئے جو چیز اس اقدام کی وجہ جواز تھی وہ زیادہ شدید کاروائی کے لیے بھی وجہ جواز ہو سکتی تھی۔ اس سلسلے میں ایک ہی دلیل موزوں تھی کہ احرار نے کوئی ایسی سنگین حرکت نہ کی تھی

کہ ان کو خلاف قانون جماعت قرار دینا حق بجانب ہو جاتا لیکن اس حالت میں مسٹر دولتانہ کو یہ کہنا پڑتا کہ ڈی آئی جی اور انسپکٹر جنرل پیشگویانہ یا سیت یا یاس آمیز پیشگوئی کے عادی ہو چکے تھے۔

احرار کے متعلق مسٹر انور علی کا اندازہ صحیح تھا:

ہمارا نیک نیتی سے یقین ہے کہ مسٹر انور علی نے احرار کو خلاف قانون جماعت قرار دینے کے اثر کے متعلق جو کچھ کہا اس سے ظاہر ہے کہ صورت حالات کے متعلق انکا اندازہ بالکل صحیح تھا اگر یہ تدبیر مئی ۱۹۵۲ء میں اختیار کر لی جاتی تو احرار علما سے مذہبی اپیل کرنے کے قابل نہ ہوتے اور جولائی ۱۹۵۲ء میں آل مسلم پارٹیز کنونشن منعقدہ نہ ہوئی ہوتی اور اگر علما بیچ میں نہ کود پڑے ہوتے تو احمدی نزاع کو دوسرے فرقہ وارانہ نزاعات سے (جن سے ہم واقف ہیں) مختلف حیثیت دینے کی نوبت نہ آتی۔

۵ جولائی ۱۹۵۲ء کے فیصلے

۲۸ جون ۱۹۵۲ء کو یا اس کے لگ بھگ مسٹر دولتانہ مجلس اصول اساسی کے ایک اجلاس میں شریک ہونے کے لیے نتھیا گلی گئے۔ ''زمیندار'' نے اپنی اشاعت مورخہ یکم جولائی میں یہ اطلاع شائع کی کہ مسٹر دولتانہ نے روانگی سے پہلے دو گھنٹے تک اپنے افسروں سے بات چیت کی۔ حکومت پنجاب کے وکیل فضل الہٰی نے کہا کہ اس بات چیت کے دوران مین مسٹر دولتانہ نے ان فیصلوں کے متعلق اپنے افسروں کو ہدایت دی تھی جو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کے اجلاس مجوزہ ۵ جولائی میں ہونے والے تھے۔ مسٹر دولتانہ کو یاد نہیں کہ آیا انہوں نے دو گھنٹے کی کوئی خاص گفتگو کی تھی لیکن تسلیم کیا کہ وہ یقیناً اپنے افسروں سے قریب قریب باقاعدہ ملاقات کرتے رہتے تھے وہ یہ کہنے سے بھی قاصر ہیں کہ انہوں نے افسروں سے مجوزہ کانفرنس کے موضوع پر کوئی بات چیت کی تھی۔

اس کانفرنس کی صدارت چیف سیکرٹری نے کی اور اس میں اضلاع کے مندوبین کے علاوہ انسپکٹر جنرل ڈی آئی جی، سی آئی ڈی ہوم سیکرٹری اور ڈائریکٹر تعلقات عامہ بھی شریک ہوئے اس کانفرنس میں یہ فیصلے کیے گئے:

(۱) احکام زیر دفعہ ۱۴۴ میں مقام جلسہ کا ذکر نہ کیا جائے۔ (۲) اگر کوئی احراری یا کوئی احمدی کسی ایسے جلسے میں تقریر کرے جو اسکی جماعت نے منعقد نہ کیا ہو اور وہ تقریر قابل اقدام ہو تو اسکی رپورٹ حکومت کو بھیجی جائے لیکن اس اثنا میں اسکو گرفتار نہ کیا جائے۔ (۳) جو جلسے مسجدوں کے باہر منعقد ہوں ان کو بھی منتشر نہ کیا جائے لیکن بعد میں احمدیوں اور احراریوں کے ممتاز لیڈروں کے خلاف (جیسی صورت ہو) مقدمات رجسٹر کر لیے جائیں۔۔۔۔۔۔ (۵) آل مسلم پارٹیز کنونشن میں جو ۱۳ جولائی ۱۹۵۲ء کو ہونے والی ہے کوئی مداخلت نہ کی جائے (گو وہ جلسہ جلسوں کے امتناع کی خلاف ورزی ہی میں ہو رہا ہو) اگر اس کنونشن شریک ہونے والے علما سے رابطہ پیدا کر کے انہیں تشدد کی مذمت کرنے پر آمادہ کر لیا جائے تو غالباً یہ امر مفید ثابت ہوگا۔

ہم نے دیکھا ہے کہ ۵ جون کی ہدایات کو ۲۸ جون کی چٹھی سے کس طرح نرم کر دیا گیا کہ اگر کسی امتناعی حکم کی خلاف ورزی کی جائے تو صرف احراریوں اور ان میں سے بھی صرف ممتاز احراریوں کے خلاف قانونی کاروائی کی جائے۔ مقصد یہ تھا کہ احراریوں کو عوام سے الگ تھلگ کر دیا جائے یہ واضح تھا کہ اس سے ممتاز احراری عام احراریوں سے بھی الگ تھلگ ہو جائیں گے۔ اس سے ممتاز لیڈر یہ محسوس کریں گے کہ شہادت کا تاج صرف انہی کے لیے مخصوص ہے اس سے قبل ۱۹ جون کو مسجدوں کے متعلق جو فیصلہ کیا گیا وہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ درست ہے کہ مسجد کے اندر کسی جلسے کو منتشر کرنا اور وہیں لوگوں کو گرفتار کرنا حماقت ہوتا لیکن یہ کہنا کہ مسجدوں کے باہر منعقد ہونے والے جلسوں میں بھی خلل اندازی نہ کی جائے تا آنکہ ان کا زہر پھیل جائے، امتناعی احکام کو تماشا بنا دینا ہے۔

۵ جولائی کے فیصلوں سے نظم حکومت کے ذمہ داروں کے موقف کمزور ہو گیا

امتناعی حکم کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز منع کی گئی ہے وہ واقع نہ ہو اگر یہ اعلان ہو کہ فلاں وقت اور فلاں مقام پر ایک جلسہ ہوگا اور وہ ممنوع کیا جا چکا ہو تو سیدھا سادہ کام یہ ہے کہ انعقاد سے دو گھنٹہ پہلے

اس مقام پر نصف درجن پولیس کے آدمیوں کی ڈیوٹی لگادی جائے تا کہ لوگ جمع نہ ہو سکیں اور یہ ایسی بات نہیں جو ہم پہلے پہل تجویز کر رہے ہوں لیکن حکومت کا قول یہ ہے کہ ان لوگوں کو موج اڑانے دو اور اگر جلسے میں پانچ آدمی تقریریں کریں اور ان میں صرف ایک احراری ہو اور وہ کوئی ممتاز لیڈر نہ ہو تو کسی کے خلاف کوئی قانونی کاروائی نہ کرو چنانچہ اب تک اس حکم کی خلاف ورزی نہیں ہوئی۔

۵ جولائی کے فیصلوں کا اثر

مرکزی حکومت کو اطلاع دی گئی کہ تمام احمدیوں اور احراریوں کے جلسے ممنوع قرار دے دیے گئے ہیں۔ کراچی میں اس کو ایک بہت بڑا فیصلہ سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ حکومت اس پر اطمینان کا اظہار کرتی ہے لیکن اس کے اثر پر غور کیجیے۔ جلسوں کو انعقاد کی اجازت دی جاتی ہے غیر احراریوں اور غیر احمدیوں کو موقع دیا جاتا ہے کہ جیسی مکروہ ناپاک باتیں چاہیں کریں۔ یہاں تک کہ معمولی قانون بھی ان کے خلاف معطل کر دیا جاتا ہے کیونکر اگر معمولی قانون سے کام لیا جائے تو الگ تھلگ کرنیکی پالیسیوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ لہٰذا مولوی محمد علی خطیب جامع مسجد سرگودھا اور ان کا اشتہار تختہ بدستور آزاد رہیگا (لیاقت علی خاں نے سفر امریکہ کے دوران میں روپے کا ناجائز استعمال کیا) کیونکہ مولوی صاحب اب احراری نہیں رہے اور آخر ممتاز احرار میں سے کتنے آدمیوں کا آپ پتہ دے سکتے ہیں۔ ان میں سے چھ تو گوجرانوالہ میں ہیں۔ دو سرگودھا میں اور ان میں آپ دو اور فالتو آدمیوں کا بھی اضافہ کر لیجیے۔ آگے چل کر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ سیالکوٹ کے منظور احمد جنھیں ''احمدیوں کے خلاف راسخ العقیدہ کارکن'' کہا جاتا تھا اور بشیر احمد خطیب جامع مسجد پسرور جو نہایت متعصب احراری اور مقامی مجلس احرار کا صدر تھا اور جس کو ۱۹۳۲ء کی تحریک میں ایک ماہ کی سزا ملی تھی۔ ان دونوں کے خلاف نومبر ۱۹۵۲ء میں گلوشاہ کے میلے پر خطرناک تقریریں کرنے کی پاداش میں کوئی مقدمہ نہ چلایا گیا، اس لیے کہ یہ چھوٹے لوگ تھے۔

مزید تنقید

پھر اگر کوئی بدقسمت انسان احراری بھی ہے اور ممتاز احراری بھی لہٰذا قانونی کاروائی سے بچ

نہیں سکتا تو اس کو بچانے کے لیے دوسرا فیصلہ موجود ہے جس کا منشا یہ ہے کہ اگر کوئی احراری یا احمدی کسی ایسے جلسے میں تقریر کرے جو اسکی جماعت نے منعقد نہ کیا ہو تو اسکے خلاف حکومت کی منظوری حاصل کیے بغیر کوئی کارروائی نہ کرنی چاہیے۔ یہ معلوم ہے کہ جب احراریوں کے جلسے ممنوع قرار دیے گئے اور انہوں نے مسجدوں میں جلسے کرنے کی چال اختیار کر لی تو کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ کانفرنس کے حاضرین میں سے کسی افسر کو یہ خیال نہیں آیا کہ احراری اپنے جلسوں کا انتظام کسی دوسرے کے سپرد کر دینگے۔ اور ان کو ''دفاع کانفرنس'' یا کسی اور نام سے موسوم کر دینگے۔ نہیں اسکا تصور نہیں کیا جا سکتا لہٰذا جس دنیا میں زیادہ تر باتوں کا انحصار دلیل اور استنباط پر ہوتا ہے وہ ضرور یہی نتیجہ نکالے گی کہ حکم امتناعی کے پردے میں اصل مقصد یہ تھا کہ جلسے منعقد کرنے اور ان میں تقریر کرنے کی زیادہ سے زیادہ امکانی گنجائش مہیا کر دی جائے۔ اگر اس فیصلے کا یہ مقصد نہ بھی تھا تو اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ اس نے اثر اسی قسم کا پیدا کیا۔

ہوم سیکرٹری اپنی یادداشت مورخہ ۷ جولائی کے ذریعے سے ان فیصلوں کو مسٹر دولتانہ کے علم میں لائے وہ یادداشت درج ذیل ہے:

کیا افسروں نے پیشتر مسٹر دولتانہ سے مشورہ کیا تھا

''آنریبل چیف منسٹر بغرض اطلاع ملاحظہ فرمائیں: کانفرنس میں جو فیصلے ہوئے وہ اس عام پالیسی کے مطابق تھے جسکی منظوری کا فیصلہ چیف منسٹر صاحب فرما چکے ہیں۔ لہٰذا یہ فیصلے بامید منظوری عزت مآب چیف منسٹر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو بھیج دیے گئے ہیں تاکہ وقت کا حرج نہ ہو''۔

''وہ کیا پالیسی تھی جسکی منظوری کا فیصلہ عزت مآب وزیر اعلیٰ کر چکے تھے؟'' مسٹر دولتانہ کا بیان ہے کہ یہ پالیسی ۲۵ مئی کی کانفرنس میں وضع کی گئی تھی اور ''اس پالیسی کے متعلق عام دفتری معمول کے مطابق میں نے ضرور افسران متعلقہ سے بات چیت کی ہوگی''۔ چودھری فضل الٰہی نے کہا ہے کہ اس پالیسی پر مسٹر دولتانہ کے نتھیا گلی روانہ ہونے سے قبل ''دو گھنٹے کی ملاقات میں گفتگو ہوئی تھی مسٹر دولتانہ کے بیان میں چودھری صاحب کے اس بیان کی کوئی خاص تردید نہیں کی گئی لیکن اگر اشارہ

۲۵ مئی کی پالیسی کی چٹھی کی طرف ہے تو ایسے دو زائد فیصلے کیوں کیے گئے۔ جنھوں نے اصلاً سابقہ فیصلہ کے اثر کو معدوم کر دیا؟ مسٹر دولتانہ ان دونوں چٹھیوں کو متضاد نہیں سمجھتے۔ ۵ جون کی چٹھی میں صرف جلسوں کے امتناع کا حکم دیا گیا ہے لیکن ان کو جبراً منتشر کر دینے کی ہدایت نہیں دی گئی'' لیکن ۵ جون کی چٹھی کے الفاظ ملاحظہ ہوں ''احتیاط سے غور و خوض کرنے کے بعد حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ امن و سکون عامہ کے عمومی مفاد کے پیش نظر نہ احراریوں اور نہ احمدیوں کو اجازت ہوگی کہ کسی نام اور کسی پردے میں بھی عام جلسے منعقد کریں۔ لہٰذا جہاں کوئی جماعت کسی جلسہ عام کے انعقاد کا ارادہ کرے آپ زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کا انسدادی کارروائی کریں''۔

ہمارے نزدیک یہ کہنا بالکل غیر منطقیانہ ہے کہ اگرچہ مقصد یہی تھا کہ جلسہ کسی طرح بھی کوئی صورت اختیار نہ کر سکے لیکن اگر پولیس پانچ یا دس منٹ دیر سے پہنچی ہو اور اس دوران میں پانچ یا دس آدمی جمع ہو چکے ہوں تو ان کو منتشر نہ کیا جائے گا۔ اگر اس منطق کو اس مرحلے سے ذرا آگے لے جائیں تو پولیس لوگوں کو جمع ہونے سے روک سکتی ہے اگر اجلاس کے منتظمین پانچ یا دس افراد یا ان اشخاص کے ساتھ جو پولیس کے پہنچنے سے پہلے جمع ہو گئے تھے۔ جلسہ جاری رکھنے پر مطمئن ہوں تو انکو اسکی اجازت دے دی جائے۔

لیکن پھر ۵ جولائی کی کانفرنس کا انعقاد کیوں ضروری محسوس ہوا؟ ۱۹ جون کے پیغام اور ۲۸ جون کی چٹھی میں مساجد کا معاملہ بھی شامل تھا۔ اور اصولاً پالیسی کی چٹھی مورخہ ۵ جون اب تک برابر قائم تھی۔ یہیں ''چیف منسٹر کی منظوری کا فیصلہ'' کے الفاظ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کا اشارہ بطور خاص چیف منسٹر کی طرف ہے کسی سابقہ پالیسی کی چٹھی کی طرف نہیں۔

یہ بات بھی افسوسناک ہے کہ ''دو گھنٹے کی بات چیت'' کے متعلق مسٹر غیاث الدین احمد اور مسٹر انور علی میں سے کسی سے بھی استفسار نہ کیا جا سکا۔ یہاں قصور صرف مسٹر یعقوب علی کا نہیں۔ جنھیں ہوم سیکرٹری کی یادداشت کے واضح معانی کی تاویل کرنی تھی۔ بلکہ چودھری فضل الٰہی کا بھی ہے جو اس ملاقات کو ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ان کا دعویٰ یہ ہے کہ معانی بالکل صاف ہیں۔ اور حالات و کوائف (جیسا ہم نے بتایا ہے) بالکل ان کے حق میں ہیں۔

۱۹ جولائی ۱۹۵۲ء کو احرار کی یقین دہانی

یہ زمانہ احرار کی اس مشہور ''یقین دہانی'' پر ختم ہوا جس میں امن قائم رکھنے کا وعدہ تو کیا لیکن اچھے برتاؤ کا عہد نہ کیا۔ اس یقین دہانی پر بحث کرنے سے پہلے ہم ڈی آئی جی کی اس یادداشت کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یقین دہانی سے ذرا پہلے احراریوں کے ذہن کی کیا کیفیت تھی۔ اس وقت تک ماسٹر تاج الدین اور بعض دیگر اشخاص احکام امتناعی کی خلاف ورزی کے لیے گرفتار کیے جا چکے تھے۔ مسٹر انور علی نے ۵ جولائی ۱۹۵۲ء کو ایک یادداشت لکھی جس کا مفاد یہ ہے:۔

۵ جولائی ڈی آئی جی سے دو احراری لیڈروں کی ملاقات

وہ انکی معافی کی تجویز کو تسلیم نہیں کرتے

مولانا اختر علی خاں آج مولوی غلام غوث کی معیت میں جو نئے صدر احرار ہیں، مجھ سے ملنے آئے۔ ان کا مقصد یہ یقین دلانا تھا کہ ایسی تقریریں نہیں کی جائیں گی جن سے نقص امن کا احتمال ہو بشرطیکہ گرفتار شدہ لوگ رہا کر دیے جائیں اور دفعہ ۱۴۴ واپس لے لی جائے۔ میں نے انکو وہ فیصلے سمجھائے جو آج افسروں کی گفت وشنید کے بعد ہوئے تھے اور ان کو بتایا کہ اگر وہ دونوں لیڈر معافی مانگ لیں تو حکومت رہائی وغیرہ کے مطالبات پر غور کر سکے گی۔

مسٹر انور علی کے اندیشے

مولوی غلام غوث سرحدی نے کہا کہ ان کے اور انکی جماعت کے خیال میں ماسٹر تاج الدین نے کوئی قصور نہیں کیا اگر ایک دفعہ احرار پر ثابت ہو جائے کہ حکومت اپنے فیصلوں کو نہیں بدلے گی تو وہ تصفیہ پر زیادہ مائل ہو جائیں گے۔

۷ جولائی ۱۹۵۲ء: مسٹر قربان علی خاں۔۔۔ ''میرے خیال میں کوئی وجہ نہیں کہ حکومت قانون وانتظام کو بحال رکھنے کے متعلق اپنے فیصلوں کو بدلے۔ جو چیز بھی بدنظمی پیدا کرنے والی ہو

اسکی سرکوبی پوری سختی سے ہونی چاہیے''۔

ہوم سیکرٹری نے اس یاداشت کو اپنی یہ رائے لکھ کراوپر بھیج دیا کہ احراریوں کو احساس ہو گیا ہے کہ وہ جمہور عوام سے الگ تھلگ کیے جا رہے ہیں۔ مسٹر دولتانہ نے ۸ جولائی کو اس یاداشت پر مختصر دستخط کر دیے۔

احرار نے حکومت کی اس کوشش کو شکست دے دی کہ احرار عوام سے منقطع ہو جائیں

ہوم سیکرٹری کے اس فقرے کو پڑھ کر کہ اب احراری انقطاع کی حکمت عملی کے اثر کو محسوس کر رہے ہیں۔ ہم کو یاد آ گیا کہ حکومت نے بھی ان کی حالت انقطاع سے ہمدردی کا اظہار کیا اور اس علیحدگی اور انقطاع کی مصیبت سے نجات دلانے کے لیے انہیں موقع دے دیا کہ وہ تمام جماعتوں کے علما کو گفتگو کی دعوت دے دیں۔ اس امر کا پہلے سے اندازہ کر لینا چاہیے تھا کہ احرار اس حلقے کو توڑنے کی کھلی کوشش کر رہے ہیں جو حکومت نے اپنے خیال میں ان کے گرد کھینچا ہے ایسی حالت میں انہیں یہ اجازت دے دینا کہ قانون کی خلاف ورزی کر کے کنونشن منعقد کر لیں۔ کوئی عقل کی بات نہ تھی۔ قانون تو گدھا ہوتا ہی ہے لیکن انہوں نے اسکو مذاق بھی بنا دیا۔ اس کنونشن کو انعقاد کا موقع دینے سے بظاہر یہ مقصود تھا کہ اس کے اجلاس سے پہلے علما سے مل کر انہیں تشدد کے خلاف تلقین کرنے پر آمادہ کر لیا جائے۔

علما سے ملاقات کی پالیسی ناکام ہوئی مگر اسکی طرف کوئی توجہ نہ کی گئی

میر نور احمد ڈائریکٹر تعلقات عامہ کا بیان ہے کہ چیف منسٹر نے انہیں مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری، مولانا محمد بخش مسلم اور مولانا غلام مرشد سے ملنے کی بطور خاص ہدایت کی۔ ان کو سمجھایا گیا کہ کنونشن کی فضا میں ''یہ علما مطلوبہ خطوط پر'' فیصلہ حاصل نہ کر سکیں گے لیکن اگر چیف منسٹر کو فیصلے سے اتنی دلچسپی تھی جتنی ہونی چاہیے تھی تو یہ نہایت عجیب بات ہے کہ اسکے بعد نہ تو میر نور احمد سے پوچھا کہ علما سے بات چیت کا کیا نتیجہ نکلا آخر ان مولویوں نے شورش میں عملی حصہ لینا شروع کر دیا اور

اکتوبر ۱۹۵۲ء میں محکمہ اسلامیات نے ان سرگرمیوں کو دیدہ ودانستہ نظر انداز کر کے انہیں اجرت پر لیکچر دینے کے لیے منتخب کرلیا۔

مسٹر دولتانہ کا بیان ہے کہ انکی یہ پالیسی نہ تھی کہ علما کو اس کنونشن میں شریک ہونے کا موقعہ دیا جائے (یہ فیصلہ ۵ جولائی کو افسروں کی کانفرنس میں کیا گیا تھا) لیکن جب مسٹر دولتانہ نے فائل نمبر۹۴ (۲) ۱۶ ملاحظہ کی کیا تو مان گئے کہ انہوں نے ۵ جولائی کو ذیل کی یاداشت لکھی تھی۔ ''اگر ڈی پی آر یا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اس کنونشن میں شرکت کا ارادہ کرنے والوں سے ملاقات کریں اور انہیں تشدد اور خلاف ورزی قانون کی مذمت پر آمادہ کرلیں تو یہ کنونشن حکومت کے نقطہء نگاہ سے حقیقتاً مفید ثابت ہوسکتی ہے''۔

لیکن کنونشن کی بابت یہ ریمارکس اس لیے کیے گئے کہ ہوم سیکرٹری کی یاداشت میں منقطع کرنے کے الفاظ استعمال کیے گئے تھے ہمیں یہ احساس ہوا کہ دونوں موقف متضاد ہیں۔ بہر حال جو امید باندھی گئی تھی اگر وہ نیک نیتی پر مبنی تھی تو ہمیں اس کے خلاف کوئی خاص اعتراض نہیں اس معاملے میں دیانت داری کے ساتھ دو رائیں بھی ممکن ہیں۔

اب پھر اس ملاقات کی طرف آیئے جو مولانا اختر علی خاں اور مولوی غلام غوث سرحدی نے ڈی آئی جی سے کی۔ اس سے ظاہر ہے کہ احراری معافی مانگنے پر آمادہ نہ تھے اور خود اپنی شرائط پر حکومت سے احکام امتناعی اور مقدمات کی واپسی کے خواہاں تھے۔ وہ تقریریں تو کرتے رہیں گے لیکن وہ ایسی نہ ہونگی جن سے نقص امن کا احتمال ہو گویا یہ اعتراف کرلیا گیا کہ اب تک جو تقریریں ہوتی رہی ہیں وہ ایسی ہی تھیں۔

گوجرانوالہ کے مقدمات واپس لے لیے گئے ۱۵ جولائی ۱۹۵۲ء
میاں انور علی کے اندیشے صحیح ثابت ہوئے

علاوہ بریں ڈی آئی جی کی یاداشت میں ایک اندیشے کا سراغ ملتا ہے کہ مبادا حکومت اپنے فیصلوں کو تبدیل کردے اور مسٹر قربان علی خاں ان کو یقین دلاتے ہیں کہ حکومت قانون وانتظام کے

قیام کے فیصلوں کو تبدیل نہیں کریگی لیکن مسٹر انور علی کا اندیشہ جلد ہی صحیح ثابت ہوگیا۔ ہم فی الحال احرار کے ساتھ سمجھوتے کا ذکر نہیں کر رہے ہیں ۔ ہم ۱۴ اور ۱۵ جولائی کو گوجرانوالہ میں مقدمات کی واپسی کے متعلق سوچ رہے ہیں جب مسٹر دولتانہ سے ان کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ محض ایک اصطلاحی فیصلہ تھا جو افسروں نے ان دو احراری لیڈروں کے متعلق کیا تھا جو اسی قسم کے الزامات کی بنا پر سرگودھا میں سزایاب ہو چکے تھے۔

واپسی حق بجانب نہیں تھی

اول: اگر کوئی شخص دغابازی کی ایک واردات سرگودھا میں اور دوسری گوجرانوالہ میں کرے تو گوجرانوالہ کے مقدمے کو واپس لینا کوئی اصطلاحی فیصلہ نہ ہوگا اور اس کے لیے کوئی جواز بھی نہیں۔ اگر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ایسی احمقانہ تجویز پیش کرے تو اس پر واضح کر دینا چاہیے کہ یہ احمقانہ تجویز ہے۔ دوم: یہ فیصلہ چھ اشخاص کے متعلق تھا جن میں سے صرف دو سرگودھا میں سزایاب ہوئے تھے۔ جب یہ امر مسٹر دولتانہ کے علم میں لایا گیا تو انہوں نے کہا مجھے یاد نہیں کہ میں افسروں کی کانفرنس مورخہ ۱۵ جولائی میں جہاں یہ فیصلہ کیا گیا شریک ہوا تھا کیونکہ اس میں پالیسی کا کوئی سوال نہ تھا پھر ان کی توجہ ہوم سیکرٹری کی مندرجہ ذیل یادداشت مورخہ ۱۸ جولائی کی طرف مبذول کرائی گئی۔

"گوجرانوالہ کا مقدمہ کل واپس لے لیا گیا۔ میں نے ۱۵۔ کو عزت مآب چیف منسٹر سے ملاقات کے فوراً بعد ڈپٹی کمشنر کو طلب کیا۔ جب وہ ۱۶ کو مجھ سے ملنے آئے تو میں نے انکو حکومت کا فیصلہ بتا دیا"۔

یہ دیکھ کر مسٹر دولتانہ نے کہا کہ "میں نے ضرور واپسی مقدمہ سے اتفاق کیا ہوگا، میرا خیال یہ ہے کہ یہ اشخاص دفعہ ۱۴۴ کے خلاف محض ایک جلسے میں شریک ہونے کی وجہ سے گرفتار کیے گئے تھے اور چونکہ شہر میں بہت زیادہ شورش تھی اس لیے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ گوجرانوالہ نے ہوم سیکرٹری سے بات چیت کی ہوگی"۔

اگر یہ جواب صحیح ہو تب بھی مسٹر انور علی کا یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوگیا کہ مبادا حکومت اپنے

فیصلوں کو بدل دے لیکن یہ جواب صحیح نہیں ہے کیونکہ ہم نے اس روداد کے حصہ دوم میں دیکھا ہے کہ گوجرانوالہ سے کوئی تجویز موصول نہیں ہوئی تھی۔

علما کا کنونشن منعقدہ ۱۳ جولائی کا اثر مضر ہوا (بقول انسپکٹر جنرل)

عین اسی دن جب مقدمے کو واپس لینے کا فیصلہ ہوا مسٹر قربان علی نے یادداشت لکھی کہ علماء کے کنونشن کا اثر عوام پر نہایت مضر ہوا ہے۔ احراریوں نے مذہبی قضیوں پر ان کے جذبات کو بھڑکا کر اپنا مقصد حاصل کر لیا ہے۔ اب حکومت اور احرار کے درمیان دوڑ ہو رہی ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ مستعد رہے اور کسی قسم کی سستی و غفلت کو روا نہ رکھے۔ ہوم سیکرٹری نے بھی اسی قسم کی تحریر لکھی اور مسٹر دولتانہ نے یہ فائل ۱۶ جولائی کو دیکھی۔ حکومت کے وکیل نے ان سے سوال کیا کہ ان یادداشتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ افسروں کے خیالات صورت حالات کے متعلق نہایت زوردار تھے کیا ان سے آگاہ ہونے کے بعد بھی مسٹر دولتانہ اسی پر اصرار کریں گے کہ مقدمہ واپس لینے کا فیصلہ افسروں کا تھا اور ان کا نہ تھا؟ اس سوال کا جواب حسب ذیل تھا

> ''یہ فائل میرے پاس محض اطلاع کے لیے بھیجی گئی تھی۔ واپسی کے سوال کا اس سے کچھ واسطہ نہ تھا''

اس کے بعد ان کو بتایا گیا کہ اسی فائل میں انسپکٹر جنرل کی ایک یادداشت مورخہ ۱۶ جولائی موجود ہے کہ اس موضوع پر ایک دن قبل کے اجلاس میں گفتگو ہوئی تھی دوسرے الفاظ میں مسٹر قربان علی خاں کی یادداشت مورخہ ۱۴ جولائی کے موضوع پر چیف منسٹر سے ۱۸ جولائی کے اجلاس میں بات چیت ہوئی تھی۔ اس پر مسٹر دولتانہ نے یہ مان لیا کہ وہ ضرور اس اجلاس میں موجود ہونگے تاہم پہلے سوال کا جواب نہیں ملا جس کا منشا یہ تھا کہ ایسے پرزور خیالات رکھنے والے افسر مقدمے کی واپسی سے اتفاق نہ کر سکتے تھے۔ اس بات پر یقین کرنا غیر ممکن ہے کہ مسٹر قربان علی خاں کاغذ پر تو اپنی بے چینی کا اظہار کریں کہ احراریوں نے کنونشن منعقد کر کے اپنی چال میں فتح پائی ہے اور حکومت کو تنبیہ کریں کہ وہ مستعد رہے اور کسی قسم کی سستی و غفلت کو روا نہ رکھے۔ لیکن جب کانفرنس میں بیٹھیں تو مسٹر دولتانہ کو

مقدمات واپس لینے کا مشورہ دیں کیونکہ ایک تو لوگ بہت مضطرب ہو رہے ہیں دوسرے ان کا قصور صرف اتنا ہے کہ انہوں نے ایک حکم کی خلاف ورزی کی ہے۔ آخر جمہوری نظام حکومت میں حکومت کا حکم اس ناگفتہ شرط کے ماتحت ہونا چاہیے کہ اسکی تعمیل سے عوام کے قلوب میں اضطراب پیدا نہ ہو ہمارا مطلب یہ ہے کہ مسٹر قربان علی خاں کو ایک پولیس افسر کی حیثیت میں یہ تشویش نہ ہوسکتی تھی کہ ان لوگوں کے سامنے جنھوں نے ایک نظام جمہوری قبول کیا ہے۔ مقدمے کو حق بجانب ثابت کریں۔ لہٰذا افسروں کی کانفرنس میں یہ کارنامہ ضرور مسٹر دولتانہ ہی نے انجام دیا ہوگا۔

احراریوں کی یقین دہانی ۱۹ جولائی ۱۹۵۲ء

اب ہم حقیقی ''یقین دہانی'' کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یہ یقین دہانی سب کو معلوم ہے بعض احراری لیڈروں نے ایک بیان میں تشدد کی مذمت کرنے کا وعدہ کیا اور مسٹر دولتانہ نے اس کے بدلے میں حکم امتناعی اور مقدمات دونوں کو واپس لینے کا ذمہ لے لیا مسٹر دولتانہ کے بیان کے مطابق احراریوں نے ان سے کہا تھا کہ ان کا مقصد قانون شکنی نہیں ہے لیکن تحریک ان کا جزو ایمان ہے اور ان کا حق ہے کہ اس مسئلے کو آئینی طریقے سے جمہور کے سامنے پیش کریں، اسکے ساتھ ہی انہوں نے اس ایقان کا اظہار بھی کیا کہ احمدیوں کے جان و مال اور آبرو کی حفاظت کرنا اس کا سیاسی اور مذہبی فریضہ ہے یہ معلوم تھا کہ جلسوں کی پابندی اٹھ جانے کے بعد وہ اپنی معمولی سرگرمیاں جاری رکھیں گے۔ لیکن قانون و انتظام کو نقصان پہنچانے والا کوئی فعل نہ کرینگے ہمارے ایک سوال کے جواب میں مسٹر دولتانہ نے بتایا کہ میرے نزدیک تو اس مفاہمت میں یہ چیز مضمر تھی کہ ماضی میں احراریوں کی عام سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ متشددانہ افعال بھی شامل تھے لیکن مجھے اسکا یقین نہیں کہ احراری بھی اس موقف کا اعتراف کرتے تھے۔ یہ مطلب ہے ہماری اس رائے کا جو ہم اوپر ظاہر کر چکے ہیں کہ احراریوں نے امن قائم رکھنے کا وعدہ تو کیا لیکن اپنے برتاؤ کو ٹھیک رکھنے کا وعدہ نہیں کیا۔

یقین دہانی کو قبول کر لینا قابل اعتراض نہیں

احراریوں نے اپنے بیان میں کہا کہ نہ انہوں نے ماضی میں قانون و انتظام کے خلاف کسی فعل

کا ارتکاب کیا ہے اور نہ آئندہ کسی ایسے فعل کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس سے ہمیں وہ واقعہ یاد آجاتا ہے کہ مسٹر انور علی نے معافی پر اصرار کیا اور مولوی غلام غوث سرحدی نے کہا کہ معافی مانگنے کی کوئی وجہ ہی موجود نہیں۔ لیکن ہمارا یہ ارادہ نہیں کہ اس مفاہمت کے مالہ وماعلیہ پر کچھ وقت صرف کریں۔ مسٹر انور علی کے سوا باقی تمام افسر مختلف وجوہ سے اس امر پر متفق ہیں کہ ایسے حالات میں یہی راہ عمل بہترین تھی۔ مسٹر قربان علی نے کہا کہ اس مفاہمت سے احرار کے خلاف اس نکتہ چینی کا دروازہ کھل گیا کہ وہ جیل کو پسند نہیں کرتے حافظ عبدالمجید نے کہا کہ حکومت کے ایک افسر کی حیثیت سے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ انہیں ایک اور موقع دینا جائے۔ مسٹر غیاث الدین احمد نے لکھا کہ ایک مذہبی مسئلے پر امتناعی حکم زیادہ مدت تک موثر نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگرچہ مسٹر دولتانہ پہلے ہی سے یہ فیصلہ کر چکے تھے لیکن جب یہ فیصلہ افسروں کے اجلاس میں پیش کی گیا تو ہر شخص نے اس سے اتفاق کیا۔

مسٹر انور علی نے کہا کہ یہ مقدمات ہی کے دباؤ کا اثر ہے کہ احرار ایک وفد کی صورت چیف منسٹر کے پاس پہنچے اور ایک تحریری اقرار نامہ لکھ کر آئندہ شورش کو قانونی حدود کے اندر رکھیں گے یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے وعدے کے پابند نہ رہے۔ اگر مجھ سے مشورہ کیا جاتا تو میں یہ کہتا کہ ان مقدمات کو واپس لینا اور ان اشخاص کو رہا کرنا مضرت رساں ہوگا کیونکہ میں احراریوں کو جانتا ہوں وہ ہرگز قابل اعتبار نہیں ہیں۔

۳۔ یقین دہانی کے بعد

''احراریوں کے اقرارنامے کے بعد کچھ مدت خاموشی رہی اور اسکے بعد پھر قابل اعتراض تقریروں کا سیلاب پھوٹ پڑا۔ اس اقدام کو ختم کرنے کے بعد اگر ان تمام لوگوں کے خلاف جو قابل اعتراض تقریریں کر رہے تھے مقدمے دائر کردیے جاتے یا ان میں سے بعض کے خلاف انسدادی کاروائی کی جاتی تو اس شورش میں مزید تخفیف ہوسکتی ہے''۔ مسٹر غیاث الدین احمد

ہوم سیکرٹری کے یہ ریمارک ذہن میں رکھ کر اب ہم ان واقعات کا جائزہ لیں گے جو ۱۹ جولائی کے بعد پیش آئے اور اس فیصلے کی نیک نیتی کا امتحان کرینگے جس کے ماتحت احراریوں کو

''آئینی طریق پر'' شورش کے جاری رکھنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

قصور میں: ۲۵ جولائی ۱۹۵۲ء

(۱) ۲۵ جولائی ۱۹۵۲ء کو قصور میں نماز جمعہ کے بعد ایک جلسہ ہوا جس کے مقررین میں ایک عالم شاہ بدمعاش بھی تھا۔ اس کے بعد چھاتی پیٹتا ہوا ایک جلوس نکالا گیا ایک آدمی نعرہ لگاتا تھا ''ظفر اللہ کنجر'' اور دوسرے آواز ملا کر چلاتے تھے'' ہائے ہائے'' اس کے بعد عالم شاہ اور ایک اور آدمی کہیں سے ایک گدھی لے آئے۔ جس پر'' بیگم ظفر اللہ'' کے الفاظ لکھ دیے پھر اس پر ایک آدمی کو سوار کرایا اور اس آدمی کو جوتوں کا ہار پہنا دیا یہ شخص'' ٹاپ ہیٹ'' سر پر رکھے ہوئے تھا جس پر'' غلام احمد مرزا'' لکھا تھا یہ جلوس احمدیوں کے ایک کارخانے کے سامنے رکا اور پندرہ منٹ تک یہ نعرہ لگاتا رہا ''مرزائیت کو تباہ کردو'' ''ظفر اللہ کنجر''۔ ''ظفر اللہ کتا''۔ ''ظفر اللہ سور''۔

ڈی آئی جی اور آئی جی کے ریمارک

مسٹر انور علی نے قصور کے متعلق روزنامچے پر لکھا کہ مذہبی جنونیوں اور مولویوں نے طاقت پکڑ لی ہے اور غنڈے بھی میدان میں کود پڑے ہیں۔ مسٹر قربان علی خاں نے کہا'' قانون کی خلاف ورزی کی شورشوں کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے۔ ایک لاقانونی سے دوسری لاقانونی پیدا ہوتی ہے اور اگر کوئی انسدادی طریقہ ممکن نہ رہے تو اس کا انجام انقلاب ہے۔ یہ تاریخ کا سبق ہے جس میں تاخیر ہو سکتی ہے لیکن اسکو جھٹلایا نہیں جا سکتا''۔

چیف منسٹر نے اس یادداشت پر حسب معمول ۱۲ اگست ۱۹۵۲ء کو اپنے مختصر دستخط کر دیے۔

لیکن کاروائی کچھ نہیں کی

لیکن اب ہم ان یادداشتوں پر زیادہ اعتبار نہیں کرینگے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تحریر سے محض خوش بیانی منظور تھی۔ ان میں یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ'' احراریوں کے وعدے کا کیا ہوا؟'' ان بیانات میں کسی اقدام کی تجویز نہیں کی جاتی اور مسٹر دولتانہ کہتے ہیں کہ جہاں کسی اقدام کی تجویز نہ کی گئی ہو وہاں کوئی اقدام نہیں کرتا۔ کوئی صریح بے عملی نظر آجائے تو وہ اور بات ہے اور موجودہ معاملہ یقیناً

صریح نہ تھا۔ علاوہ بریں ہمیں ان یاداشتوں پر اس لیے اعتبار نہیں رہا کہ اگر مسٹر دولتانہ ایک کانفرنس منعقد کرلیں گے تو یہ تمام حضرات ان کے خیال سے متفق ہو جائیں گے کہ یہ مسئلے کا کوئی جمہوری حل نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وزیر خارجہ کی سخت توہین کی گئی ہے لیکن جب تک مرکزی حکومت یہ فیصلہ نہ کرے کہ مطالبات قبول کیے جائیں گے یا رد کر دیے جائیں گے۔ کوئی کیونکر کہہ سکتا ہے کہ گالی دینا جائز تھا یا ناجائز۔

ڈی آئی جی کہتے ہیں کہ تحریک بازاری آدمیوں کے ہاتھ میں ہے

۳۱ جولائی کو ڈی آئی جی نے اپنے ذرائع سے حاصل شدہ ایک رپورٹ پر یہ یاداشت قلمبند کی: ''اب یہ تحریک ایک راستے پر قائم نہیں بلکہ بازاری آدمیوں کے ہاتھوں میں پڑ چکی ہے۔۔۔ ۔۔۔۔۔ میں احراریوں کی نیک نیتی پر یقین نہیں کرتا۔ اب تک ہم نے یہ نہ سنا تھا کہ حکومت تحریک کو راستے پر لگانے کی خواہاں ہے لہٰذا ہمیں معلوم نہیں کہ اسے کس راستے پر لگانا مقصود تھا لیکن اس لفظ کو ذہن میں رکھے گا۔

وزیر خارجہ کے جنازے

(۲) ۲۴ جولائی ۱۹۵۲ء کو ڈی آئی جی نے حکومت کو اطلاع دی کہ صوبے کے کئی مقامات پر وزیر خارجہ کے جنازے نکالے گئے ہیں اور یہ حرکت زیر دفعہ ۲۳ پبلک سیفٹی ایکٹ جرم ہے۔ ہوم سیکرٹری نے کہا کہ سیفٹی ایکٹ استعمال نہ کیا جائے بلکہ اب چیف منسٹر خود احراری لیڈروں سے بات چیت کر کے انہیں عہد و پیمان کی پابندی کی طرف متوجہ کریں کیونکہ نچلی سطح پر ان سے مذاکرات ناکام رہ چکے ہیں۔ چیف منسٹر نے اس یاداشت پر ۳۰ جولائی کو دستخط کر دیے اس عدالت میں بیان دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میں نے کوئی کاروائی نہیں کی کیونکہ مجھے ہوم سیکرٹری سے اتفاق تھا لیکن ہوم سیکرٹری نے جب سیفٹی ایکٹ کے استعمال کو رد کر دیا۔

سیفٹی ایکٹ کے ماتحت کاروائی منظور نہ کی گئی

تو بظاہر ان کے ذہن میں دفعہ ۳ کا تصور تھا جس میں آدمی کو سماعت مقدمہ کے بغیر ہی نظر بند

کر دیا جاتا ہے لیکن دفعہ ۲۳ کی حیثیت بالکل تعزیرات پاکستان کی دفعات کے برابر ہے اور اگر مسٹر دولتانہ ہوم سیکرٹری سے متفق تھے (کیونکہ ان کے تصور میں بھی دفعہ ۳ ہی تھی) تو حقیقت میں یہ قانون شکنوں کی خوش قسمتی تھی کہ چیف سیکرٹری اور ہوم سیکرٹری دونوں کا تصور دفعہ ۲۳ کے متعلق وہ تھا جو دفعہ ۳ کا تھا لیکن خود مسٹر دولتانہ نے بھی تسلیم کیا کہ ۱۹۵۲ء میں ۱۹۹ اشخاص سیفٹی ایکٹ کے ماتحت پابند کیے گئے تھے اور ان میں سے ایک بھی سیاسی نظر بند نہ تھا۔

کیونکہ سیفٹی ایکٹ ایک ہوا ہے

انہوں نے یہ بھی کہا کہ باقی رہی ہوم سیکرٹری کی یہ سفارش کہ احرار کو وعدہ یاد دلایا جائے تو میرے نزدیک ان سے کوئی مزید ملاقات ضروری نہ تھی کیونکہ میں نے ۲۷۔۲۸ جولائی کو مسلم لیگ کونسل میں تقریر کرتے ہوئے احراری لیڈروں سے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ انہیں اپنے قول وقرار پر قائم رہنا چاہیے۔

لیکن کوئی تنبیہ نہ کی گئی

اسکو کہتے ہیں صفائی کا جواب پیش کرنا! لیکن ایسے جواب پریس کانفرنس میں دیے جاتے ہیں قانونی عدالتوں میں نہیں۔

(۳) ۲۶۔۲۷ جولائی کو مسلم لیگ کے دفتر کے باہر بڑے پیمانے پر مظاہرے کیے گئے۔ ایک جلسہ منعقد کیا گیا موٹر کاروں پر پتھر پھینکے گئے۔ پولیس کے بہت سے ملازم اور بعض ممبر بھی زخمی ہوئے۔ بیگم جی اے خاں بھی مجروح ہوئیں اور وہاں سے اسی حالت میں لے جائی گئیں۔ پولیس کو اشک آور گیس اور لاٹھیوں کا استعمال کرنا پڑا۔

ایک قابل اعتراض کتابچہ ۴/اگست ۱۹۵۲ء

(۴) ۴/اگست ۱۹۵۲ء کو ایک کتابچہ سی آئی ڈی کے علم میں آیا جس کا نام تھا ''مرزائیوں کے ناپاک عزائم'' اس کے پہلے باب میں جو بنیادی عقائد سے متعلق ہے مرزا غلام احمد کی تحریروں کے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں۔ اقتباسات کا نمونہ یہ ہے: ''جو لوگ مجھے نہیں مانتے ان میں مرد سور اور

عورتیں کتیاں ہیں''۔دوسرے باب میں بیان کیا گیا ہے کہ احمدیوں کو اب تک یقین ہے کہ پاکستان پھر ہندوستان سے متحد ہو جائے گا۔تیسرے باب میں یہ لکھا ہے کہ چودھری محمد ظفر اللہ خاں پاکستان کے مخالف ہیں۔

کوئی کاروائی نہیں

اس کتابچے کا مقصد یا کم از کم اثر صاف طور پر یہی تھا کہ لوگوں کے دو طبقوں کے درمیاں تلخی اور منافرت کے جذبات کو اکسایا اور قائم رکھا جائے۔ڈی آئی جی کے اسسٹنٹ نے اس کتابچے کی ضبطی کی سفارش کی۔ڈی آئی جی نے ۳ستمبر ۱۹۵۲ء کو کہا کہ پہلے پہل جب یہ کتابچہ ہمارے علم میں آیا ہے اس پر ایک مہینہ گزر چکا ہے۔اس لیے اس مرحلے پر اسکو ضبط کرنے سے کوئی مقصد حاصل نہ ہوگا ہوم سیکرٹری نے اتفاق کیا اور چیف منسٹر نے دستخط کر دیے۔

ملتان:۲۱اگست ۵۲ء ڈی آئی جی نے تنبیہ کی تجویز پیش کی

(۵)۲۱اگست ۱۹۵۲ء کو ملتان میں ایک جلسہ ہوا جس میں سرکاری ملازموں کو خاص طور پر سخت سست کہا گیا۔ڈی آئی جی نے صورت حالات کی روزانہ رپورٹ پر لکھا کہ سرکاری افسروں کے خلاف اشتعال انگیز تقریریں ہوں تو ان کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔لیڈروں کو اس لیے رہا کیا گیا تھا کہ وہ اپنے رفقا کو حدود قانون کے اندر رہنے کی تلقین کریں۔اب ان کو طلب کر کے تنبیہ کرنی چاہیے۔یہ لوگ اگرچہ سخت نا قابل اعتبار ہیں لیکن پھر بھی یہی مناسب ہے کہ انکو دوبارہ تنبیہ کی جائے ان لوگوں نے ۲۹اگست کو ملتان میں ''یوم شہدا'' منانے کے لیے جس جلسے کا ارادہ کر رکھا ہے وہ ممنوع قرار دیا جانا چاہیے اور چونکہ ملتان فائرنگ کے متعلق جسٹس کیانی کی رپورٹ کے مطابق سرکاری ملازم بے قصور ثابت ہو چکے ہیں۔اس لیے اگر اب بھی احراری انکو نکتہ چینی کا نشانہ بنا رہے ہیں تو ان کا یہ عمل شائستگی کے تمام اصولوں کے خلاف ہے۔

صرف مقامی لیڈروں کو تنبیہ

چیف منسٹر نے جلسے کو ممنوع قرار دینے کی تجویز کو منظور نہ کیا لیکن اس تنبیہ کے اجرا سے اتفاق

کیا کہ احراریوں کو اس جلسے میں صحیح برتاؤ کا ثبوت دینا چاہیے۔ڈپٹی سیکرٹری ہوم نے تجویز کی تھی کہ اس تنبیہ کے اجرا کے متعلق پریس نوٹ جاری کیے جائیں۔ یہ تجویز بھی منظور نہ کی گئی صرف مقامی لیڈروں کو کمشنر کی وساطت سے تنبیہ کی گئی۔ہوم سیکرٹری نے دریافت کیا کہ آیا احراری لیڈروں کو ایک عام تنبیہ بھی کر دی جائے (یہاں تک تو ہوم سیکرٹری کی تحریر ٹائپ میں تھی) اسکے بعد انہوں نے اپنے قلم سے یہ سطر بھی لکھ دی کہ میرے نزدیک کچھ مدت اور انتظار کرنا چاہیے۔

عام تنبیہ غیر ضروری ہے

چیف منسٹر نے ۳۱ اگست کو کہا کہ ''میرے نزدیک اس مرحلے پر ہمیں عام تنبیہ کی فکر نہ کرنی چاہیے''۔

کسی دوسری جگہ ہم نے ملتان فائرنگ کا ذکر کیا ہے یہ واقعہ ۱۹ جولائی ۱۹۵۳ء کو پیش آیا جب تھانہ کپ کو ایک خطرناک ہجوم نے گھیر لیا تھا۔گولی چلنے کے واقعہ کے بعد حکومت نے عوام کے احساسات کی رعایت کر کے ایک عدالتی تحقیقات کا حکم دیا جس کو ہم میں سے ایک نے انجام دیا اس تحقیقات میں قرار دیا گیا۔

یوم شہدا کا جلسہ گویا عدالتی فیصلے کے خلاف احتجاج تھا

کہ پولیس نے اپنی حفاظت میں گولی چلائی لہٰذا یہ جائز تھی جن صحیح الخیال لوگوں کے نزدیک عدالتی غیر جانب داری اور عدالتی فیصلے کا وقار واجب الاحترام ہے ان کو اس فیصلے سے مطمئن ہو جانا چاہیے تھا۔اس کے بعد ''یوم شہدا'' منانے کا مطلب یہ تھا کہ عدالت کے فیصلے کو ناپسند کیا گیا ہے اور مسٹر انور علی کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ یہ امر شائستگی کے خلاف تھا لیکن حکومت پر اس نکتے کا کوئی اثر نہ ہوا۔توہین عدالت کا قانون شائستگی کا قانون ہے۔

پاکستانی فوج پر نکتہ چینی اگست ۱۹۵۲ء

(۶) صوبائی حکومت نے اگست ۱۹۵۲ء کے نصف اول کے متعلق مرکزی حکومت کو پانزدہ روزہ رپورٹ بھیجی جس میں یہ بیان کیا کہ سرگودھا کے مولوی احمد خان نے سمندری میں تقریر کرتے ہوئے پاکستان فوج پر نکتہ چینی کی کیونکہ اس کے افسر رقص اور شراب کے عادی ہیں اور حکومت کے

بڑے افسروں پر رشوت اور خویش پروری کا الزام لگایا۔ مرکزی حکومت قدرتی طور پر مضطرب ہوئی اس نے رپورٹ طلب کی اور سوال کیا کہ صوبائی حکومت کا الزام لگایا۔ مرکزی حکومت قدرتی طور پر مضطرب ہوئی اس نے رپورٹ طلب کی اور سوال کیا کہ صوبائی حکومت نے اس تقریر کے متعلق کیا کاروائی کی ہے۔

مقرر گمنام آدمی ہے

اس کا جواب ملا کہ اگرچہ مولوی نے فوج کے خلاف توہین آمیز الفاظ استعمال کیے ہیں اور اسکے خلاف نفرت پھیلانے کی کوشش کی ہے لیکن چونکہ وہ بالکل گمنام آدمی ہے اس لیے اسکو نظر انداز کرنا ہی بہتر ہے۔

(۷) ۲۵ اگست ۱۹۵۲ء منٹگمری میں احراریوں کا ایک جلسہ ہوا جس میں مولوی محمد علی جالندھری نے سامعین کو بتایا کہ حکومت نے مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیے۔ اور دفعہ ۱۴۴ واپس لے لی ''مرزائیت کوئی مذہب نہیں بلکہ تماشا ہے اور مرزائی چوہڑوں چماتروں سے بدتر ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ احرار قیام پاکستان کے سخت مخالف تھے لیکن اب وہ وفادار ہیں۔ مگر احمدی اب بھی ہندوستان سے دوبارہ مل جانے کی کوشش کرر ہے ہیں۔ مرزا قادیان بدچلن آدمی تھا اسکے حرم سرا کے معاملات کے سلسلے میں کئی آدمی قتل کیے گئے۔ مرزائیوں کو اپنے پانی کے نلوں سے پانی بھرنے کی اجازت نہ دینی چاہیے اور ان کے ساتھ ایک تانگے میں بھی نہیں بیٹھنا چاہیے۔ ان کو مجبور کرنا چاہیے کہ دوبارہ اسلام قبول کرلیں۔ یہ صحیح ہے کہ وزیراعظم کے اعلان مورخہ ۱۴ اگست کے جواب میں چودھری محمد ظفر اللہ خاں کا جواب قابل اعتراض تھا لیکن چونکہ اسکے چوتڑوں پر بڑے زور کی لات پڑی تھی اس لیے اس کا چیخنا قدرتی تھا''۔

چیف منسٹر نے یہ رپورٹ ۱۸۔ ستمبر ۱۹۵۲ء ملاحظہ فرمائی۔

کوئی تجویز نہیں۔ کوئی کاروائی نہیں

شاید اس مرحلے پر بھی کسی عام تنبیہ کی فکر کرنا غیر ضروری تھا لیکن قانون ملکی کہاں تھا؟ کیا اس تقریر پر کسی شخص کو شرم نہ آئی؟ لیکن ہم بھول رہے ہیں حکومت کوئی کاروائی کر ہی نہ سکتی تھی کیونکہ سی

آئی ڈی یا ہوم سیکرٹری نے کسی کاروائی کی تجویز نہ کی تھی۔ باقی رہا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کا معاملہ تو غالبًا یہ لوگ اپنے دوسرے فرائض میں مصروف ہوں گے۔ جو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور کے قول مطابق تقسیم کے بعد ان کے سپرد ہوئے ہیں یعنی ''بڑے آدمیوں کے استقبال کے انتظامات''۔

احرار کا خیال ''یقین دہانی'' کے متعلق کیا تھا

اب ہمیں کم از کم یہ تو معلوم ہو گیا ہے کہ ''یقین دہانی'' کے متعلق خود احرار کا خیال کیا تھا مولوی محمد علی کے قول کے مطابق حکومت مجبور ہو کر مغلوب ہو گئی تھی۔ مولانا داؤد غزنوی نے اسی خیال کو دوسری شکل میں پیش کیا اور لائل پور کنونشن مورخہ ۲۶۔۲۸ ستمبر میں یہ کہا کہ حکم امتناعی کی منسوخی اس امر کی شہادت ہے کہ حکومت ٹھیک جھک گئی ہے۔

(۸) ۲۹ اگست ۱۹۵۲ء کو مسٹر نذیر احمد ایس پی (B) نے اس اطلاع پر کہ ماسٹر تاج الدین اور شیخ حسام الدین کے گروہوں میں پھوٹ پڑ گئی ہے، یہ رائے قلمبند کی کہ مجلس عمل میں انحطاط اور افتراق کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔ مسٹر دولتانہ نے اس اطلاع کو ''دلچسپ'' قرار دیا اور سی آئی ڈی کو حکم دیا کہ ''ان تازہ حالات اور ان کے امکانی نتائج'' سے مرکزی حکومت کو مطلع کر دے۔ اس رپورٹ میں ایس پی (B) نے ایک فتوے کا بھی ذکر کیا جو ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو مولانا داؤد غزنوی اور تین دیگر علما نے دیا تھا کہ جو لوگ مرزا غلام احمد کو نبی یا مجدد یا امام مانتے ہیں وہ مرتد اور بروئے اسلام واجب القتل ہیں اور حکومت اس حکم شرعی پر عمل نہیں کرتی اس سے مقطعہ کرنا چاہیے۔ تجویز یہ تھی کہ اس فتوے کی تصدیق ان علما سے کرائی جائے جو کراچی سے آنیوالے تھے لیکن نہ آسکے۔ مسٹر نذیر احمد نے جھنگ، لائل پور، تلمبہ، منٹگمری، برانہ اور رنگلو (کیمبل پور) کی قابل اعتراض تقریروں کا بھی ذکر کیا۔

کیا شورش مر رہی تھی

اور آخر میں یہ رائے ظاہر کی کہ تحریک تو عملاً مر رہی ہے لیکن لیڈر اپنی اہمیت کو قائم رکھنے اور روپیہ جمع کرنے کی غرض سے اس کو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں حالانکہ رپورٹ کے مندرجات

میں اس خوش فکری کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر نذیر احمد احراریوں کے دوگروہوں میں پھوٹ پڑنے کی اطلاع سے غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ لیکن دوسرے پولیس افسر ایسے بے فکر نہ تھے۔ مسٹر انور علی نے اس یاداشت پر لکھا کہ گو احراری لیڈر کسی قدر تھکے ہوئے ہیں لیکن جلسوں کی تعداد میں کوئی کمی نہیں آئی اور ابھی شورش میں خطرناک امکانات پوشیدہ ہیں۔ انسپکٹر جنرل نے ۲۳ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو کہا ''اگر شورش کو اسی طرح جاری رہنے دیا گیا تو ایک دن ہمیں نہایت شدید و سنگین گڑ بڑ سے دوچار ہونا پڑے گا اور ممکن ہے اس پر قابو پانا دشوار ہو جائے۔

انسپکٹر جنرل نے گورنر کو ایک یاداشت بھیجی، چیف منسٹر کو نہیں

آپ نے یہ یاداشت ہوم سیکرٹری یا چیف منسٹر کو نہیں بلکہ گورنر کو ارسال کی۔ مسٹر انور علی کا بیان ہے کہ یہ طریقہ غالباً اس یقین کی بنا پر اختیار کیا گیا کہ شاید گورنر اس معاملے سے مرکزی حکومت کو مطلع کر دیتے۔ چونکہ ہمارا احساس بھی یہ تھا اس لیے ہم نے مسٹر انور علی سے یہ سوال کیا تھا۔ مسٹر قربان علی خان کے نزدیک صورت حالات کے تدارک کے لیے صوبائی حکومت کا رویہ اطمینان بخش نہیں تھا۔ لہٰذا انہوں نے یہ غیر معمولی طریقہ اختیار کر کے گورنر کو متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ گو وزارتی نقطہ نگاہ سے خاں صاحب کا یہ رویہ قابل اعتراض تھا لیکن گورنر صاحب نے اس یاداشت پر محض اپنے مختصر دستخط ثبت کر دیے۔

صورت حالات کا جائزہ۔ اگست ستمبر ۱۹۵۲ء

(۹) ۱۹/اگست اور ۹ ستمبر ۱۹۵۲ء کے درمیان ایس پی (B) نے صورت حالت اور احمدیوں پر اس کے اثر کا جائزہ ان الفاظ میں لیا:

جولائی ۱۹۵۲ء کے بعد سے زیادہ تر ملتان، لائل پور اور منٹگمری اور جھنگ میں ایک سو چودہ احمدی احمدیت سے تائب ہو چکے ہیں۔

گیارہ احمدیوں نے بظاہر مع اہل و عیال اپنے مسکن ترک کر دیے ہیں۔

۲۵۔ جولائی ۱۹۵۲ء کو وزیر آباد میونسپلٹی نے دو احمدی مدرسوں اور چار احمدی استانیوں کو

ملازمت سے برطرف کر دیا۔ ڈپٹی کمشنر نے اس حکم کو معطل کر دیا ہے۔

مسٹر انور علی نے رائے دی کہ ''پاکستان ازمنہ وسطیٰ کی طرف واپس چلا گیا ہے'' مسٹر دولتانہ نے اس یادداشت پر ۱۷ستمبر ۱۹۵۲ء کو دستخط کر دیے۔ احمدیوں کے اس تبدیلی مذہب سے ہمیں یاد آیا کہ جب سردار عبدالرب نشتر اس صوبے کے گورنر تھے تو انکا خیال تھا کہ احمدی جماعت کی طرف سے نقص امن کا کوئی خطرہ نہیں کیونکہ یہ جماعت بہت قلیل التعداد ہے۔ اس لیے اگر احمدیوں کے خلاف تہدید آمیز تقریریں کی جائیں تو نقص امن کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا اس لیے کہ وہ ہر وقت اپنے عقیدے سے دستبردار ہو سکتے ہیں۔

ڈسکہ کی تقریریں ۲۱ستمبر ۱۹۵۲ء

(۱۰) ۲۱۔۲۲ستمبر کو ڈسکہ میں آل مسلم پارٹیز کنونشن ہوئی۔ اس میں جو تقریریں کی گئیں ان کے قابل اعتراض حصوں کا خلاصہ درج ذیل ہے:۔

مرزا غلام نبی جانباز: مرزا غلام احمد ایک مداری تھا۔ بدبخت انسان۔ عورت باز

مولوی محمد علی جالندھری: کشمیر کی لاینحل صورت کا ذمہ دار چودھری ظفر اللہ خاں ہے۔

صاحبزادہ فیض الحسن: جس طرح گیدڑ کو خربوزوں کی اور بلی کو گوشت کی رکھوالی سپرد نہیں کی جاسکتی، اسی طرح ظفر اللہ اور دوسرے مرزائیوں پر پاکستان کے متعلق اعتبار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ غدار ہیں۔ مرزا غلام احمد واہیات تھا۔ اس نے گڑ کو مٹی سمجھ کر اس سے استنجا کر لیا تھا۔ اگر مرزائی اسلام قبول نہیں کرینگے تو ہم اس مقصد کے حصول کے لیے انتہائی کوشش کریں گے اور ایسی صورت میں یہ لوگ زمینوں، کارخانوں اور بنگلوں کی الاٹمنٹیں کھو بیٹھیں گے بلکہ ربوہ بھی انکے قبضے سے نکل جائے گا۔

سید مظہر علی شاہ شمسی: مرزائی ذلیل اور کمینے ہیں، انکو عزت آبرو کا کوئی احساس نہیں۔

شیخ حسام الدین: ظفر اللہ ہندوستان سے خفیہ تعلقات رکھتا ہے اس نے فلسطین کو اس لیے تقسیم کرایا ہے کہ یہودیوں کو ایک گڑھ مل جائے اور اینگلو امریکن بلاک کے مقاصد پورے ہوں۔

سید عطا اللہ شاہ بخاری: احمدی جاسوسوں کی ٹولی ہیں (اسکے علاوہ ملکہ وکٹوریا اور موجودہ ملک

کے بلکہ متعلق کچھ کہا گیا جس کونقل نہ کرنا بہتر ہے)

(۱۱) ''احسان'' مورخہ ۲۵ اگست ۱۹۵۲ء نے مرزا غلام احمد کو'' بنا سپتی نبی'' بتایا اور'' جانباز پاکٹ بک'' کا اشتہار دیا جس میں مذہبی نزاع کے متعلق ناشائستہ باتیں درج ہیں۔ یہ پاکٹ بک پہلے پہل فروری ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی۔

شیخوپورہ کی تقریریں ۱۹ اکتوبر ۵۲ء

(۱۲) ۱۹ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو شیخوپورہ میں اور ۱۱ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو چوہڑکانہ میں کنونشن کے اجلاس ہوئے۔

صاحبزادہ فیض الحسن: جو شخص نبوت کی عزت اور دختر رسول کی ناموس کو نہیں بچا سکتا وہ پاکستان کو بھی نہیں بچا سکتا۔ مرزا غلام احمد نے کہا ہے کہ جو لوگ اسکو نہیں مانتے وہ بازاری عورتوں کی اولاد ہیں۔ پنجاب کے وزیروں نے اور خواجہ ناظم الدین نے بھی اسکو نہیں مانا، انہیں چاہیے کہ اگر وہ ناموس رسول کی حفاظت نہیں کر سکتے تو کم از کم اپنی ماؤں کی ناموس کی حفاظت تو کریں۔

مرزا غلام نبی جانباز: یہ تنکوں کا سانپ۔ ظفر اللہ بیرونی دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہے۔
''ہم آئینی طریق پر لڑ رہے ہیں۔ میری کتابیں خریدو''

سید مظفر علی شاہ شمسی: خواجہ ناظم الدین اور دولتانہ کو چاہیے کہ لوگوں کے جذبات کا احترام کریں۔ عوام ہی نے انکو کرسیاں دی ہیں اور وہی ان کرسیوں کو ان سے چھین سکتے ہیں۔ گورداسپور ظفر اللہ کی وجہ سے جاتا رہا، مرزائی اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے اپنی لڑکیاں تک پیش کرنے میں تامل نہیں کرتے۔

شیخ حسام الدین: ظفر اللہ جاسوس اور غدار ہے۔

چیف منسٹر نے دستخط کر دیے

ڈی۔ آئی۔ جی نے اس یادداشت پر لکھا کہ احرار برابر نفرت وحقارت پھیلانے میں مصروف ہیں۔ چیف منسٹر نے اس پر دستخط کر دیے۔

۲۴ دسمبر ۱۹۵۲ء کا فیصلہ

اس عنوان کے ماتحت ہم متعدد ایسی فائلوں پر متوجہ ہوں گے جو چیف منسٹر کے ساتھ گفتگو کی خاطر معرض التوا میں پڑی تھیں اور جن کے متعلق آخر ۲۴۔ دسمبر کو ایک فیصلہ کیا گیا:۔

راولپنڈی کی تقریریں ۱۵ نومبر ۵۲ء

(الف) ۱۵، ۱۶/ نومبر ۵۲ء کو راولپنڈی میں کنونشن تقریروں کے مندرجہ ذیل اقتباسات توجہ کے قابل ہیں:۔

(۱) ماسٹر تاج الدین: ظفر اللہ کے برطرف ہونے کے بعد اس پر ایک مقدمہ دائر کیا جائے گا جس میں اسے مملکت اور اسلام کے خلاف سرگرمیوں کی جوابدہی کرنی ہوگی۔

تشدد جائز ہے

(۲) قاضی احسان احمد: یہ کشمکش غدار اور وفادار یا سچ اور جھوٹ کے درمیان ہے ۔۔۔ ۔۔۔ آجکل کے دنوں میں سود اور نفع، رشوت اور فیس، جاسوسی اور نبی مترادف الفاظ ہیں۔ اسلام کی حفاظت کے لیے تشدد جائز ہے اسلام کی تبلیغ کے لیے نہیں۔ مرزائی پھر ہندوستان میں شامل ہونے کے خواہاں ہیں۔

محمد مسکین: مرزائیوں کو اپنے قبرستانوں میں دفن نہ ہونے دو۔

عبداللہ شاہ: مرزائی ہتھیاروں کی ناجائز درآمد کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ مرزا غلام احمد دجال تھا جھوٹا نبی تھا۔

ماسٹر تاج الدین: (دوسرے دن) (کشمیر میں) متارکہ جنگ مرزائیوں کی چالوں سے ہوا تھا۔ دفعہ ۱۴۴ کا اطلاق مسجدوں پر انگریزی راج میں بھی نہ ہوا تھا اگر حکومت احمدیوں کو اقلیت قرار دینے پر آمادہ نہیں ہوتی تو ان سے مجلسی اور اقتصادی مقاطعہ کرو۔ ایک من، دس سیر چار چھٹانک گولی بارود ربوہ میں درآمد کی جا چکی ہے (کس قدر ٹھیک معلومات ہیں)

حافظ محمد سعید: گوجرانوالہ میں مرددکاندار مرزائیوں کے لیے الگ برتن رکھتے ہیں (مطلب یہ کہ تم بھی یہی کرو)

مولوی محمد علی جالندھری: مرزائی زندیق اور واجب القتل ہیں ہر مسلمان کو چاہیے کہ مرزا غلام کے نام کے ساتھ لفظ ''کذاب'' شامل کردیا کرے جو شخص کسی جھوٹے نبی کو قتل کردے اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملتا ہے۔

حکیم فضل کریم: مرزا شریف انسان نہ تھا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری: مرزا صاحب نے کہا ہے کہ ان کو خدا سے حمل ہوگیا گویا اس کے خدا نے زیر دفعہ ۳۷۶۔تعزیرات پاکستان جرم کا ارتکاب کیا۔

جالندھری کے خلاف اقدام کی سفارش

۲۱۔نومبر ۱۹۵۲ء کو ایس پی (B) نے رپورٹ کی کہ اب مولوی محمد علی جالندھری کے خلاف یا مقدمہ چلانا چاہیے یا اسے نظر بند کردینا چاہیے۔ یہ امر جالندھری کے لیے باعث عزت تھا کیونکہ اس کی تقریریں خاص طور پر اچھی تھیں اور ان میں سے انتخاب کرنا بے حد مشکل تھا لیکن آخر ''انتظام'' کا پہلو منتخب کرلیا گیا اور ''قانون'' کا پہلو نظر انداز کردیا گیا۔ بہرحال ڈی آئی جی نے ۲۵۔نومبر ۱۹۵۲ء کو لکھا کہ چیف منسٹر صاحب نے ہدایت کی ہے کہ وہ کراچی سے واپس آکر ایک مجلس مذاکرہ میں بات چیت کرکے فیصلہ کریں گے کہ جنگجویانہ اور فرقہ پرستانہ تقریروں کا تدارک کیونکر کیا جائے۔

لائل پور کی تقریریں ۲۶ ستمبر ۵۲ء

(ب)۲۶۔۲۷ستمبر کو لائل پور میں اور ۲۸ ستمبر کو سمندری میں کنونشن ہوئی:۔

صاحبزادہ فیض الحسن: مرزا صاحب پست چال چلن کے آدمی تھے اور اس قابل تھے کہ ان کے خلاف غنڈا ایکٹ کے ماتحت مقدمہ چلایا جاتا کیونکہ اس نے دختر رسول کی عصمت کی توہین کی تھی اور ظفر اللہ دونوں غنڈے ہیں۔

شیخ حسام الدین: ظفر اللہ خبیث ہے اس پر مقدمہ چلانا چاہیے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے اپنی وہی پرانی کہانی ملکہ وکٹوریہ کے متعلق دہرائی اور ساتھ ہی یہ

کہا کہ جنگ شاہی اور کھوٹہ ہوائی حادثوں کے ذمہ دار مرزائی ہیں۔

عطااللہ شاہ بخاری پر پابندی عائد کرنیکی سفارش

ان تقریروں پر ۱۲۸ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو ڈی آئی جی نے تجویز کی کہ سید عطااللہ شاہ بخاری پر کسی نہ کسی قسم کی پابندی عائد کرنا ضروری ہے۔ مثلاً اسکی نقل وحرکت کو ایک ضلع تک محدود کر دیا جائے تقریریں قوم کو خراب کررہی ہیں۔ ہوم سیکرٹری نے کہا وقت آ گیا ہے کہ حکومت پوری پوزیشن کا از سرنو جائزہ لے۔ تقریروں کا موضوع اور لہجہ نہایت شرانگیز ہے تجویز کی گئی کہ گفتگو کے لیے ایک اجلاس منعقد کیا جائے۔

(ج) ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو میلہ گلو شاہ (سیالکوٹ) پر تقریریں: مولوی بشیر احمد اور قاضی منظور احمد نے کہا کہ مرزا غلام احمد کذاب اور دجال تھا اور احمدیوں سے مقاطعہ کرنا چاہیے۔ آخر الذکر نے یہ بھی کہا کہ اگر مسٹر دولتانہ مرزا صاحب کی مدد کو آئے گا تو اس کا استقبال بھی جوتوں سے کیا جائے گا۔ ''اگر مرزا غلام احمد یہ کہہ دیتا کہ اس نے اپنا سر خواجہ ناظم الدین کی بیٹی کی گود میں رکھ دیا تھا تو آپ اس کا نتیجہ دیکھ لیتے''۔ (اس میں مرزا غلام احمد کے اس رویا کی طرف اشارہ ہے جس میں مرزا صاحب نے دیکھا کہ ان کا سر دختر رسولؐ کی گود میں ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس میں مرزا صاحب نے دختر رسول کا ذکر بالکل اسطرح کیا تھا جیسے کوئی اپنی ماں کا ذکر کرے)

۱۷ اکتوبر کی تقریریں۔ مولوی بشیر احمد نے ۱۹۳۵ء کی ایک کہانی سنائی کہ ایک شخص ڈاکٹر احسان علی نے مرزا بشیر الدین محمود احمد کی ایک سالی سے زنا بالجبر کیا۔ اس پر مرزا صاحب نے یہ سزا دی کہ سالی کے ہاتھ سے ڈاکٹر کو دس جوتے لگوائے۔ محبوب کے جوتوں کی ضربیں تو پھولوں کی طرح پڑتی ہیں اسلام میں زنا کی سزا سنگساری ہے اگر۔۔۔ کے خاندان کی کسی عورت سے زنا بالجبر کیا جائے۔۔۔

مولوی کرامت علی نے کہا: مرزا غلام احمد کہتا ہے ''اٹھو سورو، نماز پڑھو'' یہ اس شخص کے اخلاق ہیں اگر خواجہ ناظم الدین سنی ہے تو مرزا غلام احمد کے قول کے مطابق وہ بھی بازاری عورتوں کی اولاد ہے اور اس کے گھر کی عورتیں کتیاں ہیں۔

اس جلسے میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس کا منشا یہ تھا: یہ جلسہ حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ مرزائیوں کو ایک اقلیت قرار دے کیونکہ احمدی مرتد ہیں اور اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ اسلام میں ان کو قتل کرنا جرم نہیں۔ اور ان کے جان و مال کی حفاظت مسلمانوں کا فریضہ نہیں۔ مرتد کی جان کی کوئی قیمت نہیں۔ لیکن اسی حالت میں کہ مملکت اسلامی ہو۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے مقدمہ چلانے کی سفارش کی

۱۸۔ نومبر ۱۹۵۲ء کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سیالکوٹ نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ایما پر اور ۵ جولائی ۱۹۵۲ء کی پالیسی کی چٹھی کی تعمیل میں حکومت سے مذکورہ بالا تین مقررین کے خلاف مقدمات چلانے کی اجازت طلب کی۔ ایس پی (B) مسٹر نذیر احمد نے لکھا کہ ان اشخاص کے خلاف مقدمہ چلانے سے سیالکوٹ میں ''گڑ بڑ'' ہوگی جس پر مسٹر انور علی نے کہا کہ ''ہم ان پھوٹ ڈالنے والوں کے خلاف مقدمات دائر کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیں گے جو اس موقع پر مملکت کے استحکام کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ کیس ۲۴ دسمبر ۱۹۵۲ء تک زیر تجویز رکھا گیا۔ اس دن چیف منسٹر اور ان کے افسروں کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ''جہاں کوئی تقریر عام قانون کے خلاف ہو اس کے متعلق قانونی کاروائی کرنی چاہیے۔

لیکن سفارش قبول نہ کی گئی کیونکہ وہ ''چھوٹے آدمی'' تھے

۳ جنوری ۱۹۵۳ء کو مسٹر نذیر احمد نے یہ فیصلہ سپرنٹنڈنٹ پولیس سیالکوٹ کو پہنچا دیا اور قطعاً اپنی ذمہ داری پر اس رائے کا اضافہ بھی کر دیا کہ میرے نزدیک یہ تینوں مولوی ''چھوٹے آدمی'' ہیں اور ان کے خلاف مقدمات چلانے سے کوئی مفید مقصد پورا نہ ہوگا۔ ہمارے نزدیک یہ طرز عمل بے مثال اور سخت قابل اعتراض تھا ممکن ہے سی آئی ڈی کے اس افسر نے یہ محسوس کیا ہو کہ جب اسکی حکومت نے بہت سے قانون شکنوں سے خدائی رواداری کا سلوک کیا ہے تو وہ خود بھی بعض سے اسی قسم کا سلوک کر سکتا ہے۔

۹ اور ۱۰ نومبر کی سیالکوٹ کنونشن:

مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری: خواجہ ناظم الدین "اللہ لوک" ہے کھانے کا معاملہ علیحدہ ہے۔ بعض پہلوان صرف کھانے کے لیے ہوتے ہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ خواجہ صاحب ایک مرغی کھاتے ہیں، دو کھاتے ہیں یا بیس کھاتے ہیں۔

صاحبزادہ فیض الحسن: میں مرزا صاحب کو دجال اور کذاب کہوں گا۔ انہوں نے ان لوگوں کو سُور کی اولاد کہا ہے جو انہیں نہیں مانتے۔ خواجہ ناظم الدین اور مسٹر دولتانہ بھی اس قبیل میں آتے ہیں۔

مولانا داؤد غزنوی: قادیان اور ننکانہ عنقریب کھلے شہر قرار پائیں گے ایک احمدیوں کے حوالے کیا جائے گا اور دوسرا سکھوں کو دیا جائے گا یہ سب کچھ چودھری محمد ظفر اللہ خاں کی کوششوں سے ہوگا اور ہمارے بے وقوف وزراء صرف دستخط کر دینگے۔

ماسٹر تاج الدین: یہ چھ فٹ دو انچ لمبا مرتد، وزیر خارجہ پاکستان، منڈل اور ظفر اللہ خاں دونوں غیر مسلم ہیں دونوں کو قائداعظم نے منتخب کیا تھا۔ منڈل تو بھاگ گیا اب معلوم نہیں ظفر اللہ کب بھاگے گا۔ ظفر اللہ نے خود ہی اعلان کر دیا ہے کہ اگر اس نے استعفاد ے دیا تو وہ پاکستان چھوڑ کر چلا جائے گا اسکو باہر جانے کی اجازت نہ دینی چاہیے بلکہ اس پر مقدمہ چلانا چاہیے۔

شیخ حسام الدین: انگریزوں نے جہاد کو ممنوع قرار دلوانے کے لیے مرزائیوں کو قائم کر دیا یہ لوگ انگریزوں کے جاسوس ہیں دو احمدی افسر جن میں ایک میجر تھا اور دوسرا لیفٹیننٹ کرنل اٹک کے قریب اسلحہ کی ناجائز درآمد کرتے ہوئے پکڑے گئے لیکن پھر بھی گورمانی اور دولتانہ کو مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد کی اس بات پر یقین نہیں آتا کہ مرزائی ربوہ میں اسلحہ جمع کر رہے ہیں۔

۱۹، ۲۰ نومبر ۱۹۵۲ء کو شجاع آباد میں کانفرنس

مولوی غلام غوث ہزاروی: مرزا غلام احمد اپنی ٹانگیں اور رانیں عورتوں سے دبوایا کرتے تھے اور ان میں سے ایک عورت بھانو تھی وہ برہنہ عورتوں کو دیکھا کرتے تھے۔ اور ان کے بیٹے نے تسلیم کیا ہے کہ وہ شراب پیتے تھے (خدا جانے مولوی صاحب کو خاص طور پر بھانو کی فکر کیوں ہے: عدالت)

مولوی محمد علی جالندھری۔ مرزا غلام احمد اپنی ماں کا لاڈلا تھا لیکن ساتھ ہی الو کا پٹھا بھی تھا۔

ملک بدقسمت ہے جسکو خواجہ ناظم الدین جیسا وزیراعظم ملا لیکن اس کی ماں خوش قسمت ہے جس کا بیٹا وزیراعظم بن گیا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری: مرزا محمود احمد کا باپ پاخانے میں مرا۔ اور میرا باپ اپنے گھر میں فوت ہوا۔ جب وہ پاخانے میں مرا تو اس نے دوسرے راستے سے قے کی۔ ملکہ وکٹوریہ۔۔۔ ۔۔(وہی پرانی کہانی) مرزا صاحب نے کہا ہے کہ انہیں احساس ہوا کہ وہ عورت ہیں اور اللہ نے ان کے ساتھ جماع کیا ان کو دس مہینے حمل رہا۔ پھر درد ہوا۔ انھوں نے ایک درخت کو پکڑ لیا اور پھر وہ پیدا ہو گئے۔۔۔۔۔ وہ دن میں کئی کئی دفعہ پیشاب کرتے تھے۔

ڈی آئی جی کا مشورہ ہے کہ قانون وانتظام کے دائرے میں یکطرفہ کاروائی نہ کرنی چاہیے

ڈی آئی جی نے ۸ دسمبر ۱۹۵۲ء کو ان تقریروں کی ایک رپورٹ پر لکھا کہ مناسب تو یہ ہے کہ ان دونوں جماعتوں پر مقدمات چلائے جائیں (احمدیوں پر بھی؟) لیکن چونکہ مرکزی حکومت احرار کے متعلق اپنا رویہ واضح نہیں کرتی اور حکومت پنجاب یک طرفہ کاروائی نہیں کر سکتی اس لیے محض تنبیہ کافی ہے۔

ہمیں یہ پڑھ کر بے حد تعجب ہوا۔ آخر قانون وانتظام کے معاملے میں ''دوطرفہ کاروائی'' کیونکر ہو سکتی ہے؟ ان مقدمات کے علاوہ جن کا ذکر (ا۔ب۔ج۔د اور ہ) میں آیا ہے۔ مندرجہ ذیل فائلیں بھی ۲۴ دسمبر کی کانفرنس میں پیش کی گئیں۔

احمدی واجب القتل ہیں

ا۔ کیمبلپور کے مولوی عبد الحنان کی تقریر کی فائل جس میں اس نے کہا کہ مرزائی واجب القتل ہیں اور خواجہ ناظم الدین کافر، مرتد، احمق اور جاہل آدمی ہے۔

۲۔ اس پوسٹر کے متعلق فائل جس کا عنوان تھا ''ذرا سوچیں تو ختم نبوت کا منکر کون ہے''، یہ پوسٹر احمدیوں نے اکتوبر ۱۹۵۲ء کے اوائل میں شائع کیا تھا۔ اس کا مفاد یہ تھا کہ ''اگر تمھارا ایمان ہے کہ یسوع مسیح ایک دن ظاہر ہو جائے گا تو پھر تمھارا ختم نبوت کے عقیدے سے کیا مطلب ہے؟

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ منٹگمری نے مقدمہ چلانے کی سفارش کی۔ لیکن ایس پی (B) اور ڈی آئی جی نے منظور نہ کیا۔ انسپکٹر جنرل نے بھی یہی خیال ظاہر کیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ احمدیوں کو سمجھا دیا جائے کہ اپنے مفاد کی خاطر ہی بحث ونزاع کو دعوت نہ دیں۔

۲۴ دسمبر ۱۹۵۲ء کا فیصلہ

ہمیں معلوم نہیں کہ ان مقدمات پر کیا گفتگو ہوئی ہمیں کوئی شبہ نہیں کہ ایک ایسی کانفرنس میں جس کے صدر، وزیر شعبہ قانون وانتظام ہوں اور جس میں حکومت کے نہایت ذمہ دار افسر بھی شریک ہوں۔ سب سے پہلے یہ مسئلہ زیر بحث آنا چاہیے تھا کہ احرار نے اپنی ''یقین دہانی'' کا ایفا نہیں کیا۔ بلا شبہ یہ سب افسر بھی ہماری ہی طرح اس بات کے قائل تھے کہ مضولہ بالا تقریروں میں سے ہر ایک تقریر عام قانون کے خلاف تھی۔ جس میں ہم پبلک سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۲۳ کو بھی شامل سمجھتے ہیں۔

معمولی قانون کے استعمال کے متعلق کسی فیصلے کی ضرورت نہ تھی

کیونکہ اس میں بھی عام عدالتی معمول کے مطابق سماعت مقدمہ کا حکم دیا گیا ہے۔ جب فیصلہ صرف یہی ہونا تھا کہ جب کوئی تقریر عام قانون کے خلاف ہو تو مقرر کے خلاف مقدمہ دائر کیا جائے تو پھر وہ کیا چیز تھی جس پر خاص گفتگو کی ضرورت پیش آئی۔ سوائے اس کے کہ کوئی مزید کارروائی ضروری نہیں؟ کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ ۲۴ دسمبر ۱۹۵۲ء تک عام اور معمولی قانون بھی معطل ہو رہا تھا؟ یا تو اسکا مطلب یہی ہے یا یہ سمجھنا چاہیے کہ حقیقت میں کوئی فیصلہ ہی نہیں کیا گیا۔

لیکن اس تاریخ کے بعد بھی عام قانون بدستور معطل رہا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مسٹر نذیر احمد ایس پی (B) نے خود اپنی مرضی سے گلو شاہ کے مقدمے میں قانون کو معطل کر دیا تھا۔ انہوں نے آغاز میں اس عذر سے کیا کہ مقدمہ چلانے سے غیر ضروری گڑ بڑ ہوگی اور ختم اس قول پر کیا کہ مقررین اسقدر چھوٹے آدمی ہیں کہ ان کے خلاف مقدمہ چلانا ہی فضول ہے۔ تمام مقدمات میں ان دونوں میں سے ایک حالت ضرور پیدا ہوگی یا تو مجرم ایک اہم آدمی ہوگا جس پر مقدمہ چلانے سے شورش میں اضافے کا خطرہ ہوگا اور یا وہ اتنا چھوٹا آدمی ہوگا کہ اسکے خلاف مقدمے کی ضرورت نہ ہوگی اور مسٹر نذیر احمد کی رائے دونوں صورتوں پر حاوی ہے۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ جولائی میں گوجرانوالہ کے

مقدمات اس لیے واپس لے لیے گئے کہ لوگ بہت پریشان و مضطرب ہو گئے تھے لیکن بھیرہ کے مست قلندر کا ''رگڑا'' (بانی احمدیت کے خلاف نہایت توہین انگیز اور دشنام آمیز کتابچہ) نظر انداز کر دیا گیا کیونکہ اگر اس پر مقدمہ دائر کیا جاتا تو مصنف کی شہرت ہو جاتی۔

مذہبی اور ذاتی عزت کی طرف سے بے پروائی

حکومت نے احراریوں سے یہ اقرار حاصل کیا کہ وہ احمدیوں کے جان مال اور آبرو کی حفاظت کریں گے حکومت نے خود احمدیوں کی جماعتی حیثیت سے مذہبی عزت اور اس جماعت کے بعض اہم افراد کی ذاتی عزت کی کوئی پروانہ کی یہاں تک کہ اس نے وزیر اعظم کے سرکاری وقار کی بھی کوئی پروانہ کی۔

''آزاد'' مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۵۲ء کا ایک نہایت مکروہ افتتاحیہ

ہم کہہ چکے ہیں کہ ۲۴ دسمبر ۱۹۵۲ء کے بعد بھی عام قانون معطل رہا۔ مثال کے طور پر ''آزاد'' مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۵۲ء ملاحظہ ہو (احرار کا روزنامہ جسکے ایڈیٹر ماسٹر تاج الدین تھے)

> ''آخر کب تک اس ملک میں ایک زانی، شرابی، غنڈے، بدمعاش، جعلساز، جھوٹے اور دجال کے متعلق نبی، مسیح موعود، احمد اور محمد کے نام ہمارے کانوں ڈالے جائیں گے اور کب تک ایک ایسی عورت کے لیے جو ننگ انسانیت ہے امت کی پاک اور باعصمت ماؤں کو انکی قبروں میں بے چین اور مضطرب کیا جائے گا؟'' (یہ حوالہ مرزا غلام احمد اور ان کی اہلیہ کے متعلق ہے)

مرکزی حکومت سے احمدیوں کا احتجاج

منٹگمری کے احمدیوں کی ایک احتجاجی قرارداد پر حکومت پاکستان نے ۲۱ نومبر ۱۹۵۲ء کو حکومت پاکستان نے ۲۱ نومبر ۱۹۵۲ء کو حکومت پنجاب کو توجہ دلائی۔ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے تحریر زیر بحث کا جائزہ لیا اور رپورٹ کی کہ وہ زیر دفعہ ۱۵۳ الف و ۲۹۵ الف تعزیرات پاکستان اور زیر دفعہ ۲۱ پبلک سیفٹی ایکٹ قابل اقدام ہے۔ ایس پی (B) نے ۲۲ دسمبر کو یہ رپورٹ کی کہ احمدیوں کے خلاف توہین آمیز مضامین لکھنا ایڈیٹر ''آزاد'' کا روزانہ معمول ہے۔ ۲۴۔ دسمبر کے فیصلے سے دو دن بعد

۲۸ دسمبر کو ڈی آئی جی نے یادداشت لکھی کہ یہ مضمون زیر دفعہ ۱۵۳ الف وزیر دفعہ ۲۱ واضح طور پر قابل سزا ہے لیکن مرکزی حکومت نے اب تک ہماری کوئی رہنمائی نہیں کی۔

ڈی آئی جی نے کہا کہ مرکز چونکہ بے توجہی کر رہا ہے اس لیے کوئی کاروائی نہ کی جائے

اور اس بات پر ہم اب تک اظہار افسوس کرتے رہے ہیں اور مرکز کی بے التفائی کے پیش نظر صوبائی حکومت کو کوئی کاروائی نہ کرنی چاہیے۔ کسی قسم کی کاروائی نہ کرنے کی سفارش کے بعد ڈی آئی جی نے اس شدید دشنام وتوہین کے خلاف سخت نفرت کا اظہار کیا جس کا نشانہ جماعت احمدیہ کے بانی اور اس کے افراد کو مسلسل بنایا جا رہا ہے۔ یہ مضمون بھی اسی مہم کا ایک ٹکڑا ہے جو احرار لیڈروں اور ملاؤں نے روزانہ جاری کر رکھی ہے، میں ماسٹر تاج الدین سے بات کروں گا۔

ہوم سیکرٹری اور چیف منسٹر نے اتفاق کیا

ہوم سیکرٹری نے ۲۹ دسمبر کو اس رائے سے اتفاق کیا اور چیف منسٹر نے ۵ جنوری ۱۹۵۳ء کو اس یادداشت پر دستخط کر دیے۔

منہ کا مزا کڑوا ہو گیا

شرافت وشائستگی اس فیصلے سے بغاوت کرتی ہیں۔ ہم ''آزاد'' کی یہ تحریر تو اس سے قبل پڑھ چکے تھے لیکن اس پر ڈی آئی جی کی یادداشت ہمارے سامنے اس وقت پڑھی گئی جب مسٹر دولتانہ ہمارے سامنے بطور گواہ پیش تھے۔ جب ہم نے اس یادداشت کو پڑھا تو ہمیں ایسا احساس ہوا جس کا ظاہر نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ ہمیں اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین نہ آیا۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ ان مکروہ صورتوں میں کم سے کم معمولی قانونی چارہ جوئی ضرور کر لینی چاہیے۔ لیکن دو ہی دن کی مدت کے اندر کیا واقعہ پیش آیا جسکی وجہ سے یہ فیصلہ بدل دیا گیا۔ کیا مرکزی حکومت نے ۲۴ اور ۲۶ دسمبر کے درمیان ہی بے التفائی اختیار کر لی تھی؟ اگر ماسٹر تاج الدین کوئی خاص طور پر شائستہ آدمی تھے اور ان کو بری الذمہ قرار دینے کے لیے کوئی وجہ پیدا کرنا ضروری تھا تو اس کے لیے مرکز کی بے التفاتی کا بہانہ ڈھونڈنا

نہایت نازیبا بات تھی اس صورت حالات کی مضحکہ خیزی اس واقعہ میں ہے کہ ان مضامین کی طرف صوبائی حکومت کو توجہ دلانے والا خود مرکز ہی تھا۔

مسٹر دولتانہ کی تصریح

مسٹر دولتانہ نے عدالت میں کہا: ہوم سیکرٹری نے بھی اتفاق کیا اور میں نے بھی۔ اگر افسر کوئی مزید اقدام مناسب سمجھتے تو میں بلاشبہ ان سے متفق ہو جاتا۔ یہ یادداشتیں حکومت پاکستان کی اس چٹھی پر مبنی تھیں جس میں ان مضامین کی طرف توجہ دلائی گئی تھی مجھے یاد نہیں کہ میں نے یہ مضمون یا یہ یادداشت پڑھی تھی یا نہیں۔ میری توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی گئی کہ ڈی آئی جی ماسٹر تاج الدین سے ملاقات کرنے کے بعد کوئی کاروائی کرنا چاہتے ہیں مجھ سے کوئی خاص فیصلہ طلب نہیں کیا گیا تھا۔ قابل اعتراض تحریروں کے خلاف کاروائی کرنے کے مسئلے کا اس سے قبل فیصلہ کیا جا چکا تھا۔

پالیسی بالکل واضح تھی اور افسر اقدام کر سکتے تھے

اور پالیسی بالکل واضح تھی مجھ سے حکم کے کسی ابہام کی تصریح کرانے یا کسی خاص کیس کے متعلق مخصوص ہدایات حاصل کرنے کے لیے کوئی استصواب نہیں کیا گیا۔

لیکن اگر بے عملی کا کوئی صریح کیس ہو

لیکن ہمارے ایک سوال پر مسٹر دولتانہ نے یہ بھی کہا کہ ''اگر ڈی آئی جی یا ہوم سیکرٹری کی بے عملی کا کوئی واضح کیس کسی یادداشت کی شکل میں میرے پاس آتا جو محض اطلاع کی غرض سے بھیجا جاتا تو میرے لیے کاروائی کرنا بالکل بجا ہوتا۔ نہ صرف بجا ہوتا بلکہ ان کا فرض تھا کہ وہ کوئی اقدام کرتے۔ کیونکہ ایسی حالت میں ان کی وضع کی ہوئی پالیسی کی تعمیل بالکل نہ ہوئی ہوتی۔ پالیسی یہ تھی کہ عام قانون کے ماتحت کاروائی کی جائے لیکن ڈی۔ آئی جی نے محض اس لیے کاروائی کرنے سے انکار کیا کہ الزام مرکزی حکومت پر عائد ہو۔

مسٹر دولتانہ کا موقف صحیح نہیں ہے

مزید برآں ہمارا خیال یہ ہے کہ مسٹر دولتانہ نے ان فائلوں کے متعلق جو ان کی خدمت میں

بغرض اطلاع پیش ہوتی تھی جو موقف ظاہر کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے یہ فائلیں محض بغرض احترام ان کی خدمت میں پیش نہ کی جاتی تھیں کہ وہ وزیر انچارج تھے۔ ان کے پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ صورت حالات سے مطلع رہیں اور انہیں اس کاروائی کا بھی علم رہے جو کی جارہی تھی تاکہ اگر وہ اس کاروائی کو ناکافی یا ضرورت سے زیادہ سمجھیں تو اسکی ترمیم یا تنسیخ کر دیں۔

بے عملی کی دوسری مثالیں

اسی قسم کی بے عملی ان تقریروں کے متعلق بھی نظر آتی ہے جو چنیوٹ کی ختم نبوت کانفرنس میں ۲۶ دسمبر ۱۹۵۲ء کو اور بعد کے دو دنوں میں کی گئی جن کے مندرجہ ذیل اقتباسات کا نقل کرنا فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

ماسٹر تاج الدین: ظفر اللہ پاکستان کا نہیں بلکہ اپنے خلیفہ کا وفادار ہے۔ اس کی سرگرمیوں پر نگار رکھو اور اسکو برخاست کردو۔ چونکہ علما نے احراری لیڈروں کی رہائی کا مطالبہ کیا ہے اس لیے سرکاری دفتروں میں مذہبی بحث ممنوع قرار دے دی گئی ہے۔

مولوی محمد علی جالندھری: ایک احمدی افسر نے گولی بارود کا بھرا ہوا ایک ٹرک اٹک کی آرڈیننس فیکٹری سے ربوہ بھیج دیا۔ ظفر اللہ کشمیر میں ہندوستانی افسروں کو بحال رکھنے پر رضامند ہو گیا تھا۔ وہ غدار ہے اس نے گورداسپور کو ہندوستان میں شامل کرادیا۔ احرار اور مرزائی دونوں ہی پاکستان قائم کرنے کے مخالف تھے لیکن دونوں کی وجوہ مختلف تھیں۔ اول الذکر تو اسکی مخالفت سیاسی وجوہ سے کرتے تھے۔ لیکن آخر الذکر کی مخالفت مرزا غلام احمد کے الہامات پر مبنی تھی۔

سید مظفر علی شمسی: مرزا غلام احمد فاسق و فاجر تھا۔ غفار خاں تو غدار پاکستان ہونے کی بنا پر قید کر دیا گیا لیکن ظفر اللہ جو رسول پاک کا غدار ہے۔ وزیر خارجہ بنا بیٹھا ہے۔

سید عطا اللہ بخاری: اگر حکومت ظفر اللہ خاں کو برطرف نہ کرتی جس طرح مسلمانوں نے خضر وزارت کو توڑ دیا تھا اسی طرح وہ مرکزی حکومت کو بھی اقتدار سے محروم کر سکتے

ہیں۔ اگر عوام نے اور حکومت نے موثر تدابیر اختیار نہ کیں۔تو انگریز ربوہ میں ایک مرزائی حکومت قائم کر دیں گے۔

ان تقریروں کی رپورٹ چیف منسٹر کو بھیجی گئی انہوں نے ۷ جنوری ۱۹۵۳ء کو یہ رپورٹ ملاحظہ فرمائی لیکن اس پر کوئی تبصرہ نہ کیا گیا نہ کوئی کاروائی تجویز کی گئی۔

اخبارات

اب تک ہم نے رپورٹ کے اس حصے کو صرف کانفرنسوں اور تقریروں تک محدود رکھا ہے۔ اور کہیں کہیں حسب ضرورت کسی اخباری مضمون یا کتابچے کا ذکر بھی کر دیا ہے یہ قطعی طور پر بیان کیا گیا ہے کہ مسٹر دولتانہ نے ایک طرف تو جولائی ۱۹۵۲ء میں احرار کے ساتھ سمجھوتا ہونے کے بعد کوئی کاروائی نہیں کی اور دوسری طرف بعض اخباروں کو جو حکومت کے زیر اثر تھے اکسایا گیا کہ وہ اس شورش کی آگ کو ہوا دیں اس کو کراچی کی سمت ''راستے پر لگائیں''۔

راستے پر لگانا

صوبہ لیگ کونسل نے اپنے اجلاس لاہور میں منعقدہ ۲۶، ۲۷ جولائی میں فیصلہ کیا کہ مطالبات مرکز کے پاس بھیجے جائیں یہ گویا اس امر کا روشن ثبوت ہے کہ یہ تحریک کو ''راستے پر لگانے'' کی کوشش تھی۔ اسکے ساتھ ہی مسٹر دولتانہ نے سخت مخالفت کا سامنا کر کے مندوبین کو اس امر پر آمادہ کر لیا کہ وہ احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کی قرارداد منظور کرنے پر اصرار نہ کریں۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ انہوں نے یہ حرکت بدگمانی کو دور کرنے کے لیے تحریک کا رخ مرکز کی طرف موڑنے کے لیے اور مرکزی حکومت کو پریشان کرنے کے لیے کی تھی۔ اسی وجہ سے انہوں نے احرار کے ساتھ مصالحت کر کے زمین تیار کی تمام پابندیاں غیر مشروط پر ہٹالیں اور اگر کوئی شرط تھی تو یہ تھی کہ اگر ختم نبوت کے ٹکٹ پر کھڑے ہوں گے اور احرار ان کی حمایت کرینگے۔ اس معاملے پر اتفاق ہوا یا نہ ہوا یہ معاملہ آئندہ

انتخابات سے تعلق رکھتا ہے۔ ہمارا موجودہ مقصد صرف یہ ہے کہ تحریک کو ''راستے پر لگانے'' کے رجحانات کا جائزہ لیں۔ یہاں ہم یہ بتا دیں کہ خواجہ ناظم الدین بھی اس امر سے آزردہ ہوئے چنانچہ انہوں نے بیان کیا کہ ''جس شخص نے بھی مرکز پر کسی فیصلے کے صدور کے لیے دباؤ ڈالا اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ذمہ داری مرکز کی طرف منتقل ہو جائے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایسی حالت میں اگر فوج اور پولیس کسی پر گولی چلاتی ۔تو صوبائی لیڈر کہہ دیتے کہ سب کچھ مرکز کے حکم سے ہو رہا ہے اگر اس ہنگامے میں مرکزی حکومت ختم ہو جاتی تو صوبائی حکومت لوگوں سے کہتی کہ ''ہم شروع سے آخر تک تمہاری تائید کرتے رہے ہیں''۔

چار اخبار حکومت کے تنخواہ دار

اخبارات کو تعلقات عامہ کی ڈائریکٹریٹ سے اشتہارات کی صورت میں وسیع امداد ملتی ہے لیکن اب یہ واضح ہو چکا ہے کہ اردو کے چار اخبارات کم و بیش حکومت کے تنخواہ دار تھے کیونکہ انہیں ناخواندگی کے خلاف مہم کی تکمیل کے لیے سکولوں ہسپتالوں اور جیلوں کو اخباروں کے پرچے مہیا کرنے کے عوض میں بڑی بڑی رقمیں پیشگی مل رہی تھی۔ لاہور کے بڑے بڑے اخباروں کی نسبت پوزیشن حسب ذیل تھی:

پاکستان ٹائمز اور نوائے وقت نے تحریک سے کوئی دلچسپی نہ لی۔

سول اینڈ ملٹری گزٹ احمدیوں کے حامیوں کی ملکیت تھا

''آزاد'' احرریوں کا اخبار اور ''الفضل'' احمدیوں کا اخبار (اسکی اشاعت محدود تھی) اور ''زمیندار'' احراریوں کا مشہور حامی اخبار تھا۔

''زمیندار'' اور تین دوسرے اخباروں نے حکومت کی اس مد سے جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں مندرجہ ذیل رقوم وصول کریں:

آفاق	ایک لاکھ روپے (۲۶۲۵۰ کی اس رقم کے علاوہ جو اشتہارات کے حساب میں وصول ہوئی)

احسان	تہتر ہزار روپے
زمیندار	تیس ہزار روپے
مغربی پاکستان	بائیس ہزار روپے

ان رقوم کی قسطیں جولائی ۱۹۵۲ء میں مندرجہ ذیل تاریخوں پر ادا کی گئیں:۔

زمیندار کو	دس ہزار۔ تین جولائی کو
آفاق کو	چالیس ہزار۔ چار جولائی کو
احسان کو	چالیس ہزار۔ پانچ جولائی کو

میر نور احمد جو مسٹر دولتانہ کی حکومت کے دوران میں ڈائریکٹر اطلاعات عامہ رہے، بیان کرتے ہیں کہ اخبارات کو مالی امداد دینے کی سکیم سب سے پہلے دسمبر ۱۹۵۰ء یا جنوری ۱۹۵۱ء کی اس کانفرنس میں منظور کی گئی تھی جو خواجہ شہاب الدین وزیر اطلاعات نے منعقد کی تھی تاکہ جن اخباروں کی اشاعت حکومت کے متعلق سنجیدہ ہمدردانہ رویے کی وجہ سے کم ہوگئی ہو ان کے نقصان کی تلافی ہو سکے''۔ موجودہ حکومت کے وکیل چودھری فضل الٰہی کا دعویٰ یہ تھا کہ میر نور احمد مسٹر دولتانہ کی حکومت کے کارندے کی حیثیت سے ان چار اخباروں کو اس مقصد سے استعمال کر رہے تھے کہ شورش کو زندہ رکھیں اور اس کا رخ کراچی کی طرف پھیر دیں لیکن میر نور احمد کا بیان ہے کہ جولائی ۱۹۵۲ء تک حکومت کی پالیسی یہ تھی۔

ڈی پی آر کا جواب

کہ کسی خاص معاملے کی تائید یا مخالفت کا جو حق اخباروں کو حاصل ہے اس میں مداخلت نہ کی جائے۔ لیکن جولائی کے تیسرے یا چوتھے ہفتے میں چیف منسٹر نے مجھے ہدایت کی کہ میں اپنے اثر کو استعمال کر کے اخباروں کو یہ مشورہ دوں کہ وہ اس موضوع پر لکھنا ترک کر دیں۔

اخبارات کے خلاف ہوم سیکرٹری کی شکایت ۴ جولائی ۵۳ء

لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ حکومت کو بحیثیت مجموعی (جس میں سیکرٹریٹ بھی شامل ہے)

جولائی کے دوسرے یا تیسرے ہفتے ہی میں اخبارات سے تعلق خاطر پیدا ہوا۔ کیونکہ ۴ جولائی ۱۹۵۲ء کو ہوم سیکرٹری نے بعض ایڈیٹروں کی ناشائستگی کے متعلق ایک نہایت فکرمندانہ یاداشت چیف منسٹر کو نتھیا گلی بھیجی تھی (ہوم سیکرٹری کے تحریری بیان کا ضمیمہ H-1) میں نے صبح ڈی پی آر کو طلب کر کے یہ ہدایت کی کہ وہ اپنی مشینری کی رفتار کو تیز کر دیں اور پروپیگنڈا کا مواد پورے صوبے میں پھیلا دیں میں نے ان کو سمجھایا کہ وہ تین پریس نوٹ صورت حالات کے مقابلے کے لیے بالکل ناکافی ہیں۔۔۔۔۔عزت مآب چیف منسٹر کی خواہش کے مطابق یکم جولائی کو میں نے مولانا اختر علی خاں اور ان کے گروہ کے ایڈیٹروں سے بات چیت کی، ساری صورت حالات انکو سمجھائی اور ان کے تمام سوالات کے جواب دیے تاکہ انکے خطروں اور اندیشوں کا ازالہ ہو جائے۔ وہ پوری طرح مطمئن ہو کر واپس گئے لیکن مجھے بے حد افسوس ہے کہ ایک اخبار کے سوا باقی کسی نے نرم الفاظ میں بھی حکومت کے اقدام کی پسندیدگی کا اظہار نہ کیا۔ میں نے عزت مآب چیف منسٹر کی خواہش کے مطابق کل پھر ٹیلیفون پر مولانا اختر علی خاں سے بات کی۔ انہوں نے پھر حکومت کے تمام اقدامات کے خلوص پر یقین کا اظہار کیا۔ لیکن آج کے پرچے میں حسب معمول احراریوں کے تمام اقوال کی حمایت کی اس گروہ کے دوسرے اخباروں نے بھی یہی کیا۔۔۔میں نے کل مسٹر حمید نظامی (ایڈیٹر نوائے وقت) اور مسٹر مظہر علی خاں (ایڈیٹر پاکستان ٹائمز) کو بھی طلب کیا تھا ان دونوں نے کہا کہ حکومت نے جو کچھ کیا ہے اس کی عام تائید ہونی چاہیے۔۔۔البتہ مسٹر نظامی نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اگر وہ اپنے سب سے پہلے اخبار کا اظہار خیال کریں گے تو حکومت اور مسلم لیگ کے منظور نظر اخبارات اپنی اشاعت بڑھانے کے لیے سب سے پہلے انہیں احمدی قرار دے کر نشانہ ملامت بنائیں گے۔۔۔

حکومت نے خود مذہب کو استعمال کیا

مظہر علی خاں ایڈیٹر پاکستان ٹائمز

مسٹر مظہر علی خاں نے کہا کہ اگر اس گڑبڑ کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حکومت نے خود مذہب کو اپنا نعرہ اور اپنی قوت کا وسیلہ بنایا ہے اس لیے اگر ایک گروہ مذہب سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے تو دوسروں

کو اپنے مقاصد کے لیے مذہب کو استعمال کرنے سے کیونکر منع کیا جا سکتا ہے۔

اگر ہم ہوم سیکرٹری کی جگہ ہوتے تو ان حقائق ثابتہ کے بیان پر ان دونوں حضرات کا دلی شکریہ ادا کرتے۔

انسپکٹر جنرل نے نشر و اشاعت کی کمی پر ڈی پی آر کو ڈانٹ ڈپٹ کی

مسٹر غیاث الدین احمد نے اپنی شہادت میں بیان کیا کہ چیف منسٹر نے اس یادداشت پر دستخط کر کے اسے واپس کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ ایک موقع پر وہ اور مسٹر انور علی اور مسٹر قربان علی خاں تینوں چیف منسٹر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اس موضوع پر بات چیت کی۔ اسکے بعد مسٹر قربان علی نے میر نور احمد کو طلب کر کے زوردار الفاظ میں ہدایت کی کہ نشر و اشاعت کا کام زیادہ موثر طریقے سے منظم کیا جائے اس اصرار کے بعد ڈی پی آر نے ایک یا دو پوسٹر شائع کیے۔

ممکن ہے اسی وجہ سے مسٹر غیاث الدین احمد نے اپنی یادداشت مورخہ ۴ جولائی میں یہ لکھا کہ ''ایک یا دو پوسٹر'' کافی نہیں ہوں گے۔

۵ جولائی کے فیصلوں میں بھی پروپیگنڈا پر زور دیا گیا

۵ جولائی کو جو فیصلے کیے گئے ان میں واضح طور پر کہا گیا کہ اخباروں میں پروپیگنڈا تیز تر کر دینا چاہیے اور جو اخبارات عام طور پر حکومت کے حامی ہیں ان سے کہا جائے کہ اس معاملے میں بھی تعاون کریں کیونکہ ان کا رویہ اس مسئلے میں حکومت کے حق میں نہیں ہے۔

ڈی پی آر کا جھوٹا جواب

لیکن میر نور احمد نے کہا ہے کہ ''۵ جولائی کی کانفرنس میں افسروں نے مجھ سے کوئی خاص بات نہیں کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے میر صاحب سے کوئی ایسی بات نہیں کی جو قابل ذکر ہو لیکن اسکے بعد وہ نہایت سادگی سے یہ کہتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ حکومت کے حامی اخبارات اعانت نہیں کر رہے اور مجھ سے ان سے مزید امداد حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ فلاں شخص نے کوئی خاص ضرب شدید نہیں لگائی سوائے اس کے کہ زخم چھ انچ

گھرا تھا۔ اسکے بعد کہا کہ ان کا رویہ یہ تھا کہ حکام کو کوئی ایسی بات نہ کرنی چاہیے جس پر مطالبات کی حمایت یا مخالفت کا گمان کی جا سکے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ اس موقع پر ان کے سامنے ۵ جولائی کے متعلقہ فیصلے پیش کیے گئے۔ اگر حکومت کے حامی اخبارو ں سے یہ کہنے کا حکم دیا گیا تھا کہ اس معاملے میں تعاون کریں۔ اور اگر ہوم سیکرٹری یہ شکایت کی تھی کہ ان کا رویہ حکومت کے حق میں نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب کیونکر نکل سکتا ہے کہ میر نور احمد مداخلت نہ کریں اور کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے حکومت کا مافی الضمیر ظاہر ہو جائے؟ لیکن جب میر صاحب کو یہ فیصلے دکھائے گئے تو انہوں نے کہا کہ اس کا تعلق ان غلط فہمیوں سے تھا جو مساجد پر پابندیوں کے متعلق پھیل رہی تھیں۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وزیر اطلاعات کے بیان سے واضح ہے کہ حکومت کے حامی اخباروں اور محکمہ اسلامیات کے خلاف عام شکایت تھی جب ڈاکٹر صاحب جولائی کے نصف دوم میں لاہور آئے تو کسی شخص نے جس کا نام انہیں یاد نہیں رہا، انہیں یہ بتایا کہ تعلقات عامہ کی ڈائریکٹریٹ اخباروں کو ایسے مضامین مہیا کرتی رہی ہے جن سے شورش کو تیز کرنا مقصود تھا۔ انہیں اخلاقی اعتبار سے یقین تھا کہ یہ اطلاع درست ہے چنانچہ انہوں نے نہایت صفائی کے ساتھ میر نور احمد سے سوال کیا کہ آیا یہ صحیح ہے کہ محکمہ اسلامیات اخباروں کو مضامین بھیجتا رہا ہے؟

میر نور احمد نے ٹالنے کی کوشش کی

میر نور احمد نے اس سوال کو ٹالنے کی کوشش کی لیکن جب میں نے اصرار کیا تو انہوں نے کہا کہ شورش کو بعض اطراف میں ''راستے پر لگانے'' کی کوشش کی گئی تھی۔ میں نے خاص طور پر یہ حقیقت ان کے سامنے پیش کی کہ آفاق جو ہر اعتبار سے تعلقات عامہ کی ڈائریکٹریٹ کے ماتحت ہے اسی بات پر اصرار کر رہا ہے کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دیا جائے۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ اس لیے کیا گیا تا کہ تحریک بعض اطراف میں ''راستے پر لگائی'' جا سکے میں نے کہا ''یہ راستے پر لگانا نہیں بھڑکانا ہے''۔ اس کے بعد ڈاکٹر قریشی نے مسٹر دولتانہ سے رابطہ کیا اور مسٹر دولتانہ نے ان کو ۱۹ جولائی کے دن چائے پر مدعو کیا۔ انہوں نے مسٹر دولتانہ سے کہا کہ اگر صوبائی حکومت نے نشر و اشاعت کے سلسلے

میں کوئی ایسی راہ عمل اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا جو سابقہ راہ عمل سے الگ تھی تو مناسب یہ تھا کہ آپ نتھیا گلی میں (جولائی میں مجلس اصول اساسی کے اجلاس کے موقع پر) مجھ سے گفتگو کر لیتے۔

مسٹر حمید نظامی نے ڈی پی آر کو ملزم ٹھہرایا

ڈاکٹر قریشی نے غیر رسمی طور پر مقامی ایڈیٹروں کو چائے پر بلایا اس موقع پر مسٹر حمید نظامی نے کہا کہ اخباروں میں اس مہم کو جاری رکھنے کے ذمہ دار خود میر نور احمد ہیں۔ڈاکٹر قریشی کا بیان ہے کہ میر نور احمد نے اس الزام دہی کے جواب میں کچھ نہ کہا۔ مسٹر حمید نظامی جب بطور گواہ پیش ہوئے تو انہوں نے بیان کیا کہ انہوں نے انگلی سے میر نور احمد کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا کہ یہ سب سے بڑے مجرم ہیں۔ڈاکٹر قریشی کو اصل الفاظ تو یاد نہیں لیکن وہ اس بیان کے ساتھ عمومی حیثیت میں متفق ہیں۔

جب وہ کراچی واپس گئے تو انہوں نے وزیر اعظم کو بتایا کہ ان کی رائے میں تعلقات عامہ کی ڈائریکٹوریٹ شورش کی آگ کو ہوا دے رہی ہے۔اور یہ نہایت عجیب بات ہے کہ صوبائی حکومت کا ایک محکمہ ایک ایسے اہم معاملے میں مرکزی حکومت کی واضح اجازت یا احکام کے بغیر ایک خاص پالیسی اختیار کر لے۔میں یہ کہتا ہوں کہ اگر مسٹر دولتانہ کو یہ معلوم نہ تھا کہ تعلقات عامہ کی ڈائریکٹریٹ شورش کو بھڑکا رہی ہے تو یہ بھی نہایت عجیب معاملہ ہے۔اس لیے کہ اس اہم مسئلے کے متعلق اخباروں کے تراشے (ان کو ضرور مہیا کیے جاتے ہوں گے اور انہیں ضرور معلوم ہوگا کہ وہ اخبارات بھی جو براہ راست حکومت کے زیر نگرانی ہیں (مثلاً آفاق) اسی راہ عمل پر چل رہے ہیں۔ لہٰذا جب مجھے مسٹر دولتانہ نے یہ بتایا کہ یہ راہ عمل ان کے علم کے بغیر اختیار کی گئی تھی تو مجھے حقیقت میں بے حد تعجب ہوا مسٹر دولتانہ نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ وہ اس معاملے کی مزید تحقیق کرینگے۔لیکن اسکے بعد ڈاکٹر قریشی کو کوئی مزید اطلاع موصول نہیں ہوئی۔

ڈی پی آر کی طرف سے ڈاکٹر قریشی کی تردید

میر نور احمد اس سے انکار کرتے ہیں کہ مسٹر حمید نظامی نے انہیں ڈاکٹر قریشی کے سامنے (میری سماعت کے اندر) سب سے برا مجرم قرار دیا تھا میر نور احمد الفاظ کے استعمال میں بہت محتاط ہیں لہٰذا انہوں نے اپنے انکار کو اپنی قوت سامعہ کے ذکر سے محدود کر دیا ہے۔اس سے ہمیں یہ موقع

مل گیا کہ ہم ڈاکٹر قریشی کے بیان کو بھی قبول کر لیں اور ساتھ ہی میر نور احمد پر بھی یقین کر لیں۔ میر صاحب کے قول کے مطابق ڈاکٹر قریشی سے ان کی گفتگو دو شکایتوں کے متعلق ہوئی تھی جو ان کے علم میں آئی تھی: (۱) اگرچہ حکومت کے حامی اخبارات شورش کی حمایت میں مضامین شائع کر رہے تھے لیکن میر نور احمد نے انکو بند کرانے کی کوشش نہ کی (۲) کہ مولوی ابراہیم علی چشتی ڈپٹی سیکرٹری محکمہ اسلامیات اس موضوع پر مضمون نگاری کا انتظام کر رہے تھے۔ پہلے موضوع کے متعلق ان کا جواب یہ تھا کہ اخبارات کی تحریریں عموماً ''ان حدود کے اندر'' ہوتی تھیں جو گزشتہ زمانے میں جائز سمجھے جاتے تھے اور مجھے ان کو روکنے کی کوئی ہدایت موصول نہ ہوئی تھی۔ انہوں نے ڈاکٹر قریشی سے ۱۹ جولائی کو یا اس کے لگ بھگ بات چیت کی تھی اور ہوم سیکرٹری نے ۵ جولائی کو ان سے شکایت کی تھی کہ اخبارات تعاون نہیں کر رہے ہیں۔ دوسری شکایت کے متعلق انہوں نے بے خبری اور تعجب کا اظہار کیا اور کہا کہ میں نے ڈاکٹر قریشی سے کبھی یہ نہیں کہا کہ میں تحریک کو ''راستے پر'' لگا رہا ہوں۔ بلکہ مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ میں نے ایسا عجیب وغریب محاورہ استعمال کیا ہو۔

مسٹر دولتانہ کا بیان

اس معاملے کے متعلق مسٹر دولتانہ کا بیان بالکل مختلف ہے: ڈاکٹر قریشی کی تجویز یہ تھی کہ ذاتی اثر سے کام لینا چاہیے انہوں نے ضمناً یہ ذکر بھی کیا کہ انہیں شکایات موصول ہوئی ہیں کہ میر نور احمد نے یا تو بعض مضامین کہہ کر لکھوائے ہیں یا بعض کسی دوسرے نام سے خود لکھ کر دیے ہیں۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب کو یہ اطلاع مسٹر حمید نظامی نے دی تھی اس لیے مسٹر دولتانہ نے انہیں بتایا کہ مسٹر نظامی اور میر نور احمد ایک دوسرے کے مخالف ہیں لیکن میں اس معاملے کی تحقیق کرونگا۔ چند روز بعد انہوں نے ''میر نور احمد کو طلب کیا جنھوں نے اس الزام کی صحت سے انکار کیا۔ لہٰذا مزید کسی کاروائی کی ضرورت نہ ہوئی۔

میر نور احمد کا بیان ہے کہ چیف منسٹر کو خود میں نے بتایا تھا کہ ڈاکٹر قریشی نے مجھ سے شکایت کی ہے لیکن چیف منسٹر نے مجھ سے ذکر نہیں کیا کہ ڈاکٹر قریشی نے ان سے بھی شکایت کی ہے۔

ڈاکٹر قریشی اس معاملے سے کوئی سروکار نہیں رکھتے ہمیں اطمینان ہے کہ ان کا بیان غلط ثابت نہیں ہو رہا اور مخالف شہادت میں باہمی تضاد ہے۔ ڈاکٹر قریشی کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں

نے ایک ہی شکایت کے متعلق مسٹر دولتانہ سے ایک بات اور میر نور احمد سے دوسری بات کہی ہوگی۔

مسٹر گورمانی نے ڈاکٹر قریشی کی تائید کی

مسٹر مشتاق احمد گورمانی کا بیان ہے کہ ۱۹۵۲ء کے موسم گرما میں کسی وقت ڈاکٹر قریشی نے ارکان کابینہ کو بتایا تھا کہ انہیں اس مطلب کی شکایات موصول ہوئی ہیں کہ پنجاب کے اخباروں میں جو فرقہ وارانہ مضامین شائع ہو رہے ہیں وہ ایسے ذرائع کی طرف سے مہیا کیے جاتے ہیں جو یا تو سرکاری ذرائع ہیں یا حکومت ان کی سرپرستی کر رہی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ چیف منسٹر نے اس سے لاعلمی ظاہر کی ہے اور تحقیق حال کا وعدہ کیا ہے۔ ڈاکٹر قریشی، میر نور احمد کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئے۔

خواجہ ناظم الدین نے مسٹر دولتانہ سے بات کی

خواجہ ناظم الدین نے ۴ اگست کو یا اس کے لگ بھگ اس موضوع پر مسٹر دولتانہ سے گفتگو کی۔ خواجہ ناظم الدین کہتے ہیں میں نے انکو بتایا کہ ڈاکٹر قریشی کے نزدیک میر نور احمد اس تحریک کی حمایت میں مختلف اخباروں کو مواد مہیا کرتے ہیں میں نے یہ بھی کہا پاکستان ٹائمز، نوائے وقت اور سول اینڈ ملٹری گزٹ تو خاموش ہیں اور جن اخبارات پر حکومت کا اقتدار ہے خصوصاً ''زمیندار''، وہ شورش کی آگ کو ہوا دے رہے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ اردو اخبارات کی اشاعت کا انحصار مقبول عام موضوع پر ہوتا ہے اس لیے ان کو روکنا بے حد مشکل ہے لیکن میرا مقصد یہ ہے کہ اخباروں میں زہر چکانی کی جو مہم جاری ہے اسکو تلقین و نصیحت سے قابو میں لایا جائے۔ میں نے کہا کہ صورت حالات کے تدارک کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اخباروں کو شورش کے بھڑکانے سے روکا جائے اور صرف آپ ہی ایسے شخص ہیں جو انہیں روک سکتے ہیں کیونکہ ان اخباروں کا دارومدار آپ ہی اعانت اور سرپرستی پر ہے۔

مسٹر دولتانہ خواجہ ناظم الدین کے بیان کی تردید کرتے ہیں

اس کے متعلق دولتانہ کا قول ہے کہ خواجہ ناظم الدین کا بیان ''نادرست اور بالکل غیر منطقی ہے کیونکہ ڈاکٹر قریشی کی اس تجویز پر عمل کرنے کے بعد کہ میں اس موضوع کے متعلق اخباروں کو خاموش

کرانے کے لیے اپنا ذاتی اثر استعمال کروں۔ میں یہ نہیں کرسکتا کہ وزیر اعظم کے پاس جا کر کہوں کہ حکومت پنجاب کے لیے شورش کی حمایت میں اخبارات کو مضامین بھیجنا بہت اچھی بات تھی درآنحالیکہ ہم ان کو اس موضوع پر بالکل کچھ نہ لکھنے کی ترغیب دے رہے تھے''۔ اس دلیل میں مفروضہ یہ ہے کہ مسٹر دولتانہ نے ڈاکٹر قریشی کی تجویز پر عمل کیا لیکن مسٹر دولتانہ کی حمایت میں بہتر دلیل یہ دی جاسکتی تھی کہ ڈاکٹر قریشی کو یہ اطلاع دینے کے بعد کہ مجھے میر نور احمد کی سرگرمیوں کا کوئی علم نہیں۔ میں خواجہ ناظم الدین سے یہ نہ کہتا کہ راستے پر لگانے میں بھی بعض خوبیاں ہیں۔ بہرحال مسٹر دولتانہ نے ہمیں کچھ نہیں بتایا کہ انہوں نے خواجہ ناظم الدین سے ٹھیک ٹھیک کیا کہا تھا یا ان سے اس موضوع کا ذکر بھی آیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ذکر ضرور آیا تھا کیونکہ ڈاکٹر قریشی جب لاہور سے روانہ ہوئے تھے تو انہیں میر نور احمد کے معاملے کے متعلق اتنا ہی پختہ یقین تھا جتنا کیفیاتی شہادت سے پیدا ہوسکتا ہے۔ (مسٹر حمید نظامی کی براہ راست الزام دہی کو چھوڑ دیجیے) اور چونکہ ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف خواجہ ناظم الدین سے بلکہ پوری کابینہ سے اس موضوع کا ذکر بطور شکایت کیا تھا لہٰذا خواجہ ناظم الدین کے لیے یہ بالکل قدرتی تھا کہ وہ تحریک کی صورت حالات پر گفتگو کرنے کیساتھ اس موضوع کا ذکر بھی کرتے۔

اخباروں کے رویے کے باوجود ان کے معاہدوں کی تجدید کی گئی

اس سے قبل یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ اخباروں کو بعض رقوم ۳، ۴ اور ۵ کو ادا کی گئیں جب تحریک پورے شباب پر تھی۔ کوئی حکومت جو کسی شورش کے متعلق فکرمند نہ ہو۔ ایسے اخباروں کی سرپرستی کو جاری نہیں رکھ سکتی جو تعاون کے بجائے مخالفانہ نقطۂ نگاہ کی اشاعت کررہے ہوں۔ لیکن میر نور احمد نے ایسا کیا اور مسٹر دولتانہ کو اس کا علم تھا ہمیں معلوم ہے کہ ہوم سیکرٹری نے ۴ جولائی کو حکومت کے حامی اخباروں کے خلاف کس قدر تلخی سے شکایت کی اور ۵ جولائی کے فیصلوں میں انکے رویے کو کیونکہ مخالفانہ ظاہر کیا گیا جب میر نور احمد سے پوچھا گیا کہ جس حالت میں آپکے علم میں تھا کہ یہ اخبارات قابل اعتراض سرگرمیوں میں مصروف ہیں آپ نے انکو تازہ ادائیگیاں کیوں کیں تو میر نور احمد نے جواب دیا کہ میرے خیال میں وہ قابل اعتراض سرگرمیوں میں مصروف نہ تھے۔ اگر یہ سرگرمیاں حکومت کے نزدیک یا کم از کم میر نور احمد کے نزدیک پسندیدہ تھیں تو میر صاحب کا یہ جواب بالکل صحیح ہے۔

چیف منسٹر نے اس فعل کو منظور کیا

میر صاحب نے یہ بھی کہا کہ یہ رقوم انہوں نے اپنی مرضی سے تقسیم کی تھیں اور اسکی اطلاع چیف منسٹر کو دے دی تھی جنہوں نے اس تقسیم کو منظور کر لیا تھا۔ وہ ظاہراً اپنی یاداشت مورخہ ۳۰ جولائی ۵۲ء کا ذکر کر رہے ہیں جس میں لکھا ہے کہ یہ رقوم ادا کر دی گئی ہیں۔ جیسا کہ عزت مآب چیف منسٹر کی خدمت میں زبانی عرض کیا جا چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ زبانی گزارش ادائیگی سے پہلے کی گئی تھی جب یہ یاداشت مسٹر دولتانہ کو دکھائی گئی تو انہوں نے کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ روپیہ صرف کرنے کے بعد مجھ سے اسکا ذکر کیا گیا۔ میر صاحب نے اس خرچ کے متعلق مجھ سے گفتگو نہیں کی۔ مسٹر دولتانہ کا زور ان لفظوں پر ہے ''روپیہ صرف کرنے کے بعد'' لیکن چونکہ نوٹ سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ ادائیگیاں ۳، ۴، ۵ جولائی کو کی گئی تھیں اس لیے مسٹر دولتانہ سے یہ سوال کیا گیا: ''لہٰذا معلوم ہوا کہ ڈی پی آر نے آپ کے نتھیا گلی روانہ ہونے سے قبل آپ سے ضرور اس خرچ کا ذکر کیا ہوگا''۔ اس کا جواب یہ تھا کہ یہ اخراجات ۱۹۵۰ء کی پالیسی کے سلسلے میں کیے گئے تھے۔ لیکن یہ جواب تو قطعاً مفید نہیں کیونکہ ۱۹۵۰ء کی پالیسی یہ تھی حکومت کے جن حامی اخباروں کو اپنی اعتدال پسندی کے باعث اشاعت کی کمی سے نقصان برداشت کرنا پڑا ہے ان کی مالی امداد کی جائے۔ مسٹر دولتانہ جواب دیتے ہیں کہ حکومت نے سب سے پہلے یہ فیصلہ جولائی کے تیسرے ہفتے میں کیا تھا کہ ان اخباروں کو اس نزاع کی اشاعت سے باز رکھنے کے لیے اپنے اثر ونفوذ کو استعمال کرے۔ اس جواب سے موجودہ صورت حالات کا مقابلہ مقصود تھا۔

دولتانہ کا قول ہے کہ اس وقت تک کوئی پالیسی ہی نہ تھی: جولائی اگست ۵۲ء

لیکن ایک اور مقام پر مسٹر دولتانہ نے عدم مداخلت کی پالیسی میں ماہ اگست کو بھی شامل کر لیا تھا۔ زمیندار کے معاملے میں ہمیں کامیابی نہ ہوئی۔۔۔۔۔ زمیندار کے ساتھ جو معاہدہ تھا (پرچے مہیا کرنے کے متعلق) وہ ختم نہ کیا گیا۔ کیونکہ اخبار کی پوری پالیسی پر اپنا اقتدار قائم کر لینا مقصود نہ تھا جولائی اور اگست میں مطالبات کے متعلق نہ ہماری اور نہ مرکز کی کوئی پالیسی تھی۔ لیکن یہ جواب دینے

والا اس بات کو بھول گیا کہ جولائی کے تیسرے ہفتے ہی میں ڈاکٹر قریشی نے مسٹر دولتانہ سے کہا تھا کہ وہ اخباروں کو اس شورش کی اشاعت ترک کر دینے کی ترغیب دیں اور سابقہ جواب میں کم از کم تسلیم کیا گیا ہے کہ حکومت نے کسی مرحلے پر اس نزاع کو ''بلیک آوٹ'' کرنے کا فیصلہ ضرور کیا تھا۔ لہٰذا حکومت کے ذہن میں اس امر کے متعلق کوئی شبہ نہ ہونا چاہیے تھا کہ جولائی کے بعد اس شورش کے متعلق کیا رویہ اختیار کرنا ہے۔

لیکن پالیسی تو موجود تھی

یہ تو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا کہ (کم از کم سی آئی ڈی کی فائلوں کے مطابق) جولائی میں اخبارات کو کنٹرول کرنے کی کوئی پالیسی موجود نہ تھی۔ ۴ جولائی کی یاداشت میں مسٹر غیاث الدین احمد نے مسٹر دولتانہ کو نتھیا گلی میں یہ اطلاع دی کہ آپ کی ٹیلیفونی ہدایات کی تعمیل میں میں نے مولانا اختر علی خاں کو طلب کر کے ان سے بات چیت کی ہے یا تو مسٹر دولتانہ ہوم سیکرٹری سے کچھ اور کہتے تھے اور ڈی پی آر سے دوسرے انداز میں بات کرتے تھے یا وہ بھول رہے ہیں کہ وہ جولائی کے آغاز میں بھی ہوم سیکرٹری کو اخباروں کی نگرانی کے طریقے سمجھا رہے تھے۔

مسٹر دولتانہ نے جو یہ دعویٰ کی ہے کہ جولائی اگست میں کوئی پالیسی ہی نہ تھی اس سے بالواسطہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اخباروں کی ادائیگیوں کے مسئلے پر ان کے نتھیا گلی جانے سے پہلے ان کے ساتھ گفتگو ضرور ہوئی ہوگی لیکن اگر ''روپیہ صرف کرنے کے بعد'' کے الفاظ میں کچھ معنی ہیں تو کم از کم اس مرحلے پر مسٹر دولتانہ کو یہ واضح کر دینا چاہیے تھا کہ ان ادائیگیوں سے ۱۹۵۰ء کی پالیسی کا مقصد فوت ہو گیا اور انہیں چاہیے تھا کہ ان ادائیگیوں سے پہلے مشورہ کر لیتے۔

''زمیندار'' نے پروپیگنڈا جاری رکھا

اس سلسلے میں جتنے جوابات دیے گئے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس پر تنقید نہ ہو سکتی ہو۔ زمیندار کے ساتھ جو کاروباری معاہدہ تھا وہ شورش کی دیوانہ وار حمایت کے باوجود کالعدم نہ کیا گیا۔ کیونکہ کسی اخبار کی پوری پالیسی پر اقتدار قائم کرنا مقصود نہ تھا۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ آیا اخبار کی

پالیسی کے اس حصے پر اقتدار قائم کرنا مقصود تھا جس کا حکومت پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا؟ کیا یہ بات ۱۹۵۰ء کی پالیسی کے مطابق تھی کہ ایک ایسے اخبار کی سرپرستی کی جائے جو شورش کو بھڑکا رہا تھا؟ یہ بات اسی صورت میں پالیسی کے مطابق ہوسکتی ہے کہ خود حکومت کی پالیسی بھی یہی ہو کہ شورش کو بھڑکایا جائے۔

اسکی وجہ

مسٹر دولتانہ اور میر نور احمد دونوں یہ کہتے ہیں کہ ''زمیندار'' کے سوا باقی تین اخباروں نے ''بلیک آؤٹ'' کے مشورے کے بعد اس نزاع کے متعلق شاذ ہی کوئی مضمون شائع کیا ہوگا۔ ہم حصہ دوم میں بتا چکے ہیں کہ یہ ''بلیک آؤٹ'' کسقدر موسوم تھا۔ میر نور احمد نے کہا ہے کہ ''زمیندار'' نے کیوں اجتناب نہ کیا۔ اسکی وجہ میرے قیاس کے مطابق یہ ہے کہ مولانا اختر علی خاں کے نزدیک اس تحریک کی حمایت انکے لیے بے حد ہردلعزیزی کا باعث ہو رہی تھی''۔

اکتوبر میں اور رقم ملی

یہی وجہ تھی کہ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں ''زمیندار'' کو سات ہزار روپے کی ایک رقم عطا کردی گئی چیف منسٹر کے ساتھ ''زمیندار کے معاملے پر بارہا گفتگو کی گئی اور ایک دفعہ جائنٹ سیکرٹری وزارت اطلاعات ونشریات سے بھی بات چیت ہوئی اور ہر دفعہ یہی فیصلہ کیا گیا کہ وہ عام مراعات جو دوست اخبارات سے روا رکھی جاتی ہیں وہ ''زمیندار'' سے واپس نہ لینی چاہئیں۔ کیوں واپس نہ لینی چاہئیں؟ ہمیں اسی کے جواب کی ضرورت ہے۔ ۲ مارچ ۱۹۵۲ء کو اس اخبار کی اشاعت مرکزی حکومت کے احکام سے ممنوع قرار دی گئی لیکن وہ ایک اور نام ''آثار'' سے جاری ہوگیا اور اس کے عقبی صفحے پر لفظ ''زمیندار'' جلی قلم سے لکھا تھا۔ ''آثار'' ''زمیندار'' ہی کے مالک کا ایک پرانا اخبار تھا لیکن ایک خاص مدت تک شائع نہ ہوسکنے کی وجہ سے اس کا ڈیکلریشن زائد المعیاد ہوگیا تھا۔ لہٰذا وہ اس قانونی وجہ سے بند کردیا گیا اس بنا پر نہیں کہ وہ اصل میں ''زمیندار'' ہی کا تسلسل تھا۔ اس کے ساتھ ہی میر نور احمد نے سفارش کی کہ ''مغربی پاکستان'' کو مولانا اختر علی خاں نے خرید لیا ہے! اس لیے اسی مہینے میں اسکو جاری

ہونے کی اجازت دے دی جائے۔ یہ سفارش اس لیے کی گئی کہ مولانا اختر علی خاں کے بیٹے منصور علی خاں نے ایک اقرار نامہ لکھدیا تھا کہ وہ قطعی طور پر مختلف پالیسی پر کاربند ہوں گے۔ ایسے وقت میں جب مارشل لاء لاہور کو اس خامکارانہ جنگجوئی سے نجات دلانے کی کوشش کر رہا تھا جس کا حامی ''زمیندار'' تھا۔ میر نور احمد نہایت معصومانہ انداز سے اسکو بے اثر کرنے کی دوا پلا رہے تھے اور اگر مرکزی حکومت بروقت احتجاج نہ کرتی تو شاید وہ کامیاب ہو ہی جاتے۔ میر نور احمد انکار کر رہے تھے کہ مرکز سے کوئی احتجاج ہوا تھا۔ لیکن اسوقت خاموش ہوئے جب انہیں ایک یاداشت دکھائی گئی جس میں کراچی سے ایک ٹیلیفونی پیغام کے ارسال کا اندراج موجود تھا۔

مختلف اخباروں خصوصاً ''آزاد'' ''زمیندار'' (صفحات ۸۹، ۸۸، ۱۵، پیپر بک) میں بعض قابل اعتراض مضامین شائع ہوئے تھے۔ وہ میر نور احمد کو دکھائے گئے اور پوچھا گیا کہ آیا انہوں نے ان کے خلاف کوئی کاروائی تجویز کی تھی انہوں نے جواب دیا کہ ان کے متعلق وقتاً فوقتاً چیف منسٹر سے گفتگو ہوتی تھی اور ہر دفعہ وہ یہی کہتے تھے کہ کاروائی ملتوی کر دی جائے تا آنکہ بعض فیصلے ہو جائیں کہ مجموعی حیثیت سے تحریک کا تدارک کیونکر کیا جائے گا۔ ''زمیندار'' کے خلاف کاروائی ملتوی کرنے کی سب سے بڑی وجہ ان کے نزدیک یہ تھی کہ ایسی کاروائی سے اتنے عقدے حل نہیں ہوں گے۔ جتنے اور پیدا ہو جائیں گے۔

ڈی پی آر ''زمیندار'' کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں

۱۸ فروری ۱۹۵۳ء کو مرکز سے ایک تار آیا جس میں ''زمیندار'' کے دو اور ''آزاد'' کے تین مضامین کی طرف (جو سب کے سب فروری میں شائع ہوئے تھے) توجہ دلائی گئی اور امید ظاہر کی گئی کہ اخبارات کو شورش کے بھڑکانے سے باز رکھنے کے لیے ضروری تدابیر اختیار کی جائیں گی۔ ''زمیندار'' کے تعلق میں میر نور احمد نے یہ یاداشت لکھی۔ زمیندار کا رویہ احمدی مسئلے پر خاصا ناگوار ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں انتظار کرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ شورش کیا صورت اختیار کرتی ہے''۔ اب وہ کہتے ہیں کہ انکے نزدیک مناسب یہ تھا کہ جب حکومت مجموعی حیثیت سے تحریک کے

خلاف اقدام کرے تو ''زمیندار'' کا تدارک بھی اسی اقدام میں شامل ہو۔'' اس امتیاز کی وجہ یہ تھی کہ ''زمیندار'' کا مسئلہ بالکل خاص تھا: اختر علی خاں پاکستان کے مدیران جرائد کی کانفرنس (پی این ای سی) کے صدر تھے اور مرکز ان کو اچھا سمجھتا تھا''۔ جب یہ بتایا گیا کہ اس موقع پر تو خود مرکز ہی کاروائی پر اصرار کر رہا ہے تو انہوں نے جواب دیا (ہم صرف شہادت کا مفاد نقل کر رہے ہیں) ''مرکز کی دو زبانیں ہیں۔ وزارت اطلاعات نے 'زمیندار' کو حکومت کی حمایت پر قائم رکھنے کے لیے اس کے متعلق صرف ترغیبی طریقوں کے استعمال کا مشورہ دیا وزارت داخلہ نے قابل اعتراض فقروں کی طرف توجہ دلائی اور کاروائی تجویز کی جو وزارت داخلہ خود بھی کر سکتی تھی۔ اس مسئلے پر چیف منسٹر کے ساتھ ایک ایک ماہ کے وقفے سے گفتگو ہوتی رہی۔ لیکن اس دفعہ نہیں ہوئی۔ یہ صحیح ہے کہ وزارت داخلہ نے ایک انتہائی خفیہ نہایت فوری مرموز تار میں کاروائی کی سفارش کی لیکن مجھے اپنے خیالات حکومت پر واضح کرنے پڑے۔ میں نے اپنی یاداشت میں مرکز کی دوسری زبان یعنی وزارت اطلاعات کا ذکر نہیں کیا۔

ہم میر نور احمد کے جوابات وتصریح کا جتنا زیادہ مطالعہ کرتے جاتے ہیں۔ اتنا ہی ہمارا امتلی کا احساس بڑھتا جاتا ہے۔ لیکن ہماری رائے یہ ہے کہ اگر وہ مرکز کی ضروری ہدایات کو اس خیرہ چشمی سے رد کر رہے تھے تو انہیں ضرور کسی طرف سے مضبوط پشت پناہی حاصل تھی۔ لیکن وزارت اطلاعات کے کسی قول کا (بشرطیکہ وہ سچ مچ کہا گیا ہو) کوئی بعید سے بعید تعلق بھی اس فقرے سے کیونکر ہوسکتا ہے جو میر صاحب کی یاداشت میں موجود ہے۔ اگر یہ شورش قانون شکنی کی شکل اختیار کرلے اور حکومت اس کے تدارک کے لیے ایک جامع پالیسی وضع کرے تو اخبارات کے خلاف کاروائی بھی اسی پالیسی کا حصہ ہوگی۔ میر صاحب کے کئی جملے اور محاورے ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں لہٰذا ہم نے ان سے پوچھا کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ کاروائی اس وقت تک ملتوی رکھی جائے۔ جب تک قانون شکنی شروع نہ ہو جائے؟ انہوں نے کہا میرا مطلب محض یہ تھا کہ اگر لاقانونی پھوٹ پڑی تو غالبًا کاروائی زیادہ شدید کرنی ہوگی۔ کاروائی سے میری مراد مناسب کاروائی تھی۔

لغو

یعنی ایسی کاروائی جوصورت حالات کے مناسب ہو۔ ہمارے نزدیک اس قسم کی تصریحات کے جواب میں کم سے کم جولفظ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ وہ لغو ہے۔

زمیندار منظور نظر اخبار تھا

اس میں کوئی شک نہیں کہ زمیندار بہت لاڈلا اخبار تھا میر نور احمد نے ''زمیندار'' کے تعلق میں ہر قسم کی واضح اور ضمنی مہربانیوں کو تسلیم کرنے کے بعد مسٹر دولتانہ کے وکیل کے جواب میں یہ بتایا کہ مولانا اختر علی خاں کے تعلقات خواجہ ناظم الدین کے ساتھ بہت گہرے تھے لیکن کیا کوئی اور مولانا بھی ہیں جو اس عزت کے دعویدار نہ تھے؟ ہمارے نزدیک تو قاضی احسان احمد شجاع آبادی تک بھی جو احمدی لٹریچر کا ایک چوبی صندوق لیے پھرتے تھے اس اعزاز کے حامل تھے۔ خواجہ ناظم الدین اپنے مذاکرات کو کامیاب بنانے کی امید میں ان تمام حضرات سے بخوشی ملاقات کر لیتے تھے اور اگر مولانا اختر علی خاں نے اس صورت حالات سے فائدہ اٹھایا یہاں تک کہ بہاول پور سے کراچی جانے کے لیے گورنر جنرل کا وائیکنگ طیارہ تک طلب کر لیا تو اس سے محض ان کے اپنے اوصاف عالیہ کا پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ اختر علی خاں نے حکومت اور عوام دونوں کو ممنون کرنے کی کوششیں کیں۔ لیکن آخر خواجہ ناظم الدین نے ان کے متعلق یہی رائے دی کہ وہ ایک ڈھل مل یقین سے آدمی ہیں جو کراچی میں مجھ سے ایک بات کہتے ہیں اور لاہور میں پہنچ کر کرتے کچھ اور ہیں۔

خواندگی بالغاں کا فنڈ

ابھی تعجب انگیز باتیں ختم نہیں ہوئیں جو روپیہ اخباروں پر صرف کیا گیا اس میں سے دو لاکھ تین ہزار کی رقم خواندگی بالغاں کے فنڈ سے ادھر منتقل کی گئی تھی۔ اس فنڈ کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ قانون ساز اسمبلی نے یہ رقم ناخواندہ بالغوں کی تعلیم کے لیے منظور کی تھی۔ غالباً میر نور احمد کو لفظ ''خواندگی'' سے کچھ غلط فہمی ہوئی اور انہوں نے اس رقم کو ''خواندہ'' بالغوں کی تعلیم کے لیے وقف کر دیا۔

ڈی پی آر نے اسے ''خواندہ'' بالغوں کے فنڈ کے طور پر استعمال کیا

کیونکہ کسی ناخواندہ آدمی کو تعلیم دینے کا تو یہ طریقہ نہیں کہ اس کے ہاتھوں میں ''زمیندار'' یا ''آفاق'' کا پرچہ دے دیا جائے۔ کیونکہ کافی پڑھا لکھا آدمی ہی کسی اخبار سے استفادہ کر سکتا ہے۔ جب میر نور احمد نے یہ تجویز پیش کی تو انہوں نے حکومت سے کہا کہ اس امر کو ''صیغہ راز'' میں رکھا جائے کیونکہ ان کے قول کے مطابق یہ ''سیاسی خرچ'' تھا۔ لیکن ہمارے نزدیک بہتر دلیل یہ ہوتی کہ اگر یہ معاملہ ظاہر ہو گیا تو اسکے خلاف نکتہ چینی ہوگی وہ تسلیم کرتے ہیں کہ انہیں کسی قدر نکتہ چینی کی توقع ضرور تھی اور واقعہ یہ ہے کہ سر رشتہ تعلیم (محکمہ تعلیم) نے اس فیصلے کے خلاف اعتراض کیا تھا۔

ناخواندہ کو تعلیم دینا مقصود نہ تھا

لیکن میر صاحب کا بیان ہے کہ انہیں حکومت کی منظور کی ہوئی ایک سکیم پر عمل درآمد کرنا تھا اور حکومت ہی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ دوسرے فنڈ سے روپیہ منتقل کر لیا جائے اس کے بعد ایک واضح اعتراف بھی ہے: ''ہماری سکیم کا مقصد ناخواندہ لوگوں کو پڑھانا نہیں تھا بلکہ بعض خاص قسم کے اخباروں کو مالی امداد دینا تھا''۔

انہوں نے فائل (EX.D.E.250) میں ۳۰ جولائی ۱۹۵۲ء کو ایک یاداشت لکھی جس

سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے قبل چیف منسٹر سے گفتگو ہو چکی تھی۔ یہ یاداشت چیف سیکرٹری اور چیف منسٹر کے پاس بھی گئی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ میر نور احمد صرف ''اپنے طور پر'' یہ کام نہ کر رہے تھے مسٹر دولتانہ نے تسلیم کیا کہ وزیر تعلیم چیف منسٹر کی اطلاع کے بغیر فنڈ کو دوسری جگہ صرف کر سکتے تھے اس کے بعد ان کو فائل دکھائی گئی جس پر انہوں نے کہا کہ ''اگر فائل میں لکھا ہے کہ انہوں نے اس کیس کے متعلق مجھ سے بات چیت کی تھی تو ضرور کی ہوگی کیونکہ یہ پالیسی کا معاملہ تھا''۔

ممکن ہے اخبارات کسی کو بھی نہ بھیجے گئے ہوں

یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا خواندہ لوگ واقعی مزید خواندہ بنائے گئے تھے۔ڈائریکٹر نے تسلیم کیا ہے کہ ڈائریکٹریٹ اخبارات کے جتنے پرچے خریدتی تھی ان کی کل تعداد ان اداروں کی کل تعداد کے مقابلے میں جن کے لیے وہ خریدے جاتے تھے ''بہت ہی زیادہ'' تھی۔ایک فہرست سے یہ ظاہر ہوا کہ فرمائش تو ساڑھے تین سو پرچوں کی دی گئی لیکن جن اداروں کے لیے ان کی ضرورت تھی وہ ۳۳۰ تھے لیکن بعض وقت مختلف اخباروں کے پرچے (یعنی ایک سے زیادہ پرچے) ایک ہی ادارے کو مہیا کر دیے جاتے تھے۔فائل سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ان اداروں کو یہ اطلاع بھی دی جاتی تھی کہ فلاں پرچہ اتنی مدت کے لیے ان کے نام جاری کر دیا گیا ہے لہٰذا گویا اخباروں کو آزاد چھوڑ دیا گیا تھا کہ پرچہ بھیجیں یا نہ بھیجیں۔

آفاق

ان اخباروں میں سے ''آفاق'' تو حکومت ہی کا اخبار تھا اور یہ اسی واقعہ سے ظاہر ہے کہ اسکو کل -/1,26,258 روپے کی رقم ادا کی گئی۔ یہ اخبار ہفتہ وار تھا اور جونہی وسط جون ۱۹۵۱ء میں اسے بیالیس ہزار روپے کی پہلی رقم ادا کی گئی یہ روزانہ اخبار ہو گیا۔میر نور احمد کا بیان ہے کہ ان کا اس اخبار سے کوئی ذاتی تعلق نہ تھا لیکن ان کے فرزند میر اقبال احمد روز اول ہی سے چار سو روپے ماہوار پر اسکے مہتمم اشتہارات بن گئے تھے۔''اس نے فن اشتہار میں کوئی خاص ٹریننگ حاصل نہیں کی لیکن وہ گریجویٹ ہے اس سے پیشتر اس نے کسی اخبار میں ملازمت نہ کی تھی۔ وہ نمک کی برآمد کا کاروبار کرتا

تھا''۔کئی دن بعد مسٹر دولتانہ کے وکیل مسٹر یعقوب علی خاں نے ان کو یاد دلایا کہ میر اقبال احمد تقسیم سے پہلے حکومت ہند کے ماتحت تین سو روپے ماہوار پر پبلسٹی افسر بھی تو رہ چکے ہیں۔اس پر میر نور احمد نے کہا کہ میں نے سابق میں اس بات کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ مجھ سے جو سوال کیا گیا تھا وہ میرے خیال میں اس اسامی کی خاص ٹریننگ کے متعلق تھا۔بہرحال میر نور احمد نے یہ بھی کہا کہ چیف منسٹر ''سیاسی اعتبار'' سے ''آفاق'' میں دلچسپی رکھتے تھے۔چنانچہ ایک دفعہ انہوں نے پانچ ہزار روپے کا چیک ''آفاق'' کو بطور عطیہ بھی دیا تھا۔اس کے متعلق مسٹر دولتانہ نے کہا کہ یہ رقم بعض مسلم لیگی کارکنوں نے دی تھی تاکہ آفاق کو بطور عطیہ دے دی جائے۔کیونکہ ''آفاق'' نے مسلم لیگ کے مقاصد کی خدمات انجام دی ہیں۔بہرحال جو کچھ بھی ہو یہ رقم مسٹر اقبال احمد کے حساب میں داخل کر کے انہیں ''آفاق لمیٹڈ'' کا حصہ دار بنا لیا گیا۔دوسرے الفاظ میں یہ کہنا چاہیے کہ میر اقبال احمد ایک دن صبح کو سو کر جو اٹھے تو انہوں نے ایک پیسہ ادا کیے بغیر اپنے آپکو پانچ ہزار روپے کے حصوں کا مالک پایا۔لیکن ان کے والد کا بیان ہے کہ یہ روپیہ وہ نہ تھا جو لائل پور سے یا مسٹر دولتانہ سے ملا تھا۔ ''گورننگ ڈائریکٹر نے اقبال احمد کو جنرل مینجر کا عہدہ پیش کیا اور مجھے یقین ہے (زور لفظ 'یقین' پر ہے) کہ اس کو ان مزید فرائض کے معاوضے میں جو اس پر عائد ہونے والے تھے ان حصوں کو قبول کرنے کے لیے کہا۔ہمارا خیال ہے کہ میر نور احمد تصریح کے بہت بڑے ماہر ہیں۔کاش انہوں نے اپنی اس مہارت فن کو شورش کے خلاف نشر و اشاعت میں استعمال کیا ہوتا۔

اس کے بعد چند تحریری شہادتیں ان کو دکھائی گئیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ نہ صرف ''آفاق'' میں مضمون لکھتے تھے بلکہ اس کو مشورے دیتے تھے اور اسکی پالیسی کی رہنمائی بھی کرتے تھے۔

''مزدور''

اخبارات کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے دو ایسے اخباروں کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو امداد یافتہ گروہ میں تو شامل نہ تھے لیکن ان سے انتہائی مہربانی اور مرحمت کا سلوک کیا جاتا تھا حالانکہ وہ انتہائی ناشائستہ لٹریچر کی اشاعت کر رہے تھے۔ان میں سے ایک اخبار ''مزدور'' تھا جسکو

سید عطا اللہ شاہ بخاری کا ایک بیٹا ابوذر شائع کرتا تھا۔ جب اس نے ڈیکلریشن کی درخواست دی اس وقت بھی معلوم تھا کہ اس اخبار کی سرگرمیاں احمدیوں کے خلاف ہونگی لیکن اس کے باوجود ایک ہزار روپے کی ضمانت لے کر اس کا ڈیکلریشن منظور کر لیا گیا۔ احمدیوں کے خلاف اکھاڑے میں ایک اور مکے باز کا کون خیر مقدم نہ کرے گا اور اگر ضمانت کی ضبطی کا موقع بھی آ گیا تو ناقابل فہم دلائل اور سفسطائیت پر مبنی ایک یادداشت فی الفور تیار کی جا سکے گی۔ ۱۳ جون ۱۹۵۲ء کو جب اس اخبار نے مرزا غلام احمد کے متعلق ذیل کے الفاظ استعمال کیے: ''حضرت خلیفہ المسی الزنی، یدھا، ھالہ تالہ''، تو میر نور احمد نے محض تنبیہ کی سفارش کی۔ میر صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کاروائی ناکافی تھی اور حسن تناسب کے فقدان کی مظہر تھی لیکن ان کا عذر یہ ہے کہ اسی کاروائی کی تجویز ڈی آئی جی نے کی تھی۔

''آزاد''

ایک اور اخبار ''آزاد'' تھا جس کے متعلق رپورٹ کے اس حصے میں اور دوسرے مقامات پر بھی کافی ذکر آ چکا ہے۔ زمانہ زیر تبصرہ میں اس اخبار نے اتنا قابل اعتراض اور فحش لٹریچر شائع کیا ہے کہ ہمارے لیے اسکے نمونے نقل کرنا مشکل ہے۔ اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ان مضامین میں سے بعض کی طرف مرکزی حکومت تین یا چار موقعوں پر حکومت صوبہ کو توجہ دلا چکی تھی ہر دفعہ یہی جواب دیا جاتا تھا کہ تنبیہ کر دی گئی ہے۔ آخر وزارت داخلہ کو یہ کہنا پڑا کہ تنبیہات چونکہ غیر موثر ثابت ہوئی ہیں اس لیے اس اخبار کے خلاف مقدمہ چلایا جائے۔ یہ ۱۰ دسمبر ۱۹۵۲ء کا واقعہ ہے حکومت پنجاب نے اس کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ ہم بتا چکے ہیں کہ اس مہینے کے اواخر میں اس اخبار کی اشاعت مورخہ ۲۳ نومبر ۱۹۵۲ء کے ایک نہایت مکروہ مضمون کو حکومت نے بالکل نظر انداز کر دیا۔ جنوری ۱۹۵۳ء میں میر نور احمد نے مجبور ہو کر سفارش کی کہ اس اخبار کو چھ ماہ کے لیے بالکل بند کر دیا جائے۔ لیکن چیف منسٹر نے ان سے اتفاق نہ کیا یہاں تک کہ مرکزی حکومت نے ۲۶ فروری کو کابینہ میں ایک فیصلہ کیا جس کی رو سے یہ اخبار ایک سال کے لیے بند کر دیا گیا۔

ڈائریکٹ ایکشن

اس زمانے کے تذکرے کوختم کرنے سے پہلے ہم یہ ذکر کرنا چاہتے ہیں کہ ۲۱ جنوری ۱۹۵۳ء کو یا اس کے لگ بھگ علما نے وزیراعظم کو کراچی میں ڈائریکٹ ایکشن کا چیلنج دے دیا گو اس کی وضاحت نہ کی کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ خواجہ ناظم الدین کو اس امر میں کوئی شبہ نہ تھا کہ یہ عمل نقص امن کا باعث ہوگا۔ ''گذشتہ تجربے سے خصوصاً قبل تقسیم کے زمانے کے واقعات سے یہ ثابت ہے کہ سول نافرمانی کی تمام تحریکیں اسی اعلان کے ساتھ شروع کی گئیں کہ وہ پرامن اور بے تشدد ہوں گی لیکن ان کا انجام ہمیشہ تشدد پر ہوا۔'' جب خواجہ صاحب ۱۶ فروری کو لاہور آئے اور چیف منسٹر اور گورنر نے ان سے کہا کہ مطالبات کے متعلق کچھ کیجیے تو انہوں نے کہا کہ ''میں علما کے ساتھ جنگ وتصادم پر آمادہ نہیں ہوں'' جو مطالبات پر تو متفق ہیں لیکن الٹی میٹم کی صحت و درستی پر متفق نہیں ہیں۔ مسٹر چندریگر کے بیان کے مطابق وزیراعظم نے یہ بھی کہا کہ وہ علما سے مذاکرات کر رہے ہیں۔ چونکہ خواجہ صاحب خاص طور پر مضطرب اور خوف زدہ معلوم نہ ہوتے تھے اس لیے یہی سمجھنا چاہیے کہ وہ مذاکرات کے متعلق پرامید تھے۔ ان کی امید کی وجہ یہ تھی کہ ان کے نزدیک بعض علما ''ڈائریکٹ ایکشن'' کے مخالف تھے۔

سی آئی ڈی کیا سمجھتی تھی

لیکن پنجاب کے حکام کو کسی قسم کا تیقن نہ تھا۔ فائل نمبر (۱۰۲)(۲) ۱۶ مظہر ہے کہ سی آئی ڈی نے یکم فروری ۱۹۵۳ء کو ایک چٹھی پکڑی جس میں اس بات کا قرینہ پایا جاتا تھا کہ ڈائریکٹ ایکشن کا پہلا قدم یہ ہوگا کہ احمدیوں کا سوشل مقاطعہ کیا جائے گا اور پرامن پکٹنگ بھی کی جائے گی۔ ۳ فروری کو مسٹر انور علی نے لکھا کہ احرار کے ایما پر جو آل پارٹیز کنونشن قائم کی گئی تھی وہ مجبوراً ایسے موقف پر پہنچ گئی ہے کہ یا تو اسے ڈائریکٹ ایکشن کرنا پڑے گا یا ان لوگوں کے پیرو اور مریدان کا ساتھ چھوڑ

جائیں گے آپ نے یہ بھی لکھا کہ اگرچہ ڈائریکٹ ایکشن کی کوئی شکل اب تک معین نہیں کی گئی لیکن ابتدائی مرحلے میں غالباً احمدیوں کا مجلسی واقتصادی مقاطعہ شروع کیا جائے گا احرار خوب جانتے ہیں مسلسل جدوجہد کے لیے تحریک کا بے تشدد رہنا ضروری ہے۔

ڈی آئی جی کا قول: جمہور کو کوئی دلچسپی نہیں رہی ۳ فروری ۵۳ء

لیکن اس میں انہیں اپنی کامیابی پر یقین نہیں ''جمہور کو اب احراریوں کی شورش سے چنداں دل چسپی نہیں رہی کیونکہ زیادہ اہم مسائل سامنے آئے ہیں'' وہ رضا کاروں کو بھرتی کرنے کی کوششیں کررہے ہیں اوران پر خوب نظر رکھنی چاہیے۔۵ فروری ۱۹۵۳ء کو ڈی ایس پی (B) نے ڈی آئی جی کے زبانی احکام (برائے تحقیقات) کی تعمیل میں رپورٹ کی کہ ''کنونشن کے لیڈر تک یہ نہیں جانتے کہ انہیں کیا کرنا ہوگا۔صرف یہ کہتے ہیں کہ ڈائریکٹ ایکشن کیا جائے گا'' تاہم یہ یقین کیا جاتا ہے کہ اس مہم کا آغاز کراچی سے کیا جائے گا۔

کراچی اس کا مقام ہوگا

تمام وسائل خبر رسانی اس بات پر اصرار کررہے تھے کہ اولین مرحلے پر سوشل مقاطعہ اور احمدیوں کی دکانوں پر ''پرامن'' پکٹنگ کیا جائے گا۔

ڈی آئی جی پرامید نہ تھے۔۱۶ فروری ۵۳ء

جب ۱۶ فروری کو وزیراعظم کے دورہ لاہور پر ہڑتال کی گئی تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نتائج کو دیکھ کر مسٹر انور علی نے اپنی رائے تبدیل کر لی انہوں نے کہا کہ واقعات کی رفتار تیز ہے اور ''آج لاہور میں دو واقعات رونما ہوئے ہیں جن کا نتیجہ تشدد میں نکلا ہے پابند قانون عوام کو شبہ ہو رہا ہے کہ شاید حکومت اس صورت حالات کے تدارک کی قابلیت نہیں رکھتی'' ذرا یاد کیجیے ۳ فروری کو یہ کہا گیا تھا کہ عوام کو شورش میں کوئی دلچسپی نہیں رہی ان دونوں بیانوں میں کتنا واضح تضاد ہے۔

ایس پی (بی) نظر بندی کی سفارش کرتے ہیں

لیکن ہمیں اس پر یقین نہیں کہ کیونکہ فائل نمبر (۱۰۷) (۲) ۱۶، جلد سوم سے ظاہر ہوتا ہے کہ

خطرے کے آثار ۱۶ فروری سے بھی پہلے نظر آ چکے تھے۔ ۱۳ فروری کو ایس پی (B) نے ایک خاص ذریعے کی رپورٹ نقل کی کہ ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے اور سفارش کی کہ ماسٹر تاج الدین، صاحب زادہ فیض الحسن، سید مظفر علی شمسی اور قاضی احسان احمد کو مقید کر لیا جائے کیونکہ یہ ڈائریکٹ ایکشن کے سرگرم حامی ہیں۔ انہوں نے ایک پوسٹر کا ذکر بھی کیا جو شمسی نے بحثیت سیکرٹری مجلس عمل شائع کیا تھا اور جس میں اعلان کیا تھا کہ ۱۵ فروری کو دہلی دروازہ میں ایک جلسہ ہو گا مسلمانوں کو چاہیے کہ سر پہ کفن باندھ کر اس میں شریک ہوں۔ ایس پی (B) نے کہا کہ ۱۴ فروری کو بھی پروپیگنڈا شدید تھا اور لوگوں سے کہا جا رہا تھا کہ جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر آئیں۔ ۱۶ فروری کو یہ رپورٹ دی گئی کہ یوم سابق کے جلسہ میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ احمدیوں کے کاروباری اداروں کی پکٹنگ کر کے ڈائریکٹ ایکشن کا آغاز کیا جائے گا اور دو ہزار رضا کار اسی مقصد کے لیے کراچی بھیجے جائیں گے۔ انہوں نے کہا مولانا اختر علی خاں نے یقین دلایا تھا کہ حکومت پنجاب غالباً رضا کاروں کی نقل و حرکت پر قیود عاید نہیں کرے گی۔

لیکن ڈی آئی جی کہتے ہیں کوئی فوری خطرہ نہیں

ڈی آئی جی نے لکھا کہ کوئی فوری خطرہ نہیں ہے یہ تضاد کی ایک اور مثال ہے کیونکہ یہی ڈی آئی جی صاحب اسی تاریخ کو ایک اور فائل پر لکھ چکے تھے کہ ''پابند قانون عوام کو شبہ ہے کہ شاید حکومت صورت حالات کے تدارک کی قابلیت نہیں رکھتی''۔

فوری خطرہ کیوں نہیں

ممکن ہے اس وقت سچ مچ کوئی فوری خطرہ نہ ہو کیونکہ شورش کا آغاز ایسے مقام پر ہونے والا تھا جو لاہور سے خاصا دور ہے اور اگر لاہور کو صرف رضا کاروں کی روانگی ہی سے تعلق تھا اور مولانا اختر علی خاں سے حکومت پنجاب کا کوئی سمجھوتہ ہو چکا تھا تو ظاہر ہے کہ مقامی طور پر بے فکری کی گنجائش ضرور تھی لیکن تشدد کے دو واقعات اور ''جانیں ہتھیلیوں پر رکھ لینے والے'' ''کفن باندھ کر آنے'' کے پروپیگنڈے کو کیا کیا جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ 'فوری خطرے'' کے الفاظ ایس پی (B) کی اس

سفارش کے جواب میں استعمال کیے گئے ہوں کہ جب انہیں ڈائرکٹ ایکشن کے چیلنج کی اطلاع ملی۔

ڈی آئی جی کو ماسٹر تاج الدین نے گمراہ کیا

تو انہوں نے تجویز کی کہ حکومت کو فوراً امرکز سے خطاب کرنا اوراس کا رویہ معلوم کرنا چاہیے کیونکہ شورش کی آئندہ رفتار کا انحصار اسی بات پر ہے۔ ماسٹر تاج الدین نے جو اس وقت عدالت میں موجود ہیں خود مجھے بتایا کہ ڈائریکٹ ایکشن حقیقت میں شروع نہیں ہوگا۔ ہماری اطلاع یہی تھی کہ یہ لوگ حکومت کو محض مجبور کر رہے ہیں تا کہ انہیں حسب منشا فیصلہ مل جائے۔ اس امر کی بابت کہ احرار کا کوئی منصوبہ عمل بھی تھا میرا خیال یہ ہے کہ میں نے ان سے زیادہ ژولیدہ مغز لوگ آج تک نہیں دیکھے۔ ۳ فروری ۱۹۵۳ء کو انہوں نے کہا کہ وہ ایک نہایت بے تشدد اور مسلسل جدوجہد کرنا چاہتے ہیں لیکن مجھے ان پر یقین نہ آیا اس لیے کہ ان کا گذشتہ طرز عمل یہی رہا ہے کہ عہد و پیمان کرتے رہے اور پھر ان کو توڑتے بھی رہے۔ تاہم ان کی یادداشت مورخہ ۳ فروری سے ظاہر ہے کہ انہوں نے ماسٹر تاج الدین پر یقین نہ کیا اور اس چالاک لیڈر نے بھی ان کو یہ بتا کر گمراہ کیا کہ عوام کو اب شورش سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ ہم نہیں سمجھتے کہ کم از کم اس موقع پر ماسٹر نے کسی پریشان خیالی یا ژولیدہ مغزی کا ثبوت دیا ہو اس کو قدرتی طور پر یہ توقع تھی کہ چیلنج کے جواب میں حکومت کی طرف سے قانون و انتظام کی سرگرمی کا اظہار ہوگا۔ لہٰذا وہ جیل میں جانے سے پہلے کچھ نہ کچھ کر گزرنے کا خواہاں تھا۔ اس مزید اعتماد کی طرف توجہ کیجیے جو یہ احراری لیڈر سی آئی ڈی کے افسر اعلیٰ پر رکھتا تھا۔ ''میں اپنے تحریری بیان میں یہ کہہ چکا ہوں کہ آل مسلم پارٹیز کونشن مجبور ہو کر اب ایسے موقف پر پہنچ چکی ہے کہ یا اسے ڈائریکٹ ایکشن کرنا ہوگا یا اپنے پیرووں کی عقیدت وارادت سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ مجھے یہ معلومات خود ماسٹر تاج الدین سے حاصل ہوئی ہیں۔ جو اس وقت عدالت میں حاضر ہیں''۔

اس امر کا ذکر ان کی رپورٹ مورخہ ۳ فروری میں بھی موجود ہے جو بالکل ماسٹر تاج الدین کی بہم پہنچائی ہوئی اطلاع پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ اگر ماسٹر تاج الدین اپنی جماعت ہی کی جاسوسی کر رہے تھے تو وہ اور بات ہے ورنہ ہمیں تو یہ بات بالکل بعید از عقل معلوم ہوتی ہے کہ ان کی دی ہوئی اطلاع

پرذریعہ اطلاع ظاہر کیے بغیر اس قدر اعتبار کیا جائے کہ اس کو رپورٹ میں درج کرلیا جائے کہ ممکن ہے ماسٹر تاج الدین کبھی کبھی اپنے آپ کو بھی نام نہاد سا نقصان پہنچا لیتے ہوں۔ اور یہ ظاہر کرتے ہوں کہ وہ (اپنے اخبار کو محفوظ رکھنے کی خاطر) بعض (اسرار فاش کررہے ہیں)۔

ڈی آئی جی کا اقبال واعتراف

آخر مسٹر انور علی نے کہا ''میں صاف طور پر اقبال کرتا ہوں کہ مجھ پہ بات بالکل واضح نہ تھی کہ ڈائریکٹ ایکشن کا مطلب کیا ہوگا لیکن یہ صحیح ہے کہ تقسیم سے پہلے اس کا مطلب سول نافرمانی اور قانون وانتظام کی خلاف ورزی ہی تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ احراری بیس ہزار رضا کار بھرتی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن میرا خیال یہ تھا کہ وہ محض حکومت کو پریشان کرنا چاہتے ہیں چنانچہ میں نے ان کو گرفتار کرنے کی کوئی تیاری نہ کی تھی۔ یہاں پھر مسٹر انور علی نے ماسٹر تاج الدین کی اس بات پر بھروسہ کرلیا کہ ''وہ محض حکومت کو مجبور کررہے ہیں کہ فیصلہ ان کی مرضی کے مطابق ہوجائے'' حکومت سے صاف مرکزی حکومت مراد تھی کیونکہ وہی ان ان مطالبات کو رد یا قبول کرسکتی تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ ہم نے اس معاملے کے متعلق جو کچھ فائلوں سے نقل کیا ہے اس کو مسٹر انور علی کے بیان کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو اس سے یہ رائے قائم کرنے کے لیے خاصا مواد مہیا ہوجاتا ہے کہ ماسٹر تاج الدین مسٹر انور علی کو سیدھے راستے سے منحرف کرنے میں کامیاب ہوگئے اور ان کو یہ یقین دلایا کہ ہوتا ہوا تا کچھ بھی نہیں ہمارا مقصد تو صرف یہ ہے کہ مرکز کو مطالبات تسلیم کرنے پر مجبور کریں۔ اگر امر واقعہ یہ نہ ہوتا تو جس حالت میں میاں انور علی تجربے سے یہ جانتے تھے کہ ڈائریکٹ ایکشن کا مطلب سول نافرمانی ہے جو ہمیشہ تشدد پر ختم ہوا کرتی ہے تو وہ ۱۶ فروری کو یہ رائے ظاہر نہ کرتے کہ ''کوئی فوری خطرہ درپیش نہیں''، لیکن اگر ان کی دوسری آواز جو اسی دن ان کے کام و دہن سے نکلی (کہ پابند قانون عوام کو شبہ ہے کہ شاید حکومت موجودصورت حالات کے تدارک کی قابلیت نہیں رکھتی) صحیح آواز تھی تو جہاں ایک طرف ان کی تجویز یہ تھی کہ چیلنج کے متعلق مرکزی حکومت کا رویہ معلوم کرنا چاہیے وہاں دوسری طرف انہیں ایس پی (B) کا یہ مشورہ قبول کرلینا چاہیے تھا کہ قانون وانتظام کی جنگ میں بہتر شجاعت یہی ہے کہ ملزموں کو قید کردیا جائے۔

۴۔آخری مرحلہ

مرکز کو چیف سیکرٹری کی چٹھی مورخہ ۲۱ فروری
جس میں مضبوط پالیسی کا مطالبہ کیا گیا

اس مرحلے کا آغاز چیف سیکرٹری کی چٹھی مورخہ ۲۱ فروری سے ہوتا ہے جو انہوں مسٹر جی احمد سیکرٹری وزارت داخلہ کو لکھی۔ احراریوں کے ان گناہوں کی تفصیل بیان کرنے کے بعد جو ماضی قریب میں ان سے سرزد ہوئے تھے اس چٹھی میں مرکز کو اطلاع دی گئی تھی کہ ڈائریکٹ ایکشن غالباً کراچی میں ۲۳ فروری کو شروع ہو گا۔ اس میں احمدیوں کی دکانوں پر پکٹنگ کی جائے گی اور اس مقصد کے لیے رضا کار پنجاب اور دوسرے صوبوں سے بھیجیں گے۔ ۱۶ فروری کو وزیراعظم کا استقبال ہڑتال اور کالی جھنڈیوں سے کیا گیا اور اسی دن ایک جلسہ عام میں مقررین زور تو اس بات پر دے رہے تھے کہ تشدد سے ہرگز کام نہ لیا جائے لیکن اس کے ساتھ ہی عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ پولیس سے کہا جارہا تھا کہ سول نافرمانی کا مقابلہ کرتے وقت یوم قیامت کو یاد رکھیں دکانداروں کو ان کی مرضی کے خلاف دکانیں بند کرنے پر مجبور کیا گیا اور جنہوں نے دکانیں بند نہ کیں ان کے منہ کالے کر دیے گئے۔ تشدد کے دو واقعات بھی رونما ہوگئے۔ پابند قانون شہری ان مظاہروں کی مخالفت اس خوف سے نہ کر سکتے تھے کہ مبادا وہ احمدی قرار دے دیئے جائیں۔ لاہور کے ایک ڈپو ہولڈر نے ایک احمدی عورت کے ہاتھ گندم فروخت کرنے سے انکار کر دیا تا آنکہ اس عورت نے یہ اقرار نہ کرلیا کہ وہ اپنے ہم مذہبوں کے خلاف تحریک میں حصہ لے گی۔

چٹھی کے آخر میں لکھا تھا: لیکن یہ شورش اس صوبے تک محدود نہیں اور مطالبات صوبائی دائرہ

کار سے باہر ہیں حکومت اپنے آپ کو ''صورت حالت کے موثر تدارک میں بالکل بے دست و پا محسوس کر رہی ہے'' اور سمجھتی ہے کہ اگر مرکزی حکومت ان مطالبات کے متعلق ایک مضبوط پالیسی اختیار کرنے کا اعلان کر دے تو اس سے صوبائی حکومت کے ہاتھ بڑی حد تک مضبوط ہو جائیں گے۔ یہ پالیسی کچھ بھی ہو۔۔۔۔۔صوبائی حکومت محسوس کرتی ہے کہ وہ صوبے کے اندر اس پالیسی پر عمل درآمد کرنے کی کافی قوت رکھتی ہے۔

لیکن مرکز کی پالیسی تو معلوم تھی

ہم نے لاقانونی کے وہ تمام مثالیں نقل نہیں کیں جو اس چٹھی میں مذکور ہیں لیکن جو کچھ بھی ہم نے نقل کیا ہے وہ کم از کم فروری میں صورت حالات کی سنگینی کے اظہار کے لیے کافی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس مرحلے پر بھی حکومت پنجاب قانون و انتظام کی کیفیت پر قابو پانے کے لیے آمادہ نہیں تھی تاوقتیکہ مرکز مطالبات کے متعلق اپنی پالیسی کا اعلان نہ کرے لیکن کیا یہ امر بالکل واضح نہ تھا کہ مرکز کی پالیسی اس معاملہ میں یہ تھی کہ موافق یا مخالف کوئی اعلان نہ کیا جائے اور جارحانہ فرقہ بندی کو سختی سے دبا دیا جائے؟ کیا ۲۶ فروری تک سختی سے دبانا تو درکنار محض دبانے ہی کی کوئی مثال دستیاب ہو سکتی ہے؟ ''آزاد'' اور ''زمیندار'' بدگوئی اور دشنام طرازی میں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہے تھے اور میر نور احمد انتظار کر رہے تھے یہ کہ شورش قانون شکنی کی شکل اختیار کرے تو دیکھیں۔

کراچی کانفرنس ۲۶ فروری ۵۳ء

اس چٹھی کے موصول ہونے پر خواجہ ناظم الدین نے ۲۶ فروری کو گورنروں اور چیف منسٹروں کا ایک اجلاس طلب کیا لیکن مسٹر چندریگر اور مسٹر دولتانہ نے مختلف وجوہ کی بنا پر حاضری سے معذوری ظاہر کی یہ وجوہ معقول تھیں یا غیر معقول بہر حال خواجہ ناظم الدین کو یقین نہ آیا اور انہوں نے ٹیلی فون پر مسٹر دولتانہ سے بات کی۔ اس پر یہ فیصلہ ہوا کہ مرکزی کابینہ کے سامنے حکومت پنجاب کے خیالات وزیر مال چودھری محمد حسین چٹھہ پیش کریں گے اور ان کے ساتھ مسٹر غیاث الدین اور مسٹر انور علی بھی ہوں گے۔ ان کانفرنسوں میں جو ۲۶ کی شام کو اور ۲۷ کو آدھی رات کے بعد ہوئیں۔ ان کی تفصیلات

سے سوائے مندرجہ ذیل امر کے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔

مسٹر چھٹہ کا بیان

شام کی کانفرنس میں مسٹر چھٹہ نے بیان کیا کہ حکومت پنجاب کی رائے یہ ہے کہ وہ تحریک کے آگے جھک نہیں سکتی اور یہاں جو فیصلہ بھی ہوگا پنجاب اس پر عمل درآمد کرے گا۔ ممکن ہے اس میں گولی چلانے اور فائرنگ کرنے کی ضرورت بھی ہو اور یہ صرف مرکز کی پوری پشت پناہی ہی سے کیا جاسکتا ہے۔ خان عبدالقیوم خان نے پنجاب کے خیالات کی ''حمایت'' کی اور کہا کہ تحریک کو کچل دینا چاہیے۔ خواجہ شہاب الدین نے ان کی ''تائید'' کی اور کہا کہ حکومت کو ایک قطعی غلط مسئلے پر ملاؤں کے آگے نہیں جھکنا چاہیے۔ خواجہ ناظم الدین نے ملاؤں کو کچلنے سے اتفاق نہ کیا اور استعفاد ینے پر آمادگی ظاہر کی۔ کوئی فیصلہ نہ ہوا اور اجلاس اگلی صبح پر ملتوی کر دیا گیا لیکن آدھی رات کے وقت ایک بج کر پندرہ منٹ پر ہر شخص کو نیند سے جگایا گیا اور خواجہ ناظم الدین نے ان کو بتایا کہ انہیں ایک الٹی میٹم موصول ہوا ہے کہ ان کی کوٹھی پہ چھ سات بجے پکٹنگ کی جائے گی۔ خواجہ صاحب کو یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ علما تمام متفق نہیں ہیں اور زیادہ تر اسی وجہ سے خواجہ صاحب نے فیصلہ کیا تھا کہ چیلنج قبول کر لیا جائے اور فجر سے پہلے پہلے مجلس عمل کی گرفتاری کا حکم دے دیا جائے۔ انہوں نے مطالبات کے متعلق کسی قسم کا اعلان کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں اس مسئلہ کا تدارک خالص قانون وانتظام کی سطح پر کروں گا۔

مسٹر چھٹہ کے بیان کا تغیر:

یہ وہ رپورٹ تھی جو مسٹر چھٹہ نے کراچی سے واپس آکر اپنی حکومت کو دی اور یہ ضمیمہ نمبر ۵۵ کی حیثیت سے مسٹر دولتانہ کے تحریری بیان کے ساتھ منسلک ہے خواجہ ناظم الدین کو اس کے اکثر حصے سے اتفاق ہے۔

خواجہ ناظم الدین:

سوائے اس کے کہ ان کے نزدیک مسٹر چھٹہ مطالبات کو رد کرنے کے قطعی طور پر حامی تھے

انہوں نے یہ بھی کہا کہ مسٹر دولتانہ نے ۲۵ فروری کو ٹیلی فون پر گفتگو کے دوران میں یہ بھی بتایا تھا کہ ان کی کابینہ نے مطالبات کو رد کرنے کا فیصلہ کرایا ہے۔

مسٹر دولتانہ

مسٹر دولتانہ کو اس پر اصرار ہے کہ مسٹر چٹھہ کو یہ گزارش کرنے کا اختیار نہیں دیا گیا تھا کہ مطالبات رجعت پسندانہ ہیں بلکہ یہ کہ ان مطالبات کو پیش کرنے کا طریقہ رجعت پسندانہ ہے لیکن اگر صوبے کی رائے یہ تھی تو پھر مسٹر چٹھہ نے مطالبات کے متعلق اعلان پر کیوں اصرار کیا؟ اگر مطالبات کے مالہ و ماعلیہ اور ان کے پیش کرنے کے طریقے کے درمیان اب یہ خط فاصل نہ کھینچ دیا گیا ہوتا تو مسٹر چٹھہ کے میمورنڈم سے ہم یہی سمجھتے کہ انہیں مطالبات ہی پر اعتراض ہے کیونکہ ان کی رائے یہ تھی کہ حکومت پنجاب اس تحریک کے آگے جھک نہیں سکتی اور خاں عبدالقیوم خاں نے پنجاب کی رائے کی حمایت کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ تحریک کو کچل دینا چاہیے۔ خواجہ شہاب الدین نے اُن کی تائید کی اور کہا کہ حکومت کو ملاؤں کے آگے نہیں جھکنا چاہیے۔ لہٰذا پنجاب کی رائے جس کی ''حمایت'' اور ''تائید'' دوسرے دو حضرات نے کی تھی یہی ہونی چاہیے تھی کہ حکومت کو ملاؤں کے آگے نہ جھکنا چاہیے جس کا مطلب یہی ہے کہ مطالبات رد کر دینے چاہئیں۔

خان سردار بہادر خاں سردار عبدالرب نشتر

خان سردار بہادر خاں اس کانفرنس کے متعلق تو کچھ نہیں کہتے لیکن ۸، ۹ اور ۱۰ اگست ۱۹۵۲ء کی کانفرنس کا ذکر کرتے ہوئے وہ مسٹر دولتانہ سے یہ رائے منسوب کرتے ہیں کہ مطالبات غیر معقول ہیں اور رد کر دینے چاہئیں۔ سردار عبدالرب نشتر کا بیان ہے کہ مسٹر چٹھہ اور خان عبدالقیوم خاں دونوں نے پورے زور سے یہ خیال ظاہر کیا کہ اس ''تحریک'' کی سرکوبی کر دینی چاہیے۔ اب اسکے معنی اس امر پر منحصر ہیں کہ ''تحریک سے کیا مراد ہے؟ اگر اس سے احمدیوں کے خلاف تحریک مراد ہے اور یہی ہونا چاہیے تو وہ تین مطالبات کے سوا اور کسی چیز پر مشتمل نہیں لیکن اگر اس کا مطلب تازہ واقعہ یعنی ڈائریکٹ ایکشن کے فیصلے سے ہے تو پھر اس میں مطالبات کا کوئی دخل نہیں۔ اس تحقیقات کے

مقاصد کے اعتبار ہیں تو نظر نہیں آتا کہ مسٹر دولتانہ کو اس اصرار سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

تفاوت کے بغیر امتیاز:

البتہ اگر لوگوں پر یہ واضح کرنا سیاسی اعتبار سے مفید ہے کہ مسٹر دولتانہ بدستور مطالبات کی مقبولیت کے قائل ہیں یا ان سے منکر نہیں ہیں تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔

مطالبات کے متعلق مرکز کا رویہ ۲۷ فروری ۵۲ء

لہٰذا ہم آگے چلتے ہیں اگر چہ اب خواجہ ناظم الدین یہ اعلان عام کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے کہ انہوں نے مطالبات کو رد کر دیا ہے لیکن اسی دن وہ اس بات پر رضامند ہو گئے کہ تمام صوبوں کے نام ایک خفیہ تار بھیجا جائے جس میں مطالبات کے متعلق مرکزی حکومت کا رویہ واضح کر دیا جائے اس تار میں کہا گیا کہ نہ تو جمہور کے کسی طبقے کو اس کی مرضی کے خلاف غیر مسلم اقلیت قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ کسی احمدی افسر یا وزیر خارجہ کو محض مذہب کی بنا پر ان کے عہدوں سے برطرف کیا جا سکتا ہے۔ اس تار میں یہ بھی لکھا گیا کہ مرکزی حکومت کوئی سرکاری اعلان جاری نہیں کرنا چاہتی لیکن صوبائی حکومتوں کو چاہیے کہ فی الفور انہی خطوط پر پرزور نشر و اشاعت کو منظم کریں اور اخبارات کو بھی مناسب ہدایات دے دیں۔

اس کے ساتھ ہی اخباروں میں ایک سرکاری اعلان بھیجا گیا جس میں احراریوں کی تاریخ بیان کی گئی اور اس امر کو واضح کیا گیا کہ حکومت ڈائریکٹ ایکشن کی دھمکی سے مرعوب ہونے کا ارادہ نہیں رکھتی اور قانون و انتظام کو بحال رکھنے کے لیے اپنے پورے وسائل کو کام میں لائے گی۔

اس مرحلے پر دو باتیں ذہن میں رکھنی چاہئیں۔ اول مسٹر چٹھہ اور ان کے دو ساتھی افسروں نے یہ واضح کر دیا کہ وہ پنجاب کی صورت حالات کا تدارک کما حقہ کر سکتے ہیں۔ دوم: ۲۷ فروری کو انہیں مطالبات کے متعلق مرکز کا رویہ صاف طور پر معلوم ہو چکا تھا اور پنجاب کے دوسرے افسروں اور وزیروں کو اس کی اطلاع دوسرے دن ہو گئی تھی۔

چیف منسٹر کی کوٹھی پر ۲۸ فروری ۵۳ءکو فیصلے کیے گئے:

جب مسٹر چٹھہ اور ان کے رفقا لاہور واپس آئے تو مسٹر دولتانہ کی کوٹھی پر ان کا ایک اجلاس ہوا اور کراچی میں جو قول وقرار کیے گئے تھے ان کی روشنی میں بعض فیصلے کیے گئے۔ (ہوم سیکرٹری کے تحریری بیان کا ضمیمہ ا) یہ فیصلہ ہوا کہ ہر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ایک ایک فہرست مہیا کر کے تمام سرگرم احراریوں کو زیر دفعہ ۳، پبلک سیفٹی ایکٹ گرفتار کر لیا جائے اور ''زمیندار'' ''آزاد'' اور ''الفضل'' بند کر دیے جائیں۔ ۲۸ فروری کو چیف سیکرٹری کی طرف سے ایک گشتی مراسلہ تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو بھیجا گیا جس میں ان کو ہدایت کی گئی کہ صورت حالات کے متعلق چوکنے رہیں اور ''مزید گرفتاریوں کے متعلق جو پابندی عائد کی گئی اس پر خاصی بحث ہوئی۔ لیکن مسٹر دولتانہ کا دعویٰ ہے کہ اجلاس میں اس قسم کا کوئی فیصلہ نہ ہوتھا اور چونکہ ۲۷ فروری کے فیصلوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں اس لیے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ چٹھی کے اس حصے کے متعلق مسٹر دولتانہ کو جواب دہ قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ یہ چٹھی چیف سیکرٹری نے مسٹر دولتانہ کو دکھائے بغیر جاری کر دی تھی کسی چٹھی کو جاری کرنے کا کام یقیناً چیف سیکرٹری کے سپرد کیا جاسکتا ہے اور اگر اس میں ہدایات سے زائد کوئی بات لکھی ہوتو اس کی ذمہ داری وزیر پر عائد نہیں کی جاسکتی۔

رضا کار:

اس کے بعد رضا کاروں کو کراچی جانے سے روکنے کے متعلق بھی کچھ اختلاف ہے لیکن ہم اسکو چنداں اہمیت نہیں دیتے۔ اس لیے کہ اس معاملہ میں اقدام نہ کرنے کے باعث کوئی سنگین نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ مسٹر انور علی بیان کرتے ہیں کہ کراچی میں ۲۷ فروری کو یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ صوبائی حکومت رضا کاروں کو کراچی جانے سے روکے۔ چنانچہ انہوں نے لاہور واپس آنے کے بعد مختلف فیصلوں کو قلم بند کر کے ہوم سیکرٹری کے حوالے کر دیا تا کہ وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کے نام ضروری ہدایات صادر کرسکیں۔ اس پر عمل کیا گیا اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ امر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ ترغیب وتلقین کے طریقے اختیار کریں یا گرفتاریوں سے کام لیں۔

مسٹر دولتانہ نے ہدایات میں ترمیم کر دی:

لیکن ۲ مارچ کو انہیں چیف منسٹر کی ہدایات ان کے پرائیوٹ سیکرٹری مسٹر ذاکر قریشی کی وساطت سے موصول ہوئیں کہ رضا کاروں کے روکنے سے چونکہ ان اضلاع میں جوش پھیل گیا ہے لہٰذا حتی الوسع گرفتاریاں نہ کی جائیں اور صرف ترغیب و تلقین کے طریقہ ہی سے کام لیا جائے۔ لہٰذا مسٹر انور علی نے ڈی آئی جی ملتان کو ٹیلیفون کیا کہ اگر سمجھانے بجھانے کا طریقہ ناکام رہے تو رضا کاروں کو کراچی کی طرف روانہ ہونے کی اجازت دے دی جائے۔ اس حالت میں ان کو کراچی اور سندھ کے حکام گرفتار کر لیں گے۔ مسٹر دولتانہ کا قول ہے کہ ان کی ہدایات کے معنی غلط سمجھے گئے ان کا مطلب یہ تھا کہ بڑے شہروں میں گرفتاریاں کرنا مناسب نہیں بلکہ یہ کاروائی لاہور اور لودھراں کے درمیانی سٹیشنوں پر کرنی چاہیے۔ ۳ مارچ کو جب ہوم سیکرٹری نے ان کو بتایا کہ ان کی ہدایات کے سمجھنے میں گڑ بڑ ہوئی ہے تو انہوں نے پوزیشن صاف کر دی۔ یہ صحیح ہے کہ ملک حبیب اللہ ایس پی (سی آئی ڈی) کی یادداشت پر جس میں مسٹر انور علی کے بیان کے مطابق ہدایات درج تھیں چیف منسٹر نے ۹ مارچ کو دستخط کر دیے تھے اور ان کی صحت و درستی پر کوئی اعتراض نہ کیا تھا لیکن اب مسٹر دولتانہ کہتے ہیں کہ اس وقت غلطی کی طرف اشارہ کرنا بے نتیجہ اور غیر مفید ہوتا۔

مسٹر انور علی نے بیان کیا کہ جہاں تک انہیں معلوم ہے صرف دو جتھے کراچی کو روانہ ہوئے تھے۔ پہلا زیر سرکردگی صاحبزادہ فیض الحسن ۲۸ فروری کو ہدایات کے اجرا سے پہلے روانہ ہو چکا تھا اور دوسرا لودھراں پر روکا گیا۔ اگرچہ خواجہ ناظم الدین کا بیان یہ ہے کہ کراچی اور سندھ کے حکام پنجاب سے رضا کاروں کی پیہم آمد کی بار بار شکایت کر رہے تھے لیکن ان کی شہادت محض سنی سنائی باتوں پر مبنی ہے۔ لہٰذا اس کو کسی مضبوط فیصلے کے لیے استعمال نہ کرنا چاہیے تاہم یہ ضرور کہنا پڑتا ہے کہ رضا کاروں کے متعلق ہدایات کچھ مدت کے لیے چیف منسٹر کے ایما سے نرم کر دی گئی تھیں۔

مرکز کے رویہ کا پروپیگنڈا، مطلوبہ خطوط پر نہ کیا گیا

مطالبات کے متعلق مرکز کے رویے کی نسبت جو تار جاری کیا گیا تھا اس کو حکومت پنجاب

نے اس طریقے سے استعمال نہ کیا جس کو مرکز چاہتا تھا اور یہ کوتاہی قریب قریب تنہا میر نور احمد کی غیر مرئی کوشش کا نتیجہ تھی یاد ہو گا کہ صوبائی حکومتوں سے دو باتیں کہی گئی تھیں (۱) ''ان خطوط پر'' پرزور نشر و اشاعت کو منظّم کیا جائے (۲) اخبارات کی مناسب رہ نمائی کی جائے۔ ہوم سیکرٹری نے ممتاز ایڈیٹروں کو طلب کر کے ان کو بتایا کہ ان کو مطالبات کے متعلق کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے (ایڈیٹروں پر اس رویہ کا سرچشمہ ظاہر نہیں کیا گیا) اس کے بعد انہوں نے تار کی ایک نقل ڈائریکٹر تعلقات عامہ کو ''بغرض کاروائی ضروری'' ارسال کی اور اس کے ساتھ ذیل کی سطور لکھ دیں: میں نے ایک پریس کانفرنس کو جس میں متعدد مقامی روزناموں کے ایڈیٹر مدعو تھے خطاب کیا چیف سیکرٹری کے مشورے سے سرچشمہ ہدایت کو بے نقاب کیے بغیر ان کو حکومت کا رویہ بتایا اور ان پر واضح کر دیا کہ یہ گفتگو قطعی طور پر اشاعت کے لیے نہیں ہے۔

ڈی پی آر نے کچھ نہ کیا

میر نور احمد نے محض یہ کہا کہ تار کا مضمون غیر سرکاری طور پر اخباروں کے ایڈیٹروں کو بھیج دیا۔ لیکن جب ان سے سوال کیا گیا کہ آیا آپ نے ہوم سیکرٹری کی یادداشت کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس نہیں کیا تھا کہ ہوم سیکرٹری خود بھی یہی کچھ کر چکے ہیں اور آپ کو تار کی نقل بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ آپ ضروری کاروائی کریں اور پرزور نشر و اشاعت ''منظّم کریں؟ تو میر صاحب نے جواب دیا کہ میں نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ مرکز کے خیالات اخباروں کے ایڈیٹروں تک پہنچا دیے۔

چیف سیکرٹری نے بھی کچھ نہ کیا

اس تار کا مضمون ڈسٹرکٹ مجسٹریوں کو بھی مہیا نہ کیا گیا جس سے انہیں مرکزی حکومت کا وہ رویہ معلوم ہو جاتا جس کا انتظار مدت سے کیا جا رہا تھا لیکن یہ کام (جیسا کہ مسٹر دولتانہ بجا طور سے کہتے ہیں) چیف سیکرٹری کا تھا۔

نہ مسٹر دولتانہ نے کچھ کیا:

خود مسٹر دولتانہ نے ''مسلم لیگ کے عظیم الشان اثر، اس کی ساکھ اور اس کی تنظیم کو بروئے کار

لانے کی کوشش نہ کی جو اس شورش کے دوران میں بالکل جامد اور شل اور ابتر ہو رہی تھی''۔ یہ الفاظ خود مسٹر دولتانہ کے ہیں وہ اس کوتاہی کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ رائے عامہ کو مجتمع کرنے کے لیے کافی وقت نہ تھا وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ۲۷ فروری کو یہ توقع نہ تھی کہ مستقبل قریب میں کوئی شدید عمل رونما ہونے والا ہے۔ لیکن یہ بالکل ممکن ہے کہ اگر ہم لیگ کونسل کا جلسہ طلب کرتے تو ممبروں پر کوئی اثر نہ ڈال سکتے اور بالکل قائل نہ کر سکتے'' ہم یقین کرتے ہیں کہ یہ صحیح ہے اور یہ ۲۷ فروری کو بھی اتنا ہی صحیح تھا جتنا ایک سال قبل صحیح تھا۔ لہٰذا یہ دعویٰ کرنا بیکار ہے کہ اگر مرکز کی طرف سے ذرا پہلے کوئی اعلان ہو جاتا تو مسلم لیگ کی کوششوں سے صوبے کے امن وامان پر کوئی خاص اثر پڑ جاتا۔ لیکن مسٹر دولتانہ۔ بے عملی کی ایک اور وجہ بھی بیان کرتے ہیں'' مزید برآں ہر مسلم لیگی پارٹی کے ضبط ونظم کے ماتحت سول نافرمانی سے الگ رہنے پر مجبور تھا اور اگر اس سے یہ کہہ بھی دیا جاتا کہ حکومت کی پالیسی مطالبات کو رد کر دینے کی ہے تو اس کے رویہ میں کوئی خاص فرق نہ پڑتا۔ اس امر کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ یہ محض ایک منفی اور انفرادی فرض تھا۔ مثبت فرض یہ تھا کہ دوسروں کو بھی اپنا ہم خیال بنانے کے لیے اجتماعی جدوجہد منظّم کی جاتی۔

۲۸ فروری کے بعد کے واقعات

جو کوائف مارشل لا پر منتج ہوئے ان کی باقی کہانی یہ ہے کہ اگرچہ لاہور میں ۲۸ فروری ہی کو جب لیڈر گرفتار کر لیے گئے تھے جلوس بازی شروع ہو گئی تھی لیکن دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کے احکام ۲ مارچ کے واقعات سے پہلے نافذ نہ کیے گئے اور اس وقت بھی ''اندرون فصیل'' شہر کو مستثنیٰ رکھا گیا اس دن صبح کو ہوم سیکرٹری نے جنرل آفیسر کمانڈنگ دہم ڈویژن لاہور چھاؤنی (میجر جنرل محمد اعظم خاں) سے درخواست کی کہ بدنظمی کے انسداد اور اس کی سرکوبی میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور کو مدد دینے کے لیے فوجی امداد مہیا کی جائے۔ فوج آ گئی اس نے باغ جناح میں ڈیرے ڈال دیے اور فوج کے گشتی دستے مجسٹریٹوں کی معیت میں شہر میں گشت لگانے لگے۔ ۳ مارچ کی شام کو انسپکٹر جنرل نے چیف منسٹر کو اطلاع دی کہ'' آدھی لڑائی تو فتح ہو چکی''، لیکن بعد میں یہ اندازہ ضرورت سے زیادہ پر امید

ثابت ہوا کیونکہ وہ دوسرے ہی دن شام کو مسجد وزیر خاں کے دامن میں ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو بے شمار زخم لگا کر ہلاک کر دیا گیا۔

عبدالستار نیازی مسجد وزیر خاں میں

مسجد وزیر خاں اندرون فصیل حصہ شہر کی ایک نہایت اہم عبادت گاہ ہے جس میں چند روز پہلے مولانا عبدالستار نیازی قلعہ نشین ہو کر تشدد اور لاقانونیت کا وعظ کر رہے تھے اور حکام نے ان پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ سول کے حکام کا عام معمول یہ تھا کہ وہ چیرنگ کراس پر کھڑے رہتے تھے (تاکہ انھیں گورنمنٹ ہاؤس جانے سے روکیں) اور شام کو سول لائنز کے تھانے میں بیٹھ کر مشورے کیا کرتے تھے۔ اب وہ کوتوالی کی طرف بھاگے یہ مقام مسجد وزیر خاں سے مختلف جگہ پر فصیل شہر کے باہر واقع ہے قریب قریب روزانہ بعض اوقات دن میں متعدد بار سول اور فوجی افسر وزارت اور گورنر سے گورنمنٹ ہاؤس میں ملاقات کرتے تھے جو سول لائنز کے تھانے کے بعد محفوظ ترین مقام سمجھا جاتا تھا۔

گورنمنٹ ہاؤس کی تین کانفرنسیں

۵ مارچ کو اس پولیس افسر کے قتل کے بعد گورنمنٹ ہاؤس میں تین کانفرنسیں ہوئیں (قبل دوپہر، بعد دوپہر اور شام۔ پہلی کانفرنس میں چند اہم فیصلے کیے گئے ایک فیصلہ یہ تھا کہ پولیس کو کھلے دل سے قوت استعمال کرنی چاہیے اور اگر صورت حالت کے بعض کوائف مقتضی ہوں تو معاملات کو فوج کے حوالے بھی کیا جا سکتا ہے۔ دوسری کانفرنس بعض ممتاز شہریوں پر مشتمل تھی ان میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی بھی شامل تھے۔ جنھوں نے اس مطلب کا بیان شائع کرنے پر اصرار کیا کہ علما سے دوبارہ مذاکرات شروع کیے جائیں گے۔ اس میں بھی اختلاف ہے کہ مولانا کے ٹھیک ٹھیک الفاظ کیا تھے لیکن اس کا موجودہ موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ تیسری کانفرنس کا نتیجہ بعض افسروں کے نزدیک یہ تھا کہ فائرنگ کو نرم کر دینے کا حکم دے دیا گیا۔ اس کے لیے ''Let up'' کا لفظ استعمال کیا گیا قریب قریب تمام افسر جن میں چیف منسٹر بھی شامل ہیں یہی کہتے ہیں کہ پہلی دو کانفرنسوں کی طرح اس کانفرنس کی صدارت بھی مسٹر چندریگر نے کی تھی لیکن مسٹر چندریگر کا قول یہ ہے کہ اگر کوئی ایسی کانفرنس ہوئی ہے تو وہ گورنمنٹ ہاؤس کے کسی حصے میں منعقد ہوئی ہوگی جس میں، مَیں حاضر نہ تھا۔

شہادت میں جو تفاوت ہے اس کا اثر صرف اس سوال پر پڑتا ہے کہ آیا فائرنگ میں نرمی کرنے کی تجویز مسٹر چندریگر نے پیش کی تھی یا کسی اور صاحب نے خیال کیا جاتا ہے کہ اس تجویز پر عمل کیا گیا اور اس سے پولیس کے حوصلے بے حد پست ہوئے۔

اس اثنا میں شہر کے لوگ سرکاری گاڑیاں، ڈاک خانے اور دکانیں نذر آتش کر رہے تھے ریلوے کے ملازم خود انجنوں کو لوکو شیڈ سے سٹیشن پہنچنے سے روک رہے تھے اور کلرکوں کا عملہ خصوصاً سیکریٹریٹ اور دفتر اکاؤنٹنٹ جنرل (دو نہایت مذہبی ادارے) میں کام چھوڑ کر بیٹھا تھا اور گستاخ و شوریدہ سر ہو رہا تھا۔ ٹیلیفون پر نہایت خیرہ چشمی سے یہ دھمکی دی گئی تھی کہ گورنمنٹ ہاؤس کی بجلی کاٹ دی جائیگی۔ اور پیغمبر اسلام کے نام پر چند احمدی قتل بھی کر دیے گئے تھے۔ بعض کہتے تھے کہ فائرنگ بند ہونی چاہیے اور بعض کا مطالبہ تھا کہ ایک بیان شائع ہونا چاہیے۔ اس کے بعد گورنمنٹ ہاؤس اور شہر کی اس ابتری کے باوجود ۶ مارچ کی صبح طلوع ہوئی اور ہر اہم شخص گورنمنٹ ہاؤس میں پہنچ گیا۔ یہ معلوم ہی ہے کہ اس سے قبل دو پہر مسٹر دولتانہ نے اپنا وہ مشہور بیان شائع کیا جس میں اپنی طرف سے مطالبات کی منظوری کا اعلان کر دیا اور مرکز سے بھی منظوری کی سفارش کر دی۔ اس کے بعد ایک گھنٹے کے اندر اندر مرکز نے لاہور میں مارشل لا نافذ کر دیا اور پابند قانون شہریوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

اس مدت کے دوران میں جو اہم ترین نکات بحث کے محتاج ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ آیا ایک امتناعی حکم ۲ مارچ کی شام سے پہلے صادر ہونا چاہیے تھا۔

۲۔ آیا اس کا اطلاق اندرون فصیل کے شہر پر بھی ہونا چاہیے تھا۔

۳۔ آیا مسجد وزیر خاں کی صورت حالات کا تدارک مناسب طریق پر کیا گیا۔

۴۔ آیا فائرنگ کو نرم کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا اگر کیا گیا تھا تو اس کا اثر کیا ہوا۔

۵۔ آیا فوج کے ساتھ مناسب رابطہ موجود تھا اور آیا فوج نے کاروائی کرنے سے نارضامندی ظاہر کی تھی۔

۶۔ آیا مارشل لا کے نفاذ سے بچنا ممکن تھا۔

ا۔ دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کا استعمال

ہم نے اپنی تحقیقات کے دوران میں اکثر سول افسروں پر واضح کر دیا تھا کہ لیڈروں کو گرفتار کرنے کے بعد انہیں سب سے پہلے یہ خیال آنا چاہیے تھا کہ ایک امتناعی حکم نافذ کریں لیکن چونکہ انہوں نے واضح طور پر بھی اور ضمنی حیثیت سے بھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ ۲ مارچ کی شام سے پہلے صورت حالات بالکل نازک معلوم نہ ہوتی تھی لہٰذا ہم ۲۸ فروری اور یکم مارچ کے واقعات کی نسبت، سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے بیان کو اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

۲۵ فروری ۱۹۵۳ء پانچ یا چھ ہزار اشخاص کا ایک جلوس دہلی دروازے کے باہر تیار ہوا اور حکومت پولیس اور احراریوں کے خلاف نعرے لگاتا ہوا سول سیکرٹریٹ کی طرف گامزن ہوا۔ ان لوگوں نے ہمیں نصف گھنٹے یا اس سے بھی زیادہ مدت تک مصروف رکھا اور بہت مشکل سے منتشر کیے جا سکے۔ دن بھر چھوٹے چھوٹے جلوس آتے رہے اور حکام انتظامی کے لیے عقدہ دشوار بنتے رہے۔ احراریوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں آوارہ گرد بازاری آدمی بھی شامل ہو گئے اور نارضامند دکانداروں کو دکانیں بند کرنے پر مجبور کرتے رہے۔ ایک بڑے جلوس میں جب ہجوم چیرنگ کراس کی طرف مارا مارا بڑھ رہا تھا۔ مال روڈ کی دکانیں بند ہو گئیں۔ ٹریفک رک گیا اور پابند قانون شہری اپنے اپنے مکانوں اور دکانوں میں بند ہو کر بیٹھ رہے۔ یہ ہجوم زیادہ تر بازاری آدمیوں اور غنڈوں پر مشتمل تھا۔ البتہ جیسا میں نے اپنے تحریری بیان میں لکھا ہے ان لوگوں کے ''مذہبی جذبے کا لہجہ بلند'' تھا جس سے میرا مطلب یہ تھا کہ وہ کلمہ اور تکبیر کے نعرے لگا رہے تھے۔

یکم مارچ ۱۹۵۳ء

اس دن کم از کم چار جلوس نکلے جن میں سے دو خاصے بڑے تھے۔ پہلا بڑا جلوس بیرون دہلی دروازے سے شروع کیا گیا۔ مولوی احمد علی اور بتیس دوسرے آدمی گرفتار کیے گئے۔ ہجوم کا رویہ مخالفانہ اور غضبناک تھا اور اس نے خشت باری کر کے پولیس کی ایک گاڑی کو توڑ پھوڑ دیا تھا دوسرے

جلوس میں انتیس اشخاص گرفتار کیے گئے ۔تیسرے جلوس میں ۲۳ گرفتاریاں ہوئیں۔شہر بھر میں چھوٹے چھوٹے جلوس نکلتے رہے جب پولیس کا کوئی دستہ پہنچ جاتا تو یہ جلوس غائب ہو جاتے تھے لیکن جوں ہی پولیس رخصت ہو جاتی وہ پھر جلوس کی شکل اختیار کر لیتے۔غرض انہوں نے ہمیں دن بھر بھاگ دوڑ میں مصروف رکھا۔آخر تیسرے پہر دہلی دروازے سے ایک بڑا جلوس نکالا گیا۔راستے میں غنڈے اس میں شامل ہوتے چلے گئے ۔یہاں تک کہ انسانوں کی تعداد بے انتہا بڑھ گئی اور اس ہجوم کی نوعیت یہ ہوگئی کہ گویا وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے پر تلا کھڑا ہے۔دکانیں پھر بند ہوگئیں کاروبار بالکل رک گیا ٹریفک مفلوج ہوگئی اور پابند قانون لوگ اپنی سلامتی کو خطرے میں محسوس کر کے کانپنے لگے۔

دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری ۲ مارچ کو ایسے حالات میں نافذ کی گئی جو ہوم سیکرٹری کے تار مورخہ ۹ مارچ میں بیان کیے گئے تھے۔ یہ تار ہفتے بھر کے واقعات کی اطلاع دینے کے لیے مرکز کو دیا گیا تھا۔ہوم سیکرٹری کا تار ملاحظہ ہو۔

۲ مارچ

۲ مارچ کو شورش پسندوں نے جلوس نکالے جو سب چیرنگ کراس پر جمع ہوئے بڑے جلوس کی قیادت زمیندار کے مولانا اختر علی خاں کر رہے تھے جن کے خلاف پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت نظر بندی کا حکم صادر کیا جاچکا تھا لیکن گرفتار نہ کیے جاسکے کیونکہ وہ زیادہ وقت مسجد وزیر خاں میں رہے مظاہرین بے حد شوخ و بیباک تھے اور آمادہ فساد معلوم ہوتے تھے۔انہوں نے متعدد بار پولیس کے حلقے کو توڑ دیا۔چنانچہ ان کو ہٹانے کے لیے نرم سالاٹھی چارج کیا گیا کثیر التعداد لوگوں نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔جب بالآخر ہجوم واپس چلا گیا تو یہ اطلاع آئی کہ بعض لوگوں نے شیزان ریستوران پر جو ایک احمدی ی ملکیت ہے چھوٹے چھوٹے پتھر پھینکے، گو ان سے کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔اس پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ شہر کے متاثرہ علاقوں میں جلوسوں کو ممنوع قرار دینے کے لیے زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری ایک حکم امتناعی نافذ کر دیا جائے۔

۲ مارچ کا دن پہلے دو دنوں سے کچھ زیادہ خراب نہ تھا:

۲ مارچ کے حوادث اور اس سے پہلے دو دنوں کے واقعات میں یہ فرق تھا کہ اول الذکر دن میں چیرنگ کراس پر زیادہ لاقانونیت کا مظاہرہ کیا گیا جہاں سول افسر اپنا آخری سٹیشن قائم کیے انتظار کر رہے تھے۔ اب تک تو جلوس اس آخری سٹیشن ہی پر منتشر ہو جاتے تھے لیکن مسٹر قربان علی خاں کے ایک سابقہ قول کے مطابق ایک لاقانونیت سے دوسری لاقانونیت پیدا ہوتی ہے چونکہ ان لوگوں نے اس سے قبل اپنے دو کارناموں کی وجہ سے خاصی اہمیت حاصل کر لی تھی اس لیے انہوں نے آخری سٹیشن کی پابندی کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ دو سابقہ دونوں کی صورت حالات پر بحیثیت مجموعی سکون و اطمینان کا کیا موقع تھا اور وہ بھی محض اس بنا پر کہ کسی خاص نقطے پر جلوس شوریدہ سر نہ تھا، حالانکہ دن کے باقی حصے میں انہوں نے حکام کو خاصا پریشان کیا تھا۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا اندازہ

حکام متعلقہ میں سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سید اعجاز حسین شاہ سب سے زیادہ پر امید اور مطمئن آدمی تھے۔ اور اگر ہم خود ۶ مارچ کو لاہور میں موجود نہ ہوتے تو شاہ صاحب کے بیان کو پڑھ کر ہم یہی سمجھتے کہ مارشل لا حقیقت میں نافذ ہی نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے شروع میں یہ کہا کہ انہیں ۲۸ فروری کی گرفتاریوں پر کسی گڑبڑ کی توقع نہ تھی چونکہ ہمیں ۲۸ فروری کے متعلق یہ اندازہ بہت ہی ہلکا معلوم ہوا اس لیے ہم نے ان سے ذیل کے سوالات کیے۔ ہم سوالات و جوابات دونوں کو نقل کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنی معقولیت کے خود ہی مظہر ہیں۔

سوال۔ آپ کا خیال تھا کہ گرفتاریوں کے بعد کوئی احتجاج، کوئی ہڑتال، کوئی جلسہ عام، کوئی جلوس اور کوئی ہنگامہ آرائی نہ ہوگی؟

جواب۔ جی ہاں میرا یہی خیال تھا۔

سوال: کیا اسی وجہ سے آپ نے دفعہ ۱۴۴ کے ماتحت کوئی حکم صادر نہ کیا؟

جواب۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مجھے اس حکم کے نفاذ کا مشورہ نہیں دیا گیا تھا۔ اس

مسئلے پر پہلے پہل ۲ مارچ کو غور کی گیا تھا اگر میں کچھ مدت پیشتر حکم نافذ کر دیتا تو اس سے شہری آزادیاں محدود ہو جاتیں''۔

اگر آپ غور کریں تو یہ کوئی واحد جواب نہیں اس کا مطلب اولاً یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان سے کہہ دیتا تا کہ ۲۸ فروری کو ایسا حکم صادر کر دیجیے تو وہ کر دیتے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ۲ مارچ تک کسی کو اس کا خیال بھی نہ آیا تھا اور اس کا تیسرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہنگامہ آرائی کی توقع بھی ہوتی تو شہری آزادیوں کے مقاصد عالیہ کی خاطر لاقانونی کو بھی برداشت کر لیا جاتا۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ ضابطہ فوجداری کو'' آزادی'' اور مادر پدر آزادی'' کے درمیان مبہم سے خط فاصل کا تعین کر دینا چاہیے۔

سوال۔ اگر حکومت کسی تحریک کے علم برداروں کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کر دے تو کیا آپ کے نزدیک کوئی وجہ نہیں کہ اس تحریک کی حمایت میں ہونے والے مظاہروں کو بند کر دیا جائے؟

جواب۔ یہ سب کچھ حالات پر منحصر ہے اگر نہایت ہر دل عزیز لیڈر گرفتار کیے جائیں تو ہوسکتا ہے کہ ایسا ردعمل ہو جس کے خلاف کاروائی ضروری ہو جائے لیکن اگر گمنام لوگ گرفتار کیے جائیں تو ممکن ہے کوئی ردعمل بھی نہ ہو''۔

ان کے نزدیک جو لوگ گرفتار ہوئے تھے وہ گمنام لوگ تھے ''خیال یہ تھا کہ جو کچھ بھی کرنا ہے وہ کراچی میں کیا جائے گا'' ہمارے نزدیک اس فقرے سے اصل حقیقت پردے سے جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ پنجاب کے حکام انتظامی کو یہ امید تھی کہ رضا کاروں کا بہاؤ کراچی کی طرف رہے گا اور ماضی میں ہندوستان کا اور حال میں پاکستان کا بازوئے شمشیر زن یعنی پنجاب رنگروٹ مہیا کرے گا۔ بہر حال مسٹر اعجاز حسین تسلیم کرتے ہیں کہ انہیں کم از کم ۲۸ فروری کو معلوم ہوا کہ لاہور بھی گڑبڑ کا مرکز بنے گا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتے تھے کہ شورش پسندوں کو کوئی خاص حمایت حاصل نہ ہوگی کیونکہ ۲۸ جنوری کو جو پہلا جلسہ ہوا تھا اس میں صرف چند ہی اشخاص ہوئے تھے یہ اندازہ سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے اندازے سے بالکل مطابق نہیں معلوم ہوتا۔

صورت حالات ۲۸ فروری سے پہلے بھی خراب ہی تھے

لیکن ۲۸ فروری سے پیشتر کے زمانے کے متعلق بھی جب مسٹر اعجاز حسین کے حافظے کو تازہ کرنے کے لیے خود ان ہی کی پانزدہ روزہ رپورٹیں دکھائی گئیں تب جا کر انہوں نے تسلیم کیا کہ فروری کے نصف اول کے دوران میں جب ''سامعین کے جنوبی طبقے کو جوش دلانے کی غرض سے آتش ریز تقریریں کی گئیں'' تو انہوں نے حکومت کو مشورہ دیا کہ ''اگر صورت حالات میں ذرا سی خرابی بھی رونما ہو تو امن و انتظام کی حفاظت کے لیے نہایت قوی امتناعی تدابیر اختیار کی جائیں''۔ اس قسم کی سخن طرازیاں علی العموم خفیہ ڈائریوں میں کی جاتی تھیں تا کہ حکومت پر یہ اثر پڑے کہ حکام صورت حالات کی حفاظت کے لیے کس قدر مستعد ہیں۔ لیکن اب مسٹر اعجاز حسین مانتے ہیں کہ یہی صحیح پوزیشن تھی۔ چنانچہ یہ فرض کیا جائے گا کہ ۲۸ فروری اور یکم مارچ کو جو کچھ ہوا اس سے ''صورت حالات میں ذرا سی خرابی بھی رونما نہ ہوئی تھی'' اگر یہ صورت حالات بھی خراب نہ تھی تو پھر خراب صورت حالات خدا جانے کیا قیامت ہوگی۔ جب تک اختر علی خاں جیسا کوئی غیر گمنام آدمی صورت حالات کا سرکردہ رہنما نہ ہو صورت حالات اتنی خراب نہیں ہو سکتی کہ کسی حکم امتناعی کی ضرورت پڑ جائے۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (جاری):

اپنے خیال کی تائید میں مسٹر اعجاز حسین نے کہا کہ صرف ایک جلوس ۲۸ فروری کو اور ایک یکم مارچ کو نکلا تھا اور ہر جلوس میں کوئی تین یا چار سو آدمی ہوں گے۔ اس پر انہیں فروری کے نصف دوم کے متعلق ان کی اپنی خفیہ رپورٹ دکھائی گئی جس میں انسانوں کی تعداد چھ ہزار بتائی گئی تھی انہوں نے کہا ''لیکن یہ تو اس مقام پر جمع ہونے والے تمام اشخاص کی تعداد کا محض زبانی اندازہ تھا'' حالانکہ موجودہ تخمینہ بھی کوئی تحریری تخمینہ نہ تھا۔ آخر جلوس ایک مقام پر ''جمع ہونے والے تمام اشخاص'' ہی کو تو کہتے ہیں لہٰذا اگر شاہ صاحب یہ کہتے تو بہتر ہوتا کہ امتداد زمانہ کی وجہ سے غالباً ان کا موجودہ تخمینہ غلط ہوگا باقی رہی جلوسوں کی تعداد تو جب ان کا تحریری بیان انہیں دکھایا گیا تو انہوں نے تسلیم کیا کہ یکم

مارچ کو پانچ اور آٹھ کے درمیان جلوس نکلے ہوں گے لیکن ''بڑا جلوس ایک ہی تھا۔۔۔۔اور تیس آدمیوں کی گرفتاری اس امر کا ثبوت نہیں کہ صورت حالات خراب تھی''۔

لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ شہادت پر مسلسل نکتہ چینی کرنے اور ہر سطر پر اس کی صداقت کو کسوٹی پر پرکھنے سے صورت حالات یقیناً خراب ہو رہی ہے۔ہم اس قسم کی رکاوٹ کے عادی نہیں ہیں ہمیں اس میں کوئی لطف نہیں آتا۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا فرض ہے کہ وہ انسدادی کاروائی کے معنی سمجھے:

احراریوں کے وکیل مسٹر مظہر علی اظہر کا خیال یہ تھا کہ اگر جلوس کو اس کا موقع نہ دیا جائے کہ اس کے شرکا کی تعداد میں بڑا اضافہ ہو سکے اور اس کو آغاز ہی میں روک دیا جائے تو اس سے کوئی خاص لاقانونی پیدا نہیں ہو سکتی۔اسی خیال کے ماتحت انہوں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے سوال کیا کہ جو جلوس اکبری دروازے کے جلسے سے شروع ہوا تھا اسے مسجد کو جانے کا موقع کیوں دیا گیا۔جواب یہ ملا کہ جب تک قانون کی کوئی خلاف ورزی نہ ہو بے گناہ آدمیوں کو گرفتار کرنا بالکل بیکار بات ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ قانون کی حقیقی خلاف ورزی سے پہلے ایک ایسی شے بھی ہے جسے ''انسدادی تدبیر'' کہتے ہیں اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے لیے اس شے کو یاد رکھنا زیادہ اہم ہے لیکن اگر وہ ''شہری آزادیوں'' اور قانون شکنی کا ارادہ رکھنے والے کی سابقہ ''بے گناہی'' کے چکر میں پھنسا رہے گا تو یہ امر اس کے فرائض کی بجا آوری میں سخت حائل ہوگا۔جب یہ سوال کیا گیا کہ بعد میں جلوس سے تیس آدمی کیوں گرفتار کیے گئے تو انہوں نے جواب دیا کہ انہوں نے ٹریفک کو روک رکھا تھا اور نقص امن کے ارتکاب پر تلے ہوئے تھے۔لیکن یہ بات انہوں نے اپنے تحریری بیان میں نہیں لکھی کیونکہ انہوں نے اس معاملے کو ''قابل ذکر'' ہی نہیں سمجھا کہ وہ اس لیے گرفتار کیے گئے تھے کہ وہ نقص امن کے ارتکاب کا پورا عزم رکھتے تھے۔اسی طرح ۲ مارچ کے واقعات کے متعلق انہوں نے اپنے تحریری بیان میں اس امر کو بھی قابل ذکر نہیں سمجھا کہ شرکائے جلوس ''تشدد کی طرف مائل'' تھے۔

ڈی آئی جی کی تصریح:

لیکن اگر یکم مارچ کا جلوس نقص امن کے ارتکاب پر تلا ہوا تھا تو بہ اعتبار نوعیت وہ ۲ مارچ کے جلوس سے مختلف نہ تھا۔ لہٰذا یہ سمجھنے کی وجہ موجود ہے کہ دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کے لیے ضروری حالات پیشتر ہی پیدا ہو چکے تھے۔ مسٹر انور علی کا بیان ہے کہ افسروں کی رائے یہی تھی کہ اگر جلوسوں کو نکلنے کی اجازت دے دی جائے تو گو ان کے تشدد پر اتر آنے کا احتمال ہوگا لیکن کم از کم کچھ وقت تک دفعہ ۱۴۴ کے استعمال کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ یہ رائے کسی حد تک میر نور احمد کے اس خیال کے مساوی ہے کہ کسی اخبار کے خلاف کارروائی اس وقت تک نہ ہونی چاہیے جب تک اس کی تحریروں کا نتیجہ قانون شکنی کی صورت میں ظاہر نہ ہو۔ ہماری رائے میں انسدادی کارروائی کا یہ تصور ہرگز صحیح نہیں ہے۔ جب مسٹر انور علی سے یہ پوچھا گیا کہ آپ نے جلوسوں کو بند نہ کیا تو انہوں نے ایک اصطلاحی جواب دیا کہ یہ امر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے فرائض میں داخل ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ لاہور میں جلوس اکثر نکلتے رہتے تھے اور ان میں کوئی قابل تشویش بات نہ ہوتی تھی۔ ان سے ایک اور سوال کیا گیا کہ اگر جلوس آغاز ہی میں ممنوع قرار دے دیے جاتے تو کیا کوئی خاص فرق نہ پڑتا۔ انہوں نے جواب دیا ''یہ قیاس کرنا مشکل ہے کہ صورت حالات کیا ہوتی۔ تحریک مناسب قیادت کے ماتحت نہ تھی بلکہ غیر ذمہ دار اشخاص کے ہاتھ میں تھی لہٰذا یہ پیش گوئی کرنا آسان نہیں کہ تحریک کون سا راستہ اختیار کرتی۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ اگر قیادت غیر ذمہ دار آدمیوں کے ہاتھ میں تھی تو حکام کو اور بھی زیادہ مشوش اور فکرمند ہونا چاہیے تھا۔

ایس ایس پی کا خیال

جب مرزا نعیم الدین سینیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کو مسٹر انور علی اور مسٹر اعجاز حسین کے تحریری بیانات دکھائے گئے کہ یکم مارچ کے جلوس پرامن تھے تو انہوں نے کہا کہ یہ رائے صحیح نہیں ہو سکتی کیونکہ ان میں سے کم از کم ایک جلوس نے پولیس کا ایک ٹرک توڑ پھوڑ دیا تھا۔

لیکن ان کی رائے یہ تھی کہ اگر دفعہ ۱۴۴ پہلے بھی نافذ کر دی جاتی تو کوئی خاص فرق نہ پڑتا

کیونکہ جب وہ نافذ کی گئی تو اس کی خلاف ورزی ہوئی۔ ہم نے ان سے سوال کیا کہ آیا صحیح پوزیشن یہ نہیں کہ جب اقدام میں توقف کیا جائے تو لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ حکام غفلت و تاخیر کی وجہ سے اقدام کا حق کھو چکے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ معاملے کو اس زاویہ سے دیکھنے کے بعد اب ان کا خیال یہ ہے کہ اگر حکم امتناعی ۲۸ فروری کو نافذ کر دیا جاتا تو لوگ ضرور یہ سمجھتے کہ حکومت پختگی سے اپنے فرائض کی بجا آوری پر قائم ہے۔

اقدام میں توقف اقدام کو بے اثر کر دیتا ہے

ہمیں یقین ہے کہ ہم نے مرزا نعیم الدین کو جو بات سمجھائی اس میں معقولیت ہے ہم محض نفسیات عوام پر بھروسہ نہیں کر رہے ہیں۔ یہ ذہن انسان کا ایک عام شعار ہے اقدام میں تاخیر کرنا اقدام کو بے اثر کر دیتا ہے پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ ایسے معاملات میں جو ہمارے پیش نظر ہیں جب تک آپ اقدام کا فیصلہ کریں اس وقت تک فریق ثانی اپنے جوش میں ایسی ذہنی کیفیت تک پہنچ جاتا ہے کہ اس نتائج کا بالکل ہوش نہیں رہتا۔ آخر میں (اور ملتان فائرنگ کی رپورٹ میں بھی اس حقیقت ثابت کو ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی تھی) اگر حکام کی رائے میں دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کے ماتحت حکم کا صدور ضروری ہوا اور وہ اس کو نافذ بھی کر دیں تو اس کی نافرمانی کا مقابلہ نہ کر سکنا اچھے نظم و نسق کا ثبوت نہیں ہے اور اس کا نتیجہ جلد یا بدیر لازماً یہی ہوگا کہ مصیبت ناک واقعات رونما ہوں گے جیسے ۱۹ جولائی کی صبح کو ظہور میں آئے تھے۔

دفعہ ۱۴۴ کس کا فرض ہے؟

اگر دفعہ ۱۴۴ کے ماتحت حکم کا اجرا ضروری تھا تو اس کو جاری کرنا کس کا فرض تھا؟ دوسرے اضلاع میں واضح طور پر یہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا کام ہے اور یہ سیدھا سادا قانون ہے۔ اس معاملے میں عام طور پر وہ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے مشورے سے کام کرتا ہے لیکن لاہور میں انسپکٹر جنرل پولیس ہے جو داخلی سلامتی کا ذمہ دار ہے۔ ہوم سیکرٹری ہے، چیف سیکرٹری ہے، وزیر قانون و انتظام ہے اور ان سب کی موجودگی میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ایک بے جان سا آلہ کار بن کر رہ جاتا ہے جب وہ کسی

کانفرنس میں شریک ہوتا ہے تو ایک گھڑا گھڑایا حکم اپنی جیب میں ڈال کر لے جاتا ہے کہ اگر ضرورت ہو تو اسے جیب سے نکال کر اس پر دستخط کر دے اور اگر ضرورت نہ ہو تو جیب ہی میں پڑا رہنے دے۔ چنانچہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا بیان ہے کہ ''جب میں یکم مارچ کو افسروں کی کانفرنس میں گیا تو دفعہ ۱۴۴ کے ماتحت ایک حکم مسودہ ساتھ لیتا گیا، اس لیے کہ میرے نزدیک اس کا اجرا ضروری تھا بلکہ میں نے سوچا شاید اس کی ضرورت پڑ جائے'' دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود تو اس قسم کے حکم کی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے لیکن ان کا خیال یہ تھا کہ اگر کسی شخص نے اس کے نفاذ کی تجویز کی تو وہ اس کو نافذ کر دیں گے۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے گمراہ کن بیانات

''دفعہ ۱۴۴ کا ذکر آیا تھا لیکن مجھے یاد نہیں کہ یہ ذکر کس نے کیا تھا ایک بات میرے ذہن میں واضح تھی کہ لاہور ایمرجنسی ڈسٹربنس سکیم کے ماتحت یہ پولیس کا کام تھا کہ دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کے لیے مجھ سے درخواست کرتی۔ ۲ مارچ کو پولیس نے مجھ سے کوئی درخواست نہیں کی بلکہ میں نے اس حکم کا اجراء بالکل اپنی مرضی سے کیا تھا میں نے اس کی تجویز اجلاس میں پیش کی اور سب نے کہہ دیا کہ ہاں کر دیجئے''۔

لیکن یہ صحیح نہیں ہے اور اگر آپ نے اس اجلاس کی کاروائی کو پڑھا ہے جو ۲ مارچ کو ۸ بجے شام چیف منسٹر کی کوٹھی پر منعقد ہوا تھا اور جس میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی موجود تھے تو آپ ہمارے ساتھ اتفاق کریں گے۔ ''انسپکٹر جنرل اور ہوم سیکرٹری نے جو چیرنگ کراس کے واقعات کے عینی شاہد تھے صورت حالات کی کیفیت بیان کی۔ انسپکٹر جنرل نے لاہور میں دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کی تجویز کی اور کہا کہ اندرون فصیل کو مستثنےٰ رکھا جائے، اس رائے کی سب نے تائید کی اور حکم کے نفاذ کا فیصلہ ہو گیا''۔

اس وجہ سے ہم نے اس رپورٹ کے ابتدائی حصے میں لکھا تھا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صورت حالات کی ضرورت سے بھی زیادہ ذمہ داری اپنے سر لے لیتے ہیں۔ اگر ہمیں یقین ہوتا کہ یہ ذمہ داری صرف نام نہاد طور پر قبول نہیں کی جا رہی ہے اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اس کو محض اس لیے اپنے سر

نہیں لے رہے ہیں کہ زیادہ بڑی ذمہ داری (یعنی ۲۸ فروری یا یکم مارچ کو اجرائے حکم میں کوتاہی کی ذمہ داری) سے بچ جائیں۔تو ہم ان کی تعریف کرتے۔اگر وہ یکم مارچ کو ایک حکم کا مسودہ ساتھ لے گئے تھے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ یا تو وہ اس کی ضرورت محسوس کر چکے تھے یا محض ایک فرماں بردار آلہ کار کی حیثیت سے تیار ہو کر گئے تھے دونوں صورتوں میں وہ اپنی ذمہ داری کو بجا نہیں لا سکے۔اگر انھوں نے مرزا نعیم الدین کی طرح صاف صاف کہہ دیا ہوتا کہ لاہور جیسی جگہ پر اور ایسی صورتحالات میں اگر انسپکٹر جنرل یا ہوم سیکرٹری دفعہ ۱۴۴ کے ماتحت حکم صادر کرنے کے حامی نہ ہوتے تو گو میرے نزدیک وہ ضروری ہوتا لیکن میں ایسا حکم نافذ نہ کرتا تو ہم ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی اس تصریح کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتے۔لیکن ۲۸ فروری اور یکم مارچ کی کوتاہی کو حق بجانب ثابت کرنے کی غرض سے انھیں ایک غیر معقول پوزیشن اختیار کرنی پڑی جو موقع آنے پر بدلنی پڑی۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے فرض کے متعلق مسٹر دولتانہ کی رائے

مسٹر دولتانہ ۲ مارچ کے حکم کی اور نہ اس سے قبل اس کے اجرا میں کوتاہی کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں ”میں اس بات کو نہیں مانتا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس چونکہ فوری طور پر دوسرے اعلیٰ افسروں کے ماتحت کر دیے گئے تھے لہٰذا وہ آزادانہ کاروائی نہ کر سکتے تھے۔میں نہیں سمجھتا کہ ان کے فرائض دوسرے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں اور پولیس سپرنٹنڈوں سے مختلف کیونکر تھے۔۔ ۔اگر انہیں کچھ شبہات تھے تو بڑے افسروں کا مشورہ انہیں ہر وقت مل سکتا تھا دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کے وقت مجھ سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا“

مسٹر دولتانہ اس کانفرنس کو بھول رہے ہیں جو ان کی کوٹھی پر ہوئی تھی اور جس کی صدارت بھی انہوں نے کی تھی اس معاملے کی ذمہ داری کے متعلق ان کا رویہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے رویے سے بالکل متضاد ہے۔وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ صورت حالات کی تازہ ترین کیفیت سے باخبر نہ تھے کیونکہ اگر وہ ایسا کہیں تو اس سے ان کی انتہائی بے التفاتی ظاہر ہو گی لیکن اگر وہ صورت حالات سے باخبر تھے تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ صورت حالات نازک تھی اور مسٹر دولتانہ کے افسر اس کی نازک نوعیت سے

غافل تھے۔ اگر ایسی حالات میں مسٹر دولتانہ ان کو کاروائی پر آمادہ کرتے تو کیا یہ امر ان کے فرائض میں ناواجب مداخلت کا مترادف ہوتا؟

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا فرض

لیکن ہم تسلیم کرتے ہیں کہ مسٹر دولتانہ نے ان دو بڑے افسروں کے فرائض کے متعلق جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ درست ہے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ آزادانہ اقدام کر سکتا ہے۔ لاہور میں اسے بالخصوص انسپکٹر جنرل سے مشورہ کرنا چاہیے اور اگر کوئی اعلیٰ افسر اس سے اختلاف کرے تو عقل مندی کی بات یہ ہے کہ وہ اس اختلاف کو ایک یادداشت میں قلم بند کرے اور اس کی ایک نقل اختلاف کرنے والے افسر کے پاس بھیج دے لیکن اسے محض کانفرنسوں ہی میں شریک نہ ہونا چاہیے اگر اس کی ایک ٹانگ گورنمنٹ ہاؤس میں ہو تو دوسری مسجد وزیر خاں میں ہونی چاہیے اور بہتر یہ ہے کہ وہ دائیں ٹانگ ہو۔

ہوم سیکرٹری کا خیال:

کسی دوسرے سلسلے میں مسٹر غیاث الدین احمد نے مندرجہ ذیل خیالات ظاہر کیے ''میں یہ نہیں سمجھتا کہ کسی نے حکام ضلع یا انسپکٹر جنرل کے فیصلوں میں رکاوٹ پیدا کی ہو میرا ذاتی احساس یہ ہے کہ لاہور جیسے مقام پر انسپکٹر جنرل جیسے بڑے افسروں کا مقامی حکام کو مشورہ، امداد اور ہدایت دینا ضروری ہے کیونکہ مقامی حکام کے علاوہ خود انسپکٹر جنرل کا بھی یہ فرض ہے کہ قانون و انتظام کو قائم رکھے اور صوبے کے داخلی دفاع کی دیکھ بھال کرے'' یہ اس سوال کا جواب تھا کہ آیا لاہور کا معاملہ اس وجہ سے خراب نہیں کہ یہاں بہت سے اشخاص کے ساتھ مشورے کرنے پڑتے ہیں۔

۲۔ فصیلی شہر اور ۳۔ مسجد وزیر خاں

یہ دونوں موضوع ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

اس سے قبل ہم صوبائی حکومت کی ایک تحریر مورخہ ۹ مارچ کا ایک اقتباس پیش کر چکے ہیں۔ یہ تحریر مرکزی حکومت کو بھیجی گئی تھی اور اس میں ۲ مارچ سے لے کر مارشل لا تک کے حالات بیان کیے

گئے تھے۔

مسجد وزیر خاں قانون وانتظام سے بالاتر تھی

اس اقتباس کے ایک فقرے کی طرف ہم بطور خاص توجہ دلاتے ہیں جس میں کہا گیا تھا کہ مولانا اختر علی خاں ۲ مارچ کے جلوس کی رہنمائی کررہے تھے ان کے خلاف نظر بندی کا حکم تو پہلے ہی ہو چکا تھا لیکن وہ اس لیے گرفتار نہ کیے جاسکے کہ وہ مسجد وزیر خاں میں تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یکم مارچ تک بھی مسجد وزیر خاں قانون وانتظام کے اقتدار سے بالاتر تھی۔ یہ ایک سادہ سی حقیقت ہے جس نے ہم کو ابتدا ہی سے متاثر کیا ہے لیکن بعض افسر اس سے بشدت انکار کرتے ہیں کیونکہ اس کا اقرار ان کے لیے لازماً مشکلات کا باعث ہوسکتا ہے۔ پہلی مشکل یہ ہے کہ اگر مسجد وزیر خاں ایسی ہی خطرناک جگہ تھی تو اس پر حکم امتناعی کا اطلاق کیوں نہ کیا گیا؟ دوسری مشکل یہ ہے کہ اگر پولیس وہاں کی صورتحالات پر قابو نہ پاسکتی تھی تو اس کو فوج کے حوالے کیوں نہ کیا گیا؟ خصوصاً ۵ مارچ کو جب اس بات کا فیصلہ گورنمنٹ ہاؤس میں ہو چکا تھا؟ تیسری مشکل یہ ہے کہ اس امر کا اعتراف کرنے کے بعد یہ معاملہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ جب ۴ مارچ کی شام کو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو قتل کر دیا گیا تو ہر شخص موقع واردات یعنی مسجد وزیر خاں کی طرف نہیں بلکہ کوتوالی کو بھاگا اور یہ لوگ اس امر کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے کہ اس عجیب وغریب طرز عمل کی وجہ یہ تھی کہ صورت حالات ان کے قابو سے باہر اور لا علاج ہوگئی تھی۔ چوتھی مشکل یہ تھی مولانا عبد الستار نیازی (صرف مشکل ہی نہیں بلکہ استرے کی دھار) جنہوں نے اپنا گھر چھوڑ کر مسجد میں اڈا جما لیا تھا اور وہاں سے مذہبی بادلوں کی وہ کڑک اور گرج صادر کررہے تھے جن کی لرزش گورنمنٹ ہاؤس تک محسوس ہو رہی تھی۔

فصیلی شہر کو مستثنیٰ رکھنے کی تجویز انسپکٹر جنرل نے کی تھی:

فصیلی شہر کو حکم امتناعی سے باہر رکھنے کی ذمہ داری اصلاً انسپکٹر جنرل پر عائد ہوتی ہے لیکن ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اس کو بھی اپنی ہی طرف منتقل کرنے پر مصر ہیں۔ مسٹر انور علی کا بیان ہے کہ ''یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ کوئی ایسا حکم جاری نہ کرنا چاہیے جس کا پورا پورا نفاذ نہ ہوسکے۔ ۱۹۳۴ء میں جب

شہید گنج کی تحریک جاری تھی اور میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا پولیس کے آدمیوں پر اینٹیں برسائی گئیں اور وہ فصیلی شہر کے اندر کا ملاً بند ہو کر رہ گئے اس کے بعد انسپکٹر جنرل نے احکام صادر کیے گئے کہ ہمیں فصیلی شہر کے اندر کسی جلوس کو روکنے یا اس تدارک کرنے کی کوشش کبھی نہ کرنی چاہیے اگر ایسی حالت پیدا ہوگئی تو فوج کو بھی اسی قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا''۔

''سوال۔کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کی صورت حالات میں فوج اور پولیس دونوں بے بس ہونگی؟

جواب۔اگر اس قسم کے حکم کا اجرا لازمی ہوتو اس کو شہر کے کسی ایک حصے میں چند حصوں میں نافذ کرنا چاہیے کیونکہ ایسی حالت میں اس کے نفاذ کی مشکلات نسبتاً کم ہونگی''۔

فوج نے چھ گھنٹے کے اندر شہر پر کیونکر قابو پالیا:

اس مرحلے پر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوا کہ فوج کے لیے یہ کیونکر ممکن ہوگیا کہ مارشل لا کے چھ گھنٹوں کے اندر پورے شہر پر قابو پالے اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے امید بھی یہی تھی اس کا جواب یہ تھا کہ فوج کے پاس نفری بھی زیادہ نہیں ہے پھر اس سے ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک خاص صورت حالت فوج کے حوالے کیوں نہ کی گئی یا ایک خاص فرض مثلاً کرفیو توڑنے والوں کو گرفتار کرنے کا کام فوج کے سپرد کیوں نہ کیا گیا۔

حکومت فوج کو استعمال کرنے سے بچنا چاہتی تھی

مسٹر انور علی کہتے ہیں اگر فوج پوری قوت کے ساتھ سول حکام کی مدد کے لیے آجاتی تو صورت حالت پر قابو پالیا جاتا فوج کیوں طلب نہ کی گئی اس کی وجہ یہ ہیں (۱) حکومت فوج کو طلب کرنے سے بچنے کی خواہش مند تھی (۲) احساس یہ تھا کہ فوج اسی صورت میں تعاون کرے گی کہ پورا اختیار، اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے سمجھا جاتا تھا کہ اگر پورا اقتدار تفویض کردیا گیا تو زیادہ خون ریزی نہ ہوگی یہ دونوں وجوہ مختلف نہیں بلکہ حقیقت میں ایک ہی وجہ ہے کہ حکومت خونریزی کے اندیشے کی وجہ سے فکرمند تھی یہ بالکل صحیح ہے کیونکہ ٦ مارچ کو بھی جب صورت حالات ہر اعتبار سے

سخت نازک ہو رہی تھی مسٹر دولتانہ نے ''فوجی قبضے'' کے مقابلے میں اپنی شکست کا اعتراف کیا یعنی سول حکام معاملے کو اس زاویہ سے دیکھ رہے تھے!

چیف سیکرٹری کی کوئی رائے نہ تھی

حافظ عبدالمجید چیف سیکرٹری اس معاملے کو محض ایک بیرونی آدمی کی حیثیت سے دیکھ رہے تھے جب ان سے سوال کی گیا کہ فصیلی شہر کیوں حکم امتناعی سے مستثنیٰ رکھا گیا تو انہوں نے جواب دیا ''اس کا نفاذ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا کام تھا اور یہ سوال ان ہی سے کرنا چاہیے۔۔۔۔ میں نے فصیلی شہر کے استثنا پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا''۔

ہوم سیکرٹری اور فصیلی شہر:

مسٹر غیاث الدین احمد نے یہ خیال ظاہر کیا: ''ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور انسپکٹر جنرل دوسرے افسروں اور وزیروں سے بے نیاز ہو کر آزادانہ اقدام کر سکتے تھے۔ یہ درست ہے کہ مسجد وزیر خاں اس وقت تمام گڑبڑ کا مرکز تھی لیکن یہ محسوس کیا جاتا تھا کہ پولیس کے لیے وہاں کوئی کاروائی کرنا ممکن نہیں (فوج کے متعلق سوال کیا گیا) مجھے معلوم نہیں کہ اس نکتہ پر فوج سے بطور خاص کوئی مشورہ کیا گیا تھا یا اس کو فصیلی شہر کے اندر جانے کے لیے کہا گیا تھا لیکن انسپکٹر جنرل کی رائے یہ تھی کہ قبل تقسیم کے زمانے میں بھی تنگ گلی کوچوں اور گنجان عمارتوں کے باعث اندرون شہر انتظامی اقدامات قابل عمل نہ ہوتے تھے۔۔۔۔ یہ صحیح ہے کہ مارشل لا کے نفاذ کے بعد فوج شہر کے اندر مصروف ہوئی لیکن اس کو اس کام میں کوئی چار بریگیڈ متعین کرنے پڑے اور پھر بھی کچھ وقت تک انتظار کرنا پڑا۔۔۔۔ یہ درست ہے کہ مارشل لا سے پہلے بھی فوج دستیاب ہو سکتی تھی۔۔۔۔۔۔ میں نے نہیں دیکھا کہ سول حکام نے اس خاص صورت حالات کو فوج کے حوالے کرنے میں کسی تامل کا اظہار کیا ہو لیکن اس سوال کا صحیح و موزوں جواب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور انسپکٹر جنرل ہی دے سکتے ہیں''۔

فصیلی شہر کے استثنا کے لیے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی وجوہ

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے کہا کہ میں نے فصیلی شہر کو ۲ مارچ کے حکم سے اس لیے خارج رکھا کہ

وہاں کسی فساد کا احتمال نہ تھا اور اس کا کوئی بعید سے بعید موقع بھی نہ تھا لیکن کم سے کم سید فردوس شاہ (ڈی ایس پی) کے قتل کے بعد تو اس قدر قطعی اور یقینی اظہار خیال میں ضبط سے کام لینا چا۔ہیے تھا جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو یہ واقعہ یاد دلایا گیا تو انہوں نے کرفیو آرڈر پاس کر دیا پھر جب ہم نے کرفیو آرڈر کو پڑھا اور دیکھا کہ اس میں وہ رقبہ کرفیو سے آزاد رکھا گیا ہے جو سرکلر روڈ سے گھرا ہوا ہے تو ہم نے پوچھ کہ کیا کرفیو آرڈر میں شہر شامل ہے اس پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اپنے پہلے جواب کو نظر انداز کر کے کہا ''مجھے فصیل شہر کے اندر کرفیو نافذ کرنے کا مشورہ نہیں دیا گیا تھا'' اس تمام جواب کا نتیجہ یہ ہے کہ ''فساد کا احتمال'' نہ ہونے یا ''بعید سے بعید موقع'' نہ ہونے کے متعلق جو بیان دیا گیا تھا وہ از سرتا پا باطل ہو گیا۔ اس کے بعد آپ نے کہا کہ فصیلی شہر کو مستثنیٰ کرنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ یہ حکم وہاں نافذ نہ ہو سکتا تھا بلکہ یہ تھی کہ پولیس نے اس کے متعلق مجھ سے کوئی تحریک ہی نہیں کی تھی۔

بیان نا قابل اعتبار ہے

لیکن جب ان کو سینئیر سپرنٹنڈنٹ پولیس کا یہ بیان دکھایا گیا کہ فصیلی شہر کے استثنا کی وجہ یہ تھی کہ انسپکٹر جنرل کے نزدیک شاید اس حکم کا نفاذ اس رقبہ میں ممکن نہ ہو اس پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے کہا کہ صحیح پوزیشن یہی ہے بہر حال ''صحیح پوزیشن'' کچھ بھی ہو ہم اس کے لیے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔

فوج کی امداد طلب کیوں نہ کی

اس کے بعد ان سے سوال کی گیا کہ اگر ''صحیح پوزیشن'' یہی تھی تو آپ نے فوجی امداد کیوں طلب نہ کی آپ نے کہا کہ فوج تو اس وقت طلب کی جا چکی تھی! لیکن سب کو معلوم ہے کہ فوج موجود کھڑی تھی ہم تو یہ جاننا چاہتے کہ جب یہ موثر دوا موجود تھی تو اس کو اس بیماری کے علاج کے لیے کیوں استعمال نہ کیا گیا۔ عطائیوں کے ٹوٹکے کیوں استعمال کیے گئے کیونکہ ہمارے نزدیک یہ عطائیوں کے ٹوٹکے سے بھی بدتر تھا کہ خطرے کا مقام تو مسجد وزیر خاں ہوا اور فوج کوتوالی میں بھیجی جائے۔

اس کے بعد ان سے پوچھا گیا کہ آیا پولیس کے حاکم ہونے کی حیثیت سے آپ نے پولیس

کو حکم دیا تھا کہ مسجد وزیر خاں کو خالی کرائے آپ نے جواب دیا ''میرا فرض تو حکم دینا تھا ابتدائی کام کرنا پولیس کا فرض تھا'' اس سے ہمارے دل میں امید کی جھلک پیدا ہوئی اور ہم نے ان سے پوچھا کیا واقعی آپ نے کوئی ایسا حکم دیا تھا''۔ جواب ملا کہ ''اس قسم کا حکم دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ ہم سب پر واضح تھا کہ مسجد کو خالی کرانا چاہیے اور پولیس اس ضرورت سے باخبر تھی''

ایک اور جگہ انہوں نے مسجد کے سلسلے میں یہ کہا ''ہم سب کو معلوم تھا کہ یہ بہت بڑا خطرہ ہے پولیس کو اپنے فرض کا پورا احساس تھا اور وہ اس کے لیے میرے کسی رسمی حکم کی محتاج نہ تھی اور واقعہ یہ ہے کہ کرفیو تو نافذ ہو ہی چکا تھا'' اور لطف یہ ہے کہ کرفیو میں شہر شامل ہی نہیں تھا! پوچھا گیا کہ کیا آپ کے نزدیک پولیس نے اس معاملے کے متعلق ادائے فرض میں کوتاہی نہیں کی۔ آپ نے جواب دیا کہ میں یہ نہیں کہوں گا'' کیونکہ پولیس ضرور مسجد کو خالی کرانے کا بہترین طریقہ معلوم کرنے پر غور و خوص کر رہی ہوگی۔۔۔۔ اس معاملے پر ۲ یا ۳ مارچ کو نیازی کی اشتعال انگیز تقریر کے بعد غور کیا جا رہا تھا اور ڈی ایس پی کے قتل کے بعد اس مسئلہ پر اور بھی زیادہ توجہ کی گئی تھی''۔

''سوال۔ کیا اس غور اور توجہ کا کوئی محسوس نتیجہ بھی نکلا؟

جواب۔ پولیس نے ضرور کوئی اقدام کیا ہوگا۔۔۔ مجھ سے کسی خاص حکم کی حاجت نہ تھی کیونکہ ہم سب اس خطرے سے پوری طرح باخبر تھے۔۔۔۔ یہ صحیح ہے کہ میں پولیس کا حاکم ہوں لیکن پولیس ضرور صورت حالت کے تدارک کی کوشش کر رہی ہوگی اور میں نے بھی ایک طریقے سے کوشش کی تھی''۔

انہوں نے ۶ مارچ کو چند خواتین و حضرات کو مسجد میں بھیجا۔ جماعت اسلامی کے وکیل چودھری نذیر احمد خاں کے خیال میں زیادہ زور خواتین پر تھا۔ اس پر چودھری صاحب نے ایک رباعی پڑھی جس کا ایک مصرع یہ تھا کہ

زنے از غیب بروں آید و کار بکند

لیکن پولیس پر اتنا زور دیا جا رہا تھا کہ ہم نے ان سے پوچھا کہ اگر لاہور میں کوئی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نہ بھی ہوتا تو کیا پولیس کو کوئی خاص فرق معلوم ہوتا آپ نے جواب دیا کہ ضرور فرق معلوم

ہوتا'' کیونکہ ایسی حالت میں ان کے اقدامات کی ہدایت اور ان کی سرگرمیوں کی نگرانی کرنے والا کوئی نہ ہوتا''

سوال۔ کیا آپ نے ان کے اقدامات کی ہدایت کی؟

جواب۔ نہیں۔ کیونکہ ان کے راستے میں ضرور بعض مشکلات حائل ہوں گی۔

سوال۔ کیا آپ نے اس مشکل کو معلوم کرنے کی کوشش کی؟

جواب۔ مجھے صرف لاہور ہی کی دیکھ بھال نہیں کرنی پڑتی۔۔۔''

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ٹال مٹول کیوں کر رہے تھے

دوسری باتوں کے علاوہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو امتحان میٹرک کے امیدواروں کے والدین کی طرف سے بیتابانہ ٹیلیفون وصول ہوتے ہیں۔ لہٰذا انہیں قدرتی طور پر مسجد وزیر خاں کو پولیس پر چھوڑ دینا پڑتا ہے لیکن کاش وہ یہی تسلیم کر لیتے کہ انہوں نے مسجد کو پولیس پر چھوڑ دیا تھا، آپ کم از کم تین میل کے فاصلے سے مسجد اور پولیس کی ''نگرانی'' کر رہے تھے۔ لیکن مسجد اور پولیس دونوں کو معلوم تھا کہ صورت حالات نہایت نازک ہے اور انہیں کیا کرنا چاہیے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب کا خیال یہ تھا کہ وہ مسلسل احکام صادر کر رہے تھے لیکن درحقیقت صادر نہیں کر رہے تھے کیونکہ پولیس کو معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور ان سب کو خطرے کا پورا احساس تھا۔

ہمیں اس قسم کی خرافات مدت دراز تک سننی پڑی۔ اس سے صفحوں کے صفحے بھرے پڑے ہیں اور ہمیں ان کو نقل کرنے کی فرصت نہیں کیونکہ یہ صاحب یہ ماننے پر آمادہ نہ تھے کہ ان کا اور سب کا فرض کوتوالی سے نہیں گورنمنٹ ہاؤس سے نہیں بلکہ مسجد وزیر خاں سے تعلق رکھتا تھا اور کرفیو کے حکم کا اطلاق کم از کم مسجد وزیر خاں پر ضرور ہونا چاہیے تھا اور اگر صورت حالات قابو سے بالکل باہر ہو گئی تھی تو اس کو فوج کے حوالے کر دینا چاہیے تھا۔

نیازی کی گرفتاری

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کہتے ہیں کہ انہوں نے تجویز کی تھی

لیکن دوسرے حضرات مسجد میں گرفتاری کے خلاف تھے :غالبًا یکم مارچ کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو یہ اطلاع ملی کہ مولانا عبدالستار نیازی مسجد وزیرخاں میں مقیم ہیں ''لیکن ان کی کوئی تقریر ایسی نہیں تھی جس کی بنا پر ان کو گرفتار کرنا جائز ہوتا مجھے معلوم ہوا کہ یہ شورش پسندوں کا گڑھ ہے۔۔۔ جب میں نے دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی تو اس کے بعد پولیس کا کام تھا کہ۔۔۔ وہاں جاتی۔۔'' ہمارے خیال میں اس وقت وہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ انہوں نے فصیلی شہر کو حکم میں شامل رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر اپنی دلیل کو اسی مفروضہ پر مبنی قرار دیتے ہیں۔۲ مارچ کو یہ اطلاع ملی کہ نیازی برابر حکومت پر نکتہ چینی کر رہے ہیں اور لوگوں کے جذبات کو بھڑکا رہے ہیں۔میرا خیال ہے اس دن مارچ کی تیسری تاریخ تھی میں ان کو گرفتار کرنے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ اسی اثنا میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں میں نے نیازی کو گرفتار کرنے کی تجویز پیش کی کیونکہ وہ تین دن سے عوام کو اشتعال دلا رہے تھے۔تین دن پیشتر کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ نیازی کم از کم ۲۸ فروری سے صرف مسجد میں مقیم ہی نہ تھے بلکہ اسی وقت سے عوام کو مشتعل بھی کر رہے تھے جب انکو انہی کا تحریری بیان دکھایا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ تحریری بیان میں جو کہانی لکھی ہے وہ ''اس غیر واضح معلومات پر مبنی تھی جو مجھے سینیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس سے حاصل ہوئی تھی''۔

ہمارے نزدیک یہ ایسی صورت حالات ہے جس میں کسی گواہ کو خصوصاً ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اپنے سابقہ بیان سے منحرف ہونے کی اجازت نہ دینی چاہیے اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ موجودہ معلومات سابقہ معلومات سے زیادہ مبہم اور غیر واضح نہیں ہو گی۔واقعہ یہ ہے کہ

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے جو بیان کیا ہے کہ انہوں نے نیازی کو مسجد سے فوراً گرفتار کرنے کی تجویز پیش کی اور دوسرے افسروں نے اس کی مخالفت کی۔ یہ بیان بھی ۴ مارچ کی کانفرنس کے ریکارڈ سے غلط ثابت ہوتا ہے۔

لیکن ریکارڈ ان کی تردید کرتا ہے

(Ex.De.316) اس ریکارڈ میں ایک فیصلہ شامل ہے کہ ''نیازی کے خلاف انسدادی کاروائی فی الفور کی جائے اور ہوم سیکرٹری زیر دفعہ ۳ پبلک سیفٹی ایکٹ ان کی گرفتاری کے احکام صادر کردیں''لیکن ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اس فیصلے کو اور لفظ ''فی الفور'' کو پڑھنے کے بعد بھی اس پر اصرار کیا کہ جو تجویز کردی گئی تھی وہ صرف گرفتاری کی نہ تھی بلکہ (۱) فوری گرفتاری اور (۲) مسجد سے گرفتاری کے متعلق تھی دوسرے الفاظ میں دیگر افسروں نے یہ فیصلہ کیا کہ جب تک نیازی مسجد میں ہے اس کو گرفتار نہ کیا جائے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے تسلیم کیا کہ کوئی شخص یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ نیازی مسجد سے کب باہر نکلیں گے۔ لہٰذا اگر یہ تاویل کی جاتی تو یہ فیصلہ بالکل موثر نہیں ہوسکتا تھا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کہتے ہیں ''بالکل یہی شکایت مجھے تھی'' علاوہ اس امر کے کہ فیصلے کے الفاظ سے ان کے بیان کی تردید ہوتی ہے خود ہوم سیکرٹری نے اس سے انکار کیا ہے کہ نیازی کو گرفتاری کے متعلق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی کوئی تجویز رد کردی گئی تھی۔ فیصلہ یہ تھا کہ انسدادی کاروائی کی جائے یعنی نیازی کو مزید تقریریں کرنے سے روکا جائے اور یہ مقصد نیازی کو فی الفور گرفتار کیے بغیر حاصل نہ ہوسکتا تھا۔ ہوم سیکرٹری کا یہ بیان دکھایا گیا کہ نیازی پر حکم کی تعمیل نہ کرائی جاسکتی تھی کیونکہ سی آئی ڈی کے اطلاع کے مطابق مسجد جوش میں بپھرے ہوئے عوام سے بھری ہوئی تھی تو انہوں نے جواب دیا کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ نیازی کو مسجد کے اندر گرفتار کرنا مقصود تھا اور نہ یہ میرے اس بیان کے بالکل مطابق ہے کہ ان کو مسجد میں گرفتار کرنے کے متعلق میری جو تجویز تھی وہ نامنظور کردی گئی تھی''۔

ہم سوائے اس کے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ایسی شہادت کے ساتھ تحقیقات کو جاری رکھنا ناممکن ہے۔ اس بات کو ثابت کرنے کی یہ کوشش نہایت لاحاصل ہے کہ اگرچہ مولانا نیازی مسجد میں

گرفتار کیے جا سکتے تھے لیکن ان کو گرفتار کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہماری نہایت واضح رائے یہ ہے کہ مسجد وزیر خاں کے حالات ۲۸ فروری ہی سے کاروائی کا تقاضا کر رہے تھے اور یہ کوئی دور دست گوشہ نہ تھا بلکہ ساری سرگرمی کا عصبی مرکز تھا آیا انسپکٹر جنرل کے ان اندیشوں کی کوئی صحیح بنیاد تھی۔

فصیلی شہر کے متعلق انسپکٹر جنرل کے اندیشے مضبوط بنیاد پر قائم نہ تھے

جن کی بنا پر وہ فصیلی شہر میں کرفیو آرڈر کے نفاذ کو غیر ممکن العمل سمجھتے تھے اس کے متعلق ان کے بعض اپنے جوابات سے خاصی امید افزائی کی گنجائش نظر آتی ہے۔ اور اگر ہمارے سامنے یہ حقیقت موجود نہ ہوتی کہ فوج نے کسی تکلف وتصنع کے بغیر اس کام کو انجام دے دیا تو شاید ہم اپنے سوالات اس قدر یقین واعتماد سے نہ کر سکتے تھے۔

جنرل اعظم نے فصیلی رقبے پر کاروائی کا مطالبہ کیا

جنرل اعظم نے شکایت کی کہ جو عمومی کام فوج کو تفویض کیا گیا اس میں ''ہمیں فصیلی شہر سے باہر رکھا گیا حالانکہ طوفان کا مرکز اندرون فصیل کا رقبہ ہی تھا۔ ہم اس میں نہایت آسانی سے گشت کر سکتے تھے نیم دلی کی تدابیر اور ناقص قیادت کا نتیجہ تباہی کی صورت میں نکلا'' پھر گورنمنٹ ہاؤس میں صبح کو جو کانفرنس ہوئی اس میں، میں نے تجویز کی کہ ڈی ایس پی کے قتل کا واقعہ چونکہ فصیلی شہر کے رقبے میں ہوا ہے اور یہی سب سے زیادہ فساد زدہ رقبہ ہے اس لیے ہمیں وہاں مضبوط اقدام کرنا چاہیے'' جب ان سے پوچھا گیا کہ اگر فصیلی شہر میں بغاوت ہو جاتی تو آپ کیا کرتے انہوں نے جواب دیا ''میں اس رقبے کو اسی طرح پاک کر دیتا جس طرح میں نے ٦ مارچ کی شام چھ بجے تک کر دیا تھا۔ بلا شبہ مسجد وزیر خاں کے فولادی دروازے کو کھولنا مناسب نہ ہوتا جہاں لوگ بند ہو کر بیٹھ گئے تھے لیکن میں نے ان کی بجلی بند کر دی، ان کے لاؤڈ سپیکر کاٹ دیے، ان پر پانی بند کر دیا اور کسی شخص کو اندر نہ جانے دیا۔ بالکل یہی تجویز میں نے اس کانفرنس میں پیش کی تھی جو ۵ مارچ کی صبح کو چیف منسٹر کی کوٹھی پر ہوئی تھی۔ اس وقت انسپکٹر جنرل نے اعتراض کیا تھا کہ کئی سال پیشتر جب انگریز نے فصیلی شہر میں کاروائی کی تھی تو انہوں نے تکلیف اٹھائی تھی۔ میری تجویز یہ نہ تھی کہ شہر فوج کے حوالے کر دیا جائے

بلکہ یہ تھی کہ اگر پولیس رقبہ متاثرہ کو صاف نہیں کر سکتی تو اس کام کو انجام دینے کی مجھے اجازت دی جائے میں نے ۶ مارچ کو فصیلی شہر کو پاک کرنے میں صرف ایک بٹالین سے کام لیا تھا۔

اس شوریدہ سر مرکز (مسجد وزیر خاں) کو جو حکومت کے لیے ہوا بنا ہوا تھا صرف اس کی ضروری آسائشوں سے محروم کر کے قابو میں لے آنا محض خراب نہ تھا بلکہ یہ کارنامہ ہماری آنکھوں کے سامنے واقع ہوا ہے۔ اگر جنرل اعظم ہمیں یہ نہ بتاتے کہ انہوں نے یہ تجاویز کانفرنس میں پیش کی تھیں تو شاید ہم اس کو کوئی خاص فوجی کمال یا راز مخفی سمجھتے جسے سول حکام بالکل بے خبر ہیں۔ مسٹر چندریگر اور مسٹر انور علی کے سوا سول حکومت سے تعلق رکھنے والے تمام گواہوں کو خود شہادت دینے سے پیشتر اخباروں میں جنرل اعظم کی شہادت کو پڑھنے کا موقعہ ملا اور انہوں نے جنرل کے بیان کی تردید نہیں کی۔ خوں ریزی کے خوف کے باعث شہر کو فوج کے حوالے کرنے سے ہچکچانا تو سمجھ میں آسکتا ہے گو عذر معقول نہیں سمجھا جا سکتا لیکن تجویز کردہ پرامن طریقے اختیار نہ کرنے میں کیا عذر تھا جو بعد میں جنرل اعظم نے اختیار کیے۔

مسجد وزیر خاں سے غفلت کی گئی

جب ہم نے مری میں تحریری بیانات پڑھے تو اس کے بعد ہمیں یقین ہو گیا کہ مسجد وزیر خاں کے معاملے میں غفلت کی گئی لیکن جس واقعہ سے ہمیں انتہائی تعجب ہوا وہ یہ تھا کہ جب مسجد کے سامنے سید فردوس شاہ کے قتل کی خبر نکلی تو ہر شخص کوتوالی کو بھاگا۔ پہلا بیان پڑھتے وقت ہم نے سمجھا کہ ''کوتوالی'' محض کتابت کی غلطی ہے اصل میں ''مسجد وزیر خاں'' مراد ہو گی لیکن جب دوسرے دن بیان میں پھر مرکز کشش کی حیثیت سے کوتوالی کو بھاگنے کی وجہ یہ تھی کہ مسجد وزیر خاں کے بعد یہ بہترین مقام تھا اور آدمی کو خود اپنے ذہن کو قائل کرنے اور اکثر دھوکا دینے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔ مسٹر انور علی نے کہا کہ اس واقعہ کے بعد ضروری پیش بندیاں کیے بغیر مسجد وزیر خاں کو جانا خطرے سے خالی نہ تھا ہمارا مطلب یہ نہیں کہ یہ افسر بھی اپنے آپ کو اسی خطرے میں ڈال دیتے جس نے سید فردوس شاہ کی جان لے لی تھی لیکن اس مرحلے پر اس خاص صورت حالات کو فوج کے سپرد کر دینا تو یقیناً حق بجانب تھا۔

۴۔ فائرنگ نرم کرنے کا فیصلہ

مسٹر چندریگر اور جنرل اعظم کے سوا باقی تمام افسر اس امر پر متفق ہیں کہ ۵ مارچ کی شام کو ایک تیسری کانفرنس ہوئی تھی جس کی صدارت خود مسٹر چندریگر نے کی تھی ہم نے جنرل اعظم کا نام اس لیے لیا ہے کہ ملک حبیب اللہ ایس پی (سی آئی ڈی) نے جو مختصر یادداشت قلم بند کی تھی اس میں جنرل اعظم کے موجود ہونے کا ذکر کیا ہے جنرل اعظم کہتے ہیں کہ انہوں نے اس کانفرنس میں حصہ نہیں لیا چونکہ وہ عموماً اس قسم کی دوسری کانفرنسوں میں حاضر ہوتے تھے اس لیے ممکن ہے کہ اس یادداشت میں ان کا ذکر بھولے ہی سے کر دیا گیا ہو لیکن اس قسم کی غلطی اس شخص کے متعلق تو نہیں ہو سکتی جس نے اس کانفرنس کی صدارت کی تھی۔

مسٹر دولتانہ کا بیان:

لیکن جہاں تک ''Let up'' فائرنگ کو نرم کر دینے کے فیصلے کا تعلق ہے یہ سب لوگ متفق نہیں ہیں مسٹر دولتانہ کا قول یہ ہے کہ ایسا کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا صرف اتنی بات ہوئی تھی کہ عزت مآب گورنر صاحب نے بعض دوسرے مقامات پر اپنے تجربے کی چند مثالیں پیش کر کے یہ تجویز پیش کی تھی کہ کرفیو آرڈر کی اصطلاحی خلاف ورزیوں کو نظر انداز کر دیا جائے یہ گفتگو نماز مغرب کے بعد ہوئی تھی۔

مسٹر چندریگر

مسٹر چندریگر کا بیان ہے ممکن ہے ان کی غیر حاضری میں کابینہ کا کوئی اجلاس گورنمنٹ ہاؤس کے کسی حصے میں ہوا ہو اور اس نے یہ فیصلہ کیا۔ جہاں تک خود میرا تعلق ہے میں نے صبح اس رائے کی تائید کی تھی کہ کرفیو کی اصطلاحی خلاف ورزیوں کو نظر انداز کر دیا جائے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کرفیو کے اوقات میں سڑک پر گزرتا ہوا پایا جائے تو ایسی حالت میں دستور یہ ہے کہ اس کو گولی نہ ماری جائے بلکہ گرفتار کر لیا جائے مسٹر چندریگر نے یہ بھی کہا کہ فائرنگ کو نرم کرنے کا کوئی معاملہ میرے علم میں نہیں آیا۔

جنرل اعظم:

جنرل اعظم نے کسی شخص کو کسی ایسے فیصلے کا ذکر کرتے ہوئے نہیں سنا لیکن انہوں نے یہ کہا کہ مسٹر انور علی شام کے پانچ بجے جم خانہ ہیڈ کوارٹر میں ان سے ملنے آئے اور بتایا کہ معززین شہر کا ایک اجتماع گورنمنٹ ہاؤس میں منعقد ہو رہا ہے ''وہ پریشان معلوم ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ آج دن کے وقت شہر میں جو فائرنگ ہوئی ہے اس نے عوام میں سرکشی پیدا کر دی ہے مجھ پر ان کی باتوں کا یہ اثر ہوا کہ گویا وہ شدید فائرنگ غلط خیال کرتے ہیں انہوں نے کہا جب کبھی پولیس گولی چلاتی ہے تو اس کے بعد ایک تحقیقات لازمی طور پر ہوتی ہے''

میاں انور علی:

اس نکتہ پر میاں انور علی کے بیان کا خلاصہ یہ ہے ''۵ کی شام کو گورنمنٹ ہاؤس کی ایک کانفرنس میں گورنر نے مجھ سے صورت حالات کے متعلق سوال کیا۔ مسٹر عالم ڈی آئی جی نے رپورٹ کی کہ لاقانونی کا آخری واقعہ (پولیس کی ایک گاڑی کو آگ لگانا) ڈھائی بجے بعد دوپہر ہوا ہے اس وقت تک احکام یہ تھے کہ ہمیں خلاف قانون مجمعوں کو زیادہ سے زیادہ طاقت استعمال کر کے منتشر کر دینا چاہیے۔ اس کے بعد فیصلہ کیا گیا گورنر صاحب قطعی طور پر موجود تھے اور انہی نے فائرنگ میں نرمی اختیار کرنے مشورہ دیا تھا ممکن ہے اس وقت لیڈروں کی یہ شکایت ان کے ذہن میں ہو کہ فائرنگ بہت زیادہ کی گئی ہے'' پولیس پر اس کا کیا اثر ہوا اس کے متعلق انہوں نے کہا ''یہ صحیح نہیں ہے کہ ان فیصلوں سے پولیس کے حوصلے پست ہو گئے تھے لیکن ان میں کوفت اور تکان کے آثار ظاہر ہو رہے تھے کیونکہ وہ مدت دراز سے بغیر کسی آرام کے ڈیوٹی پر تھے اور اس لیے بھی کہ شورش میں تخفیف کے کوئی آثار نظر آتے تھے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ ان فیصلوں کی وجہ سے پولیس نے کاروائی ترک کر دی تھی''

لیکن انہیں یہ اطلاع ضرور ملی تھی کہ بعض جونیئر افسروں کی رائے میں گولی چلانا بالکل غیر ضروری ہے اور مطالبات منظور کر لینے چاہئیں۔

ملک حبیب اللہ

ملک حبیب اللہ جنہوں نے یاداشت قلم بند کی تھی یہ نہیں بتا سکے کہ فیصلہ ٹھیک کیا تھا (یاداشت میں صرف یہ لکھا ہے کہ کرفیو آرڈر کی اصطلاحی خلاف ورزیوں کونظر انداز کر دیا جائے) ان کے نزدیک فیصلے کا خلاصہ یہ تھا کہ پولیس کو صرف اس وقت گولی چلانی چاہیے جب اس پر حملہ کیا جائے اور کرفیو یا دوسرے احکام زیر دفعہ ۱۴۴ کی اصطلاحی خلاف ورزیوں کونظر انداز کر دیا جائے'' یہ فیصلہ گورنر صاحب کی تجویز پر کیا گیا تھا لیکن میرا یہ مطلب یہ نہیں یہ تنہا گورنر صاحب ہی کا فیصلہ تھا۔۔۔ میرے حافظہ میں ایک دھندلا سا نقش ہے کہ چیف منسٹر، ملک محمد خاں لغاری اور ایک اور وزیر نے یہ کہا تھا کہ انہیں چوک دال گراں میں گولی چلنے کی ایک تشویش انگیز خبر ملی ہے۔ ان کا خیال یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ فائرنگ اس امر کا نتیجہ ہے کہ ریلوے کے مزدوروں نے کرفیو آرڈر کی ایک اصطلاحی خلاف ورزی کی تھی۔ مسٹر عالم نے پوزیشن واضح کر دی جس سے حکومت بہ ظاہر مطمئن ہوگئی لیکن میرا خیال ہے کہ معزز شہریوں نے حکومت پر دباؤ ڈالا اور افسر اس فیصلے کے حامی معلوم نہ ہوتے تھے۔ گورنر صاحب نے شولا پور کے فسادات ۱۹۳۱ء کی مثال پیش کی۔ اس فیصلے کا پس منظر یہ ہے ۴ مارچ کو ڈی ایس پی کے قتل کے بعد رات کے وقت بھی اور ۵ مارچ کو بھی آتش زنی اور زدوکوب کے بے شمار جرائم کا ارتکاب کیا گیا۔ پولیس کو کئی موقعوں پر ہجوم کو منتشر کرنے کے لے گولی چلانی پڑی گورنمنٹ ہاؤس کے اجلاس میں یہ ظاہر ہوتا تھا کہ حکومت مضطرب ہو رہی ہے اور اس کا خیال ہے کہ مزید گولی چلانے سے لوگ مزید غضب ناک ہونگے۔ فائرنگ کو نرم کرنے کے فیصلے کے بعد صورت حالات قطعی طور پر بدتر ہوگئی پولیس کے حوصلے پست ہو گئے اور شوریدہ سر غنڈے زیادہ بیباک و گستاخ ہو گئے۔

حافظ عبدالمجید

حافظ عبدالمجید نے اپنی شہادت کے پہلے دن یہ بیان کیا کہ ''Let up'' کا لفظ انسپکٹر جنرل نے استعمال کیا تھا اور یہ تجویز بھی ان ہی کی تھی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ گورنر یا جنرل اعظم اس

وقت موجود تھے" خیال یہ تھا کہ آئندہ دن چونکہ جمعہ ہے اور تیسرے پہر کوئی واقعہ نہیں ہوا اس لیے ہمیں عوام کو مشتعل نہ کرنا چاہیے لیکن اس امر کا کوئی اشارہ تک نہ تھا کہ جہاں ضروری ہو وہاں مضبوط اقدام نہ کیا جائے" دوسرے دن حافظ صاحب نے تصریح کی کہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اصل تجویز مسٹر انور علی نے پیش کی تھی۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ افسر اس فیصلے کے خلاف تھے اور ایک اور واقعہ کے تعلق میں اب انہیں یاد آ گیا کہ گورنر صاحب ضرور اس اجلاس میں موجود ہونگے۔

مسٹر غیاث الدین احمد

مسٹر غیاث الدین احمد نے کہا کہ گورنر اور جی او سی صاحب دونوں اس اجلاس میں موجود تھے اور گورنر صاحب نے تجویز کی تھی کہ کرفیو آرڈر کی محض اصطلاحی خلاف ورزی پر گولی نہ چلائی جائے۔ میرا خیال ہے کہ" Let up" کا لفظ گورنر صاحب ہی نے استعمال کیا تھا چونکہ اطلاع یہ تھی کہ سہ پہر کے آغاز ہی سے کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا اور چونکہ شہریوں کے اجتماع میں انسپکٹر جنرل نے صبح کی صورت حالات کا جو تجزیہ کیا تھا اس پر بہت پرشور احتجاج کیا گیا تھا لہٰذا گورنر اور کابینہ دونوں کا یال یہ تھا کہ فائرنگ میں نرمی کی جائے۔

مرزا نعیم الدین:

مرزا نعیم الدین سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس اس کانفرنس میں موجود نہ تھے لیکن جب ۶ مارچ کی صبح کو وہ کوتوالی گئے تو انہیں معلوم ہوا کہ گورنمنٹ ہاؤس سے" کوتوالی کنٹرول" میں احکام موصول ہوئے ہیں کہ فائرنگ محدود کر دی جائے اور کرفیو آرڈر کی اصطلاحی خلاف ورزی نظر انداز کر دی جائیں جن پولیس افسروں کے ساتھ انہوں نے اس معاملے کے متعلق بات چیت کی ان کی رائے یہ تھی کہ اگر اس حکم کے بعد انہوں نے کہیں گولی چلائی تو ان کیخلاف تحقیقات ہو جائے گی۔ ایک اور حکم بھی کوتوالی میں اسی سرچشمہ سے پہنچا جس کو مرزا عباس ڈی ایس پی نے وصول کیا کہ پولیس کو صرف اپنے بچاؤ کے لیے گولی چلانی چاہیے۔ سول لائنز کے ایک سب انسپکٹر نے یہ تازہ ترین حکم مرزا نعیم الدین کو پہنچایا۔

استعفے کی پیش کش

مرزا نعیم الدین کہتے ہیں کہ اس طرح گویا پریشان کن اور متضاد ہدایات موصول ہو رہی تھیں جو خود ان کی سمجھ میں نہ آتی تھیں چہ جائیکہ ان کے ماتحت انہیں سمجھ سکتے۔ مرزا صاحب نے ۶ مارچ کی صبح کو انسپکٹر جنرل کے سامنے اپنی بیزاری کا اظہار کیا اور کہا کہ حکومت کی اس کمزور پالیسی سے پولیس کے حوصلے پست ہو رہے ہیں اور اگر حکومت نے اپنی اس پالیسی کو تبدیل نہ کیا تو وہ استعفے دے دیں گے۔ اس نکتے پر مسٹر انور علی واضح طور پر ان سے اختلاف کرتے ہیں۔ مسٹر انور علی کے قول کے مطابق مرزا نعیم الدین اس وجہ سے استعفا پیش کر رہے تھے کہ جمہور عوام کسی پیغام تسلی کی توقع کر رہے تھے اور اس امر پر ناراض تھے کہ حکومت نے مطالبات کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ مسٹر انور علی نے ان سے اتفاق کیا چنانچہ وہ دونوں چیف منسٹر کے پاس گئے اور ان سے یہی بات کہہ دی چیف منسٹر بھی یہی کہتے ہیں کہ مرزا نعیم الدین انسپکٹر جنرل کے ساتھ آئے اور انہوں نے مشورہ دیا کہ صورت حالات کے تدارک کا صرف ایک طریقہ ہے کہ کسی قسم کا سیاسی مداوا کیا جائے معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ بعض فوجی افسروں کی وساطت سے گورنر صاحب کے علم میں بھی آیا۔ ان کو بتایا گیا کہ انسپکٹر جنرل اور سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس نے چیف منسٹر کو مشورہ دیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ گولی چلانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا اور عوام کی تسکین و تسلی کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ مسٹر چندریگر نے چیف منسٹر سے پوچھا پھر ان دونوں افسروں سے بھی سوال کیا۔ ''انہوں نے ابتدا میں تو تسلیم کیا کہ انہوں نے ایس مشورہ دیا تھا لیکن جب میں نے ان کو ڈانٹ کے پوچھا تو وہ کہنے لگے کہ یہ مشورہ ان کا نہ تھا بلکہ بعض لوگوں کا نقطہ نگاہ تھا جو انہوں نے چیف منسٹر تک پہنچا دیا تھا''۔

دونوں افسروں نے بشدت انکار کیا ہے کہ انہیں ڈانٹا گیا تھا۔

استعفے کے معاملے میں صرف نعیم الدین کی تائید نہیں ہوئی

یہ کوئی ایسا گورکھ دھندا نہیں جس کا حل ناممکن ہو کم از کم اتنی بات تو واضح ہے کہ استعفے کے معاملے میں مرزا نعیم الدین کی خاصی تردید کی گئی ہے اور چونکہ یہ ہمارے نزدیک کوئی تحقیق و تنقیح

طلب معاملہ نہیں اس لیے ہمیں صرف یہ کہنا چاہیے کہ جو کچھ انہوں نے اس کے متعلق بیان کیا وہ ثابت نہیں ہوسکا۔ لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ باہر یہ خیال پھیل گیا تھا کہ فائرنگ نرم کی جائے گی تو پولیس کے نقطہ نگاہ سے مرزا نعیم الدین کا انسپکٹر جنرل سے شکایت کرنا بالکل طبعی تھا۔ ممکن ہے مسٹر انور علی اس شکایت کو تسلیم کرنے پر اس لیے آمادہ نہ ہوں کہ وہ خود بھی اس فیصلے میں شامل تھے۔ ملک حبیب اللہ نے اس فیصلے کے پس منظر کی تصریح میں جو بیان دیا ہے اس سے ہم کو اس وسیع و پیچیدہ شہادت سے باہر نکلنے کا سیدھا راستہ مل گیا ہے۔

لیکن فائرنگ کے متعلق کوئی حکم ضرور صادر ہوا

اس میں کوئی شک نہیں کہ تیسرے پہر ایک اجتماع ہوا جس میں معزز شہریوں نے اس شدید فائرنگ کے خلاف احتجاج کیا جو سید فردوس شاہ کے قتل پر برپا ہونے والی لاقانونیت کے باعث کی گئی تھی۔ وزیروں میں سے بھی بعض اس سے متاثر ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ایک عارضی جوش وخروش کے مقابلے میں آئندہ ایکشن زیادہ اہم تھا۔ چوک دال گراں میں گولی چلی اور جہاں کہیں گولی چلتی ہے الزام پولیس ہی پر عائد کیا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے موٹر کار کا کوئی بھی حادثہ ہو، اس میں قصور ڈرائیور ہی کا ہوتا ہے! یہ صحیح ہے کہ مسٹر عالم نے اس واقعہ کی تصریح کی تھی لیکن آخر وہ بھی پولیس افسر ہی ہیں اور تصریح و توضیح پولیس کا کام نہیں ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ''فائرنگ ضرور کرفیو آرڈر کی محض اصطلاحی خلاف ورزی کی وجہ سے کی گئی اور آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ہم نہایت آسانی سے اپنے آپ کو اس فیصلے کے لے تیار کر سکتے ہیں لیکن جس حالت میں موضوع زیر بحث ''شدید فائرنگ'' ہے تو جو فیصلہ اس کی ترمیم کرے گا اس کا مطلب قدرتی طور پر یہی سمجھا جائے گا کہ یہ فائرنگ کو نرم کا فیصلہ ہے۔ اور اسی بنا پر بہت سے افسروں نے اس کا مطلب یہی سمجھا۔

اس کا مطلب یہی سمجھا گیا کہ یہ فائرنگ کو نرم کرنے کا حکم ہے

اور ہم فرض کیے لیتے ہیں کہ وہ تمام متفق الرائے تھے اور اگر ان کے دلوں میں کچھ شبہات بھی تھے تو انہوں نے ان کا اظہار نہ کیا تھا۔ ملک حبیب اللہ نے بیان کیا ہے کہ افسر متفق معلوم نہ ہوتے تھے لیکن یہ بیان محض تاثر ہے اس سے زیادہ نہیں۔ اس امر کی شہادت موجود نہیں کہ یہ فیصلہ کوتوالی کو

کس نے پہنچایا لیکن ارسال حکم میں جو الفاظ استعمال کیے گئے ان کا مطلب یہی سمجھا گیا کہ فائرنگ نرم کر دی جائے۔ خود مسٹر اعجاز حسین شاہ کا بیان بھی ہے کہ سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس ۶ مارچ کی صبح کو شکایت کر رہے تھے کہ فائرنگ کو محدود کر دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے بعد کوتوالی میں ایک انسپکٹر نے بھی مجھ سے پوچھا کہ آیا یہ صحیح ہے۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بھی اس کے متعلق سنا

میں نے انسپکٹر سے کہا کہ مجھے اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں اور پولیس کو اپنے فرائض حسب معمول بجالانے چاہئیں۔

حوصلے اس سے پست ہو گئے

لہٰذا یہ سمجھنا صحیح ہو گا کہ فائرنگ گورنمنٹ ہاؤس کے ایک غیر واضح سے فیصلے کی بنا پر نرم کر دی گئی ہم سے کہا جائے یا نہ کہا جائے کہ اس قسم کے فیصلے سے حوصلے پست ہو جاتے ہیں ہمیں کوئی شبہ نہیں کہ اس کا یہی اثر ہو گا۔ ظاہر ہے کہ وہ لوگ فائرنگ اس لیے تو نہیں کر رہے تھے کہ گولی بارود کو مدت سے آزمانے کا موقع نہ ملا تھا وہ تو اس لیے فائرنگ کر رہے تھے کہ ''آتش زنی اور زدوکوب کے بے شمار واقعات رونما ہو چکے تھے'' ہماری فہرست مظہر ہے کہ ۵ مارچ کو لاقانونی کے کل ۴۷ واقعات کی اطلاعیں موصول ہوئیں جن میں آٹھ آتش زنی کے واقعات۔ ایک قتل اور دو لوٹ مار کے حادثے شامل تھے۔ اس کے علاوہ تانگے والوں اور دکانداروں کے منہ کالے کیے گئے۔ پولیس پر اینٹیں برسائی گئیں کم از کم ایک حملہ ریلوے ٹرین پر بھی کیا گیا اور ان سب کے مقابلے میں پولیس نے ۹ دفعہ گولی چلائی۔ لہٰذا اب اس قسم کا حکم جاری کیا جائے تو اس سے پولیس کو یقیناً اندیشے لاحق ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح سے فوج زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے اس کو یہ فیصلہ نہیں کرنا پڑتا کہ وہ خود حفاظتی کے لیے کاروائی کر رہی ہے یا وہ قطعی ضرورت کے مقابلے میں زیادہ قوت استعمال کر رہی ہے۔ اسی وجہ سے جنرل اعظم کے قول کے مطابق میاں انور علی شکایت کر رہے تھے کہ جب بھی پولیس گولی چلاتی ہے اس کے بعد ایک تحقیقات ضرور کی جاتی ہے۔

۵۔فوج کے ساتھ رابطہ

سنی سنائی باتوں پر مبنی تاثرات:

جس وقت ہم نے سول کے افسروں کے تحریری بیانات پڑھے تو ہم نے یہ زبردست تاثر قبول کیا کہ اگر فوج امداد پر آمادہ ہو جاتی تو ان افسوسناک واقعات کا سدباب ہو سکتا تھا۔ فوج امداد پر آمادہ کیوں نہ تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ فوجی افسر کامل اختیار چاہتے تھے یہ صورت ہم کو طبعاً نہایت افسوسناک معلوم ہوئی کہ ایک ہی مقصد کے لیے کام کرنے والی دو طاقتوں کے درمیان اس قسم کے رسمی تکلفات حائل ہوں لیکن ہمارے سامنے جو شہادت پیش ہوئی اس سے ہمیں خوشگوار تعجب ہوا کہ اگرچہ ہر گواہ کا احساس یہ تھا کہ فوج نے پوری توجہ نہیں کی لیکن انہوں نے اپنے اس احساس کو دوسرے لوگوں سے سنی سنائی باتوں پر مبنی بتایا۔ بالآخر ان میں سے بعض نے ہمارے سامنے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا ذکر کیا گیا اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ہمیں بتایا کہ وہ اس کام سے بالکل مطمئن ہیں جو فوج نے انجام دیا ہے۔

مسٹر چندریگر کا خیال:

ہم مسٹر چندریگر سے ابتدا کرتے ہیں کیونکہ اگر افسر ایک دوسرے کے ساتھ درست طور پر تعاون نہیں کر رہے تھے تو گورنر کے پاس کوئی نہ کوئی شکایت ضرور پہنچی ہوگی مسٹر چندریگر نے بیان کیا کہ ۶ مارچ کو جنرل اعظم نے یہ خیال ظاہر کیا کہ صورت حالات کو فوج کے سپرد کر دینا چاہیے اس میں گویا ضمنی طور پر یہ شکایت شامل تھی کہ پولیس صورت حالات کا مقابلہ مضبوطی سے نہیں کر رہی ہے پولیس کی طرف سے بھی ایک شکایت موجود تھی کہ ان کو فوجی نفری اتنی تعداد میں مہیا نہیں کی گئی جس کی انہیں ضرورت ہے۔ جنرل اعظم نے اس کا یہ جواب دیا کہ جب کبھی مجھ سے درخواست کی گئی میرے پاس جتنی نفری موجود تھی میں نے پولیس کے حوالے کر دی۔ یہ واضح ہے کہ شکایت کے اس حصے میں

امداد کی نوعیت کا کوئی ذکر نہیں۔

ہار پہنانے کا واقعہ:

مسٹر چندریگر نے مزید یہ کہا کہ انسپکٹر جنرل نے ان سے ذکر کیا تھا کہ جمہور کے بعض افراد نے چند فوجی افسروں کو پھولوں کے ہار پہنائے اور جنرل اعظم نے تسلیم کیا کہ کم از کم ایسا واقعہ ضرور ہوا تھا جس پر انہوں نے اپنے افسروں کو تنبیہ کر دی تھی کہ ہار بالکل قبول نہ کریں۔

پھوٹ ڈالنے کی کوشش:

مسٹر چندریگر کا بیان ہے جنرل اعظم نے یہ خیال ظاہر کیا کہ تحریک کے بعض لیڈر جان بوجھ کر فوج اور پولیس میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انسپکٹر جنرل نے مسٹر چندریگر کو بتایا تھا کہ میں نے جب کبھی استدعا کی ہے جنرل اعظم نے میری پوری پوری امداد کی ہے لیکن بعض فوجی افسروں نے ہجوموں پر گولی نہیں چلائی حالانکہ انسپکٹر جنرل کے نزدیک انہیں گولی چلانی چاہیے تھی جنرل اعظم نے اس معاملے کی تحقیقات کی اور ان کی تصریح سے مسٹر چندریگر مطمئن ہو گئے کہ جن موقعوں پر کوتاہی کی شکایت کی گئی ہے ان پر گولی چلانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لہٰذا مسٹر چندریگر کے نزدیک اندیشے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ ہار پہنانے کا صرف ایک واقعہ ہوا تھا اور جنرل اعظم نے ضروری تنبیہ کر دی تھی۔

مسٹر دولتانہ کی رائے:

مسٹر دولتانہ نے ۶ مارچ کی صورت حالات کے متعلق یہ کہا کہ اس پر قابو پانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ اس کو فوج کے حوالے کر دیا جائے کیونکہ اس ''پوری امداد'' کے باوجود اس وقت تک سول حاکم کو فوج کی طرف سے مل رہی تھی وہ اس پر قابو نہیں پا سکتے تھے مجھ سے کوئی خاص شکایت نہیں کی گئی ''گو ۵ کی صبح کو مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ دونوں طاقتوں کے درمیان پورا رابطہ نہیں ہے مثال کے طور پر ۳ یا ۴ کو مجھے معلوم ہوا کہ فوج نے اپنے گشتی دستے شہر سے ہٹا دیے ہیں یہ بھی کہا گیا کہ شہر میں پولیس کے خلاف اور فوج کے حق میں نعرے لگائے گئے ہیں'' جیسا مسٹر چندریگر نے کہا ہے کہ اس حرکت کا

مقصد پھوٹ ڈالنا تھا لیکن جہاں تک فوج کو ہٹا لینے کا تعلق ہے واقعات یہ ہیں کہ اس کا صرف ایک حصہ اس دن ہٹایا گیا تھا جس دن سول آفیسر یہ کہہ رہے تھے کہ ''آدھی لڑائی جیتی جا چکی ہے'' لیکن ان کو شہر سے ہٹانے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ فوج کا ڈیرہ باغ جناح میں تھا اور فوجی سپاہی شہر میں صرف گشت کے لیے جایا کرتے تھے۔ لہٰذا مسٹر دولتانہ کے اس احساس سے اس ''پوری امداد'' میں کوئی کمی معلوم نہیں ہوتی جو ان کی رائے میں فوج نے سول حکام کو مہیا کی تھی۔

فیصلہ نمبر ۲ مورخہ ۵ مارچ:

اس مرحلے پر اس فیصلے کا ذکر کرنا موزوں ہوگا جو ۵ مارچ کا فیصلہ کہلاتا ہے یہ ان دس فیصلوں میں سے ایک ہے جو گورنمنٹ ہاؤس کے اجلاس قبل دوپہر کیے گئے تھے اور یہ فیصلہ ۳ اور فیصلہ ۴ سے مل کر ایک ایسی چیز بن گیا ہے جس پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے۔

فیصلہ نمبر ۲: چونکہ لاہور میں صورت حالت بدتر ہو گئی ہے اور شہر میں ایک عام ہنگامہ برپا ہے اس لیے سب سے پہلے پولیس کو چاہیے کہ نہایت مضبوط اقدام کرے اور فسادات کو فرو کرنے کے لیے جس قدر قوت ضروری ہو استعمال کرے۔ پولیس کے گشتی دستوں کی امداد فوج کے دستے کریں گے جو اپنے کمانڈروں کے ماتحت ہوں گے

اقدام:۔ انسپکٹر جنرل پولیس/جنرل آفیسر کمانڈنگ

فیصلہ نمبر ۳: اگر پولیس کسی خاص خطے کے حالات کا مقابلہ نہ کر سکے تو اس وقت جو سینئر پولیس افسر موجود ہو اسے چاہیے کہ اس خطے کی صورت حالت کا چارج اس فوجی کمانڈر کے سپرد کر دے جو اس کے ساتھ متعین ہو۔

اقدام: انسپکٹر جنرل پولیس/جنرل آفیسر کمانڈنگ

فیصلہ نمبر ۴: اگر مذکورہ بالا تدابیر سے قانون و انتظام کا بحال نہ ہو سکا اور پولیس فوج کی جزوی امداد سے عام صورت حالات پر قابو نہ پا سکی تو فوج سے کہا جائے گا کہ وہ شہر کا چارج لے لے۔

اقدام: انسپکٹر جنرل پولیس/جنرل آفیسر کمانڈنگ

ہم سے پہلے ان فیصلوں کی تعبیر ایسے طریق سے کرنے کی کوشش کریں گے گویا یہ مجموعہ ضابطہ فوجداری کا ایک حصہ ہیں فیصلہ نمبر۲ ''نہایت مضبوط اقدام'' پر زور دیا گیا ہے لیکن یہ بھی لکھا ہے کہ ''سب سے پہلے'' پولیس یہ اقدام کرے گی۔ فوجی کمانڈر اپنے دستے کے ساتھ پولیس کی معیت میں رہے گا کیونکہ فیصلہ نمبر۲ مظہر ہے کہ ناکامی کی صورت میں پولیس افسر اس فوجی دستہ پولیس کے گشتی دستے کی امداد کیونکر کرے گا کیونکہ آپ کسی دوسرے شخص کی امداد نہیں کر سکتے جب تک اپنے کام کو اس کے کام کے مطابق نہ کر لیں۔ ایسی حالت میں آپ آزادانہ اقدام نہ کر سکیں گے بلکہ دوسرے شخص کی تجاویز کی تکمیل کے لیے کام کریں گے۔ اگر وہ آپ سے ایک کام کرنے کو کہے اور آپ کوئی دوسرا کام کرنے لگیں تو آپ کا یہ فعل ''امداد نہیں سمجھا جائے گا۔ لہٰذا آپ کو اپنے تمام اعمال اس کے ماتحت رکھنے ہوں گے آپ اس وقت تک کوئی اقدام نہ کریں گے جب تک آپ سے کہا نہ جائے ممکن ہے کہ آپ کو اقدام کے لیے سرے سے کہا ہی نہ جائے۔

آیا یہ بات کہ فوجی دستے ''اپنے کمانڈروں کے ماتحت'' ہوں گے کوئی خاص معنی رکھتی ہے؟ وہ لوگ ہمیشہ ہی اپنے کمانڈروں کے ماتحت ہوتے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ اس وجہ کی بنا پر وہ آزادانہ اقدام کر سکیں گے۔ اگر یہ مطلب سمجھا جائے تو پھر لفظ ''امداد'' بے معنی ہو جائے گا بلکہ فیصلہ ۳ کے ابتدائی الفاظ بھی بے معنی ہو جائیں گے۔ اس فقرے سے کہ ''اگر پولیس کسی خطے کے حالات کا مقابلہ نہ کر سکے'' ظاہر ہوتا ہے صورت حالات کا مقابلہ پولیس ہی کر رہی ہے لیکن اگر دونوں دستے آزادانہ اقدام بھی کر رہے ہوں تو پھر وہ دونوں ہی صورت حالات کا مقابلہ کر رہے ہوں گے۔

مسٹر چندریگر:

اس نکتے پر مسٹر چندریگر کی شہادت کا مطلب یہ ہے کہ فوجی دستے بھی ''بشرط ضرورت'' قوت کا استعمال کریں گے لیکن وہ اپنے کمانڈروں کو اختیار تمیزی کے استعمال کا حق ہے تو وہ خود ہی اس کا فیصلہ کریں گے۔ لیکن فرض کیجیے پولیس افسر نے قوت کا استعمال شروع کر دیا اور کمانڈر کے نزدیک وہ غیر ضروری ہوا یا کمانڈر سے پولیس کے دستے کو ''امداد'' کیونکر ملے گی۔ اس کے علاوہ ''جی او سی کی جاری کردہ ہدایات'' بھی ہوں گی جن کی گنجائش فیصلے میں کہیں معلوم نہیں ہوتی۔ اگر جی او سی نے یہ

عام ہدایت دے دی کہ قوت اسی حالت میں استعمال کی جائے جب پولیس اسے استعمال کر رہی ہو تو پھر اس کے استعمال کا ''اختیار تمیزی سے کام لیا جائے لہٰذا ہدایت بے سود ہو جاتی ہے۔

لیکن یہ فرض کر لینے کے بعد کہ فیصلہ نمبر ۲ کی تعبیر یہی ہے مندرجہ ذیل سوال و جواب سے ظاہر ہو جائے گا کہ فوج کے خلاف شکایت تو کجا خود پولیس کے خلاف شکایت کی جاتی تھی کہ وہ کام نہیں کرتی۔

سوال: از مسٹر مظہر علی اظہر (وکیل احرار) ''کیا انسپکٹر جنرل یا جی او سی میں کسی افسر نے آپ سے شکایت کی تھی کہ دوسرا فیصلہ نمبر ۲ کو نافذ نہیں کر رہا ہے؟''

جواب۔ ''جی او سی کی شکایت انسپکٹر جنرل پولیس کے خلاف یہ تھی کہ پولیس کے حوصلے پست ہو گئے ہیں ان کے افسروں کو خوف ہے کہ پولیس کے ان ملازموں کے خلاف جو شہر میں رہتے ہیں انتقامی کارروائیاں کی جائیں گی اور انسپکٹر جنرل پولیس متیقن نہیں ہیں کہ وہ اپنے جوانوں کی وفاداری پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔ جب میں نے اس کے متعلق انسپکٹر جنرل پولیس سے سوال کیا تو انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ اس مسئلے پر پولیس کے جوانوں کی وفاداری پر پورا اعتماد نہیں کر سکتے اور ان کی رائے میں زود یا بہ دیر صورت حالات پر قابو پانے کا کام فوج کے حوالے کرنا ہی پڑے گا۔ مسٹر انور علی تسلیم کر چکے ہیں کہ پولیس کے جونیر افسروں کے نزدیک مطالبات منظور کر لینے چاہئیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ جی او سی نے پولیس کو پست حوصلہ ہونے کا الزام دیا تو یہ بھی صحیح ہے کہ فوج تعاون نہیں کر رہی تھی۔ انسپکٹر جنرل ایک شدید الزام کو قبول کرنے کے بجائے خود اپنی جگہ فوج کے عدم تعاون کا شکوہ کر سکتے تھے۔

اگر فوجی کمانڈر کو حق دے دیا گیا تھا کہ جس قسم کا اقدام چاہے کرے تو پھر فیصلہ نمبر ۳ کے ماتحت ''فوج کے حوالے'' کر دینے کا سوال ہی کیونکر پیدا ہوتا تھا۔ وہ صورت حالات کا اتنا ہی انچارج تھا جتنا پولیس افسر تھا اور آپ کسی شخص کو ایک چیز حوالے نہیں کر سکتے جو پہلے ہی اس کے ہاتھ میں ہو۔

حافظ عبدالمجید مسودہ نویس

حافظ عبدالمجید پر پہلے پہل تو معنی بالکل واضح تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے فوج پر بے حرکتی کا الزام عائد کیا چونکہ مسودہ انہوں نے خود مرتب کیا تھا اس لیے دوسروں کے مقابلے میں وہ

فائدے میں بھی تھے۔

تعاون کی کوئی واضح سکیم نہ تھی

انہوں نے بتایا کہ ان کی موجودگی میں فوج اور سول کی قوت کے درمیان تعاون کی کسی واضح سکیم پر کبھی گفتگو نہیں ہوئی نہ کوئی فیصلہ کیا گیا اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ موجودہ موقع پر بھی کسی چیز کے متعلق گفتگو یا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ ہمارے خیال میں جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ قوت کے استعمال پر زور دیا گیا اور عمومی حیثیت سے یہ بھی کہہ دیا گیا کہ فوج بلاشبہ پولیس کی امداد کے لیے موجود رہی ہوگی۔ اسی وجہ کی بنا پر جب چیف سیکرٹری سے سوال کیا گیا کہ آیا ان سے آزادانہ اقدام کی توقع تھی تو انہوں نے جواب دیا کہ ''ان پر بہ روئے قانون بعض ذمہ داریاں تھیں اور بعض فرائض بھی عائد ہوتے تھے اور انہیں قانون کے مطابق اقدام کرنے سے روکنے والی کوئی چیز نہ تھی'' اس کے بعد ان سے فیصلوں کا ذکر کیا گیا اور پوچھا گیا کہ ''آیا ان فیصلوں کے بعد فوج کے لیے آزادانہ اقدام کا اختیار باقی رہ گیا تھا۔ انہوں نے جواب دیا ان ''فیصلوں کے باوجود'' میرا خیال یہ ہے کہ ان فیصلوں کی وجہ سے فوج کی یہ ذمہ داری حذف نہیں ہو جاتی تھی کہ جس صورت حالات میں فوجی اقدام ضروری ہو اور خصوصاً جب پولیس موجود نہ ہو) فوج اقدام کریگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کم از کم ان فیصلوں میں (جہاں تک مسودہ نویس کے علم کا تعلق ہے) آزادانہ اقدام کا تصور شامل نہ تھا۔ تا آنکہ فیصلہ نمبر ۳ کے عمل درآمد کا وقت آ جائے۔ تاہم انہوں نے فوج کی اس پوزیشن کو قبول نہ کیا کہ ان فیصلوں کی رو سے فوج اسی صورت میں کوئی اقدام کر سکتی تھی کہ سول کی قوت ان کے اقدام کی خواستگار ہو۔ انہوں نے ہمیں یاد دلایا کہ جو کچھ ۵ مارچ سے پہلے ہو رہا تھا اس کی بھی تحقیق کرنی ضروری تھی اور کہا کہ ان فیصلوں سے گویا یہ کوشش کی گئی تھی کہ ''فوج اور پولیس کے درمیان کوئی قابل عمل ترتیب کار قرار پائے'' ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اگر اس تاریخ تک ترتیب کار کا انتظام تسلی بخش نہ تھا تو ان دونوں کے درمیان کوئی قابل عمل ترتیب کار قرار پایا جائے'' ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اگر اس تاریخ تک ترتیب کار کا انتظام تسلی بخش نہ تھا تو ان دونوں کے درمیان تقسیم عمل کا بندوبست کیا جا سکتا تھا اور فوجی کمانڈروں سے کہا جا

سکتا تھا کہ وہ آزادانہ اقدام کریں۔ایسی حالت میں نہ پولیس اور نہ کوئی مجسٹریٹ ان کے ساتھ ہوتا کیونکہ اگر کوئی مجسٹریٹ ان کے ساتھ ہوتا تو کمانڈر برائے قانون اس کے زیر ہدایت ہوتے تا آنکہ مجسٹریٹ ان کو اجازت نہ دے دیتا کہ حالات کو اپنے قبضہ میں لے لیں۔حافظ عبدالمجید بھی اس تعبیر کو قبول کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ فیصلوں میں کمانڈروں پر یہ رستہ کھلا ہوا تھا کہ اکیلے کام پر جائیں یا مجسٹریٹ یا پولیس کی معیت میں جائیں۔

اگر اہل فوج کے نزدیک بھی فیصلوں کی یہ تعبیر صحیح ہوتی تو ان کو کوئی شکایت باقی نہ رہتی اور اس کے بعد وہ موثر کاروائی کرتے کیونکہ چیف سیکرٹری کے قول کے مطابق ''وہ صورت حالات پر قابو پانے کا ایسا اختیار چاہتے تھے جس میں سول حکام کی طرف سے کسی مداخلت کا امکان نہ ہو۔حقیقت یہ ہے کہ یہ کانفرنس اور اس کے فیصلوں کا رجحان اسی تاثر پر مبنی تھا جو سول حکام کے دماغوں میں جا گزیں تھا۔۔۔۔گورنر چیف منسٹر، ہوم سیکرٹری، انسپکٹر جنرل پولیس اور خود میں نے جو کچھ یکم، ۲، ۳ اور ۴ مارچ کو دیکھا اور جو کچھ فوجی افسروں سے گفتگو کے دوران میں نے سنا۔اس کی بنا پر ہم سب کا تاثر یہی تھا۔صاف نظر آتا تھا کہ وہ اس پوزیشن کو قبول کرنے سے ہچکچاتے تھے کہ (ان کے قول کے مطابق) ایک اسسٹنٹ سب انسپکٹر پولیس ان کے سپاہیوں کا کمانڈر بن جائے''۔ہمارا خیال ہے کہ یکم، ۲ مارچ کے متعلق بیان محض خطابت کا ایک نمونہ تھا کیونکہ فوج ۲ مارچ کی شام تک طلب نہ کی گئی تھی۔جب مولانا اختر علی خاں مجبوراً منظر عام پر آئے تھے اور فوجی سپاہیوں نے دوسرے دن صبح تک گشت شروع نہ کی تھی جیسا کہ ہم ابھی کہہ چکے ہیں اس کے بعد فوج آزادانہ اقدام کرتی۔اس کو کسی بیرونی اقتدار کی شکایت نہ ہوتی اور وہ اسی طرح عمل کرتی جس طرح اس نے مارشل لا کے دوران میں کیا لیکن اس کے بعد بھی اس نے اقدام نہ کیا۔

چیف سیکرٹری سے ہم نے سوال کیا کہ آیا ''عدم امداد'' کی کوئی مثال ان کے علم میں آئی تھی ان کا جواب یہ تھا کہ ''میں نے محض یہ کہا ہے کہ فوجی حکام نے ادھر اُدھر گشت لگانے کے سوا اور کوئی کاروائی نہیں کی اگر صورت حالات کسی خاص اقدام کی متقاضی تھی اور کسی فوجی افسر کا یہ خیال تھا کہ سول حکام صورت حالات کا موثر تدارک نہیں کر رہے ہیں تو ان افسروں کو چاہیے تھا کہ اپنی تجاویز ہم

کو بتاتے ۔معلوم ہوتا تھا کہ انہیں اس امر سے کوئی دل چسپی ہی نہ تھی کہ کیا کرنا چاہیے' اس بیان سے معاملے کا ایک نیا پہلو ہمارے سامنے آیا ہے۔فوج کا کام صرف یہی نہ تھا کہ سول اقتدار سے آزادرہ کر کام کرے بلکہ یہ بھی تھا کہ جہاں صورت حالات کے تدارک کی تدبیروں کو کمزور پائے وہاں سول حکام کو مشورہ بھی دے۔لیکن ہم مسٹر چندریگر سے سن چکے ہیں کہ جنرل اعظم نے ان سے شکایت کی تھی کہ پولیس کے حوصلے پست ہورہے ہیں۔اس سے سول حکام پر واضح ہوجانا چاہیے تھا کہ پولیس کسی صورت حالات کا مقابلہ بھی مضبوطی سے نہیں کررہی ہے۔

اس پوری مدت میں ہم نے فیصلوں کی طرف توجہ نہیں کی جن کے الفاظ سے آزادانہ اقدام کا کوئی خیال ظاہر نہیں ہوتا۔ چیف سیکرٹری کا استدلال ''ان فیصلوں کے باوجود'' عام قانون کے وجود پر مبنی ہے ہم یہ فرض کیے لیتے ہیں کہ اجلاس میں ہر شخص کو یہ معلوم تھا کہ اگر کسی فوجی کمانڈروں اور اس کے سپاہیوں کا سامنا کسی خلاف قانون مجمع سے ہوگا تو عام قانون کے ماتحت وہ اپنے اختیار تیزی کو استعمال کر کے اس کو منتشر کرسکے گا لیکن اگر فوج اور پولیس دونوں کے اعلیٰ حاکم اس علم کے باوجود اجلاس میں اس بات پر متفق ہوجاتے ہیں کہ فوج کا امدادی دستہ مخصوص انداز سے استعمال کیا جائے گا یعنی وہ پولیس کو'امداد' دے گا تو کیا فوج آزادانہ اقدام کر کے اس الزام کا نشانہ بن جاتی کہ اس نے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے؟ پھر اگر یہ فرض کیا جائے کہ عام قانون کا استعمال بھی پیش نظر تھا تو فوج کا دعویٰ ہے کہ جہاں کہیں اسے مجمع نظر آیا اس نے ان کو منتشر کردیا اور اس کے خلاف کوئی مثال موجود نہیں۔خود چیف سیکرٹری کے ذہن میں بھی ایسی کوئی مثال موجود نہ تھی اور بالآخر انہوں نے جو شکایت کی وہ صرف مشورے میں کوتاہی کی شکایت تھی۔

مسٹر انور علی کی تعبیر حافظ عبدالمجید کی تردید کرتی ہے

انسپکٹر جنرل کو یہ معلوم ہونا چاہیے تھا کہ فوج اور پولیس کے رابطے کی تفصیل کس طریقے سے ملے گی لیکن ان کا بیان فیصلوں کی اس تعبیر کے بالکل خلاف ہے جو چیف سیکرٹری نے کی ہے۔ان کے قول کے مطابق حکومت خونریزی کے خوف کی وجہ سے فوج کو طلب کرنے سے بچنا چاہتی تھی۔ ایسی فکرمندی کی حالت میں یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ فوج کو آزادانہ اقدام کی اجازت دے دی

جائے گی۔ انہوں نے اپنے تحریری بیان میں یہ لکھا کہ اگرچہ میں محسوس کرتا تھا کہ مجمعوں کو منتشر کرنے کے لیے فوج سے کام لینا چاہیے لیکن کابینہ کی رائے یہ تھی کہ فوج کو صرف مخصوص صورتوں میں استعمال کرنا چاہیے۔ اپنی شہادت میں ایک دوسرے مقام پر انہوں نے کہا ''میرا منصوبہ یہ تھا کہ فوج کو چار مقامات پر متعین کیا جائے یعنی باغ جناح، کوتوالی، گول باغ، منٹو پارک اور فوج کے سپاہی بکتر بند گاڑیوں برین کیریئروں اور ٹینکوں کو ساتھ لے کر شہر کی بڑی بڑی سڑکوں پر گشت لگائیں۔ اگر کسی وقت ان سے کام لینے کی ضرورت پڑے تو مجسٹریٹ کسی خاص صورت حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ان سے استدعا کرے لیکن صورت حالات کو ان کے سپرد نہ کرے'' ایک اور جگہ انہوں نے کہا کہ فیصلہ نمبر ۲ کا مطلب یہ تھا کہ اگر کسی مخصوص صورت حالات میں پولیس ناکام رہ جائے تو وہ فوج کو بلا لے اور اس کو تدارک کے لیے کہہ دے۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ان سے کہا

''اہل فوج یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ان سے کسی مخصوص صورت حالات کا چارج لینے کی کبھی استدعا نہیں کی گئی۔ لہٰذا انہوں نے کچھ نہیں کیا۔۔۔۔۔۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے مجھے بتایا کہ فوج نے مجسٹریٹوں کے بعض خاص احکام کی تعمیل نہیں کی میں نے ان سے کہا کہ اس معاملے کے متعلق تحریری رپورٹ بھیجیں لیکن انہوں نے کوئی رپورٹ نہ بھیجی نہ انہوں نے مجھے اس عدم تعمیل کی کوئی مثال بتائی۔ میرے نزدیک فیصلہ نمبر ۲ کا مطلب یہ نہ تھا کہ جب کبھی فوج کے نزدیک کوئی صورت مداخلت کی متقاضی ہو تو وہ خود بخود۔

فیصلے کا مطلب یہ نہ تھا کہ فوج آزادانہ اقدام کر سکے گی

میرے نزدیک فیصلہ نمبر ۲ کا مطلب یہ نہ تھا کہ جب کبھی فوج کے نزدیک کوئی صورت مداخلت کی متقاضی ہو تو وہ خود بخود ہی اپنے کمانڈروں کے ماتحت کوئی اقدام کر لے۔ فیصلے کا یہ مقصد نہ تھا کہ فوج کسی مجسٹریٹ یا پولیس کی معیت کے بغیر آزادانہ اقدام کر سکے گی۔ ۵ مارچ کے فیصلوں سے پہلے فوج کے گشتی دستے پولیس کی معیت کے بغیر ہی گشت کر رہے تھے''

اس پر طبعاً مسٹر یعقوب علی خاں نے جب ذیل سوال کیا:۔

سوال: پھر فوج کے خلاف آپ کی وہ شکایت کیا ہوئی جس پر آپ نے اپنے تحریری بیان میں زور دیا ہے؟

جواب۔اہل فوج نے یہ تاثر پیدا کیا کہ وہ گولی نہیں چلائیں گے جس وقت پولیس کو گالیاں دی جارہی تھیں اور بعض لوگ اپنے اعضائے مخصوصہ کو کھول کر پولیس کی توہین کررہے تھے اس وقت بعض موقعوں پر فوجی افسر پھولوں کے ہار اپنے گلوں میں ڈلوا رہے تھے۔

ہاروں کے معاملے کے متعلق اس سے قبل بحث کی جاچکی ہے یہ واقعہ فوجی عملیات کے ابتدائی دور میں ہوا تھا اور جی او سی نے اس کے متعلق تنبیہ کردی تھی یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ حرکت نازیبا تھی اور اگرچہ دشنام طرازی کی صورت حال لازمی طور پر نازک صورت حال نہیں ہوتی لیکن بہرحال اس قسم کا تاثر پیدا نہ ہونا چاہیے تھا۔ بدوضعی کی یہ واحد مثال تھی جس سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی وہ شکایت ہمارے نزدیک کچھ اہم تر نہیں کہ انسپکٹر جنرل نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے جو کچھ سنا شاید اسی کی بنا پر گورنر سے شکایت کی کہ بعض موقعوں پر فوج کو اقدام کرنا چاہیے تھا لیکن اس نے نہیں کیا آخر میں مسٹر انور علی نے کہا کہ ''ان واقعات کی تفصیلات ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس مہیا کرسکتے ہیں''۔

ہوم سیکرٹری کی تعبیر

لہٰذا اب ہم ان دو افسروں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کیونکہ ہوم سیکرٹری ہم کو کچھ زیادہ نہیں بتا سکتے انہوں نے کہا ہے کہ ''جی او سی نے ہمیشہ سول حکام کو پورے تعاون کا یقین دلایا اور یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ سول حاکم نے ان کی پیش کش قبول کرنے سے انکار کیا میں نہیں کہہ سکتا کہ معاملات کی حقیقی حالت کیا تھی لیکن ایسی شکایات ضرور کی گئیں کہ فوج کوئی موثر حصہ نہیں لے رہی ہے میرا خیال ہے انسپکٹر جنرل نے مجھ سے شکایت کی اور ایک واقعہ بیان کیا کہ بعض فوجی افسروں کو ہار پہنائے گئے یہ

واقعہ ہے کہ مارشل لا نافذ ہونے تک فوج نے اپنے وجود کا کوئی موثر ثبوت نہیں دیا۔ اہل فوج شورش کو توڑ کر بے جان کر سکتے تھے'' جنرل اعظم کا قول بھی تھا کہ اگر انہیں موقع دیا جائے تو وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ لیکن فیصلہ نمبر۲ کے متعلق ہوم سیکرٹری کا بھی تاثر یہی ہے کہ فوج کو پولیس کے ساتھ رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔

ایس پی کا تاثر:

سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کی شہادت کا خلاصہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے ''۳ کی صبح کو میں نے ایک فوجی افسر کو وہ راستے بتائے جن پر میں گشت کرانے کی ضرورت سمجھتا تھا۔ میں نے اپنے افسروں کو ہدایت کر دی تھی کہ فوج جس وقت بھی ان سے کوئی امداد طلب کرے وہ فوراً مہیا کریں بعض حالات میں پولیس کے افسر فوج کے ساتھ ساتھ تھے۔ فوج کا پہلا کام یہ تھا کہ محض نمائش کی غرض سے گشت کرے انسپکٹر جنرل جی او سی اور دیگر فوجی افسروں سے اصرار کر رہے تھے کہ فوج کو کوئی شدید اقدام کرنا چاہیے۔ اگر گشتی دستہ کسی مجسٹریٹ کی معیت میں ہوتا تو وہ مجسٹریٹ کے حکم کے بغیر قوت استعمال نہ کر سکتا تھا یہ ہدایت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے دی تھی کہ فوج کے گشتی دستوں کے ساتھ مجسٹریٹ بھی جائیں۔

اس وقت یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ فوج کوئی آزادانہ اقدام نہیں کر رہی ہے لیکن میں اس کی کوئی خاص مثال پیش نہیں کر سکتا۔ یہ خیال مجھے بعض پولیس افسروں سے معلوم ہوا جو یہ کہہ رہے تھے کہ فوج نے نہ کہیں گولی چلائی ہے نہ مجمعوں کو منتشر کیا ہے انہوں نے بھی کوئی معین مثال نہیں دی۔ اگر جنرل اعظم یہ کہتے ہیں تو ممکن ہے یہ صحیح ہو کہ جب کبھی فوجی دستے بلوائیوں کو نظر آتے تھے بلوائی منتشر ہو جاتے تھے۔ میرا تاثر یہ ہے کہ ہمیں فوج سے اس قسم کا تعاون حاصل نہیں ہوا جو انہوں نے ۱۹۴۷ء کے بلووں میں پیش کیا تھا جبکہ وہ کسی سے پوچھے بغیر گرفتاریاں کر رہے تھے''۔

لیکن اس کے برعکس ''حکومت'' فوج کو زیادہ اختیار دینے میں یہ اندیشہ محسوس کر رہی تھی کہ مبادا وہ خونریزی کا باعث ہو۔ سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس فوج سے جس کام کی توقع کر رہے تھے وہ اس

اقدام سے زائد تھا جو انسپکٹر جنرل نے اس کے سپرد کیا تھا۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم بہتر یہ سمجھتے تھے کہ فوج چیف سیکرٹری کی تجویز کے مطابق عمل کرتی لیکن اگر ایسا ہوتا تو ''حکومت'' کو سخت پریشانی لاحق ہو جاتی ہر شخص کو خوش کرنا بے حد مشکل ہے۔

مرزا نعیم الدین یہ بھی کہتے ہیں ''مجھے خیال ہے کہ بعض مجسٹریٹ بھی فوج کے رویہ کے خلاف اگر کر رہے تھے۔ مارشل لا کے ایام میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بیان کیا تھا کہ انہیں بھی بعض مجسٹریٹوں سے اس قسم کی شکایات موصول ہوئی تھیں''۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا بیان:

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اس سے انکار کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ میں فوج اور پولیس کے رابطہ عمل سے کاملاً مطمئن تھا ان کے بیان کے مختلف حصوں سے مندرجہ ذیل اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں جن سے پوزیشن مزید واضح ہو جائے گی:۔

> ۳ مارچ کی صبح کو ہم سول لائنز کے تھانے میں فوج کے سینئر افسروں سے ملے اور ان کو وہ اہم مقامات بتائے جن میں گشت کرنا ضروری تھا ہم نے کہا کہ مجسٹریٹ اور پولیس گشتی دستوں کے ساتھ لازمی طور پر ہوں گے اگر کوئی مجمع خلاف قانون نظر آئے گا تو مجسٹریٹ اسی موقع پر مناسب اقدام کا فیصلہ کرے گا۔ میں فوج سے یہ توقع نہیں رکھتا تھا کہ وہ مجسٹریٹ کے حکم کے بغیر گولی چلائے گی۔ میں ایسی کوئی مثال پیش نہیں کر سکتا کہ کہیں فوج تنہا گئی ہو۔ کسی ہجوم سے اس کا سامنا ہوا ہو اور اس نے وہ اقدام نہ کیا ہو جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ مجھے دو موقعوں کا علم ہے جب صورت حالات کو فوج کے حوالے کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ ایک تو ۵ مارچ کو لوہاری دروازے کے باہر جب پولیس کے تھانے پر حملے کا خطرہ تھا اور اس کے اندر اینٹیں پھینکی جا رہی تھیں۔ دوسرا موقع ۶ مارچ کو ٹولنٹن مارکیٹ میں پیش آیا۔ فوج نے گولی چلائی اور صورت حالات کا مداوا ٹھیک طور سے کیا۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ میں نے سپرنٹنڈنٹ پولیس سے کہا تھا کہ مجسٹریٹوں نے مجھ

سے فوج کے عدم تعاون کی شکایت کی ہے۔ مجھے پورا اطمینان تھا کہ فوج نے اپنے آپ کو کاملاً سول حکام کے حوالے کر رکھا ہے۔۔۔۔ فیصلہ نمبر۲ کا مطلب یہ تھا کہ فوج اور پولیس دونوں اکھٹے ہو کر باہر نکلیں گے''

ملک حبیب اللہ:

ملک حبیب اللہ نے بیان کیا۔ ''مجھے فوج کی طرف سے تعاون کی کمی کی کوئی شکایت نہ تھی اس کے برعکس ایک ہی موقع پر جب میری موجودگی میں مسٹر عالم نے ایک فوجی دستہ طلب کیا تو فوج نے وہ دستہ فی الفور مہیا کر دیا لیکن ایک اور موقع پر اس مطالبے کے تھوڑی دیر بعد۔۔۔ ہم نے دیکھا کہ جو فوجی دستہ لوہاری دروازے کے تھانے پر پہنچا تھا وہ جارحانہ اقدام کے لیے مورچہ لگائے بیٹھا تھا لیکن عوام اس پر اور اس کی گاڑیوں پر پھول اور ہار پھینک رہے تھے۔۔۔ فوج ایک ایسے وقت پر تھانے کی طرف گئی تھی جب ہجوم تھانے پر خشت باری کر رہا تھا اور میں نے دیکھا کہ پوری سڑک اور پورا انارکلی چوک اینٹوں سے پٹا پڑا تھا لیکن فوجی دستے نے گولی نہیں چلائی''۔ اس سے یہ کہانی کسی قدر پیچیدہ ہو جاتی ہے کیونکہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہمیں بتا چکے ہیں کہ فوج نے گولی چلائی اور اور موثر طور پر چلائی لیکن اگر صرف یہی وہ پھول تھے جن کی خوشبو ہماری کہانی میں بار بار پھیلتی رہی ہے تو ہم اعتراف کرتے ہیں کہ اس میں فوج کا کچھ قصور نہ تھا کہ وہ تو گولی چلانا چاہیں اور لوگ اس پر پھول برسانے کے خواہاں ہوں کوئی شخص ایسے آدمی پر گولی نہیں چلا سکتا جو اس کو پھولوں کا تحفہ پیش کر رہا ہو۔

جنرل اعظم کا بیان:

آخر ہم نے جنرل اعظم کی شہادت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ اب تک جو شہادت قلمبند ہوئی ہے اس سے فوج کے خلاف کسی الزام کا انکشاف نہیں ہوا لیکن صورت حالات کے متعلق جنرل اعظم کا بیان بھی ضرور سننا چاہیے۔ جنرل اعظم فیصلہ نمبر۲ کا یہ مطلب نہیں سمجھتے کہ پولیس کے ساتھ فوج ضرور ہوگی۔ ''نہ پولیس نے ہم سے کوئی استدعا کی تھی کہ ہم اس کے ساتھ رہیں'' لیکن فوج کہیں دور فاصلے پر مقیم نہ تھی ''اپنے کمانڈروں کے ماتحت'' کا یہ مطلب نہ تھا کہ فوج پولیس سے بے نیاز ہو کر آزادانہ اقدام کرے گی وہ اس سے پیشتر بھی اپنے ہی کمانڈروں کے ماتحت تھی۔ ''مسٹر چند

ریگر نے فیصلے کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ فوجی دستے قوت کا استعمال کریں گے لیکن وہ اپنے کمانڈروں کے ماتحت اقدام کریں گے۔ یہ مطلب ان معنوں میں صحیح ہے کہ اگر پولیس ہم سے امداد طلب کرے گی تو وہ امداد فی الفور دی جائے گی۔۔۔۔ ان کا بیان کہ میں نے تسلیم کیا ہے کہ ہار پہنانے کا کم ازکم ایک واقعہ ضرور ہوا تھا صرف اس حدتک درست ہے کہ ایک دفعہ اس قسم کی کوشش کی گئی تھی اور اس میں پھول دور سے دکھائے گئے تھے۔ شاید اس سے مقصود یہ تھا کہ فوج اور پولیس میں پھوٹ پڑ جائے۔ مسٹر چندریگر نے بیان کیا ہے کہ میں نے اس معاملے کی تحقیقات کی اور انھیں یہ اطمینان ہو گیا کہ جن موقعوں کے متعلق شکایت کی گئی ہے ان پر گولی چلانا ضروری نہ تھا یہ بیان صرف اس حدتک درست ہے کہ میں نے بریگیڈ کمانڈر سے تحقیق کی تھی جو اس وقت موقع پر موجود تھا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہار پہنانے کے صرف ایک واقعہ نے فوج کے خلاف تعصب پیدا کر دیا۔ یہ بات ایک شخص سے دوسرے شخص تک اور ایک حلقے سے دوسرے حلقے تک پہنچی اور لوگ اس کو بہ طور مثال پیش کرنے لگے کہ فوج نے صورت حالات کے متعلق یہ رویہ اختیار کیا ہے۔ لیکن ایسی کوئی مثال پیش نہیں کی گئی اور کوئی ایسی مثال مبہم طور پر بھی معلوم نہیں جس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ فوج نے اپنا مفوضہ کام انجام نہیں دیا یا ایسے طریق سے انجام دیا کہ اس کے متعلق دورائیں ظاہر کی جاسکیں۔ اس موضوع کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہی کہا گیا ہے کہ فوج نے جو کچھ کیا وہ اس سے زیادہ بھی کر سکتی تھی۔

فوج کے خلاف کوئی چیز ثابت نہیں

وہ یقیناً کر سکتی تھی بشرطیکہ اس کو بغیر کسی تامل کے استعمال کیا جاتا یہ تامل محض اس اندیشے کی وجہ سے تھا کہ وہ خوں ریزی کا باعث ہو گی فوج کے خلاف کوئی چیز ثابت نہیں۔ یہ الزام وملامت سے بچنے کا محض ایک بہانہ تھا۔

۶۔ کیا مارشل لا سے بچنا ممکن تھا؟

جنرل اعظم کا خیال ہے کہ اگر بروقت کاروائی کی جاتی تو فوج بھی بالکل غیر ضروری تھی ''نیم دلی کی تدبیروں اور ناقص قیادت کا نتیجہ تباہی کی صورت میں نکلا۔ پولیس فرسٹ کلاس تھی اگر وہ ایک خاص مرحلے پر مضبوط پالیسی پر عمل کرتی تو فوج کی مدد کے بغیر ہی صورت حالات پر قابو پا لیتی ضرورت جرات کی اور ایک معین مقصد کی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس امر کا احساس چاہیے تھا کہ یہ معاملہ قانون وانتظام کا ہے اور ہر قیمت پر اس کا سامنا کرنا ہے''۔

اگر فوج کے استعمال کرنے کے متعلق ہچکچاہٹ نہ ہوتی

یہ شاید صحیح نہ کہ فوج کی بالکل ہی ضرورت نہ پڑی لیکن یہ صحیح ہے کہ سول حکام کے اقدامات پر ایسی مصلحتوں کا اثر تھا جو خالص قانون وانتظام کے مصالح سے بالکل علیحدہ تھیں۔ حکومت فوج کو بلا تامل استعمال کرنے سے ہچکچا رہی تھی کہ مبادا خوں ریزی ہو جائے۔ جیسا مسٹر انور علی نے کہا ہے اور وزراء معزز شہریوں کے اس احتجاج سے پریشان ہو رہے تھے کہ پولیس ان پر تشدد ہجوموں پر بھی گولی چلا رہی ہے (ہم دہراتے ہیں کہ ''پرتشدد ہجوموں پر بھی'') جو زیادہ سے زیادہ کسی تھانے پر خشت باری کر دیتے ہیں یا کسی کسی جگہ کسی اومنی بس کو جلا دیتے ہیں یا کسی قصور وار ڈاک خانے کو آگ لگا دیتے ہیں یا مسافروں سے بھری ہوئی کسی ریلوے ٹرین پر پتھر پھینکتے ہیں کیونکہ وہ سٹیشن سے روانہ ہونے کی کوشش کرتی ہے یا ان تانگے والوں اور دکانداروں کا منہ کالا کر دیتے ہیں جو اپنے کاروبار کو بند نہیں کرنا چاہتے یہ بہت چھوٹے واقعات ہیں بمقابلہ اس کے کہ ایک بھری ہوئی بوری کو خواجہ ناظم الدین کا مجسمہ بنا کر دکھایا جائے اور قصور میں ایک گدھا تیار کیا جائے جس کے سوار کو ظفر اللہ خاں ظاہر کیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک حکم صادر کر دیا گیا جس کے معنی یہ سمجھے گئے کہ فائرنگ کو محدود کرنے کی ہدایت کی گئی ہے اور جس کا اثر پولیس پر طبعاً بہت برا ہوا۔

اگر مسجد وزیر خاں کو منقطع کر دیا جاتا

لیکن اب ہم پھر ۴ مارچ کا ذکر کرتے ہیں جب سید فردوس شاہ قتل کیے گئے تھے اس سے بھی قبل سب کو معلوم تھا کہ مسجد وزیر خاں تمام گڑبڑ کا مرکز ہے۔ مولانا عبدالستار نیازی اس میں مسند نشین ہو چکے ہیں او ایک ایسی مضبوط نشست سے حکومت کے خلاف نفرت پھیلا رہے ہیں کہ ان کے خلاف گرفتاری وارنٹ کی بھی تعمیل نہیں کی جا سکتی۔ اگر پولیس صورت حالات پر قابو نہیں پایا جا سکتا تھا تو اس کو فوج کے حوالے کیوں نہ کیا گیا۔ ہمارا پختہ عقیدہ ہے کہ اگر صرف اس ایک ہی صورت حالات کو فوج کے حوالے کر دیا جاتا تا بلووں کی رفتار پر نہایت نمایاں اثر پڑ جاتا۔

اگر انسدادی اقدام کچھ مدت پہلے کیا جاتا

اب ہم اور بھی پہلے کے واقعات کی صرف متوجہ ہوتے ہیں سوائے اس حالت کے کہ حکومت پنجاب اور مجلس عمل کے درمیان یہ سمجھوتہ ہو چکا ہو کہ شورش کا مرکز کراچی ہوگا۔ ۲۸ فروری کو زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری حکم نافذ کرنا دنیادارانہ تدبیر تھی۔ اسی وجہ کی بنا پر اسے ''انسدادی'' تدبیر کہتے ہیں اس قسم کا حکم ۲۶ یا ۲۷ جولائی ۱۹۵۲ء کو بھی جاری کیا گیا تھا۔ جب لیگ کے دفتر کے سامنے تشدد کا مقامی خطرہ درپیش تھا اور یہ حکم ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے کسی سے استصواب کیے بغیر نافذ کر دیا تھا۔ یہ حسن تناسب کے فقدان کا ثبوت ہے کہ اس موقع کو ۲۸ فروری سے بھی زیادہ خطرناک ممکنات کا حامل سمجھا گیا۔ حالانکہ ۲۸ فروری کو ڈائریکٹ ایکشن کے چیلنج پر عمل ہونے والا تھا اور مرکزی حکومت نے اس چیلنج کو قبول کر کے ممتاز لیڈروں کی گرفتاری کا حکم دے دیا تھا جو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے نزدیک ''گم نام'' لوگ تھے۔

اگر باورچی اتنے زیادہ نہ ہوتے:

انگریزی میں ایک مثل ہے کہ بہت سے باورچی سالن کی ہنڈیا کو خراب کر دیتے ہیں۔ ہمیں بارہا یہ احساس ہوا ہے کہ لاہور کی مصیبت بھی ''بہت سے باورچیوں'' کی وجہ سے تھی۔ دوسرے اضلاع میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس صورت حالات پر گفتگو کر کے ایک لائحہ عمل تیار

کر لیتے ہیں اور بغیر کسی خلل اور مداخلت کے اس کو پورا کر سکتے ہیں۔ لاہور میں متعدد بڑے افسر موجود ہیں جن سے مشورہ ضروری ہوتا ہے اور باوجود اس کے جو کچھ مسٹر دولتانہ اور ان کے افسروں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے فرائض کے متعلق کہا ہے اگر ان کے پاس ایک ایسا قوی آدمی ہوتا جو بروقت ایک حکم امتناعی جاری کر دیتا اور مسجد وزیر خاں کو فی الفور آبادی سے منقطع کر دینے کا حکم دے دیتا اور فائرنگ نرم کرنے کے فیصلے کو اٹھا کر طاق پر رکھ دیتا تو ہمیں یقین ہے کہ اس کا آئندہ عہدہ کراچی میں کنٹرولر اجناس خوردنی وفونٹین پین'' ہوتا۔ لیکن تم کو حقیقت میں ایسے افسروں کی ضرورت ہے جو ۴ مارچ کی شام کو صرف ایک پستول جیب میں ڈال کر اور گھوڑے پر سوار ہو کر تن تنہا مسجد وزیر خاں میں جا سکیں۔ تم کو اس قسم کے افسروں کی نسل بڑھانی چاہیے اور ان میں آزادی وخود مختاری کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے۔

لائل پور کی ایک مثال:

''بہت سے باورچیوں'' کے موضوع کے سلسلے میں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مسٹر این حسن ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لائل پور نے تن تنہا انسپکٹر جنرل، ہوم سیکرٹری، چیف سیکرٹری، چیف منسٹر اور گورنر کی امداد کے بغیر کیا کام انجام دیا۔ یہ شہر لاہور کے مقابلے میں چھوٹا ہے لیکن اس کا رقبہ مسجد وزیر خاں سے کچھ بڑا ہی ہوگا۔ ۲ مارچ کو جامع مسجد میں لاہور اور کراچی جانے والے رضا کاروں کے اعزاز میں اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں لیکن اس کے بعد ہم نے ان رضا کاروں کے متعلق کچھ بھی نہ سنا۔ پولیس نے سالار روالا کے مقام پر ان کو کہیں غائب کر دیا۔ ۳ مارچ کو سیال کوٹ میں گولی چلنے کی خبر سے کچھ اضطراب پیدا ہوا۔ لہٰذا فوراً دفعہ ۱۴۴ لگا دی گئی چار پانچ ہزار آدمیوں کا ایک جلوس ڈپٹی کمشنر کے مکان کی طرف روانہ ہوا لیکن منزل مقصود پر پہنچنے سے پہلے چند گرفتاریاں کر لی گئیں۔ ۴ مارچ کو مکمل ہڑتال تھی ایک جلوس نے پھر ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی کا رخ کیا لیکن ڈپٹی کمشنر نے نہایت ہوشیاری سے کام لے کر اس کو جیل کی طرف منتقل کر دیا۔ جلوس کا رویہ جارحانہ اور اشتعال انگیز تھا لیکن ڈپٹی کمشنر نے پولیس کی نفری کو ناکافی پا کر اس کو منتشر نہ کیا لیکن ۱۲۵ آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد اس افسر نے ہوم سیکرٹری کو ٹیلیفون کر کے فوجی امداد اور ایک ہوائی جہاز کا مطالبہ کیا

تا کہ قانون وانتظام کا احترام قائم کیا جائے یہ دونوں چیزیں بلا تاخیر مہیا کر دی گئیں ۵ مارچ کو دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کے حکم کی خلاف ورزی میں ایک جلوس نکالا گیا اور ۵۵ اشخاص گرفتار کیے گئے ۶ اور ۷ کو بھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو خبر ملی کہ تین ٹرینیں روک لی گئی ہیں اور مسافر عورتوں کی بے عزتی کی جارہی ہے اوران کولوٹا جارہا ہے۔اس نے مضبوط اقدام کے لیے کسی مجسٹریٹ کو نہیں بھیجا بلکہ خود وہاں گیا اور اس نے ہجوم کو منتشر کرنے کا حکم دے دیا جب لوگ منتشر نہ ہوئے تو اس نے لاٹھی کا خطرہ لینا گوارا نہ کیا جس میں اکثر پولیس پٹ جایا کرتی ہے۔اس نے گولی چلانے کا حکم دے دیا جس سے چار ہلاک اور پانچ زخمی ہوئے پھر اس نے ٹرینوں کو فوجی پہرہ مہیا کیا تا کہ آمد ورفت کی روانی معطل نہ ہونے پائے۔

۸ مارچ کو اس نے سنا کہ چنیوٹ بازار کے مکانوں کی چھتوں پر اینٹیں جمع کی گئیں ہیں تا کہ اگر پولیس جلوسوں میں مداخلت کرے تو اس پر اینٹوں کی بوچھاڑ کی جاسکے۔ساڑھے سات بجے شام وہ ڈی آئی جی کے ساتھ چنیوٹ بازار گیا وہاں ان کا سامنا ایک سرکش ہجوم سے ہوا۔یہ دونوں افسر وہاں سے واپس آگئے اور پھر فوج کا ایک دستہ لے کر آئے۔انہوں نے ہجوم کو منتشر ہونے کا حکم دیا جب اس حکم کی تعمیل نہ ہوئی تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے گولی چلانے کا حکم دے دیا جس سے تین آدمی ہلاک ہوئے اور ایک زخمی ہوا۔

اس کے بعد کوئی واقعہ نہیں ہوا صرف ایک واقعہ البتہ ہوا کہ ایک دن شام کو چیف منسٹر نے ٹیلیفون پر اس کے مضبوط اقدام پر مبارکباد دی۔

سیالکوٹ کی مثال:

سیالکوٹ میں کم از کم دو ایسے واقعات ہوئے جن کا انتظام فوج کے حوالے کر دیا گیا اور کسی کو یہ اندیشہ نہ ہوا کہ فوج ایسا قابو پالے گی کہ سول حکام بالکل ہی بے دخل ہو جائیں گے نہ کوئی ایسا خطرہ تھا کہ خوریزی ہو جائے گی۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ اس کے متعلق کوئی اضطراب نہ تھا کیونکہ جب گولی چلے گی تو خونریزی لازماً ہوگی اور ”تم کو معلوم ہے کہ ایسے واقعات ہر مشہور فتح کے موقع پر ہوا ہی کرتے ہیں“ ہم ایک مختلف موقع پر یہ لکھ چکے ہیں کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے جب دیکھا کہ صورت

حالات اسکی متقاضی ہے تو اس نے اسکو فوج کے حوالے کر کے دانش مندی کا ثبوت دیا۔

مارشل لا کے بعد جنرل اعظم نے فصیلی شہر کے اندر (جس پر ۱۹۳۲ء سے کسی نے قابو نہ پایا تھا) صرف ایک بٹالین استعمال کی جس میں چار سو اور چھ سو کے درمیان نفری تھی۔ جنرل اعظم نے شکایت کی کہ مارشل لا کے اعلان سے پہلے فوج کو محض نمائشی مقصد (یعنی گشت) کے لیے استعمال کیا گیا اور بدنظمی کو دبانے کے لیے کام میں نہ لیا گیا۔'' مثلاً اگر مجھ سے یہ کہا جائے کہ کرفیو آرڈر کو گولی چلا کر اور گرفتاریاں کر کے نافذ کرو تو یہ بدنظمی کو دبانے کا کام ہوگا۔ اس کے بعد طوفان کا مرکز یعنی مسجد وزیر خاں کا رقبہ بلکہ حقیقتہً فصیلی شہر کا پورا رقبہ نظر انداز کر دیا گیا اگر دبانے کا کام ہمارے سپرد ہوتا تو ہم سارے شہر میں اپنی چوکیاں قائم کر لیتے اور لوگوں کو ان کے ''بھٹوں'' میں آنے جانے سے بالکل روک دیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ جہاں کہیں فوجی دستے ظاہر ہوتے تھے لوگ غائب ہو جاتے تھے''۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ہمیں بتایا ہے کہ ۵ مارچ کی شام تک پولیس جواب تک صورت حالت کے تدارک کے لیے جدوجہد کر رہی تھی ناکام ہونے لگی اور اس کے بعد پولیس کا کام تھا کہ فوج کی خدمات سے فائدہ اٹھاتی'' جب ان سے سوال کیا گیا کہ آپ نے اس کو ممکن کیوں نہ بنایا انہوں نے جواب دیا ''فوج بھی موجود تھی اور پولیس بھی موجود تھی'' ان کا فرض تھا کہ فوج کو طلب کر لیتے اور فوج پہلے ہی سے شہر میں موجود تھی۔ یہ پولیس کے حاکم اعلیٰ کا فرض تھا کہ انہیں بتاتا کہ انہیں کس طریقے سے کاروائی کرنی چاہیے۔ اگر مجسٹریٹ موجود ہو جب بھی پولیس ہی کا کام ہے کہ فوج سے اقدام کی استدعا کرے'' آپ نے کہا کہ ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۲۹ کا یہی مطلب ہے۔

ہمارا یہی مطلب ہے اس قول سے اگر ایک قوی آدمی موجود ہوتا جو قانون و انتظام کے سوا دوسری بیرونی مصلحتوں کو نظر انداز کر دیتا اور اس اعلیٰ درجے کے مواد و سامان میں جو اس کے قدموں پڑا تھا زندگی کی روح پھونک دیتا تو حالات بالکل مختلف ہوتے اس باب کو ہم اس مصرع پر ختم کرتے ہیں کہ

شیر خدا و رستم ستانم آرزو دست

اس حصے کے آخری نتائج

اب پوری صورت حالات پر تبصرہ کرنا مناسب ہے۔

ہر شخص اس پر متفق تھا کہ احراری ایک مخالف حکومت گروہ ہے یہ لوگ قیام پاکستان کے مخالف تھے اور سردار عبدالرب نشتر کا خیال بھی یہی ہے کہ وہ اپنے اعتماد کو دوبارہ بحال کرنے کی فکر میں ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں اور پھر ۱۹۵۲ء میں مسٹر انور علی نے جو اس زمانے میں ڈی آئی جی سی آئی ڈی تھے پر زور سفارش کی کہ ان کو خلاف قانون امکانی نتائج سے آگاہ کیا۔ ایک لاقانونی سے دوسری لاقانونی پیدا ہوتی ہے۔ ایک مکروہ شے دوسرے مکروہ شے کا باعث ہوتی ہے لیکن جب کبھی کوئی کانفرنس ہوئی یا تو ان لوگوں کو اپنی پر زور رائے تبدیل کرنے پر آمادہ کرلیا گیا یا سرکاری اخلاق نے انہیں احتجاج سے باز رکھا۔ لہٰذا مسٹر دولتانہ کہتے ہیں کہ جو فیصلے فائلوں میں درج ہیں ان پر ہر شخص متفق تھا اور حکام متعلقہ نے اس بات کی کبھی تردید نہیں کی لہٰذا ہماری رائے یہ ہونی چاہیے کہ ذمہ داری مشترک تھی گو ہمارا احساس اس سے مختلف ہے۔ مزید براں ہمارا احساس یہ بھی کہ احراریوں سے جس کو اس کا باپ کسی اجنبی کو پیٹنے پر سزا کی دھمکی دیتا ہے اور وہ بچہ یہ جان کر کہ اسے سزا نہ دی جائیگی، اجنبی کو پھر پیٹنے لگتا ہے۔ اس کے بعد چونکہ دوسرے لوگ دیکھ رہے ہوتے ہیں اس لیے باپ محض پریشان ہوکر بیٹے کو مارتا ہے لیکن نرمی سے تاکہ اسے چوٹ نہ لگے۔

چونکہ مرکزی حکومت مسلسل دریافت حال کررہی تھی اور سی آئی ڈی کی یادداشتیں انبار در انبار جمع ہورہی تھیں اس لیے ۲۵ مئی ۱۹۵۲ء کو ایک کانفرنس منعقد کی گئی اور فیصلہ کیا گیا کہ احراریوں اور احمدیوں کے تمام جلسے ممنوع قرار دے دیے جائیں یہ اقدام بہت خوب تھا لیکن ۵ جولائی تک اس کو کانٹ چھانٹ کر بالکل ہی نیست و نابود کردیا گیا۔ حکم امتناعی کی خلاف ورزی میں جلوس نکلتے ہیں تو نکلنے دو، جلسے ہوتے ہیں تو ہونے دو، احراریوں کے سوا کسی کو گرفتار نہ کرو، کوئی احراری گرفتار نہ کیا جائے صرف ممتاز احراری گرفتار کئے جائیں اور اگر کوئی ممتاز احراری کسی ایسے جلسے میں تقریر کرے جو

اس کی جماعت نے منعقد کیا ہوتو اسے حکومت سے استصواب کیے بغیر گرفتار نہ کیا جائے۔

اور حکام ضلع نے قدرتی طور پر اس میں ایک چوتھی ہدایت کا اضافہ کر لیا حکومت سے استصواب کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ استصواب کرنے میں دیر لگتی ہے۔ آخر حکومت کو پولیس کے سول تھانوں کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے اور پھر مہاجرین اور استقبال معززین کو بھی مزید دو تھانے ہی سمجھنا چاہیے۔ یہ کیس ایک کانفرنس میں پیش کرنا ہوگا لیکن اس وقت جب ساتھ آٹھ اسی قسم کی مزید فائلیں جمع ہو جائیں پھر تین مہینے کے بعد تم سنتے ہو کہ عبداللہ اور نارائن صرف ادنیٰ قسم کے لوگ ہیں، ان کے خلاف مقدمات دائر کرنے سے کوئی مفید مقصد حاصل نہ ہوگا لیکن اگر عدالتی کاروائی کی منظوری بھی دے دی گئی تو تین مہینے گزارنے کے بعد اس کی امتناعی وقعت کیا رہ جائے گی؟

اگرچہ ۵ جولائی کے فیصلے اس وقت کیے گئے جب مسٹر دولتانہ نتھیا گلی میں تھے لیکن اس امر کے قرائن موجود ہیں کہ ان کے جانے سے پہلے ان فیصلوں کے متعلق ان سے بات چیت کی جا چکی تھی ہوم سیکرٹری نے ان سے ٹیلیفون کا رابطہ بھی برابر قائم رکھا تھا۔

جہاں ایک طرف افسروں پر یہ ظاہر کیا گیا کہ ان فیصلوں سے احراریوں کی باقی قوم سے منقطع کرنا مقصود ہے وہاں دوسری طرف احراریوں کو اس امر کا موقع دے دیا گیا کہ وہ ۱۳ جولائی کو کنونشن منعقد کر کے تمام مسلم جماعتوں کے علما سے اتحاد کر لیں۔ اس چال سے احرار نے جمہور کے ایک بہت بڑے طبقے کی ہمدردیاں حاصل کر لیں کیونکہ عوام احرار کی نسبت علما کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔

جب احراریوں نے دیکھا کہ ان کے جلسے ممنوع کیے جا چکے ہیں اور بعض احراریوں کے خلاف مقدمات بھی دائر ہو چکے ہیں تو انہوں نے ایک ٹکا دے کر اپنی آزادی خرید لی۔ انہوں نے ایک بیان جاری کیا کہ انہوں نے کبھی آج تک تشدد کی تلقین کی ہے نہ آئندہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ حکومت کو معلوم تھا کہ انہوں نے تشدد کی تبلیغ کی ہے یا کم از کم ان کی تقریروں کا اثر یہی ہوا ہے۔ لیکن حکومت نے یہ جانتے ہوئے بھی ان کے بیان کو اس طرح قبول کر لیا گویا احراریوں نے معافی مانگ لی ہے۔ حالانکہ صرف پندرہ روز پیشتر جب مسٹر انور علی نے ان سے معافی مانگنے کو کہا تھا تو

انہوں نے انکار کر دیا تھا۔حکومت کو خوب معلوم ہے کہ ایک صحیح قسم کا معافی نامہ کیونکر حاصل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ۲۸ فروری کو مولانا اختر علی خاں سے ایسا معافی نامہ حاصل کر ہی لیا تھا لیکن احرار کے معاملے میں ایک ایسا بیان جس سے ان کی عزت اور ان کے اعتبار میں ذرہ بھر کمی بھی نہ ہوتی تھی بہت بڑی کامیابی قرار دیا گیا اور ان کو اجازت دے دی گئی کہ وہ شوق سے تقریریں کریں ،وزیر خارجہ کو گالیاں دیں، وزیراعظم کو رسوا کریں اور شائستگی کے خلاف الفاظ استعمال کریں۔اس تمام دوران میں مسٹر دولتانہ کو ان کے افسر بار ہا یاد دلاتے رہے کہ احرار اپنے قول وقرار کی پابندی نہیں کررہے ہیں لیکن ان افسروں نے خود بھی کسی کاروائی کی تجویز پیش نہ کی یا تو انھیں علم تھا کہ انکی یاداشتوں کا کوئی اثر نہیں یا انہیں یاداشتیں لکھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ جب متعدد فائلیں جمع ہو گئیں تو ایک پالیسی کانفرنس کی تجویز ہوئی اور ۲۴ دسمبر ۱۹۵۲ء کو فیصلہ کیا گیا کہ عام قانون کا احترام کیا جائے۔

یہ بات تمسخر سے کم نہیں معلوم ہوتی کہ اب تک حکومت پنجاب، اس کی وزارت قانون و انتظام اور ان کی سول اور پولیس سیکرٹریٹ کو معلوم ہی نہ تھا کہ عام قانون کا احترام ضروری ہے۔لیکن اس وقت تک افسروں کی ذکاوت حس اسقدر مردہ ہو چکی تھی کہ ان کے نزدیک عام قانون کی خلاف ورزی کی سزا میں بھی محض تنبیہ کافی تھی۔

مرکزی حکومت نے پالیسی کی ایک چٹھی ستمبر ۱۹۵۱ء میں اور دوسری جولائی ۱۹۵۲ء میں جاری کی اور صوبائی حکومت پر یہ واضح کر دیا کہ جارحانہ فرقہ آرائی کو سختی سے دبا دیا جائے۔لیکن صوبائی حکام نے اپنی یاداشتوں میں اس امر پر زور دیا کہ مطالبات کے متعلق فیصلہ مرکز کا کام ہے اور جب تک ان کے موافق یا مخالف فیصلہ نہ ہوگا قانون و انتظام کی صورت حالات بہتر نہ ہوگی، انہیں خوب معلوم تھا کہ مرکز کسی حالت میں بھی مطالبات کو منظور نہیں کر سکتا اور اگر کوئی فیصلہ ہوگا بھی تو وہ نامنظوری ہی کا فیصلہ ہوگا۔لیکن وہ مصر رہے کہ کوئی فیصلہ ضرور ہونا چاہیے اور مرکز جس کے نمائندہ خواجہ ناظم الدین تھے کھلم کھلا یہ نہیں کہنا چاہتا تھا کہ وہ مطالبات کو مسترد کر رہا ہے کیونکہ خواجہ صاحب کے نزدیک ایسے فیصلے سے ان کا علماء سے تصادم ہو جائے گا اور خواجہ صاحب علما کی طرف نہایت گہرا میلان رکھتے تھے۔

ہمارا خیال ہے کہ یہ مطالبات بغیر کسی مذہبی احتیاط کے بغیر امن عامہ کو خطرے میں ڈالے اور بغیر حسیات عامہ کو صدمہ پہنچائے مسترد کیے جا سکتے تھے لیکن ہمارے نزدیک قانون و انتظام کی

صورت حالات کے مقاصد کے لیے ان کا جواب دینا بالکل ضروری نہ تھا۔ وہ صورت حالات تو ایک سادہ حکم امتناعی کے نفاذ ہی سے بہت بہتر ہوگئی تھی (گو وہ حکم بہت ناکافی تھا) لیکن جب جولائی ۱۹۵۲ء کے بعد احرار علما کے ہر قول وفعل کی طرف سے کامل بے پروائی کا رویہ اختیار کر لیا گیا تو وہ صورت حالات پھر بگڑتی چلی گئی بلکہ اس کے برعکس چیف منسٹر کی ان تقریروں کی وجہ سے یہ بگاڑ اور بھی زیادہ ہو گیا جن میں انہوں نے علی الاعلان یہ خیال ظاہر کیا کہ احمدی مسلمان نہیں ہیں۔

اخبارات نے یقیناً ڈائریکٹر تعلقات عامہ کی حوصلہ افزائی سے شورش کی آگ کو ہوا دی اور ہم ڈاکٹر قریشی کے اس خیال سے متفق ہیں کہ مسٹر دولتانہ ہرگز اس امر سے بے خبر نہ ہو سکتے تھے کہ اخبارات کیا کر رہے ہیں۔ اردو کے چار اخباروں کو ان کے ہزاروں پرچوں کے عوض بڑی بڑی رقمیں دی گئیں اور وہ پرچے بھی شاید خریدے نہ گئے اور یہ سب کچھ ایک پرانی پالیسی کی تعمیل میں کیا گیا کہ حکومت کی حمایت کرنے والے اخباروں کی سرپرستی کی جائے اور اگرچہ یہی اخبارات سب سے زیادہ شورش انگیزی کر رہے تھے۔ لیکن جولائی ۱۹۵۲ء میں ان کے معاہدوں کی تجدید کر دی گئی اور مسٹر دولتانہ کو اس کا علم تھا۔ دولاکھ روپے کی رقم جو اسمبلی نے ناخواندہ بالغوں کی تعلیم کے لیے منظور کی تھی مسٹر دولتانہ کے احکام کے ماتحت ان چار اخباروں کی خریداری کے لیے منتقل کر لی گئی اور کہا گیا کہ اس سکیم کو خفیہ رکھا جائے۔ ڈائریکٹر نے نہایت خیرہ چشمی سے ہمارے سامنے بیان کیا کہ یہ سکیم خواندگی کو ترقی دینے کے لیے نہیں بلکہ خاص قسم کے اخباروں کی امداد کے لیے وضع کی گئی تھی۔ ''زمیندار'' باوجود اس امر کے کہ وہ جولائی ۱۹۵۲ء کے بعد بھی جب ڈاکٹر قریشی نے مسٹر دولتانہ سے شکایت کی تھی برابر نفرت کی تلقین واشاعت کرتا رہا۔ گویا مامور من اللہ سمجھا جاتا رہا اور اس کے خلاف اقدام اس وقت تک ملتوی ہوتا رہا جب آخر اس التوا کی کوئی گنجائش نہ رہی کیونکہ مرکز نے سخت شکایت کی تھی۔ احراریوں کے آرگن ''آزاد'' کی طرف مرکز نے بار بار صوبائی حکومت کو توجہ دلائی اور صوبائی حکومت نے ہر دفعہ محض تنبیہ پر اکتفا کیا۔

مجلس عمل کے چیلنج کو دونوں میں سے کسی حکومت نے بھی سنجیدگی سے قابل توجہ نہ سمجھا۔ خواجہ ناظم الدین آخری لمحے تک اسی امید میں رہے کہ غیب سے کوئی اچھا سامان ہو جائے گا اور صوبائی حکومت مطمئن رہی کہ شورش کا آغاز کراچی میں ہوگا۔

آخر کار جب الٹی میٹم رد کر دیا گیا تو پوری صورت حالات کو بالکل تھیٹر کے ایک پرامن تماشے کی طرح سمجھا گیا جس میں مطمئن سامعین کی دل چسپی کے لیے سٹیج پر جلوس نکالے اور نعرے لگائے جا رہے ہوں۔ ''لاہور میں جلوس قریب قریب روزانہ نکلتے ہیں اور کوئی شخص ان کی پروا بھی نہیں کرتا'' جرگے بہت ہو رہے تھے اور کاروائی بالکل مفقود تھی ''پولیس بھی موجود تھی اور فوج بھی تھی'' اور جیسا کہ ایک افسر نے کہا ہر شخص صورت حالت کے متعلق گہرے غور خوض میں مصروف تھا اور ہر شخص کو معلوم تھا کہ کیا کرنا چاہیے ہر شخص محسوس کر رہا تھا کہ فوج خاصا کام انجام دے سکتی تھی لیکن کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ ایسا کیوں نہ ہوا۔

''بعض کہتے ہیں کہ وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا دوسرے کہتے ہیں وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا، یہ لوگ یوں ہی قیاسی باتیں کرتے ہیں۔۔۔۔۔تو کہہ دے کہ میرا خدا بہتر جانتا ہے (کہف)

ہمیں یقین واثق ہے کہ اگر احرار کے مسئلے کو سیاسی مصالح سے الگ ہو کر محض قانون و انتظام کا مسئلہ قرار دیا جاتا تو صرف ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس ان کے تدارک کے لیے کافی تھے۔ چنانچہ وہ طاقت جسے انسانی ضمیر کہتے ہیں ہمیں یہ سوال کرنے کی ترغیب دیتی ہے کہ آیا ہمارے سیاسی ارتقا کے مرحلے پر قانون و انتظام کا مسئلہ اس جمہوری ''ہم بستر'' سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا جسے وزارتی حکومت کہتے ہیں اور جس کے سینے پر ہر وقت سیاسی کابوس سوار رہتا ہے لیکن اگر جمہوریت کا مطلب یہ ہے کہ قانون و انتظام کو سیاسی اغراض کے ماتحت کر دیا جائے تو اللہ تعالیٰ ہی علیم و خبیر ہے کہ کیا ہوگا اور یہاں ہم رپورٹ کو ختم کرتے ہیں۔

محمد منیر۔ پریزیڈنٹ

ایم آر کیانی۔ ممبر